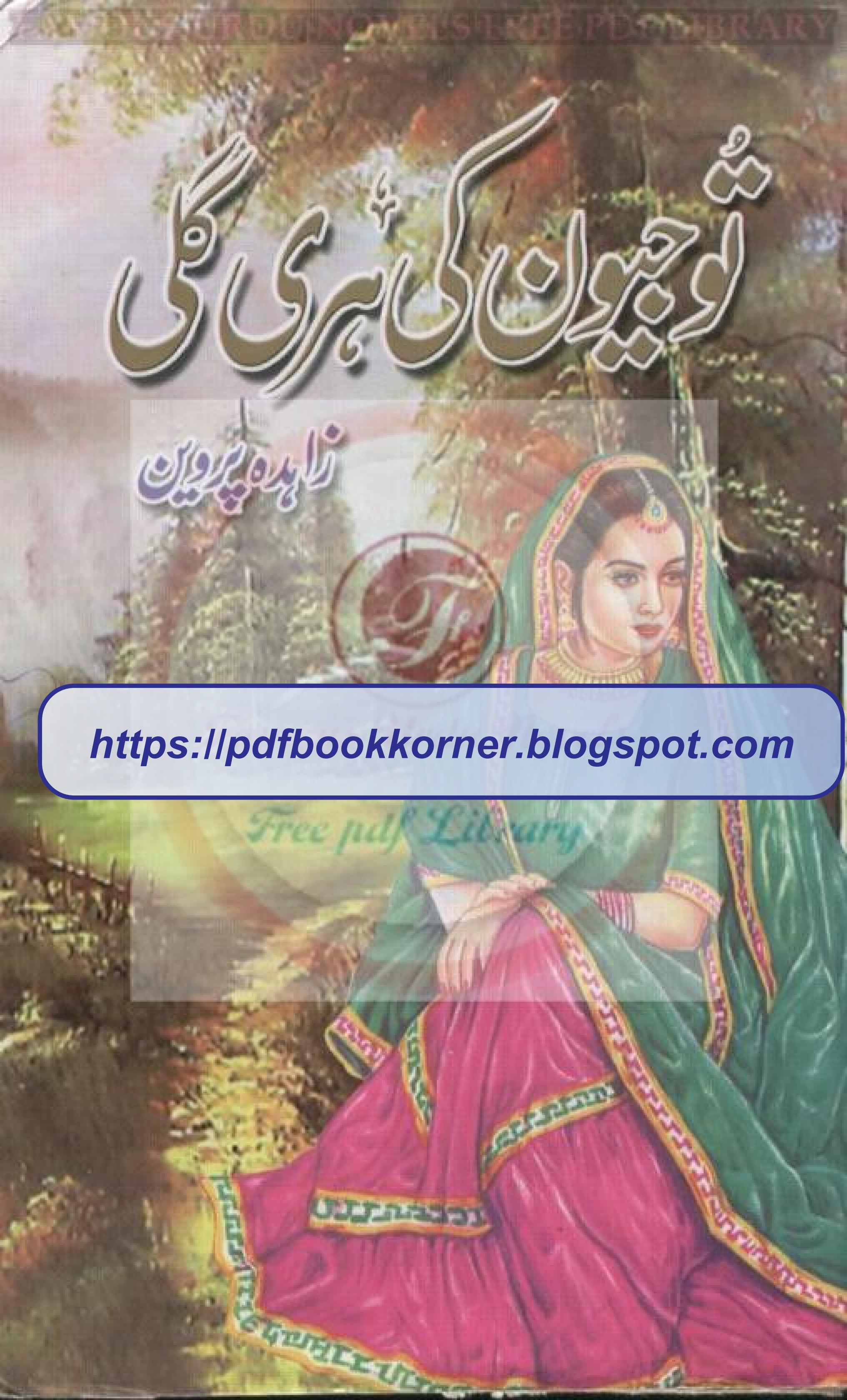
URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY
تُو جیون کی ہری گی
زاہدہ پروین
https://pdfbookkorner.blogspot.com
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY
https://pdfbookkorner.blogspot.com

بازار

وہ بہار کی حسین رُت تھی جب فاخر حسین نے پہلی مرتبہ سعدیہ سے بات کی تھی۔ اور پھر جوں جوں بہار کا رنگ بھرا موسم مست پون کے سنگ سنگ رقص کرتا گیا، تختِ چمن کے ساتھ ساتھ ویرانوں میں بھی پھولوں کے نرم و نازک ٹکڑے کھلتے گئے۔ ان دونوں میں بے تکلفی بڑھتی چلی گئی۔ دوستی میں پائیداری آتی گئی۔ غلافی آنکھوں اور کھلتی ہوئی چمپئی رنگت والی سعدیہ اس کے حواسوں پر چھانے لگی۔

پہلا سال تو فاخر حسین نے سعدیہ کو دیکھتے دیکھتے میں ہی گزار دیا تھا۔ دونوں ایک ہی مضمون میں ایم اے کر رہے تھے۔ ہر روز ہی ملنا ہوتا تھا۔ فاخر کا تعلق اس شہر سے نہیں بلکہ ایک چھوٹے سے قصبے سے تھا۔ سو اسے ہوسٹل میں رہنا پڑا۔

اس کے دوست نے کرائے پر ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ ہوسٹل میں رہنا فاخر کو بھی پسند نہ تھا لہٰذا دوست کے اصرار پر وہ بھی ہوسٹل کو خیرباد کہہ کر اس کا کمرہ شیئر کرنے آ گیا۔

اس دن تو وہ حیرت اور خوشی سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا جب اس نے اسی گھر کے گیٹ سے سعدیہ کو یونیورسٹی کے لیے نکلتے دیکھا۔ اس حسن اتفاق پر دونوں دنگ رہ گئے۔ فاخر کے تو خوشی سے پاؤں ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ یہ تصور کر کے اسے پوری کائنات نظر آنے لگی۔ یہ دوسری بات تھی کہ سعدیہ سے اس کی دوستی اس حسن اتفاق کے [illegible] کو بھی حسن پرست اور شاعرانہ مزاج والا فاخر حسین بہت بھایا۔ وہ ایسے دلنشین اور خوبصورت لب و لہجے میں گفتگو کرتا کہ گھر جا کر سعدیہ گھنٹوں تنہائی میں اس کے جملے یاد کر کے مسکرائے چلی جاتی۔

☆☆☆

"تب میں سمجھا......"

"کیا......؟" سعدیہ نے نوٹس بناتے بناتے چونک کر پوچھا۔

"تیرے رخسار پہ......" سعدیہ نے قلم رکھ کر بے اختیار ہتھیلی رخسار پر رکھ لی۔ "تِل کا مطلب۔" فاخر کے انداز میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔

"کیا...... کیا؟" اس دفعہ وہ جھنجلا سی گئی۔

"دولتِ حسن پہ دربان بٹھا رکھا ہے۔"

"اللہ میری توبہ!" اس کا چہرہ تمتما گیا۔ ہونٹ دانتوں میں داب کے چوری چوری ادھر اُدھر دیکھا مگر خیریت ہی تھی۔ یہ دونوں لائبریری کے اس آخری گوشے میں اکیلے ہی تھے۔

وہ تھوڑا سا اس کی طرف سے رخ پھیر کے بیٹھ گئی۔ اب یہ دوسری بات تھی کہ تِل بھی اسی رخسار پر براجمان تھا۔ یہ دیکھ کر فاخر شرارت سے مسکرانے لگا۔ سعدیہ دوبارہ نوٹس بنانے کی کوشش کرنے لگی مگر اب وہ دھیرے دھیرے سُروں میں باقاعدہ گنگنا رہا تھا۔

"گنگناتے ہوئے آنچل کی ہوا دے مجھ کو
انگلیاں پھیر کے بالوں میں سُلا دے مجھ کو"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

لوگ کہتے ہیں کہ یہ عشق نگل جاتا ہے
میں بھی اس عشق میں آیا ہوں دُعا دے مجھ کو
جس طرح فالتو گلدان پڑے رہتے ہیں
اپنے گھر کے کسی کونے سے لگا دے مجھ کو"

آواز تو سچ مچ ہی بہت خوبصورت اور سُریلی تھی اس کی مگر سعدیہ نے زچ ہو کر قلم فائل پر پٹخ دیا۔

"ٹھیک ہے گلدان صاحب! لیکن کسی کونے میں رہنے کا ڈبل کرایہ ہوگا۔"

"منظور ہے...... بیگم صاحبہ!" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر خم کھا گیا۔

"تو پھر وہ...... آپ کی گاؤں والی حویلی میں کون رہے گا جا کر؟" اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"وہ تو ہمارا مستقل ہے۔" فاخر نے اطمینان سے جواب دیا۔ "فی الحال تو جناب کے گھر میں گھر بنانے ہیں مجھے۔"

"گلدان بن کر؟" وہ ہنسی۔

"ہاں ایسی سمجھ لو۔" اس نے سوکھا سا منہ بنایا۔

"لیکن فاخر! آپ نے تو معلوم نہیں کب تک یہیں گھر بنانے ہیں جبکہ میرا جی چاہتا ہے کہ کھیت دیکھوں...... کھلیانوں میں جاؤں، گاؤں کے بازاروں، پگڈنڈیوں پہ گھوموں۔ معلوم نہیں وہ وقت کب آئے گا......؟ سچ میں نے تو کراچی کے شوروغل، گہما گہمی اور ہنگاموں کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ گاؤں جانے کا بہت شوق ہے مجھے۔"

فاخر کے پُرکشش چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"خواب اور حقیقت میں بہت فرق ہوتا ہے مادام! فرض کرو گاؤں میں حسین و جمیل مناظر کی بجائے تمہیں......"

"بس جی بس!" سعدیہ نے منہ بنا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "جو بھی بات کر رہی ہوں، اس کے برعکس ہی جواب مل رہا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ کوئی گاؤں واؤں نہیں ہے۔ جھوٹ بولنے سے فائدہ؟" فاخر ہنسنے لگا۔ وہ چڑ کر سنجیدگی سے نوٹس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ اس کی طرف جھک کر سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

"میں اس حصار سے نکلوں، تو اور کچھ سوچوں
تمہارے پیار سے نکلوں، تو اور کچھ سوچوں"

انداز ایسا ہی تھا جیسے شعر نہیں، لیکچر سنا رہا ہو۔

"تری گلی کے علاوہ بھی اور قریے ہیں
جو اس دیار سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں
رچا ہوا ہے ترا عشق میری پوروں میں
میں اس خمار سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں"

"آج تو پورا دیوان ہو گیا۔" سعدیہ نے روٹھے ہوئے انداز میں طنز کیا۔

"نہیں...... ابھی نہیں۔" وہ ایک انگلی اٹھا کر بولا۔

"تمہارے جسم کی خوشبو نے کر دیا مخمور
اس آبشار سے نکلوں، تو اور کچھ سوچوں"

سعدیہ، جو اندر سے پوری کی پوری اس شاعری کی سحر آفرینی اور مٹھاس میں ڈوب چکی تھی، بڑے انداز سے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "اچھا جی معاف کیجئے ہمیں تو۔ آئندہ کبھی گاؤں جانے کی فرمائش نہیں کریں گے۔ بلاوجہ پورا دیوان سنانا پڑے گا آپ کو۔"

ساتھ ہی اس نے اپنے کاغذات سمیٹ کر اٹھنے کا قصد کیا مگر فاخر نے فوراً اپنے بھاری بھرکم ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیے اور نرمی سے بولا۔

"سعدیہ! کہنے کو تو تم یونیورسٹی کی طالبہ ہو اور دیکھنے میں بھی اتنی ہی بردبار اور سمجھدار نظر آتی ہو مگر...... درحقیقت ہو بہت سادہ، معصوم، بھولی اور قدرے نادان نادان سی......"

"یہ میرے لئے نئی اطلاع ہے۔" وہ فوراً بولی۔ "ویسے کیا نادانی کی بات کہہ دی ہے میں نے؟" وہ ایک دم تڑپ کر بولی۔

"تم نے شاید غور نہیں کیا۔ نادان کے ساتھ ساتھ میں نے معصوم، سادہ اور بھولی بھی کہا ہے مگر لے دے کر لفظ نادانی۔" پھر وہ اسے نرمی سے سمجھانے لگا۔

"دراصل...... میں نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ تم عام لڑکیوں سے بہت منفرد ہو۔ تمہاری سوچیں اور خیالات دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ورنہ شہر کے ہنگامے، چہل پہل، گہما گہمی اور شور شرابے میں کسے گاؤں اور دیہات یاد رہتے ہیں؟ جبکہ تم تو وہاں جانے کے لئے بھی بضد ہو۔ حالانکہ یہ صرف تمہارے اندر کا حسین سا تصور ہے کہ تم خیالوں میں پھولوں سے لدی پگڈنڈیاں اور حسین مناظر دیکھتی ہو...... ایسا نہیں ہے...... [illegible] کہانیاں نہیں ہیں بلکہ دیہات تو انہی مناظر سے عبارت ہوتے ہیں مگر...... وہاں کی زندگی اور کہانیوں میں کھینچے گئے مناظر اور قصوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ وہاں کے راستے ٹیڑھے میڑھے، ناہموار اور پتھریلے ہوتے ہیں۔"

وہ گاؤں کی [illegible] پھر کچھ دیر رک کر بولا۔

"بلاشبہ وہاں گھنے سایہ دار پیڑوں اور سبزے کی بہتات ہوتی ہے...... لہلہاتے، سرسراتے، ہرے بھرے کھیت بھی ہوتے ہیں، شفاف اور ٹھنڈی نہریں بھی بہتی ہیں، ندی نالے بھی گنگناتے ہیں، کوئل بھی کوکتی ہے، پھول بھی کھلتے ہیں، فصلیں بھی لہلہاتی ہیں، سب کچھ ہوتا ہے لیکن...... جب وہاں لو چلتی ہے، گرم گرم ہواؤں کے تھپیڑے تن من کو جھلساتے ہیں اور اس جھلساتی دھوپ کی تپش بدن کا رواں رواں جلانے لگتی ہے تو...... سارے رومانی خواب اور ٹھنڈے میٹھے تصورات ڈھیر ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔ اور تم تو شاید...... یہاں اپنے شہر کے ٹھنڈے کمرے کی فضا یاد کر کے وہیں کی ہو جاؤ گی بلکہ...... مجھے تو یقین کامل ہے کہ دوبارہ کبھی گاؤں کا نام لینا بھی گوارا نہ کرو گی۔" آخری جملے میں پھر اس کی فطری شوخی ابھر آئی تھی۔

"جی نہیں۔" سعدیہ نے منہ بنایا اور بگڑ کر بولی۔ "ویسے اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ میں کبھی آپ کے "پنڈ" جانے کا نام نہ لوں تو ٹھیک ہے آئندہ بھی ایسا نہیں ہوگا۔ آپ کو میرا اصرار کرنا برا لگتا ہے تبھی تو وہاں کی برائیاں گنوانے بیٹھ جاتے ہیں۔ کیا میں کوئی بچی ہوں......؟ اب اگر گرمی کا موسم ہے تو گرمی بھی ہوگی۔ دھوپ میں تپش بھی ہوگی۔ پسینہ بھی خود بخود بہے گا۔ یہاں کیا شہروں میں سردی، گرمی، برسات، بہار یا خزاں کوئی موسم انسان پر اثر انداز نہیں ہوتا؟ پھر گاؤں تو گاؤں ہوتے ہیں۔ وہاں کی کھلی کھلی فضا اور کشادہ سرزمین پر ہر موسم شدت سے محسوس ہوتا ہوگا۔ اونہہ، چلے آئے ہیں سمجھانے...... مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں جیسے میں آپ کی کوئی بات سمجھ ہی نہ پاؤں گی۔ جناب! آئے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

دنوں کی دوستی میں آپ کو آپ سے زیادہ جان چکی ہوں۔ کوئی مذاق کی بات نہیں آپ ہیں کس خیال میں مسٹر!" یہ سب کہتے ہوئے وہ خود بھی ہنس پڑی۔

جواب دیتے دیتے اس کا موڈ خود بخود درست ہو گیا تھا۔ وہ ایسے ہی ٹھنڈے میٹھے مزاج کی خوش طینت لڑکی تھی۔ خود ہی اس سے لڑتی پھر خود ہی مان جاتی تھی۔ فاخر جو دل و جان سے اسے چاہتا تھا، اس کے اس شعلہ و شبنم مزاج سے چھیڑ چھاڑ کر کے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔

چند ثانیے دونوں کے درمیان خاموشی طاری رہی پھر فاخر اسے مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا یوں گویا ہوا۔ "یہ تو سرکار! ہمیں بھی خبر ہے کہ آپ آسانی سے جان چھوڑنے والوں میں سے ہرگز نہیں ہیں۔ گاؤں دیکھے بغیر چین سے بیٹھیں گی، نہ ہمیں بیٹھنے دیں گی۔ چنانچہ ہم نے بھی اب اپنے جی میں تہیہ کر لیا ہے کہ آپ کی یہ آرزو ضرور...... ضرور پوری کی جائے گی مگر......"

"مگر کیا؟ دیکھا، آ گیا نا بیچ میں مگر۔" سعدیہ نے بے تابی سے پہلو بدلا۔

وہ اس کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

"مگر یہ کہ...... ہم آپ کو آپ کے شایانِ شان طریقے سے لے کر جائیں گے۔"

"یعنی......؟" سعدیہ کا اشتیاق قابلِ دید تھا۔

"یعنی یہ کہ...... ذرا دھوم دھڑکے سے بلکہ بڑے شور شرابے سے...... کچھ ہنگامے اور گہما گہمی کے ساتھ۔ سیدھے سادے الفاظ میں یوں کہ ڈھول تاشے اور باجے کے ہمراہ...... کچھ آیا سمجھ شریف میں؟" فاخر نے اپنی بات اس درجہ شوخی اور شرارت سے مکمل کی کہ سعدیہ جو پوری توجہ اور شوق سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، بے ساختہ جھینپ گئی...... مارے خجالت اور شرم کے اس کا چہرہ گلگوں ہو گیا۔

"کیوں جی! پسند آیا آپ کو ہمارا خیال؟" اب اس کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

"یو...... شٹ اپ!" سعدیہ نے جھینپ کر دوپٹہ درست کیا اور اپنی فائل اٹھا کر چل دی۔

فاخر بیٹھا مسکراتا رہا۔ اسے معلوم تھا اب وہ کچھ دنوں میں مان جائے گی۔

***

سعدیہ کا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے تھا۔

اس کے والد سعید احمد ایک تعلیم یافتہ، انتہائی شریف النفس اور رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔ تقسیم پاک و ہند کے وقت وہ چھپتے چھپاتے فقط اپنی والدہ کے ساتھ، عزیز و اقارب کی ایک کثیر تعداد گنوا کر پاکستان کی سرزمین پر اترے تو ان کے تن کے لباس کے علاوہ کچھ ان کے پاس نہ تھا۔ اس وقت ان کے قدم لاکھوں قربانیوں کے بعد حاصل ہونے والی پاک سرزمین پر تھے اور اس سے بڑھ کر ان کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں انہیں نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ ان کا کل سرمایہ ان کی والدہ کے علاوہ خود ان کے ہاتھ پاؤں اور ایک میٹرک کی سند تھی۔

اپنے پیچھے وہ لاشوں کے قافلے چھوڑ آئے تھے۔ آگ و خون کی ہولی اور بے حرمتی کے شکار لاشے ادھر ادھر چھوڑے تھے۔ تین چار گھرانوں کے سوا پوری ریل میں کوئی نہ بچا تھا۔ کسی کا باپ تو کسی کی ماں...... کسی کی بہو تو کسی کا بیٹا...... کئی دنوں تک تو دونوں ماں بیٹے کے اوسان ہی خطا رہے۔ ان کی سہمی ہوئی سماعت سے مسلسل "جے، جے ست سری اکال" کے نعرے ٹکراتے رہے۔

ملک نیا نیا تقسیم ہوا تھا۔ تقریباً ہر گھر، ہر فرد کا یہی مسئلہ اور یہی کیفیت تھی۔ سب دکھوں اور آہوں کا

سمندر پھلانگ کر پہنچے تھے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر انسان دکھ بھری کہانی تھا۔ کسی کے پاس بھی کہنے کو کوئی داستان نہ تھی۔ سب کی بپتا ایک سی تھی۔

آخر یہ کب تک رہتا؟...... رفتہ رفتہ زندگی نے اپنا صدیوں پرانا ڈھب دوبارہ اختیار کر لیا۔ جب زندگی بیدار ہو جائے اور مصیبت کا کٹھن لمحہ دور ہو جائے تو ساری انسانی حیات از خود انگڑائیاں لیتی ہوئی جاگنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ زندگی کا ہمیشہ سے یہی ڈھنگ رہا ہے۔

الم ناک صدموں اور روحوں کو سلگاتے غموں کی دھوپ ماند پڑتے ہی سب سے پہلے انسانی معدہ بیدار ہوتا ہے۔ گو کہ کچھ دن اسی کیمپ میں گزرے جو مہاجرین کے لیے بطور خاص قائم کیے گئے تھے۔ مگر کب تک اس طرح چلتا۔ اتنا بڑا شہر کراچی کہ جہاں آئے دن لٹے پٹے انسانوں کے قافلے چلے آ رہے تھے، اب بغیر ہاتھ ہلائے کھانے کو کیسے اور کہاں تک ملتا؟ تن بھی ڈھانپنا تھا۔

غموں کی ماری دکھوں سے نبرد آزما ہوتی ماں کو ابھی تک ہوش ہی نہ آ پا رہا تھا۔ اپنے پیچھے شوہر اور اولاد کے لاشے چھوڑے تھے۔ بھرے پرے گھر کے عیش و آرام اور تحفظ کو تج یاد کیا تھا۔

ناگاہ برق میرے نشیمن پہ آ گری

وہ بے چاری بیچ بیچ اسی مصرعے کی گردان کرتی تھیں۔ سب بھولتے بھولتے ہی اس سانحۂ دلخراش کو بھول سکی تھیں۔ تاہم بہت جلد ہی بھولنے لگیں۔ پریشان حال اور تنہا بچ رہنے والے لختِ جگر کو اپنا آخری خزانہ اور آخری سہارا سمجھ کر سینے سے لگایا اور رب کا صد شکر ادا کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ خدانخواستہ اگر سعید احمد بھی...... "نہیں...... نہیں......" خوف اور وحشت سے ان کی گھگھی بندھ جاتی۔

"اے میرے مولا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے سعید احمد کو زندگی بخش دی۔" وہ بے اختیار رب کائنات کے حضور جھک جاتیں اور سجدے میں گر کر نوافل ادا کرنے لگتیں۔

نوکری یا کم از کم مزدوری تو کرنی ہی تھی۔ سو انہوں نے ہاتھ کی ایک انگلی میں مرحوم شوہر کا چاہتوں سے پہنایا ہوا سونے کا ایک چھلا جو رہ گیا تھا، سعید احمد کو بتائے بغیر کسی نہ کسی طرح فروخت کر دیا۔ ایک سیر کالے چنے منگوائے۔ آنسوؤں کے لیے ہی ڈوبتے ابھرتے وہ چنے ابالے، نمک مرچ سے تیار کیے اور بچا بچا کر سعید احمد کے سپرد کر دیے۔ یوں ان دونوں ماں بیٹے کی دال روٹی عزت و آبرو سے چلنے لگی۔

سعید احمد کی میٹرک کی سند خوب کام آئی۔ سچ ہے تعلیم کی دولت نہ کبھی دھوکا دیتی ہے اور نہ ہی کوئی چرا کے لے جا سکتا ہے۔ ملک نیا نیا بنا تھا۔ مسائل بہت زیادہ تھے۔ ان کے حل بھی بہرحال موجود ہی تھے۔ کئی ہفتوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک آفس میں کلرکی مل ہی گئی۔ گویا زندگی کو سہارا مل گیا۔ یہ دونوں ابھی تک ایک کیمپ ہی میں تھے۔ ملازمت کا آسرا ملا تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ تھوڑی سی تگ و دو کے بعد کرائے پر ایک کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کر کے وہاں منتقل ہو گئے۔

تقریباً دو ڈھائی برس تک سعید احمد اور ان کی والدہ اسی ایک کمرے میں رہائش پذیر رہے۔ آزمائش کے مسلسل دور سے گزر کر بالآخر تیسرے برس ایک چھوٹا سا کوارٹر ان کے نام الاٹ ہو ہی گیا۔ یوں انہوں نے ماہ بہ ماہ کرائے کے بوجھ سے نجات پا کر سکھ کی سانس لی۔

ابھی اس خوشی کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک دفعہ پھر ان پر ستم ٹوٹ گیا۔ جس میں سعید احمد کی کم آمیزی اور سادہ لوحی کو زیادہ دخل تھا۔ ہوا یوں کہ جس آفس میں وہ ملازم تھے، وہاں کے ماحول کو سمجھے

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

سے قاصر تھے۔ فطرت میں چالاکی اور تیزی طراری نام کو بھی نہ تھی۔ چنانچہ جب تک وہ اندرونی سیاست کو سمجھ پاتے، اسی آفس میں پہلے سے تعینات ہیڈ کلرک نے انہیں پروانۂ رخصتی دلوا کر ان کی جگہ اپنے برادر نسبتی کو یہ عہدہ دلوا دیا اور یہ چپ چاپ منہ لٹکا کر گھر میں آ بیٹھے۔ اماں نے لاکھ سر پٹخا کر اپنے حق کے لیے ڈٹ جاؤ، لڑ جاؤ، جھگڑ جاؤ۔ مگر ان سے کچھ بھی نہ ہو پایا۔ تنگ آ کر اماں نے دوبارہ بچے اُبال اُبال کر دینے شروع کر دیے لیکن...... اپنے میٹرک پاس صاحب زادے کو چھولے بیچتے دیکھ کر ماں کے سینے پر چھریاں چلنے لگتیں۔ جب وہ اس کم ہمت بیٹے کے مستقبل کے متعلق غور و فکر کرتیں تو دل ہولنے لگتا۔ اب وہ خود تو کافی ہوشیار ہو چکی تھیں۔ بیتے غموں اور زخموں پر جوں جوں کھرنڈ آنے لگا تھا، ان کی تمام تر امیدیں اور ارمان اسی بیٹے سے وابستہ ہوتے جا رہے تھے مگر لمحہ فکریہ تھا کہ فقط آلو چھولے بیچنے والے سعید احمد کو کیا اسی لیے میٹرک تک پڑھایا تھا؟

وہ خود تو بہت حوصلہ مند خاتون تھیں سو بیٹے کی طرف سے مایوس ہو کر وہ خود ہی میدان عمل میں کود پڑیں۔ پھر روز کسی نہ کسی بااثر صاحب یا صاحبہ سے ملنا انہوں نے دستور بنا لیا۔ ایک سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے تک جاتے جاتے بالآخر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اپنے بیٹے کو ماسٹر بنانے میں وہ کامیاب ہو ہی گئیں۔ جس روز سعید احمد کو محکمہ تعلیم میں تقرر نامہ موصول ہوا وہ ان دونوں کی زندگی میں سب سے بڑا خوشی کا دن تھا۔ اتنی قربانیاں دے کر انہیں ایک سرکاری، خواہ وہ معمولی ہی تھی مگر ایک سیٹ تو ملی۔ دونوں خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ سعید احمد فوراً والدہ کے قدموں میں جھک گئے۔ اگر وہ ہمت کر کے حالات کے سامنے ڈٹ کر کھڑی نہ ہو جاتیں تو یہ سرکاری نوکری بھی نہ مل پاتی۔

سعید احمد ذاتی طور پر بے حد دیانت دار اور محنتی تھے۔ پوری جان سے اپنے تفویض کردہ فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے۔ اسکول میں ان کی خوب ہی لگی۔ جس اسکول میں تقرری ہوئی تھی، وہاں سب سے پہلے پہنچنے والے اور سب سے آخر میں نکلنے والے فرد یہی ہوا کرتے۔ حسن اتفاق ہیڈ ماسٹر بھی انہی سے ملتے جلتے حالات و مزاج کے نکلے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دونوں میں گہری اور پرخلوص دوستی کا رشتہ استوار ہوتا چلا گیا۔ انہی کے مشورے اور تعاون سے سعید احمد نے نہ صرف یہ کہ پہلے ایف اے پھر بی اے، بی ایڈ کر لیا بلکہ شام کے اوقات میں ایک چھوٹا سا ٹیوشن سینٹر بھی قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی اماں سجدۂ شکر بجا لائیں۔ اب وہ سعید احمد کے مستقبل کی طرف سے خاصی مطمئن ہو گئی تھیں۔

×●×

کہتے ہیں جب پیٹ بھرا ہو تو دماغ کو بھی نئی نئی سوجھتی ہے۔ اور اس میں ہر وہ منصوبہ اور ہر وہ خواہش از سر نو جاگ پڑتی ہے جس کی طرف سے کسی وقتی رکاوٹ کی وجہ سے توجہ ہٹ گئی ہو۔

یہی کچھ ان کی والدہ صاحبہ کے ساتھ بھی ہوا۔

ماں ہونے کے ناتے رہ رہ کر گھر کا سونا آنگن انہیں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ اب چاند سی دلہن لا کر گھر آنگن کو جگمگا ڈالنے اور پھر ننھے منے پوتے پوتیاں کھلانے کا ارمان ان کی راتوں کی نیندیں اڑانے لگا۔ انہیں دن رات یہی دھڑکا ستانے لگا کہ خدانخواستہ بیٹے کو بیاہے بغیر کہیں اس دار فانی سے کوچ نہ کر جائیں۔ پھر سعید احمد کا کیا بنے گا؟ اللہ نہ کرے کہ اس کے سہرے کے پھول کھلے دیکھے بغیر رہ جائیں۔ آخر وہی تو سب کچھ تھا۔ اگر اسی کے سارے کام اور فرائض پورے نہ ہو سکے تو کیا

فائدہ اس زندگی کا؟؟

جب انسان کسی مقصد کو سامنے رکھ کر قدم بڑھائے اور نیت صاف اور ارادہ پختہ ہو تو جھکتے کامیابی بھی جھکتی ہے۔ سرکاری ملازمت کو چند سال ہی ہوئے تھے کہ سعید احمد دولہا بن گئے۔ والدہ کے قدم مارے خوشی کے زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ دلہن گھر لانے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے خدا کے حضور شکرانے کے نفل ادا کیے اور پھر دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کی بچی سنوری معصوم صورت دیکھی اور ہزاروں دعاؤں سے نوازا۔

یوں "نہ...... نہ" کرتے ہوئے بھی سعید احمد بیوی والے ہو گئے۔

دیکھا جاتا تو ان کی والدہ بھی اپنی جگہ درست نظریہ رکھتی تھیں۔ ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔ اب وہ برسر روزگار بھی تھے اور بہ لحاظ عمر بھی یہی تقاضا تھا۔ والدہ کی مراد کچھ یوں بھی جلدی پوری ہو گئی کہ تقسیم پاک و ہند کے وقت جو کچھ کانوں سے نہ سنا ہو گا، وہ سب آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ بڑی بڑی اندوہناک مصیبتیں اٹھا کر یہاں تک پہنچ پائے تھے۔ اس سفر میں گھر کے گھر لٹ گئے تھے۔ یہاں پہنچ کر جو سب سے بڑی پریشانی تھی وہ بے روزگاری اور بھوک کے عفریت کو منانا تھا۔ وہ تن جو دن میں تین مرتبہ کھانے کا طلب گار رہتا ہے، جس کے ڈھانپنے اور سر چھپانے کے لیے بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے۔ اس کی بھی فکر تھی۔

اسی افراتفری کے عالم میں ایک انتہائی شریف اور غیور گھرانے کے چھ افراد پر مشتمل ایک گھر میں سعید احمد کی والدہ کا آنا جانا ہو گیا تھا۔ اچھے برے وقت میں ایک دوسرے کے سنگی ساتھی بنتے بنتے اماں کو ان کی منجھلی بیٹی بھا گئی۔ اس دور میں وقت آج کی طرح بے درد نہ تھا۔ حالات اس درجہ سنگین نہ تھے کہ دلوں سے انسانیت ناپید ہو گئی ہو۔ پھر سعید احمد کی والدہ بھی بیچاری انہی کے دکھ بٹانے اور بوجھ اتارنے پر آمادہ تھیں اور بھرپور انکساری بھی ایسی کہ بغیر کسی جہیز، فقط بہو کا سوال لے کر گئی تھیں۔

لڑکی والے ویسے ہی مصیبت و آلام کے مارے اور حالات کے ستائے ہوئے تھے۔ مسلسل بے روزگاری اور آئے دن کی فاقہ مستیاں بھی تھیں اور وہ تھے ایسے میں تین جوان بیٹیوں کا بوجھ۔ وزن ایسا ناقابل برداشت کہ کمر دوہری ہوئی جاتی تھی۔ چنانچہ بہت غنیمت تھا جو میسر آ رہا تھا۔

سعید احمد میں یوں بھی کوئی ظاہری یا باطنی عیب نہ تھا۔ شریف ایسے کہ دانستہ کسی کو نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ فرمانبردار اور سعادت مند ایسے کہ کبھی والدہ سے اونچی آواز یا تیز لہجے میں ہمکلام نہ ہوتے تھے۔ جس روز سے ملازمت ملی تھی، تنخواہ لا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ ماں اٹھتے بیٹھتے ڈھیروں دعاؤں سے نوازتیں۔ ایسی فرمانبردار اولاد پر جتنا فخر کرتیں، بجا تھا۔ انہیں زندگی میں طمانیت ہی طمانیت اور سکون ہی سکون حاصل ہو گیا تھا۔ بس بچھڑنے والوں کی ایک کسک تھی جسے وہ بیٹے کے سامنے ظاہر بھی نہ کرتی تھیں۔ ایسے گھر میں آنے والی دلہن یقیناً خوش نصیب تھی جسے بغیر دیکھے بھالے، دل کا صاف اور من کا کھرا شوہر اور سچی محبت کرنے والی ساس مل گئی تھی۔

ماں تو نکاح کے بول ہوتے ہی پوتا ہونے کی دعائیں مانگنے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ پانچوں وقت کی نماز و نوافل کے بعد گھنٹوں جائے نماز پر بیٹھی تسبیح کے دانے گھمایا کرتیں اور گھر میں ادھر سے ادھر سر جھکائے دوپٹا لپیٹے کام کاج کرتی دلہن کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں صدقے واری جایا کرتیں۔ اب انہیں شدت سے انتظار تھا کہ کب ان کا اگلا ارمان پورا ہو اور وہ گھر میں بچوں کی چہکاریں سنیں۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

خدا کے حضور ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت حاصل ہوا اور رب العزت نے ان کے بیٹے کے گلشن میں ایک خوش رنگ پھول کا اضافہ کر دیا۔ قدرت نے ان کی سن تو ضرور لی تھی مگر انہوں نے خدا کے حضور دعائیں تو ایک عدد پوتے کے لئے کی تھیں لیکن اللہ نے ایک عدد پیاری پیاری سی، گلابی گلابی گالوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والی پوتی عطا کر دی۔ مگر وہ پھر بھی خدائے بزرگ و برتر کا شکر بجا لائیں اور اس ننھی سی جان کو اٹھا کر کلیجے سے چمٹا لیا اور درازئ عمر کی دعائیں دینے لگیں۔ بہو کے دل سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا اور اس نے سکون کا گہرا سانس لیا۔

سعدیہ کے بعد اللہ نے ایک اور بیٹی نازیہ عطا کی۔ پھر تو گویا اس گھر کا راستہ بچوں نے دیکھ لیا۔ چند برسوں کے اندر اندر سعید احمد کے آنگن میں آدھ درجن بچوں کی پلٹن اتر چکی تھی۔

دادی جو دعائیں مانگ مانگ کر جھولی بھر چکی تھیں، اب ان بچوں کی فوج سے گھبرانے بھی لگیں۔ کچھ عمر کا تقاضا بھی تھا پھر بھی بیٹے کے بھرے آنگن کو دیکھ کر کھل پڑتی تھیں۔ بہو کے ساتھ اچھی نبھ رہی تھی مگر خدا کے حکم پر کس کی مجال کہ اف کر سکے۔ ایک شب ان بچوں کی دادی چپکے سے ان سب کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ سعید احمد کو ماں کی جدائی بے حد شاق گزری۔ بہو بھی ساس کی جدائی پر تڑپی۔ آخر کو وہ اس کی مددگار رہی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ سب کے دلوں کو قرار آ گیا۔ البتہ سعدیہ بہت محسوس کرتی تھی۔

***

روز افزوں بڑھتی ہوئی مہنگائی، اوپر ہی اوپر جاتے اخراجات اور ضروریات زندگی نے سعید احمد کو وقت سے پہلے نچوڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی عمروں سے بڑے لگنے لگے تھے۔ فکروں اور بڑھتی الجھنوں نے انہیں اندر ہی اندر کمزور کرنا شروع کر دیا تھا۔ مگر وہ اپنی پریشانیاں اور مالی فکریں کسی سے شیئر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بیوی کو باہر کے معاملات کا کیا پتا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد ان معاملات میں وہ تنہا رہ گئے تھے۔ ورنہ ماں کا مشورہ ان کے شامل حال رہا کرتا تھا۔ اپنے مہربان دوست جو ان کے ہیڈ ماسٹر بھی تھے، کے مشورے سے سعید احمد نے ایک ٹیوشن سنٹر کھول تو لیا تھا مگر وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کر پائے تھے۔ کاش خدا نے انہیں پہلوٹھی کی بیٹی کی بجائے بیٹا دے دیا ہوتا تو آج ان کا زور بازو ہوتا۔ کئی پریشانیاں اور فکریں ذہن سے اتر گئی ہوتیں۔

قدرت نے بھی یکے بعد دیگرے دو بیٹیوں سے نوازا تھا جو ایک ساتھ ہی پڑھ کر سیانی ہو گئی تھیں اور بجائے ان کا سہارا بننے کے، خود ہی کسی مضبوط اور مناسب سہارے کی محتاج تھیں۔ لڑکیاں تو بڑھتی ہوئی بیلیں ہوتی ہیں جن پر پڑنے والا برسات کا پہلا ہی چھینٹا ان میں جان ڈال دیتا ہے۔ لڑکیاں جو شاید برصغیر میں بسنے والے ہر باپ کے لئے یکساں طور پر ایک فکر اور ایک پریشانی کی حیثیت رکھتی ہیں تو غریب سعید احمد لڑکیوں سے کیا آس رکھتے؟ وہ اور ان کی بیوی تو ہر وقت جتائے فکر رہتے تھے کہ رب کوئی سبیل بنائے۔ ان کو اعلیٰ تعلیم و تربیت میں دونوں نے کوئی کوتاہی نہ چھوڑی تھی۔

دو بیٹیوں کے بعد جو بیٹا ہوا وہ ڈھائی برس کی عمر میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ اس کے بعد پھر دو بیٹیاں ہوئیں اور آخر میں دو بیٹے۔ دادی کی وفات کے بعد پھر ایک بیٹی چلی آئی تھی۔ کچھ یونہی لگتا تھا کہ بچوں نے جیسے انہی کے گھر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ جس کو دیکھو یہی کہتا۔

"خدا پہلے بیٹے ہی دے دیتا۔ کم از کم باپ کا سہارا تو بنتے۔"

اب یہ بیٹے کب جوان ہوتے، کب کما کر لاتے...... کم از کم، دو بڑی تو جب تک مناسب

عمروں کی حدود پھلانگ چکیں۔ ایسے حالات میں سعید احمد کے بنائے کچھ بھی نہ بن پا رہا تھا۔

وہ اس امر سے خوب واقف ہو چکے تھے کہ فی زمانہ لڑکی کے ذاتی جوہر، سلیقہ، تعلیم، سیرت، سگھڑاپا، حتیٰ کہ بسا اوقات بہترین کردار کی بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی۔ درحقیقت اب تو اچھے رشتے لڑکی کے باپ یا بھائی کی حیثیت اور معاشرے میں ان کا اونچا مرتبہ اور بلند مقام دیکھ کر آتے ہیں۔ اگر باپ بھائی کی بلند حیثیت اور سماجی مقام لڑکے والوں سے میل نہ کھاتا ہو تو پھر بات بنائے بھی نہیں بنتی۔ رشتے ناتوں کے اس نیلام گھر میں کوئی بھی بولی اعلیٰ ترین جہیز اور مالی تحفظات و ضمانت کے بغیر نہیں لگائی جاتی۔ اب خود سعید احمد والا دور تو رہا نہ تھا۔

بیوی البتہ بہت سلیقہ شعار اور سمجھ دار تھیں۔ سو اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کیے جا رہی تھیں۔ انہیں برے بھلے کا امتیاز اور ہر طرح کی اخلاقی اقدار سے روشناس کرانے کا سہرا انہی کے سر تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمے داریوں اور سلیقے کی تربیت بھی دی تھی۔ دونوں بڑی لڑکیوں میں سعدیہ بہت پڑھاکو قسم کی لڑکی تھی۔ اس کا مزاج باپ کی طرح بے حد سادہ تھا جبکہ نازیہ شروع سے ہی گھریلو امور میں دلچسپی لیتی تھی اور قدرے چلبلی تھی۔ بی اے کے بعد اس نے تو باورچی خانے کا رخ کیا اور سعدیہ یونیورسٹی کی ضد لگا بیٹھی۔ اس کا موقف تھا کہ میں اپنے اخراجات ٹیوشن کے ذریعے خود پورے کروں گی کیونکہ بعد میں اس کا ارادہ والد کا سنٹر بہتر انداز میں چلانے کا تھا۔

سعید احمد نے اس کی بھرپور حمایت کی۔ خود وہ درس و تدریس سے وابستہ تھے سو اسے پڑھنے دیا۔ اس زمانے میں بچیوں کا ایم اے، بی اے کرنا صحیح معنوں میں قابلیت کا دور تھا۔ سعید خود ذاتی طور پر ایماندار اور نیک نیت انسان تھے۔ اب تک اپنی ہمت، حوصلے اور محنت سے زندگی گزاری تھی۔ سو یہی توقع اولاد سے بھی رکھے ہوئے تھے۔

دونوں میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی تھی۔ بیوی نے بچوں کی دینی تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ دی تھی۔ قرآن پاک ناظرہ خود پڑھایا۔ سعید احمد نے دینی علوم پر مشتمل کتب بطور خاص منگوائی تھیں۔ اس طرح تربیت کا اثر تھا کہ بڑی لڑکیوں کے ذہن و کردار کو خصوصاً جلا ملی تھی اور ان کے اوصاف مزید نکھر گئے تھے۔ کردار میں پختگی اور روح میں بالیدگی سرایت کر گئی تھی۔ اچھے برے کی تمیز بہتر طور پر آ گئی تھی۔ ملنے جلنے والے بھی اس گھر کی مثالیں دیتے تھے۔

بڑی بہنوں کی دیکھا دیکھی چھوٹے بہن بھائیوں میں بھی واضح طور پر یہی خوبیاں اور اوصاف سرایت کرتے چلے گئے۔ ایک دوسرے کا احترام، والدین کی فرمانبرداری، سعادت مندی، آگے پیچھے کا ادب لحاظ، دھیمے دھیمے ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا انداز، ایک دوسرے سے ہمدردی...... ان سب خوبیوں نے مل کر ان کی طبیعتوں میں ایک خوبصورت سا ٹھہراؤ، سکون اور متانت پیدا کر دی تھی۔ مالی طور پر کمزور ہونے کے باوجود سعید احمد کا گھرانہ مثالی بن گیا اور اس پرسکون اور مطمئن گھرانے کے حسن کو چار چاند اس کی قناعت پسندی اور جذبہ صبر و شکر نے لگا دیئے تھے۔ اور جس گھر کے لوگ ایک دوسرے سے مطمئن اور خوش ہوں، اس گھر سے غیر اور اجنبی لوگ راحت ہی پاتے ہیں۔

چند برسوں کے اندر اندر سعید احمد کے گھرانے کی نیک نامی، خوش خلقی اور شرافت شہرت پا گئی۔ جہاں چار لڑکیوں کا ذکر نکلتا، سعدیہ، نازیہ کا تذکرہ لازمی اچھے لفظوں میں کیا جاتا۔ اپنی سفید پوشی کے باوجود ان لوگوں کا رہن سہن قابل ستائش تھا۔

اکثر کہیں چند خواتین جمع ہوتیں اور دوران گفتگو لڑکیوں کی شادی بیاہ اور جہیز وغیرہ جیسے مسائل

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

نوبت بحث آئے تو سعید احمد کی بیوی صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کر دیتیں۔

"بھئی، ہم تو اعلیٰ ترین جہیز، قیمتی اور عمدہ سامان اپنی بچیوں کو نہیں دے سکتے۔ بس جہاں تک ممکن ہوا ہے، انہیں ہم نے زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا ہے۔ اچھی تربیت اور خانہ داری کے قواعد سکھلائے ہیں۔ ہماری بیٹیوں کا جہیز اور کل اثاثہ تو یہی تعلیم و تربیت اور ان کا سلیقہ ہے۔ کوئی قدر دان مل گئے تو زندگی آسان ہو جائے گی...... ورنہ جو اس قادرِ مطلق کی مرضی۔"

لیکن پھر بہت جلد ہی انہیں اندازہ ہو چلا گیا کہ سننے والے ان کی بات کی تہہ تک پہنچ کر دم سادھ جاتے ہیں۔ بحث کرنے والوں پر ایسا سناٹا طاری ہو جاتا کہ بیان سے باہر...... رفتہ رفتہ انہیں یقین آ گیا کہ خود ان کی جنتی ساس ہی شاید وہ واحد شریف النفس ماں تھی جس نے اس نیلام گھر میں اپنے بیٹے کی کوئی قیمت مقرر کئے بغیر بے جہیز کی بہو ہنسی خوشی قبول کر لی تھی اور تا زندگی اسے کلیجے سے لگا کر رکھا تھا۔ ورنہ اب تو ایسی باتیں سننے والے محض سن کر ہی ہری جھنڈی دکھا جاتے تھے۔ ثابت ہوا کہ بن باپ لیکن صاحبِ جائیداد لڑکی ہو تو بھی ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہے۔ مگر بن جہیز کی لڑکی کا وارث بننے کو کوئی تیار نہ تھا۔

لوگوں کا یہ رویہ سعید احمد اور ان کی بیوی کے لئے بہت حوصلہ شکن اور غور طلب تھا۔ ان صفات کی حامل لڑکیوں کی زمانہ تعریف تو بہت کرتا ہے مگر بہو بناتے وقت انہیں اور بھی بہت کچھ چاہئے ہوتا ہے۔ سادہ لوح ماں باپ دھوکے ہی میں رہ جاتے ہیں۔

٭٭٭

والدہ کی زندگی میں ہی سعید احمد نے کچھ تو ان کی پس انداز کی ہوئی رقم، کچھ بیگم سعید کی خاموشی سے ڈالی کمیٹیاں اور کچھ اپنے جی پی فنڈ سے نکلوا کر گھر کو بہتر انداز میں بنوایا تھا۔ پانچ مرلے پر بنا یہ مکان اب ڈبل اسٹوری ہو گیا تھا۔ باہر کی طرف ایک جانب سا کمرہ واش روم کی سہولت کے ساتھ بنوایا گیا تھا۔ مردانہ مہمانوں کے بیٹھنے کے طور پر... اسے بھی کرائے پر اٹھا دیا گیا اور اس طرح معقول کرایہ وصول ہونے کی سبیل بن گئی تھی۔

فاخر حسین کے دوست فرحت علی کو سعید احمد کے بیٹا جاوید نے متعارف کروایا تھا۔ ان کی آپس میں عزیز داری تھی۔ گو کہ اس سے قبل کوئی لڑکے بطور کرایہ دار یہاں نہیں آئے تھے تاہم ان کا کہا سعید احمد کو ٹالنا گوارا نہ تھا۔ اس طرح فرحت کے توسط سے بعد ازاں فاخر بھی اسی کمرے میں آ گیا۔ دونوں لڑکے ہی صاحبِ کردار اور بردبار طبیعت کے پائے گئے لہٰذا اہلِ محلہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوا۔

وہ دونوں شام تک یونیورسٹی اور لائبریری میں مصروف رہتے پھر کبھی کسی دوست کے ہاں نکل جاتے۔ رات کا کھانا باہر کھا کر ہی اس گھر میں آتے۔ چھٹی کا دن زیادہ تر سو کر گزارتے۔ مکان داروں سے زیادہ رابطہ ہی نہ تھا سو سعید احمد ان کے اطوار سے مطمئن تھے۔

جس روز فاخر حسین نے سعدیہ کو اس گھر کے گیٹ پر دیکھا، وہ خوشی اور حیرت سے اچھل پڑا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی اس حسین اتفاق کا گمان نہ تھا۔ حیران تو فرحت علی بھی ہوا مگر اس کا ردِعمل عام سا تھا۔ جبکہ فاخر کی تو کیفیت ہی دوسری تھی۔ اس روز کمرے کے اندر پہنچ کر اس نے فرحت کو پکڑ کر چاروں طرف گھما ڈالا۔ اچانک ملنے والی خوشی نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔

"ارے ارے...... کھوپڑی آؤٹ ہو گئی ہے کیا؟" فرحت بوکھلا گیا۔

"کھوپڑی آؤٹ نہیں پیارے! کھوپڑی اِن۔" وہ واقعی آپے میں نہ تھا۔

"مجھے تو...... دال میں کچھ کالا کالا نظر آ رہا ہے۔ بات کیا ہے آخر؟" فرحت نے اس سے دور ہٹ کر مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"محبت کے لئے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں
یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پہ گایا نہیں جاتا"

فاخر حسین نے مزے میں آ کر اس کے اور اپنے سینے کی طرف زور زور سے اشارہ کرتے شعر پڑھا۔

"یا اللہ اس عاشق مجنوں پر رحم فرما۔" فرحت نے دعائیہ انداز میں ہاتھ پھیلائے۔ "مجھے ڈر ہے کہیں جوتے کھا کر نہ نکلنا پڑ جائے اس گھر سے۔"

"نہیں یار اب تو کیوں فکر کرتا ہے؟ اب بس اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھ۔ بس میرے حق میں دعائے خیر کئے جا۔ باقی سب خیریت ہے۔"

"ابے کیا بکے جا رہا ہے؟" فرحت نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مالک مکان تیرے رشتے دار ہوں؟"

"تیرے منہ میں حلوہ پوری اور چم چم...... اگر نہیں ہیں رشتے دار، تو دعا کر ہو جائیں۔"

فاخر نے بڑی عقیدت سے جھوم کر کہا۔

"ابے چل!" فرحت نے اسے جھڑک دیا اور بیٹھ کر جوتے موزے اتارنے لگا۔

"عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے"

فاخر نے سرد آہ بھر کر شعر پڑھا پھر اپنے پلنگ پر جوتے سمیت لیٹ گیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر چھت کو گھورنے لگا۔

فرحت نے کوئی توجہ نہ دی اور واش روم میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر میں اسے دھڑ دھڑ اور دھپا دھپ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فاخر کو دیکھنے لگا۔

وہ کمرے کے طول و عرض میں طوفانی انداز میں چکراتا پھر رہا تھا۔ عجیب و غریب رقص تھا اس کا۔ کبھی کمر پہ ہاتھ رکھ کر لچکتا تھا، کبھی زمین کی طرف ہاتھ لے کر کر کے جھکنے اٹھنے لگتا۔ سارے کمرے میں چک پھیریاں لگانے لگتا۔ کبھی شانوں تک ہاتھ اٹھا اٹھا کر مٹکنے لگتا تھا۔ اللہ جانے کیا نام تھا اس رقص کا!

فرحت کچھ دیر تو چپ چاپ کھڑا نظارہ کرتا رہا لیکن ساتھ ہی اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ مبادا مالک مکان ہی صورت حال دیکھنے نہ آ پہنچیں۔ اچھا خاصا شور ہو رہا تھا اس کی اچھل کود سے۔ مگر اسے پرواہ نہ تھی۔

تنگ آ کر فرحت نے ایک پتلی سی چھڑی ڈھونڈ نکالی اور دھیرے دھیرے اس کی برق رفتاری سے حرکت کرتی ٹانگوں کو نشانہ بنانے لگا۔

"کیا ہے...... کیا ہے بھئی؟ اب میرے ڈانس پر بھی پابندی ہے کیا؟" وہ اور بھی زیادہ چھلانگیں لگانے لگا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"ڈانس کے بچے!" فرحت نے دانت پیس کر کہا۔ "وہ تمہارے سگے آ گئے تو اعتراض کرتے ہوئے تو یہ بندروں کی طرح کودنا دونا بھول جاؤ گے۔"

"ارے...... یہ کیسا ظلم ہے؟" اس نے بلبلا کر جواب دیا۔ "جب ہم ان کا منہ مانگا کرایہ انہیں حاضر کر رہے ہیں تو پھر اعتراض کا ہے کا؟"

"کرائے کی بات نہیں، شرافت کی ہے۔ وہ تمہاری طرح لفنگے نہیں ہیں۔" فرحت نے دبے دبے لہجے میں اسے لتاڑا پھر گریبان سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے جا کر پلنگ پر دھکا دیا اور خود بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ چند لمحے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا، پھر خفا ہو کر بولا۔

"یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ نائٹ کلب نہیں ہے جہاں تم......"

فاخر نے لیٹے لیٹے ہی اس کی بات کاٹی۔ "لاحول ولا قوۃ۔ یار! تم بھی بات کہاں سے کہاں لے اڑے۔ میں کوئی نائٹ کلب والا ڈانس کر رہا تھا؟ ارے بے وقوف! یہ تو ہمارے چاروں صوبوں کا مکس ڈانس تھا۔"

"اور ایجاد بھی تمہاری ہی ہے۔" فرحت نے جل کر فقرہ کسا۔

"ظاہر ہے۔" وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

"بہر حال...... میں تمہیں آگاہ کر رہا ہوں۔" فرحت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اگر میرے ہمراہ یہاں رہنا ہے تو اپنی یہ لفنگے پن کی عادتیں ترک کرنا ہوں گی۔ کیونکہ یہ قاعدے قرینے کے لوگوں کی بستی ہے اور مالک مکان تو بہت ہی شریف اور نیک ہیں۔ وہ تو بغیر فیملی کے کسی کو رکھتے ہی نہیں ہیں۔ صرف اپنے دوست کی قدر دانی کی وجہ سے مجھے رکھ لیتے ہیں۔ مگر میں تمہیں صاف الفاظ میں بتائے دیتا ہوں کہ جہاں بدمعاشی کی ذرا بھی بو آئی تو وہ بھی ہماری چٹنی گا گا کر بجایا کرتے۔ خبردار! ورنہ یہاں سے بوریا بستر گول کر دو۔"

"یا اللہ!" فاخر سر پر ہاتھ مار کر کراہا۔ "ایک ہی سانس میں مجھے لفنگا بھی بنا دیا...... خبیث، بدمعاش، بھانڈ اور ڈانسر جانے کون کون سے القاب دے ڈالے۔ کم از کم یہ کہ کوئی خوشی کی خبر بھی سنائی ہو۔"

"اچھا تو کیا مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ...... صاحب جی! مبارک ہو آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے؟" فرحت نے جھلا کر اسے "خوشی کی خبر" سنائی۔

وہ منہ دبا کر ہنسنے لگا۔

"کیوں...... اب کیا ہو گیا؟" فرحت نے اسے گھور کر دیکھا۔

"وہ...... تمہاری کلاس فیلو سن رہی ہے۔"

"کون؟...... کہاں......؟" فرحت نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔

فاخر اسی طرح لیٹے لیٹے بولا۔ "دروازے کی اوٹ سے...... چھپ چھپ کر سن رہی ہے۔"

فرحت بوکھلا کر کھڑا ہو گیا اور بے اختیار دروازے تک چلتا چلا گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اسے فاخر کی شرارت سمجھ میں آ گئی۔ کھسیا کے واپس لوٹا اور اسے ایک گھونسہ رسید کر کے بڑبڑایا۔

"دوسرے کو بے وقوف سمجھتا ہے چند کہیں کا۔ تیری آنکھوں میں ایکسرے مشین فٹ ہے جو دیوار کے آر پار دیکھ رہا ہے؟"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔" فاخر نے ایک لمبی آہ بھری۔

"کاش میں تیرے حسین ہاتھ کا کنگن ہوتا
تو بڑے پیار سے، چاؤ سے، بڑے مان کے ساتھ
اپنی نازک سی کلائی میں چڑھاتی مجھ کو
اور بے تابی سے ...... کس ...... سے ......

فرحت نے آگے بڑھ کر کس کے اس کے منہ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھ دیا اور بگڑ کر غرایا۔

"یہ اپنی شاعری والی بند کرتا ہے کہ توڑوں دانت؟"

"ایسا غضب مت کر ڈالنا۔" فاخر بمشکل اس کے شکنجے سے آزاد ہو کر گھگھیایا۔ "دانت ٹوٹ گئے تو پھر وہ بالکل بھی گھاس نہ ڈالے گی۔"

"ہاں، ظاہر ہے۔ پھر وہ گھاس تو چبائے گا کیسے؟" فرحت نے طنز کیا۔

"ویسے ایک بات ہے یار! تو ہے بڑا بدذوق۔" فاخر اپنے جبڑے کو سہلاتا ہوا بولا۔ "ایسا کس کے ہاتھ جمایا ہے بے دردی سے کہ میری داڑھیں درد کرنے لگی ہیں۔"

"اچھا...... اچھا...... اب وہ گانا شروع نہ کر دینا، بے دردی، جلی (جلی) بجا۔" فرحت نے بے نیازی سے کہا۔

"بدذوق و بے دردی نہیں، سنگدل اور بے رحم بھی ہو۔" وہ تپ کر زور سے بولا۔

"تم جیسا خراب...... خراب دوست بھی نہ دیکھا ہے نہ سنا۔ ایسا بھی کیا کہ ذرا بھی ہمدردی نہ ہو۔ بس پورے کا پورا دشمن جاں بنا ہوا ہے۔ ذرا سا حال دل کہنا چاہا تو بدمعاش، لفنگا اور جانے کیا کیا بنا ڈالا۔ ایک ذرہ برابر بھی تو انسانیت نہیں ہے تجھ میں، ساری آدمیت ہی بھری پڑی ہے۔"

"ابے! ابھی ادب آداب کوئی شاعری اور دوسری عنایتیں نکال کر بولا۔

"صاف صاف بول تیرا مقصد کیا ہے؟...... لیکن ایک بات یاد رکھنا، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ساری شاعری والی نکال کے رکھ دوں گا اور سیدھا سیدھا نظر آئے گا ہاسٹل میں۔ چل اب بول......!"

"اوہ...... اچھا اچھا......" فاخر جلدی سے مصالحانہ انداز میں بول پڑا۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے بظاہر کسی سوچ میں کھو گیا۔

"اب کیا ہو گیا؟" وقفہ طویل ہو گیا تو فرحت کو ٹوکنا پڑا۔

مگر اچانک ہی وہ دوسری انتہا کا سامنا کر رہا تھا۔

فاخر اٹھ کر اس کے قدموں میں آ بیٹھا اور اس کے گھٹنے پکڑ کر درد بھری آواز میں بولا۔

"فرو!...... فرو! میں سخت ذہنی اذیت میں گرفتار ہوں...... مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے فرو!"

فرحت کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ "ابے تو تو بالکل میری اماں کی طرح بول رہا ہے۔ وہ بھی کبھی کبھی مجھے دلار میں فرو کہہ کر پکارتی ہیں۔"

"میں اماں تو کیا تیری نانی دادی بننے کو بھی تیار ہوں۔" وہ نہایت جوش سے بولا۔ "تو بے فکر رہ یار! میں تیرے سارے رشتے داروں کا کردار بننے کو تیار ہوں، بس تو اپنے مالک مکان سے......"

فرحت فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں سے ہنسی یکدم غائب ہو گئی۔ وہ آنکھیں نکال کر بولا۔ "پھر لیا تو نے مالک مکان کا نام...... دیکھا دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ ہے کوئی ضرور ایسی ویسی بات۔ آخر کو ہوا نا میرا خدشہ پورا...... اچھا بس۔ چلو بہت بک چکے۔ اب بھاؤ کوچ کا نقارہ۔"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فرحت نے چٹکی بجاتے ہوئے باہر کی جانب اشارہ کیا۔

"ارے ارے...... پاگل ہوئے ہو کیا؟" فاخر نے پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا دیا۔ "پوری بات سنی نہیں اور لگے اترانے میاں خان۔"

"اترانے وترانے کی بات نہیں ہے۔" فرحت نے لپک کر جواب دیا۔ "میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میں ایک رشتے دار انکل کے توسط سے یہاں رہ رہا ہوں۔ ورنہ چھڑے چھانٹوں کو کون رکھتا ہے کرائے دار؟"

"ہاں! یہ بات تو تمہاری سو فیصد درست ہے۔" فاخر نے جلدی سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "اور تم بتا رہے تھے کہ وہ بہت شریف اور بردبار شخصیت کے مالک ہیں۔ ہے نا؟"

"ہاں تو اور کیا۔" فرحت اس کی سنجیدگی سے مطمئن ہو کر بتانے لگا۔ "میرے انکل کہہ رہے تھے کہ وہ ان کے سکول کے بہترین اساتذہ میں سے ہیں۔ ریاضی ان کا خاص مضمون ہے۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں دھوم ہے ان کی محنت اور قابلیت کی۔"

"اچھا ان کا اسم گرامی کیا ہے فرو؟"

فرحت بہت سنجیدہ تھا۔

"سعید...... سعید احمد خان۔" فرحت ایک دفعہ پھر اس کے معقول سوال جواب کی زد میں بآسانی پھنس گیا تھا۔

"ہاں تو میں انہی کی صاحب زادی کی تو بات کر رہا ہوں۔" فاخر نے نہایت معصوم صورت بنا کر انکشاف کیا۔ "سعدیہ سعید!"

"کیا؟" فرحت بدک کر ...

"یار! تو سمجھتا کیوں نہیں؟" فاخر نے پھر اس کے گھٹنے پکڑ لیے۔ "یہ تیرے اس کمرے میں آنے سے بھی پہلے کی بات ہے۔ پچھلے سال ماہ فروری میں ہوا تھا یہ ایکسیڈنٹ، جب میں نے نیا نیا ایم اے میں ایڈمیشن لیا تھا۔ میں تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھا تو پھر تم ہی بتاؤ کہ کس طرح واقف ہو جاتا؟ دیکھ، مجھے کھا جانے والی نظر سے مت گھور۔ تو سمجھ رہا ہو گا کہ میں جان بوجھ کر ہاسٹل سے تیرے پاس شفٹ ہوا ہوں۔ لیکن ایسی بات ہرگز نہیں ہے۔ یقین کر یار ایک سال گزر گیا، میری اس سے ایک بات بھی نہیں ہو پائی۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟" فرحت اسے پھاڑ کھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ...... میں اس...... سعدیہ سعید سے تمہاری "سیٹنگ" کراتا پھروں؟ کسی گمان میں نہ رہنا میاں خان! تمہاری آوارگیاں تمہیں ہی مبارک۔"

"آہ...... ظالم دوست! تو نے مجھے آوارہ بھی کہہ ڈالا۔" فاخر دردناک لہجے میں گویا ہوا۔ "تو کیا جانے، عشق کیا ہوتا ہے؟ تو ٹھہرا زاہد خشک...... افسوس عشق کی "ع" تک نہیں جانتا تو اور یہاں یہ حال ہے کہ ایک سال سے زیادہ ہو گیا نہ نیند اپنی ہے، نہ سوچیں، نہ خواب۔ سب پر اس مہ رخ کا قبضہ ہو گیا۔ ایک بے قراری، ایک بے چینی اور اضطراب ہے جس نے پوری طرح جکڑ رکھا ہے۔ بقول شاعر

اس کو دیکھا اک نظر جس شام پہلی مرتبہ
دل میرا دھڑکا بہت اس شام پہلی مرتبہ

بن گئی تھی میری وہ، جب پتہ مجھ کو چلا
دل نے کیا برپا بہت کہرام پہلی مرتبہ

فرحت بے اختیار اپنا سر ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گیا اور بے بسی سے بولا۔

"یار! ایک تو میں تیری اس شاعری سے تنگ آ چکا ہوں۔ دیکھ، میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں فاخر! خدا کے لئے میری خطا معاف کر دے۔ بس نثر میں یہ مختصر سا بتا ڈال کہ آخر تو مجھ سے چاہتا کیا ہے؟ اور میں تیرے لئے کیا کروں؟"

فاخر نے اس کے پریشان چہرے پر شرارت آمیز نظر ڈالی پھر گنگنانے لگا۔

تو تو عالم ہے، سمجھتا ہے کتابوں کی زباں
میرا چہرہ بھی کبھی پڑھ مرے حالات بتا
بس ہو جائے مجھے میری محبت حاصل
تو کوئی ایسی دعا، ایسی مناجات بتا

"اُف ا...... خدا کی پناہ!" فرحت کانوں میں انگلیاں ٹھونس کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔

✽✽✽

اور پھر......

اس کی دلی مراد بر آئی۔ دور دور سے نظریں سیراب کرنے کی بجائے اس نے سعدیہ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے شروع کر دیے اور بہت ہی مہذب انداز میں۔ بظاہر اس کو ٹیوشن کرنے والا فرحت اس کا ہمیشہ مددگار رہا اور آہستہ آہستہ نظروں کی شناسائی دل کی شناسائی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ فاخر نے کچھ عرصے بعد سعدیہ کو تمام حقیقت بتا دی کہ وہ اس کے گھر میں کرائے دار ہے۔ اگرچہ ساری ملاقاتیں ... مگر فاخر حسین خوشیوں کے ساتویں آسمان پر اڑا نہیں پھر رہا تھا۔ اس کا انگ انگ رقص کرتا تھا۔ معلوم نہیں کتنی شاعری پڑھ ڈالی تھی اس نے۔ اپنے پسندیدہ اشعار سنا سنا کر سعدیہ کو نہال کر دیتا۔ شعروں کا یہ سلسلہ اس کے کمرے میں بھی جاری رہتا۔ فرحت کان بند کر کے عاجز آ جاتا مگر وہ سنا کر ہی دم لیتا۔ فرحت کی اکتاہٹ کو وہ کہاں خاطر میں لانے والا تھا۔ اس کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے مصرعے پر مصرعے سناتے چلا جاتا۔

ایک دن فرحت چلا اٹھا۔ "میرے بجائے یہ انکشاف تو "اس" سے کیوں نہیں کرتا؟"

"ہاں، ہاں...... کرتا ہوں، اس سے بھی کرتا ہوں۔" فاخر نے ہنس کر اعتراف کیا۔

"چل نکل یہاں سے۔" ابھی اس نے مزید شعر سنانے کے لئے ڈائری پکڑی ہی تھی کہ فرحت نے اسے کان سے پکڑ کر باہر نکال دیا۔ بڑے گیٹ کی طرف اشارہ کر کے آہستہ آواز میں بولا۔

"اور کر یہ اعلان اندر جا کر۔ پھر دیکھ کیسے چودہ طبق روشن ہوتے ہیں۔ بیٹا! سعید صاحب اتنے جوتے ماریں گے کہ تیری سات پشتیں گنجی پیدا ہوں گی۔" پھر کھٹ سے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا لی۔

فاخر ہنستا ہوا آہستہ سے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ادھر ادھر سے گشت کر کے وہ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور فرحت گہری نیند سو رہا تھا۔

کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد فاخر نے لائٹ آف کرنے سے پہلے اسے دو تین آوازیں دیں مگر

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فرحت کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بالآخر وہ شروع ہو گیا۔

"نیند میں ہو جاتا ہے جب عالم خاموش
ہم فضاؤں میں تیری آواز سنا کرتے ہیں"

"لعنت ہو تجھ پر اور تیری اس پر......" فرحت نے کسمسا کر بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدلی۔

فاخر نے لائٹ آف کر دی اور دبے دبے قہقہے لگاتا ہوا اپنے پلنگ پر جا لیٹا۔

✽●✽

دونوں لڑکوں سے سعید احمد کے بڑے مشفقانہ مراسم تھے۔ ان کے کمرے میں وہ کبھی آئے نہ تھے، باہر کہیں اتفاقاً ملاقات ہو جاتی تو یہ دونوں نہایت ادب و احترام سے انہیں جھک کر آداب کرتے۔ وہ بھی محبت سے پیش آتے اور ان کے شریفانہ انداز کو پسند کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ محلے والوں کو بھی ان لڑکوں کے رہنے پر اعتراض نہ ہوا۔

گھر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی کہ یونیورسٹی میں سعدیہ اور فاخر ایک دوسرے کے کتنے قریب ہیں۔ گھر تو بہت دور کی بات ہے، گلی میں بھی کبھی فاخر نے اسے نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ اس لئے سعدیہ بھی اس کی طرف سے مطمئن تھی لیکن دل ہی دل میں کبھی کبھی الجھ بھی جاتی۔ اب ان کا فائنل ایئر اختتام پذیر تھا لیکن دونوں ایک دوسرے کے پس منظر سے ناواقف تھے۔ خصوصاً سعدیہ تو فاخر کے پس منظر سے بالکل ہی اندھیرے میں تھی۔ اگر کبھی سعدیہ دانستہ کوئی ایسا تذکرہ چھیڑ بھی دیتی تو وہ سیریس نہ لیتا اور موضوع بدل دیتا تھا۔

ایک دوپہر سعدیہ لائبریری میں میز پر جھکی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھی کہ فاخر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آیا اور اس کے پاس ہی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ سعدیہ نے نوٹس نہیں لیا تو بولا۔

"دو سال دیکھتے اور ایک سال ملتے ہوئے ہو گئے مگر تمہیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

سعدیہ نے کتاب بند کر دی اور اچانک یہ شعر اس کے لبوں سے پھسل گیا۔

"انہی دنوں میں کٹے تھے گزرے موسم میں
یہ ایک سال تو پل میں گزر گیا جاناں!"

فاخر حیرت سے اچھل پڑا۔ "ارے...... مار ڈالا ظالم!...... واہ واہ! سبحان اللہ۔ مکرر۔"

"جی نہیں...... مکرر ہرگز نہیں۔ یہاں مشاعرہ نہیں ہو رہا۔" سعدیہ نے بے نیازی سے کہا۔ "بعض اوقات حسب حال کچھ یاد آ جائے تو کہہ گزرتے ہیں۔ آپ کی طرح ہر وقت نہیں۔"

"پلیز! ایک دو شعر مزید عنایت ہوں۔ جناب سے پہلی مرتبہ سن رہا ہوں۔" فاخر نے اس کے بہت قریب ہو کر فرمائش کی۔

"دور...... دور...... ذرا دور رہ کر......" سعدیہ نے فوراً ٹوک دیا۔ "بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ مزید آپ ہی سنا ڈالئے۔"

فاخر نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور بڑے رومینٹک انداز میں گویا ہوا۔

"دور رہ کر بھی ہے ہر سانس میں خوشبو تیری
میں مہک جاؤں اگر پاس بلا لے مجھ کو"

"اف...... توبہ!" سعدیہ کو شرم بھی آئی اور کوفت بھی ہوئی۔ "عجیب عجیب اشعار یاد ہیں آپ کو

تو۔ بعض دفعہ تو یوں لگتا ہے جیسے بیت بازی ہو رہی ہو اور بڑی تیاری سے آئے ہوں آپ۔"

فاخر نے اس کے ریمارکس ان سنے کر دیئے اور ایک جذب کے عالم میں کہتا چلا گیا۔

"نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کے چاہو مجھے پاگل کر دو
تم ہتھیلی کو میرے پیار کی مہندی سے رنگو
اپنی آنکھوں میں مرے نام کا کاجل کر دو
جیسے صحراؤں میں ہر شام ہوا چلتی ہے
اس طرح مجھ میں چلو اور مجھے جل تھل کر دو
اپنے احساس سے چھو کر مجھے ......"

"صندل کر دو۔" قریب سے گزرتی ایک لڑکی نے اس کا مصرعہ مکمل کر دیا اور ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"فاخر!...... خدا کے لئے۔" سعدیہ نے گھبرا کر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "آئندہ کبھی شعر سنانے کو نہ کہوں گی۔ اس وقت تو معاف کر دو۔"

فاخر نے ٹھنڈی سانس بھر کر ایک اور شعر پڑھ دیا۔

"کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے"

"پھر وہی شعر۔" وہ سچ مچ بگڑ اٹھی۔

"کوئی حد بھی ہے۔ آپ نے تو مذاق ہی بنا لیا ہے شاعری کو۔ کچھ دوسری بات بھی ہو یا بس اشعار ہی اشعار سنے جائیں۔"

فاخر نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور بڑی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"مسئلہ ہوں تو نگاہیں نہ چراؤ مجھ سے
اپنی چاہت سے توجہ سے مجھے حل کر دو"

"آپ سدھرنے والوں میں سے نہیں۔" سعدیہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا پھر جانے کے لئے کتابیں سمیٹنے لگی۔

وہ ملتجیانہ انداز سے روکنے لگا۔

"پلیز! بتاؤ نا، تمہیں کیا گلہ ہے مجھ سے؟...... خفا ہو؟"

سعدیہ کچھ کہتے کہتے تھم گئی۔ اس کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ تھا۔ شکوے تو بہت سارے تھے مگر کہنے کا حوصلہ نہ تھا۔

"مجھے بتاؤ نا...... کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ اصرار پر اصرار کئے جا رہا تھا۔ برابر نرمی سے اس سے پوچھے چلا جا رہا تھا۔

"کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔" بالآخر اس نے ٹال دیا۔

اس وقت تو پیریڈ شروع ہونے کی وجہ سے وہ ٹل بھی گیا تھا لیکن اسی رات وہ دوبارہ الجھ کر رہ گیا۔ اس دفعہ اس کا ٹکراؤ فرحت سے ہوا تھا۔ فرحت، جو بال کی کھال نکال کر رکھ دیا کرتا تھا۔

فائنل ایگزام سر پر ہونے کی وجہ سے دونوں رات گئے تک اسٹڈی میں مصروف رہنے لگے تھے۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

یہ ہر روز کا معمول بن چکا تھا۔

اسی رات فاخر اپنی فائل کھلی چھوڑ کر ذرا دیر کے لئے کسی کام سے اٹھ کر گیا۔ واپس آیا تو نیا محاذ تیار تھا۔

فرحت اس کی کھلی ہوئی فائل پر آنکھیں گاڑے ساکت بیٹھا تھا جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔

"کیا ہو گیا میرے بھائی؟" فاخر نے اسے اچھی طرح ہلا جلا کر دریافت کیا۔

وہ ایک جھرجھری سی لے کر ہوش میں آ گیا اور گھور گھور کر اسے دیکھنے لگا۔

"خیر تو ہے فردا کہیں کوئی چڑیل وڑیل یا بھتنی وتنی تو نہیں دیکھ لی؟" فاخر نے فکرمندی سے پوچھا۔

فرحت اس کی آواز سنی ان سنی کر کے غصیلے لہجے میں بولا۔

"میں کہتا ہوں فاخر! دیکھ اب بھی وقت ہے، سدھر جا۔ سدھر جا فاخر!"

"ہائیں! اب میں نے کیا کر ڈالا آدھی رات کو؟" فاخر نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ "عجیب بات ہے۔ آج ایسی ہی بات سعدیہ بھی کہہ رہی تھی۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔" فرحت نے اسی انداز میں کہا۔

"جب تو اچھی بھلی شریف زادی کو پاگل کہے گا اور یونیورسٹی کا اچھا بھلا اسٹوڈنٹ ہو کر بھی پرائمری کلاس کے چھچھورے نادان لڑکوں کی طرح اسے خط لکھ لکھ کر بھیجے گا تو پھر وہ بے چاری کیا کہے گی۔ میں پوچھتا ہوں سارا سارا دن وہاں یونیورسٹی میں تو اس کے ساتھ باتیں کر کر کے تھکتا نہیں ہے، جواب خط بھی لکھنے لگا ہے۔"

"خط...... خط؟ یعنی میں سعدیہ کو خط لکھتا ہوں؟...... یعنی لو لیٹر؟" فاخر نے حیرت کی شدت سے ہکلا کر دریافت کیا۔

"تو اور کیا میں الزام تراشی کر رہا ہوں؟" فرحت نے فائل اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی۔

فاخر نے فائل پر جگمگاتی اپنی تحریر دیکھ کر اپنے سر پر دو ہتڑ رسید کئے۔

"پاگل لڑکی
پہلے میرے خط کے اس نے
اک انجانے خوف سے ڈر کر
ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے

اب
ایک حسیں احساس کے تابع
جس کا کوئی نام نہیں ہے
پچھلے کئی ہی گھنٹوں سے
دروازے کی اوٹ میں چھپ کر
ٹکڑے جوڑ رہی ہے...... پاگل"

"یہ خط نہیں، ایک نظم ہے۔ شاعری ہے بڑے بھائی!" اس نے اعتماد کے ساتھ فرحت کو سمجھانا چاہا مگر فرحت نے یقین کرنے سے صاف انکار کر دیا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"میں تیری شاعری واعری سب سمجھتا ہوں سالے! یہ سب اوچھا پن ہے تیرا۔ سراسر ڈھٹائی ہے۔ اور اب شعر سناتے سناتے خط بھی لکھنے شروع کر دیے ہیں تو نے۔ دیکھ بیٹا! صبح ہی سید صاحب

سے کہہ کر تیرا عشق وشق سب چھڑواتا ہوں۔ بڑے مجنوں کے نانا بنے چلے ہیں۔ باہر سیوسٹی کے نلکے سے پانی تک تو بھر کے لا نہیں سکتے، فرہاد کی طرح دودھ کی نہر کھودیں گے۔ میں صاف کہے دیتا ہوں، کسی کی عزت سے کھیلنا آسان بات نہیں ہے۔ اگر سالے کا پکڑ کر نکاح نہ پڑھوا دیا تو فرحت نام نہیں ہے۔ بہت دنوں سے تیرے کھیل تماشے اور ڈرامے دیکھ رہا ہوں پھر بھی برداشت کئے جا رہا ہوں۔ اب سیدھی طرح پٹڑی پر آ جا۔ مجال نہیں تیری کہ فرار ہو سکے۔ سارے راستے بند کر دوں گا۔ سمجھ رہا ہو گا چند دن کھیل کر ناپ لوں گا اپنا راستہ لیکن اتنا نہیں معلوم میاں خان کو کہ ہم یہاں گردن ناپنے کو بیٹھے ہیں۔"

فرحت بہت دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ کھری کھری سناتا رہا۔ مگر خلاف معمول فاخر نے پلٹ کر جواب نہ دیا۔ کان لپیٹ کر پڑا رہا۔ ان لمحوں میں اس کا شعر پڑھنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

⁂●⁂

جوں جوں دونوں کے یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے دن قریب آ رہے تھے۔ سعدیہ کے دل پر بے چینی اور ایک بے نام سی بے کلی رینگنے لگی تھی۔ کسی لمحے اسے محسوس ہوتا شاید کہ فاخر کچھ کہنے کو ہے...... مگر جلد ہی یہ احساس اسے فقط اپنا گمان اور وہم لگنے لگتا۔

سعدیہ کی سیدھی سادی زندگی اب تک ایک رواں اور صاف اور شفاف جھرنے کی مانند تھی، جس کے آئینے پانیوں میں فاخر اپنے خوبصورت اور دلفریب اشعار کی ڈور سے باندھ کر کنکر پھینکتا رہا تھا بلکہ سو فیصد کامیاب بھی رہا تھا۔ اب اس جھرنے کے پانی میں امیدوں اور ارمانوں کا جوار بھاٹا اٹھنے لگا تھا۔ گو کہ کبھی سے اب تک سعدیہ نے کسی کی بات پر بدظنی کو شکایت کا موقع نہ دیا تھا مگر فاخر سے دلی تعلق قائم کرنے کے بعد اس نے اپنی جوانی کے خوبصورت دنوں میں سہانے خواب سجانے شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ سولہ سال کی نہ تھی کہ بالی عمریا میں تو نادانی کے خواب آتے ہی ہیں۔ یہ خواب ارادی تھے۔ گو کہ وہ ایک مضبوط کردار کی مالک تھی مگر فاخر نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا اور اس حوالے سے وہ خوبصورت مستقبل کے جو سپنے بنے گی بے طرف فاخر کی ذات اس کی زندگی میں اس انداز سے شامل ہو گئی تھی کہ اس کا تصور ہی روح کو گل و گلزار کر دیتا تھا۔

گہری دوستی ہونے کے باوجود ان دونوں نے کبھی حد سے تجاوز نہ کیا تھا۔ تاہم فاخر بھی کبھی کوئی گنگناتی سی بات، خوش رنگ سا فقرہ ایسا کہہ جاتا کہ جس سے اس کے مستقبل کے عزائم عیاں ہونے لگتے۔ بس اس حد سے آگے وہ بھی نہ گیا تھا۔

⁂●⁂

گزشتہ دو دن سے شہر گرد آلود ہواؤں کی زد میں تھا۔ فراٹے بھرتے ہوئے گرم لو کے جھونکے مصروف سڑکوں کی رونقیں سمیٹ لے گئے تھے۔ اسی روز ایم اے فائنل کا آخری پرچہ تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ امتحان کے بعد ذہنی سکون حاصل ہوتا مگر سعدیہ کے ساتھ الٹا معاملہ تھا۔ وہ کسی انجانے خدشے کے تحت شدید ٹینشن میں مبتلا تھی۔ پرچہ اس نے جانے کیسے اور کس حوصلے سے حل کیا تھا۔ دل و دماغ بے چارے تھے۔

بعض دفعہ انسانی محسوسات پر ایسی ہی وحشتیں طاری ہونے لگتی ہیں۔ جب آتی جاتی سانسیں بھی گراں بار لگنے لگتی ہیں۔ زندگی ناقابل برداشت بوجھ تلے پسی ہوئی، بن مانگی، ان چاہی دعا محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسے ہی گھٹن اور بوجھل لمحات آج سعدیہ کو اپنے چاروں طرف منہ لاتے نظر آ رہے تھے۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

جی چاہ رہا تھا کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر جی بھر کے رولے۔

فاخر کے ساتھ لائبریری کی طرف جاتے ہوئے دل اس طرف سے تو مطمئن تھا کہ حسب توقع سارے پرچے شاندار ہوئے تھے مگر تمام وقت وہ کچھ سوچتی ہی رہی تھی۔

'شاید...... فاخر آج وہ بات کہہ دے جو وہ سننے کی متمنی تھی...... شاید آج وہ دن آ گیا ہو۔

کاش!...... اے کاش!'

مگر حسرت، حسرت ہی رہی۔

فاخر نے دنیا کے ہر موضوع کو چھو لیا۔ حال کی ہر بات کر لی۔ گزرے بیتے وقت کے ہر قصے کو دہرا لیا مگر مستقبل کا کوئی سنہرا خواب نہ بنا...... کوئی خوش رنگ، گدگداتی بات نہ کی۔ کوئی دلنشین، فرحت بخش فقرہ نہ کہا جسے وہ وقت رخصت سنبھال رکھتی بلکہ...... بہت ساری نیک خواہشات، پرخلوص دعاؤں اور دلی تمناؤں کے ساتھ اسے رخصت کر کے جانے کدھر کو چلا گیا؟ آج اس نے کوئی شعر بھی نہ سنایا۔ شاید وہ زندگی کے میلے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہو چکا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ بلک بلک کر روئی۔

وہ پچھتاوے کی آنچ میں سلگنے لگی۔ جدائی کی گھڑی تلوار کی مانند سر پر تنی کھڑی تھی مگر اسے سال بھر کے بیتے گئے فاخر کے جملے اور گنگناتے اشعار بھی یاد آ رہے تھے۔ کیا وہ سب دھوکا تھا، فریب تھا یا فاخر پیچھے ہٹ گیا؟...... وہ صحیح صورت حال سے ناواقف تھی۔

'کاش میں نے خود اپنے جذبوں کو عیاں کر دیا ہوتا...... ان صبر آزما لمحوں میں جب اس کی آنکھیں دکھا رہی تھیں، میں اپنی خودداری کے منہ پر پاؤں دھرے چپ بیٹھی رہی...... اب ساری عمر چپ ہی رہنا ہے۔'

اور جب اسی شب اسے اپنی ایک کتاب کے بیچ فاخر کا لکھا ایک منا سا رقعہ ملا تو وہ بیچ پتھر کا بت بن گئی۔

ہزاروں دکھ سہہ جا پڑیں، محبت مر نہیں سکتی
ہے تم سے بس یہی کہنا، محبت مر نہیں سکتی
کیا تھا ہم نے کیمپس کی ندی پر اک حسیں وعدہ
بھلے ہم کو پڑے مرنا، محبت مر نہیں سکتی
جہاں میں جب تلک جگنو چمکتے اڑتے پھرتے ہیں
ہے جب تک پھول کا کھلنا، محبت مر نہیں سکتی
اگر ہم حسرتوں کی قبر میں ہی دفن ہو جائیں
تو یہ کتبوں پہ لکھ دینا، محبت مر نہیں سکتی

'آہ! یہ شعر...... حقیقت میں اس کی آخری ملاقات ہی ہے؟'

اس کے سنتے ہوئے دماغ نے نتیجہ اخذ کیا اور فوراً ہی دماغ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

وہ دھڑام سے کھڑے قد سے پکے فرش پر گر چکی تھی۔

❖❖○❖❖

پل بھر میں پورا گھر اس کی طرف دوڑ پڑا تھا۔

سعید احمد کا گھر تھا ہی کتنا بڑا کہ کسی کو خبر نہ ہو پاتی!

سعدیہ کی آنکھیں بند تھیں اور پیشانی سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ وہ یوں لمبے لمبے سانس لے رہی تھی جیسے میلوں بھاگی ہو۔ شکر ہے سعید احمد گھر پر موجود نہ تھے اور نہ ہی کسی نے اس کی کھلی کتاب پر موجود پھڑپھڑاتے کاغذ پر توجہ دی تھی جس پر فاخر حسین کے قلم سے لکھی ہوئی تحریر جو کہ منتخب شدہ اشعار پر مبنی تھی، اداسی سے ایک ایک کی صورت تک رہی تھی۔

"ارے حمید جا جلدی سے صغریٰ دادی کو بلا لا۔ دیکھ میری بچی کو معلوم نہیں کیا ہو گیا۔ کیسی بے سدھ پڑی ہے۔" سعید احمد کی بیوی نے گھبرا کر اپنے بیٹے کو پڑوس میں دوڑایا اور خود سعدیہ کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئیں۔ پریشانی سے برا حال تھا ان کا۔

ذرا سی دیر میں صغریٰ دادی، دادی کے پیچھے ان کی بہو اور بہو کے تعاقب میں درجن بھر بچے آ موجود ہوئے۔ [illegible] صغریٰ دادی نے جو سعدیہ کی مرحومہ دادی کی منہ بولی بہن بنی ہوئی تھیں، پہلے اس کی نبض ٹٹولی، آنکھوں کے پپوٹے کھول کر دیکھے پھر زخم دیکھ کر حکم دیا۔

"جلدی سے پانی کا کٹورا اور روئی لے کر آؤ۔ اور کسی ریشمی کپڑے کا ٹکڑا بھی ڈھونڈ لاؤ۔ جلا کر زخم میں بھرا جائے گا۔"

"اوئی اللہ!" ان کی بہو سینے پر دوہتڑ مار کر چلائی۔ "اوئی اماں! لڑکی کے ماتھے پر نشان رہ جائے گا۔ یہ خرابی مت کرو۔"

"چپ بے عقل کہیں کی۔" انہوں نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔ "کچھ معلوم نہ ہو تو بولا مت کر۔ زخم کا منہ بند نہ ہو گا تو خون کس طرح رکے گا؟...... آج کل کی لونڈیوں میں کوئی جان بھی ہے...... دیکھو تو ذرا سی دیر میں پیلی سرسوں پڑ گئی ہی۔ بہتے خون کو روکنا تو پڑے گا۔"

زخم داغتے ہی سعدیہ نے ایک دلخراش چیخ ماری اور پھر بے سدھ ہو گئی۔ پورا گھر اس ناگہانی آفت پر رو رہا تھا مگر صغریٰ دادی کی "مسیحائی" پر چنداں اثر نہ پڑا۔ زخم داغنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے بے ہوش سعدیہ کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار مار کر اسے ہوشیار کرنا چاہا مگر اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو پائیں۔ چنانچہ اپنی بہو اور نازیہ کی مدد سے انہوں نے کسی نہ کسی طرح سعدیہ کو فرش سے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔

"ہائے اماں! یہ میری بچی کو کیا ہو گیا ایک دم؟" سعید احمد کی بیوی نے ہاتھ ملتے ہوئے فریاد کی۔

"یہ تو ہونا ہی تھا ایک دن۔" انہوں نے منہ بگاڑ کر جواب دیا۔ "اور تم ایک دم کیوں کہہ رہی ہو؟...... میں تو ہمیشہ ہی کہتی رہی کہ لڑکی کو اتنا مت پڑھاؤ، مت پڑھاؤ۔ اے اللہ ماری! کوئی

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

نوکریاں تھوڑی کرانی ہیں جو اتنی مغز ماری کی جائے۔ آخر کو کرنا تو وہی ہانڈی چولہا ہی ہے۔ ہم نے اور اللہ بخشے تمہاری ساس نے ساری گھرداری کی، یہی تھوڑی موٹی موٹی کتابیں چاٹ چاٹ کر سیکھی تھی؟...... مگر تمہاری سمجھ میں کوئی بات آئے تب نا...... دن رات پڑھ پڑھ کر آخر کو دماغ ہو گیا خالی۔ پھر نہ آئیں تو پھر کیا ہوگا۔ مجھے سالوں پہلے سے یہی خدشہ تھا۔ پڑھنے والی لڑکیوں کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ نہ پیٹ بھر روٹی کھائیں، نہ جی بھر کے نیند سوئیں، نہ بالوں میں بھر بھر کٹوری تیل ڈالیں۔ وہی خشکی کمزوری ٹھہر گئی پنڈے میں۔ کمزرے ڈیل چکر کھا کے گری ہے۔ مولا خیر کرے۔" انہوں نے لمبی چوڑی تقریر کرنے کے بعد نازیہ کو حکم صادر فرمایا۔

"چل دوڑ جلدی سے کٹورا بھر تیل لا جا کر۔"

تھوڑی دیر میں صورت حال کچھ یوں تھی کہ نازیہ اور اس کی امی سعدیہ کے پیروں کے تلوے سوتی کپڑے کی دھجیوں سے سہلا رہی تھیں۔ خود صغریٰ دادی اس کے سر میں تیل سے مالش کرنے میں معروف تھیں اور ان کی بہو اور پوتی ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو سہلا رہی تھیں مگر اس کے ہوش میں آنے کے آثار دور دور تک دکھائی نہ دیتے تھے۔ سعدیہ کے چھوٹے بہن بھائی کونوں کھدروں میں کھڑے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنی پیاری آپا کو عجیب کیفیت کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے دیکھ رہے تھے۔

اسی اثناء میں جبکہ گھر کے ماحول پر موت کا سا سناٹا طاری تھا، اس سانحے سے بے خبر سعید احمد حسب معمول اندر داخل ہوئے۔ خلاف معمول گہری خاموشی سے ان کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ سیدھے چلتے ہوئے اسی کمرے میں آ گئے۔ بیوی تو ان کی صورت دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"ہائے غضب ہو گیا...... میری پھول سی بچی...... معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے...... اچھی بھلی تھی بس کھڑے کھڑے قد سے گر پڑی۔ بڑی عجیب بات ہے۔" ساتھ ہی صغریٰ دادی نے بھی اس کی کیفیت کی تفصیلات فراہم کرنا شروع کر دی تھیں۔ تھوڑی دیر تک تو سعید احمد کے پلے کچھ نہ پڑا مگر جوں ہی اصل صورت حال ان کی سمجھ میں آئی انہوں نے قمیص کے بٹن دوبارہ بند کرتے ہوئے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ صغریٰ دادی کی تفصیلات ابھی جاری تھیں۔

چشم زدن میں وہ نزدیکی کلینک سے ڈاکٹر کو لے آئے تھے۔ جس ڈاکٹر کو وہ لے کر آئے تھے وہ ایک قابل اور سمجھدار معالج ثابت ہوا۔ ساری بات اس نے تسلی سے سنی اور صورت حال کا جائزہ لے کر سب سے پہلے اس نے کمرا خالی کروایا۔ صرف سعید اور ان کی اہلیہ کو روک لیا۔ پھر مریضہ کا معائنہ کیا۔ پیشانی کا زخم دیکھ کر اور پھر صغریٰ دادی کا تجویز کردہ علاج دیکھ کر اس نے سر پیٹ لیا۔ سخت لہجے میں بولا۔

"اس زخم پر ٹانکے لگنے تھے جہاں آپ لوگوں نے اپنی جہالت سے کپڑا جلا کر بھر دیا ہے۔ طویل بے ہوشی کا سبب اس کی اذیت بھی ہو سکتی ہے...... ممکن ہے اب یہ سیاہ نشان یونہی رہے۔"

زخم صاف کر کے اس نے ضروری کارروائی کی۔ ایک انجکشن بھی لگایا۔ اس دوران سعدیہ ہوش میں تو آ چکی تھی مگر تکلیف کی شدت سے نڈھال تھی۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر ماں باپ کے اوسان کچھ بحال ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کو رخصت کرنے کی غرض سے سعید احمد باہر آئے تو فرحت اور فاخر اپنے کمرے کا تالا کھول رہے تھے۔ دونوں نے انہیں ادب سے سلام کیا۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر فاخر کو پریشانی لاحق ہو گئی

تھی۔ اس نے فرحت کو ٹہوکا دیا۔ اس نے فوراً دریافت کیا۔

"قبلہ! خیریت تو ہے؟ خدانخواستہ کسی کی طبیعت تو ناساز نہیں؟"

"آپ کا قیاس درست ہے برخوردار!" انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔ "آج ہماری بڑی بیٹی اچانک ہی بے ہوش ہو گئی۔ حالانکہ یونیورسٹی سے بھلی چنگی واپس آئی تھی۔ آج ایم اے فائنل کا اس کا آخری پرچہ تھا۔" سعید احمد نے مختصر احوال سے لڑکوں کو آگاہ کیا اور پھر فوراً ہی گھر کے اندر چلے گئے۔ وہ اپنی بچی کی طرف سے بہت فکرمند نظر آ رہے تھے۔

✖●✖

کمرے کے اندر پہنچ کر فرحت، فاخر پر چڑھ دوڑا۔

"اس واقعے میں یقیناً تیری کسی کارگزاری کا دخل ہے۔ ورنہ وہ بے ہوش کیوں ہوتی؟ مجھے یقین ہے یہ ضرور تیری کارستانی ہے۔"

خلاف معمول فاخر نے کوئی جواب دیا نہ بحث کی۔ جلے پیر کی بلی کی طرح پورے کمرے میں چکراتا پھر رہا تھا۔ پریشانی اور مارے ہول کے اسے ایک پل قرار نہ تھا۔ گہرے پچھتاوے اور ایک معصوم دل کے ٹوٹ جانے کے احساس نے فاخر کے چہرے کی ساری بشاشت اور رونق چھین لی تھی۔ سعید احمد کی زبانی حقیقت حال سن کر اسے گہرا دھچکا پہنچا تھا جس کی اذیت وہ با آسانی محسوس کر سکتا تھا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ مثال تھی کہ "اب پچھتائے کیا ہوت......" اس کی مسلسل خاموشی فرحت کو زہر لگ رہی تھی۔ وہ پھر بول پڑا۔

"ابے کچھ بتاتا کیوں نہیں؟ کیا حرکت کی ہے تو نے اس کے ساتھ؟"

"پاگل ہوا ہے کیا؟" وہ جھنجھلا کر برس پڑا۔ "یہ کیسے الفاظ استعمال کر رہا ہے تو؟...... میں نے کیا حرکت کرنی تھی؟"

"ظاہر ہے یونیورسٹی میں تو وہ بس تیرا ہی [illegible]" فرحت نے طنز کیا۔ "تیرے سوا وہ کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتی۔ میں نے خود دیکھا تھا پیپر دینے کے بعد ساری دنیا اپنے ٹھکانوں کو چل دی تھی لیکن تو اکیلا اس سے راز و نیاز میں مصروف تھا۔ ضرور تو نے ہی کسی بھی انداز میں اس کا دل دکھایا ہوگا جو وہ گھر آ کر بے ہوش ہو گئی۔"

صاف اندھیرے میں چلانے کے باوجود فرحت کا پھینکا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر جا کر پیوست ہو گیا۔ وہ تڑپ کر چلا اٹھا۔

"ہاں، ہاں میرے باپ! تو درست کہہ رہا ہے۔ سارا کیا دھرا میرا ہی ہے۔ یقیناً میرے ہی رویے اور ناروا سلوک سے وہ دلبرداشتہ ہو گئی۔" چند لمحوں کے لیے وہ چپ ہو گیا۔ اب وہ کرسی پر ٹک گیا تھا اور اس کی پشت سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں بھر رہا تھا۔ لیکن فرحت اسے اب تک کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"یار! مجھ سے بہت بڑی حماقت ہو گئی فرحت!" کافی دیر کے بعد اس نے اعتراف کر لیا۔ لہجے میں سچائی جھلک رہی تھی۔ "دراصل سیریس تو میں اس کے لیے پہلے دن سے تھا۔ تمہارا شبہ غلط ہے...... میں ہرگز وقت گزاری نہیں کر رہا۔ اتنے عرصے سے دل ہی دل میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش میں تھا۔ میرے دل میں بہت سارے عزائم اور ارادے ہیں جن پر عمل کرنا بہرحال میرا ہی کام ہے۔ میں تو اوپر اوپر سے اسے ستا رہا تھا۔ آج آخری پیپر کے بعد بھی یہی ہوا۔" فاخر کے تصور میں

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ایک بار پھر سعدیہ کی کملائی ہوئی صورت اور وقتِ رخصت کی نم آنکھیں اتر آئیں۔ اس نے بے اختیار اپنے گال پر ایک زوردار چانٹا رسید کیا اور روہانسا ہو کر بولا۔

"واقعی آج کے سانحے کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ میں سعدیہ کا مجرم ہوں۔ میں نے اس کے معصوم احساسات مجروح کیے۔ اس کا دل دکھایا۔ آہ! وہ آخر تک مجھے امید بھری نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی مگر میں نے اسے بالکل بھی دلاسا نہ دیا، نہ مستقبل کی کوئی اچھی اچھی باتیں کیں۔ اس بیگانگی کے ساتھ اسے خدا حافظ کہا گویا آئندہ بھی اسے ملنے جلنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی ہو۔ درحقیقت میں اندر ہی اندر اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گویا اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ یہ میری شرارت تھی یا حماقت، ان لمحوں میں مجھے قطعی احساس نہ رہا۔ تبھی جب تھا کہ اس کی نگاہ بچا کر "محبت مر نہیں سکتی" کے عنوان سے چند اشعار کا ایک چھوٹا سا پرچہ بھی اس کی کتاب میں رکھ دیا تھا۔ مقصد اسے ستانے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ سوچا تھا بعد میں با آسانی اسے منا لوں گا۔"

اس کے خاموش ہوتے ہی فرحت غصے سے لال پیلا ہوتا ہوا اس کے سر پر آ کھڑا ہوا اور آنکھیں نکال کر غرایا۔

"کیسے اشعار تھے وہ؟ ...... منہ سے بک۔"

فاخر نے آنکھیں بند کر کے بڑے دل گداز انداز میں پڑھا۔

"ہزاروں دکھ [illegible] محبت مر نہیں سکتی
ہے تم سے بس یہی کہنا محبت مر نہیں سکتی"

"بس بس ...... کافی ہے۔" فرحت نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرایا پھر [illegible] بول کر بولا۔

"ہے تم سے بس یہی کہنا۔ گویا اس کے بعد تجھے اس سے ملنا ہی نہیں تھا۔ ان شعروں کے ذریعے تو نے خوب اچھی طرح اسے ذہن نشین کرا دیا کہ اس کے سوا تجھے اب تم سے کچھ کہنا ہے، نہ لینا دینا ہے۔ اب تم اپنی راہ پکڑو اور میں اپنی راہ جاتا ہوں، کیونکہ آخری بار یہ کہہ رہا ہوں، ملاقات بھی ختم ...... باقی رہا کہ "محبت مر نہیں سکتی" تو میاں خان! ایک تمہارے ہی کہہ دینے پر کیا منحصر ہے۔ محبت واقعی بھی مر سکتی ہے نہ فنا ہو سکتی ہے۔ یہ تو ایک آفاقی جذبہ ہے۔ جب تک اس دھرتی پر ایک بھی جاندار زندہ ہے، محبت یقیناً زندہ رہے گی ...... محبت، محبت ہی ہے کوئی فاخر تو نہیں کہ بدل جائے۔ اس کا ظاہر اور باطن بھی تیری طرح جدا جدا نہیں۔ بیٹا! صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم ہی میں کوئی بوئے وفا نہ تھی۔ اور تم کیا شعر سناؤ گے ...... لاؤ، آج میں تمہیں آئینہ دکھا جاؤں۔ تمہارے حسبِ حال ہے۔ لو سنو۔

وقت کی آنچ پہ پتھر بھی پگھل جاتے ہیں
قہقہے ٹوٹ کے اشکوں میں بدل جاتے ہیں
عمر بھر کون کسے یاد کیا کرتا ہے
وقت کے ساتھ خیالات بدل جاتے ہیں"

فاخر آنکھیں پھاڑے پھاڑے اسے دیکھتا رہا مگر فرحت نے اس کی ذرہ بھر بھی پروا نہ کی اور پلٹ کر اپنے پلنگ پر جا لیٹا اور دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔ اس کے اس رویے پر فاخر پچھتا کر رہ گیا۔ اس نے تلملا کر بار بار اپنی صفائی پیش کرنا چاہی مگر فرحت صاف سوتا بن گیا۔

ان کا یہ کمرہ سعید احمد کے رہائشی حصے سے خاصی دور، صحن کے آخری گوشے میں تھا۔ پھر یہ دونوں لڑکے احتیاطاً دھیمی آواز میں بات کرتے تھے لہٰذا اس وقت بھی فاخر شور مچانے سے قاصر تھا۔

صبح دم فرحت کی آنکھ کھلی تو فاخر کو مصلے پر بیٹھا دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ نمازِ فجر وہ ادا کر چکا تھا اور اب ہاتھ پھیلائے مصروفِ دعا تھا۔ فرحت کے دل سے ساری کدورت جاتی رہی۔ رات جتنا وہ دوست سے بدظن ہو رہا تھا، صبح کے ان مقدس لمحوں میں اتنا ہی ٹوٹ کر اسے فاخر پر ترس آنے لگا۔ ویسے بھی دونوں دوستی کے پُرخلوص رشتے میں جڑے ہوئے تھے۔ خوبصورت "اشعار سے گندھا" شفاف دل رکھنے والا یہ دوست اسے دل کی گہرائیوں سے عزیز تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے آنے والے دلنواز ہوا کے شریر جھونکے فاخر کے سر پر بندھے ہوئے رومال سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے لیکن وہ اس چھیڑ چھاڑ سے بے نیاز اپنے رب کے سامنے سربسجود تھا۔

دور کسی درخت کے پتوں میں چھپی ہوئی صبح دم کوکنے والی کوئل کی کوک رہ رہ کر ابھر رہی تھی۔ کھڑکی سے دکھائی دینے والے آسمان پر کہیں ایک تنہا بادل دھنکی ہوئی روئی کے گالے کی مانند اڑتا پھر رہا تھا۔ مئی کی ابتدائی تاریخیں ہونے کے باوجود فضا اس وقت خوشگوار اور جی کو بھلی لگ رہی تھی۔ ویسے بھی صبح کا منظر تو ہوتا ہی سہانا ہے۔ بدقسمت ہے وہ جو اس سحرخیزی کا لطف نہیں اٹھاتا۔ ہلکے ہلکے اجالوں میں صبح کی تازہ ہوائیں تازگی بخش رہی تھیں۔ تبھی سعید احمد کے آنگن میں موتیے کے چھوٹے سے جھاڑ سے بیک وقت بہت سی ننھی منی چڑیوں کی چہکار سنائی دی۔ فاخر جو نہ جانے کتنی دیر سے سجدے میں تھا، نم آنکھیں لیے اٹھا اور مصلیٰ لپیٹ دیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا جا کر کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

باہر گرمیوں کی سہانی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ ہر سو ایک شرمیلا شرمیلا سا اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف نظر دوڑاتے دوڑاتے معاً فاخر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا ہو۔ یہ سوچ کر ہی اس کا دم گھٹنے لگا کہ اب چند دنوں کے اندر اندر اسے یہ خطہ، یہ ماحول اور یہ فضائیں چھوڑ کر چلے جانا تھا۔ یہ خیال ہی اس کے لیے جان لیوا اور تکلیف دہ تھا۔ اب جبکہ اس کا فائنل بھی مکمل ہو چکا تھا تو پھر اس گھر میں کس بہانے سے رہ سکتا تھا۔ ابھی کل ہی فرحت کہہ چکا تھا کہ یہ ماہ پورا ہو جائے تو کرایہ بھی پورا ہو جائے گا اور ان کے یہاں رہنے کی مدت بھی۔ رات بھر سعدیہ کی طرف سے تشویش لاحق ہو جانے کے بعد سے اب تک وہ ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکا تھا۔ فکرمند اور پریشان حال دل و دماغ میں اب یہاں سے رختِ سفر باندھ لینے کا خیال مزید دکھ اور چبھن کا باعث بنا اور اس کے احساسات پر ایک وحشت سی طاری ہونے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کی چوکھٹ پکڑ کر سر لوہے کی گرل پر ٹکا دیا۔ نماز اور دعا کے بعد جو روحانی لطف و سرور حاصل ہوا تھا وہ اس کی لاحاصل سوچوں میں زائل ہونے لگا۔

"فاخر!" کسی نے دھیرے سے اسے نام لے کر پکارا اور ساتھ ہی بازو سے پکڑ کر آہستہ سے اپنی طرف موڑ لیا۔ اس نے چونک کر دیکھا، فرحت عین اس کے مقابل کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ صبح کے ابھرتے سنہری اجالے میں دونوں دوست آمنے سامنے تھے۔ چند لمحے دونوں ایک دوسرے کی صورت تکتے رہے، پھر فرحت نے پوچھا۔

"رات بھر سوئے نہیں نا؟" لہجہ شفقت آمیز تھا۔ جواب میں فاخر نے شاکی نگاہوں سے گھورا مگر جواب کچھ نہیں دیا۔

"مجھ سے ناراض ہو نا؟" وہ سوال پر سوال کر رہا تھا۔

"میں نہیں کسی سے بھی ناراض ہوں۔" اس نے روٹھے ہوئے انداز میں جواب دیا اور فرحت کا

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ہاتھ جھٹک کر اپنے پلنگ پر جا بیٹھا۔

"یار! کیا یہ بھی باور کرانے کی ضرورت باقی ہے کہ میں تجھے دوست سے زیادہ اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ چل اب تو معاف کر ڈال میرا قصور۔" اتنا کہتے کہتے فرحت اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا اب زیادہ مکاری کی ضرورت نہیں۔" فاخر نے بے اختیار اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کے پُرملال چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی رمق دوڑ گئی۔ اس کے مسکراتے ہی فرحت شیر ہو گیا اور اسے چھیڑنے لگا۔

"اچھا میرے یار اب ذرا صلح کی خوشی میں ہو جائے ایک آدھ شعر۔ بہت دن گزرے تجھ سے سنے ہوئے۔ جی اداس ہو گیا ہے میرا۔"

خلافِ توقع فاخر نے مزید کچھ کہے بغیر فوراً اس کی فرمائش پوری کر دی۔

"ساری دنیا کے مریضوں کو شفا دے یا رب!
آج معلوم ہوا ہے کہ علالت کیا ہے"

ساتھ ہی آنکھوں سے موٹے موٹے دو آنسو ٹپک پڑے۔

✻●✻

نور کے تڑکے سعید احمد حسب معمول فجر کی نماز ادا کرنے کی غرض سے مسجد جا چکے تھے۔ دونوں میاں بیوی نے رات بھر بچی کی تیمارداری کی تھی۔ ماں نے تو لمحے بھر کو بھی پلنگ کی پٹی نہ چھوڑی تھی۔ بارہا سعید احمد نے دلاسا دیا۔

"نیک بخت! حوصلہ رکھ۔ اب اس کی حالت بہتر ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے خوب تفصیل سے معلوم کر لیا تھا۔"

لیکن ان کی صورت تشفی نہ ہو رہی تھی۔ انہوں نے زاروقطار رو رو کر آنکھیں سُجا لی تھیں۔ بار بار ایک ہی بات کی رٹ تھی۔

"پھر یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہی؟...... بات کیوں نہیں کر رہی؟...... ابھی! میں کہتی ہوں بے ہوش ہی ہے۔ اس کی غشی ٹوٹی نہیں ہے۔"

سعید احمد برابر انہیں تحمل سے سمجھاتے رہے۔

"تمہارا خیال غلط ہے بیگم! خدا کا شکر ہے وہ ہوش میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے احتیاطاً سکون کا انجکشن لگا دیا ہے تاکہ وہ نیند پوری کر سکے۔"

وہ تو کچھ دیر کو سوئے بھی مگر بیوی نے پلک سے پلک نہ لگائی۔ رات بھر میں جو کچھ وظیفہ درود یاد تھا، پڑھ پڑھ کر سعدیہ پر دم کرتی رہی تھیں۔ سیانی بچی کا یوں غشوں میں پڑ جانا مذاق نہ تھا۔ ان کے دل و دماغ میں سینکڑوں وہم آ جا رہے تھے۔ فکر اور اس ناگہانی آفت سے رات بھر میں ذرا سی صورت نکل آئی تھی۔ کسی کل چین نہ آ رہا تھا۔ سعدیہ کی ایک آہ یا ایک کروٹ پر بے قراری سے اس پر جھک جاتیں۔

دن چڑھے سعید احمد منہ ہی منہ میں ورد زبانی کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ تبھی سعدیہ نے کراہ کے "پانی، پانی" کی پکار لگائی۔ نازیہ جو بہن کے پاس ہی موجود تھی، لپک کر پانی لے آئی۔ دونوں ماں بیٹی نے سہارا دے کر اس کی گردن اونچی کی اور ماں نے "اللہ تیرا شکر ہے" کہہ کر کٹورا اس

کے منہ سے لگا دیا۔ ایک گھونٹ پانی پی کر وہ دوبارہ لیٹ گئی اور نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟...... مجھے کیا ہو گیا؟" سعید احمد نے پڑھ کر تین بار اس پر پھونک ماری۔ نازیہ نے کرسی آگے کھسکا دی تھی۔ پلنگ کے پاس بیٹھ کر انہوں نے نہایت شفقت سے نرم لہجے میں آواز دی۔

"بی بیا! کتنا سوؤ گی؟ اٹھ کر بیٹھو بیٹا!" باپ کی آواز پر اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور مندی مندی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اب ماں نے اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دلار سے کہا۔

"اتنا دن چڑھ آیا۔ آج نیند سے ہی فرصت نہیں۔"

وہ ٹکر ٹکر ماں کی صورت دیکھنے لگی۔ پلنگ کے اردگرد سارے چھوٹے بہن بھائی گھیرا باندھے کھڑے تھے۔ سب سہم کر رہ گئے تھے۔ اس گھر کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ کل سے اب تک ایک کھیل بھی اڑ کر کسی کے منہ میں نہ گئی تھی۔ باورچی خانہ اوندھا پڑا تھا۔ ہینڈ پمپ کے گرد سوکھے پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا جو ہوا کے جھونکوں سے پورے آنگن میں اڑتے بکھرتے پھر رہے تھے۔ منہ اندھیرے اٹھ کر صفائی پوچے کے بعد کیاریوں اور پودوں کو پانی دینے والی بستر علالت پر جو پڑی تھی۔ ایسا حال تو دادی جان کی موت پر بھی نہ ہوا تھا۔

وہ خالی الذہنی سے سب کو دیکھے جا رہی تھی۔ ماں کی قوت برداشت ختم ہو گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"یا اللہ! کیسی میری چہکتی ہوئی بلبل خاموش ہو گئی۔ ارے کوئی تو بتاؤ اسے کیا ہو گیا؟ اچھی بھلی پڑھنے گئی تھی۔" ان کے آنسو ٹپ ٹپ گر کر سعدیہ کے زرد زرد گالوں کو بھگونے لگے۔

"خاموش احمق عورت۔" سعید احمد غصے ہوئے۔ انہوں نے بیوی کو ڈانٹا۔ "تم جیسی عورتوں کو ایسی فضولیات کے سوا بھی کچھ آتا ہے؟ کیسی الٹا سیدھا بیان بکنے لگیں۔ ارے وہ ابھی نیند کی سی کیفیت میں ہے۔ حواس بیدار ہوں تو از خود اٹھ بیٹھے گی۔ غنودگی کے زیر اثر ہے وہ۔"

پھر وہ نازیہ کی طرف مڑے۔ "چلو چھوٹی! تم جا کر ہاتھ منہ دھلاؤ سب کے لئے۔ تمہاری اماں نے عجب دہشت پھیلا رکھی ہے۔ تم بہن بھائیوں کو کھلاؤ پلاؤ اور ان کے لئے بھی کچھ لے آؤ۔"

نازیہ نے جلدی سے اپنے مسلسل بہتے آنسو پونچھ ڈالے اور سب کو اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گئی۔ کسی کو صفائی پر مامور کیا، کسی کو پودوں کو پانی دینے پر لگا دیا اور کسی کو اپنے ساتھ باورچی خانے میں مصروف کر لیا۔ گھر کی پُرہیبت خاموشی کو ہینڈ پمپ کی آواز اور بچوں کے مسلسل بولنے اور چلنے پھرنے کی آہٹوں نے توڑنا شروع کیا تو یہ گھر جیتے جاگتے گھروں میں شمار ہونے لگا۔ نازیہ نے تازہ آٹا گوندھ کر جلدی جلدی چولہا جلایا، چائے بنائی اور کچھ ہی دیر میں گھر کی فضا پراٹھوں کی خوشبو سے مہک اٹھی۔

گھنٹوں کا فاصلہ گویا منٹوں میں طے ہو گیا اور زیادہ دن نہ چڑھا تھا کہ سب بہن بھائی برآمدے میں دسترخوان بچھائے بیٹھے تھے۔ سب کے منہ چل رہے تھے۔ آنکھیں سعدیہ پر لگی ہوئی تھیں جسے ماں بار بار ہوشیار کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ نازیہ ان تینوں کا ناشتہ اندر کمرے میں ہی میز پر سلیقے سے رکھ آئی تھی۔ اس نے جاتے جاتے بہن کی طرف پلٹ کر دیکھا اور دل مسوس کر رہ گئی۔

✻●✻

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فاخر کے آنسو دیکھ کر فرحت کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ یقین کرنے لگا کہ یہ محض دل لگی نہ تھی، تاہم اس نے ضبط سے کام لیا اور بناوٹی ہنسی ہنس کر بولا۔

"ارے رے......... تو تو بالکل ہی مٹی کا مادھو نکلا۔ اس طرح تو لڑکیاں بھی آنسو نہیں بہاتیں۔ ہمارا تو نام ہی ڈبو دیا تو نے یار!" فاخر اس کے پاس سے اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"ملال مجھے اس بات کا ہے فرحت! کہ اس نے ساری اذیت صرف میری......"

فرحت نے اس کی بات کاٹ دی اور سمجھا کر بولا۔

"یہ محض تمہارا خیال بھی ہو سکتا ہے۔ پورا قصہ تو ہمیں معلوم ہی نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ پھسل گئی ہو یا اتفاقاً......"

"نہیں...... ایسا ہرگز نہیں ہے۔" فاخر نے ہاتھ اٹھا کر بڑے وثوق سے وضاحت کی۔ "میرا دل کہتا ہے کہ ضرور، ضرور وہ میرے الجھے ہوئے رویے سے دکھی تھی۔ یقیناً اُسے اس بات کا شاک پہنچا ہے کہ میں نے اُسے دھوکا دیا ہے اور عام لڑکوں کی طرح اس سے محض کھیل کیا ہوں۔ میں نے اس کا دل اور مان دونوں توڑے ہیں۔ آہ فرحت! اس کی معصوم، حیرت زدہ، ڈبڈبائی آنکھیں مجھے اب تڑپا رہی ہیں۔ میرا تو یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں تو اس کے سامنے دل ہار گیا تھا۔ پھر نہ جانے کہاں مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں یہ سب کر بیٹھا۔ اب کیا ہو گا؟ معلوم نہیں اس کی طبیعت کیسی ہے؟" بات کرتے کرتے اس نے فرحت کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ انداز ایسا درد انگیز اور لہجہ ایسا دلگداز تھا کہ فرحت گھبرا سا گیا۔ اس کو فاخر کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت اور درد کی لہر اتی دکھائی دی۔

"ارے مجنوں کے نانا! طبیعت کا معلوم کرنا کون سا مشکل مرحلہ ہے؟" اس نے توجہ بٹانے کو دلاسا دیا۔

"اچھا پھر جلدی سے معلوم کراؤ۔" فاخر نے بچوں کی طرح خوش ہو کر کہا۔ فرحت پوری طرح پھنس کر رہ گیا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ ہو گیا۔

"یار! معلوم کراؤ نا کسی [illegible]" فاخر نے اسے مخمصے میں گرفتار دیکھ کر التجائیہ لہجے میں اصرار کیا۔

"اچھا، اچھا، کچھ کرتا ہوں۔" فرحت نے دوست کی خاطر ہتھیار ڈال دیے اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر سعید احمد کے گھر کے اندرونی پھاٹک کی طرف چل دیا۔

فاخر بڑھ کر امید بھری نظروں سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ فرحت نے گھوم کر دیکھا، فاخر نے جلدی سے ہاتھ ہلا کر اس کی حوصلہ افزائی کر دی۔ فرحت نے جی کڑا کر کے کواڑ تھپتھپا دیا۔

فاخر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر اس نے نگاہیں وہیں جمائے رکھیں۔ دوسری دستک پر کسی نے زنجیر گرائی۔ اندر سے حمید نے سر نکال کر باہر جھانکا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھ رہا تھا۔ سعید احمد کی بجائے حمید کو پا کر فرحت کے اوسان بحال ہوئے۔ فطری اعتماد بھی عود کر آیا۔ بڑے ہمدردانہ الفاظ میں دریافت کیا۔

"کل چچا جان سے معلوم ہوا تھا کہ آپ کی ہمشیرہ محترمہ کی نصیب دشمناں طبیعت خراب ہے۔ اب کیسی ہیں وہ؟" جتنی بھی تیزی سے وہ بول سکتا تھا، بولا۔

"اوہ...... جی اچھا، اچھا!" حمید جیسے اس کی دستک کا مطلب سمجھ کر مطمئن ہو گیا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں پودوں کو پانی دینے والا فوارہ تھا۔ اس نے وہ وہیں زمین پر رکھ دیا اور خود دروازے سے

باہر آ گیا اور ادب سے پوچھنے لگا۔

"لیکن آپ بجیا کی طبیعت پوچھ رہے ہیں یا ایپا کی؟"

"ایں؟" فرحت کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ بیوقوفوں کی طرح اس کی صورت تکنے لگا۔ لیکن حمید قطعی سنجیدہ تھا۔ اچانک ہی فرحت کو مناسب جملہ سوجھ گیا۔

"تو کیا دونوں ہی کی طبیعت خراب ہے؟" اس نے نہایت فکرمند چہرہ بنا کر پوچھا۔

"جی ہاں...... ایسا ہی ہے۔" حمید نے بڑے بوڑھوں کی طرح جواب دیا۔

"بجیا کو تین چار دن قبل بخار ہوا تھا۔ بہت طبیعت خراب رہی۔ ایپا کل اچانک ہی بے ہوش ہو گئیں۔ طبیعت ایسی بگڑی کہ نوبت ڈاکٹر صاحب تک جا پہنچی۔"

"استغفر اللہ!" فرحت نے بے ساختہ کہا۔ "خدا خیر کرے۔ اب طبیعت کیسی ہے؟"

حمید نے دوبارہ اسی انداز میں اسٹارٹ لیا۔ "بجیا قدرے بہتر ہیں۔ بخار اتر چکا ہے مگر ایپا کی طبیعت کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

"کیا مطلب؟" فرحت نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کی گھبراہٹ سے پریشان ہو کر فاخر جس کا دل ادھر ہی لگا ہوا تھا، بے اختیار اس کے قریب آتا چلا گیا۔

"مطلب یہ کہ......" حمید نے خود تشریح کی۔ "ایپا اس جان کی بات کا جواب دے رہی ہیں، نہ پوری طرح آنکھیں کھول رہی ہیں۔ بس صبح سویرے پانی مانگا تھا اور بس یہ پوچھا تھا "میں کہاں ہوں؟" بابا جان کہہ رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب نے [illegible] کا انجکشن دیا ہے ابھی اسی کے اثرات ہیں۔ رفتہ رفتہ کیفیت نارمل ہو جائے گی۔"

"ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟" اس دفعہ فاخر نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"اللہ جانے۔" حمید نے سادگی سے جواب دے کر بات ختم کر دی۔

"اچھا میاں! اگر ہمارے لائق کسی قسم کی کوئی خدمت ہو تو ضرور دھیان میں رہے۔" فرحت نے بات بنائی اور دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔ آرام انہیں یوں بھی کہاں تھا۔ دوبارہ آمنے سامنے آ بیٹھے۔

"ہو گئی تمہاری تسلی؟" فرحت نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ تسلی والی باتیں ہیں؟" فاخر نے الجھ کر جواب دیا۔ پھر چونک کر بولا۔ "یار! کیوں نہ ڈاکٹر صاحب سے ملیں چل کر؟"

"بھیا! مجھے تو معاف کرو۔" فرحت نے ہاتھ جوڑ لیے۔ "مجھے تو ابھی یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ حمید نے اگر سعید صاحب سے ہماری تحقیقات کا حال جا سنایا تو کیا ہو گا اور جناب والا ہیں کہ ڈاکٹر تک چلے جا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں فاخر! کیوں میرے چہرے پر کالک لگوانے کے لیے تلا ہوا ہے؟"

"تو تو ہے ہی بے حس، پتھر دل۔" فاخر نے جل کر کہا۔

"ویسے یہ حقیقت ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔" فرحت نے ہنس کر کہا۔ "تم تو ہوئے "ایپا" کے غم میں مبتلا۔ کیوں نہ میں "بجیا" کا روگ پال لوں۔ تمہاری بھی شکایت جاتی رہے گی۔"

"کیا مطلب؟" فاخر نے حیران ہو کر پوچھا۔ فرحت نے اسے حمید کی گفتگو سنائی مگر فاخر مسکرا بھی

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

نہ سکا۔ مزید خاموش ہو کر رہ گیا۔

اب کافی دن چڑھ چکا تھا۔ چاروں اطراف دھوپ ہی دھوپ اتر آئی تھی۔ فرحت کو بھوک لگ رہی تھی مگر جانتا تھا اس وقت فاخر بالکل بھی باہر جانے پر تیار نہ ہوگا۔ کپڑے بدل کر وہ اکیلا ہی ناشتہ لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ناشتہ لے کر بہت خوشی خوشی واپس آیا اور آتے ہی چہک کر بولا۔

"لے بھائی! مبارک ہو۔ مٹھائی کھلا۔ تیری اپ...... میرا مطلب ہے میری "آپا" کو مکمل ہوش آ چکا ہے۔ ابھی سعید صاحب مجھے راستے میں مل گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو "اس" کی کیفیت بتانے جا رہے تھے۔ تیری خاطر میں بھی پیٹ درد کا بہانہ کر کے ساتھ لگ کر چلا گیا۔ ان کی صاحبزادی باہوش و حواس ہیں۔ ناشتہ بھی ہلکا سا کر لیا ہے انہوں نے۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید دوا دی ہے اور اطمینان کا اظہار بھی کیا ہے۔" فاخر جو سراپا سماعت بنا یہ خوشخبری سن رہا تھا، لجاجت سے بولا۔

"یار! تجھے میری قسم۔ یہ سب سچ ہے تو جھوٹ موٹ تو نہیں کہہ رہا نا؟"

"جھوٹ کہہ رہا ہوں تو لے دیکھ لے یہ کیا ہے؟ اور لا نکال دوا کے پیسے۔" فرحت نے تنک کر دوا کی شیشی اور چند پڑیاں اس کے سامنے میز پر پھینکیں۔ "یہ رہی پیٹ درد کی دوا۔ خواہ مخواہ ہائے وائے مچا کر میں نے شفاخانے میں اودھم مچا دیا اور دوا لی۔ کوئی عجب نہیں تھوڑی دیر میں سعید صاحب میری ہی عیادت کو چلے آئیں۔"

فاخر کو بڑے زور کی ہنسی آ گئی اور فرحت کے ساتھ مل کر ناشتہ کرنے لگا۔

❋●❋

جوں جوں سعدیہ کی طبیعت بحال ہوتی گئی اس کی صحت بہتر ہوتی گئی۔ ماں باپ سے نگاہیں ملاتے ہوئے کتراتی۔ گو کہ حقیقت کسی کو بھی معلوم نہ تھی، تاہم وہ اپنے شفیق والدین اور محبتیں نچھاور کرنے والے بہن بھائیوں سے دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی رہی۔ بات اتفاقی چوٹ پر ٹل گئی تھی۔ اس نے بار بار سب کو یہی کہہ کر یقین دلایا تھا۔ "بے دھیانی میں میرا پیر رپٹ گیا تھا۔" اس کے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے جوار بھاٹے سے کوئی بھی واقف نہ ہو سکا۔ اس معاملے میں آج تک اس نے کسی کو رازداں بنایا تھا نہ ہی حال دل کہا تھا۔ برابر کی ہم جولی اور ہم سن بہنیں بھی ہر قصے سے لاعلم تھیں۔ تو پھر کون واقف حال ہوتا؟

پوری طرح ہوش و حواس بیدار ہونے کے بعد اسے فاخر کے لکھے ہوئے رقعے "محبت مر نہیں سکتی" کی تلاش ہوئی۔ اس فکر میں اس نے بہانوں سے نازیہ کو باتوں میں لے کر دریافت کیا مگر کسی کو بھی اس کاغذ کا معلوم نہ تھا۔ خبر نہیں وہ کن ہی ہاتھوں میں کہاں پہنچا اور اگلے دن صفائی کے بعد تو بالکل ہی لاپتہ ہو گیا تھا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ سعدیہ دل مسوس کر رہ گئی۔

سعید احمد کو لڑکی کی طرف سے بہت فکر ہو گئی تھی۔ وہ بار بار بیوی کو بھی باور کروا رہے تھے۔

"سعدیہ بہت کمزور ہے۔ اس کی صحت کا قدرے خصوصی خیال رکھا کرو۔"

اگلے دن اتوار ہونے کی وجہ سے سب گھر پر ہی تھے۔ زیر بحث وہی سعدیہ اور اس کی طبیعت تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر دونوں میاں بیوی باتیں کر رہے تھے۔ قریبی چارپائی پر وہ خود بھی کروٹ لیے لیٹی تھی۔

"مجھے تو اماں نے یہ کہہ کر دہلا ہی دیا کہ پڑھ پڑھ کر سعدیہ کا دماغ خشک ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اسے چکر آئے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ!" سعید احمد بے اختیار بول پڑے۔ "کہیں تعلیم حاصل کرنے سے بھی دماغ خشک ہوا کرتا ہے۔ اماں صغریٰ ہمیشہ دور کی کوڑی لاتی ہیں۔ اسی طرح بغیر سوچے سمجھے لڑکی کی پیشانی کے زخم میں کپڑا جلا کر بھر ڈالا۔ معلوم ہے ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ یہ نشان نہ باقی رہ جائے۔"

"اوئی اللہ!" بیوی کے اوسان خطا ہو گئے۔ "اجی! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟...... میری بچی کی اجلی پیشانی تو داغدار ہو جائے گی۔ ابھی آپ ڈاکٹر صاحب سے اچھی طرح معلوم کر لیں۔"

"اب اس میں اچھی طرح اور بری طرح کا کیا سوال ہے؟ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ ممکن ہے داغ بھی نہ رہے۔" سعید احمد نے تاسف سے جواب دیا۔ بیوی غصے سے بولی۔

"لیکن میں بھی اماں کو جتائے بغیر ہرگز نہ رہوں گی۔ شکایت تو ضرور کروں گی۔ لو بھلا یہ کیسی بھلائی کی انہوں نے ہمارے ساتھ؟"

"تم ہرگز کچھ نہ کہو گی۔" سعید احمد نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مانا کہ ان سے بے وقوفی ہوئی مگر انہوں نے جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا تھا۔ میں کہے دے رہا ہوں ان کی اپنائیت اور نیک نیتی کو الزام مت دینا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہماری ماں کے برابر ہیں۔ ہمارا برا بھی نہیں چاہ سکتیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پرانے ذہن کی ہیں۔ لہٰذا پرانے طور طریقے کے مطابق انہوں نے یہ عمل کیا۔ اب ان کو شرمندہ کرنے کی ہرگز کوشش مت کرنا بلکہ ان کا احسان مند رہو کہ بری گھڑی میں کام آئیں۔" وہ دونوں اسی طرح کی باتوں میں مصروف رہے۔

سعدیہ کا ہاتھ بے اختیار اپنی پیشانی کے زخم کو چھونے لگا اور اس کی گمشدہ سوچیں کہیں سے کہیں پرواز کرنے لگیں۔ روح کی گہرائیوں سے ایک خیال ہوک بن کر جاگ اٹھا۔ نظر انداز کیے جانے کے المیے کو سہہ جانے کے بعد وہ اتنی بیمار تو پڑی تھی کہ آہستہ آہستہ اس کی رگ رگ میں سرایت کرتا چلا جا رہا تھا۔ اگر والدین کی ٹھنڈی چھاؤں اسے نصیب نہ ہوتی تو شاید وہ زندہ نہ بچی ہوتی لیکن اندر سے اس کے احساسات کی دنیا گرد و غبار کی تیز آندھیوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ محسوسات پر پُرخار جھاڑیاں ہی سایہ فگن تھیں۔ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار جو چند روز پہلے تک فاخر کے دم قدم سے آباد تھے، اب دور دور تک ویران ہو چکے تھے۔ سر پر تنہائیوں کا سلگتا ہوا سورج ہو...... دور تک صحن دل خالی پڑا ہو اور کوئی غمگسار ہو نہ دلدار، کوئی مونس ہو نہ غم خوار تو پھر ایسے میں ایک دکھے دل کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ وہ بھی سعدیہ جیسی تنہا اور کمزور سی لڑکی کا دل...... جو اس روز اندر ہی اندر اپنی ہی سوچوں سے لڑتے لڑتے شکست کھا کر چکرا کے گری اور ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی۔ اب پیشانی کا زخم نظر آتا یا نہ نظر آتا لیکن اس کی دانست میں روح کے زخم نے تو تا زندگی اس کے ساتھ رہنا تھا۔ یہ چند لمحوں میں اس پر آگہی کے کون سے در کھلے تھے کہ اب وہ درد آشنا ہو چکی تھی۔ اس کیفیت کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو اس صورت حال سے گزر رہا ہو۔

سعدیہ کی شدید جذباتی کیفیت محض ایک اوپری کیفیت نہ تھی۔ وہ درد کے صحرا سے اور دکھ کے سمندر سے ہو کر آ چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سپاٹ چہرہ لیے وہ بظاہر بے حس دکھائی دیتی مگر اندر کے جوار بھاٹے سے وہ بخوبی آگاہ ہو چکی تھی۔ سعید احمد اور بیوی تو بحث و تکرار کرتے کرتے اٹھ کر اپنی اپنی مصروفیات میں لگ گئے مگر سعدیہ کی واپسی اس کی سوچوں کی نگری سے نہ ہو سکی۔

وہ دیوار کی طرف کروٹ لیے لیٹی شاہراہ حیات کے ان یادگار اور حسین لمحوں کا آغاز یاد کر رہی تھی

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"آوارگی کی بھی حد ہوتی ہے فاخر!" وہ بھنا کر بولا۔ "کہتے ہیں ڈائن بھی سات گھر چھوڑ کر حملہ کرتی ہے۔ لگتا ہے تیرے اندر سے تو انسانیت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔ اب اسعید احمد جیسے شریف اور باکردار انسان نے تیرا کیا بگاڑا ہے جو تُو ان کی عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ بھلا یہ کرنے کی بات ہے جو تُو نے کی؟ اور کیا مجھے ایسا بدطینت اور گرا پڑا سمجھا ہے کہ میں ایسی غلیظ حرکت کر بیٹھوں گا تیرے لئے؟...... معاف کرنا، دوستی کی ایسی کی تیسی۔ سسری رہے کہ نہ رہے، مجھ سے ایسی توقع مت رکھنا۔ جتنا ممکن ہوا میں نے تیرا ساتھ دیا مگر اب میرے اختیار سے باہر ہے۔ تجھے اچھا لگے یا برا، میں نے صاف منہ پر کہہ دیا۔ تُو جانے اور تیرا کام۔"

اس وقت حقیقت میں فرحت کو بھی بہت غصہ آ گیا تھا۔ وہ جب بولا تو بولتا ہی چلا گیا۔ اگر بھرا بازار نہ ہوتا تو شاید وہ اسے پیٹ ڈالنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ ایک دم سے چپ ہی تو گیا تھا وہ۔

"بات کو غلط معنوں میں مت لو دوست!" فاخر نے سنجیدگی سے سمجھایا۔ "میرے دل میں بھی سعید صاحب کی عزت و توقیر تم سے کم ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اپنے دل و دماغ کا کیا کروں جو ان کی صاحبزادی کے لئے پاگل ہوا جا رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی بے ہوشی اور چوٹ کا ذمہ دار سراسر میں ہی ہوں۔ میرا ضمیر مجھے برابر کچوکے دیئے جا رہا ہے...... اس بے چینی اور شرمندگی کو کم کرنے کا واحد طریقہ میری عقل میں یہی آ رہا ہے کہ کسی صورت سعدیہ سے مل کر، اس کے روبرو بیٹھ کر میں اپنے جرم اور زیادتی کی اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لوں۔ اپنی نیک نیتی اور آخری بیچ کے دن محض شرارت کے خیال سے کی جانے والی اپنی زیادتی کھل کر اس کے سامنے بیان کر دوں۔ ممکن ہے اس کا دل میری طرف سے صاف ہو جائے۔ بس اس کے سوا میرا مدعا کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر تمہارا ذہن معلوم نہیں کہاں سے کہاں گھوم گیا۔ بھائی! وہ سعدیہ وہی سعدیہ تو ہے جو ہماری کلاس فیلو ہے۔ ابھی تو تجھے پتا ہے اور نہ ہی اسے کہ یہ ملاقات نہ صرف اسے بلکہ تجھے بھی یاد رہ جاؤں گا۔ بقول خود تیرے، میں گھنٹوں اس سے اکیلا "راز و نیاز" میں مصروف رہا کرتا تھا۔"

اب دونوں آہستہ آہستہ قدموں میں باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہو کر ایک پارک کے قریب سے گزر رہے تھے۔ بے خیالی میں چلتے ہوئے ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ فاخر کی غیر معمولی وضاحت سے فرحت کا چڑھا ہوا پارہ نارمل ہونے لگا تھا۔ بالآخر تھوڑی دیر میں وہ سیٹ ہو گیا۔

پارک خاصا وسیع و عریض اور خوبصورت تھا۔ گرمی کی رت میں چلنے والی ہوا کے دلنواز جھونکے مہندی کی باڑ اور اونچے اونچے درختوں کے پتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے گزر رہے تھے۔ خوش باش باتیں کرتے جوڑے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ دودھیا الیکٹرک پول کی روشنیوں میں بہت سے بچے ایک دوسرے کو چھو لینے کی کوشش میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ بے حد رونق اور گہما گہمی کا عالم تھا مگر وہ دونوں اپنی ہی باتوں میں مگن تھے۔ کچھ دیر پارک کا جائزہ لینے کے بعد فاخر نے دوبارہ بات چھیڑ دی اور مسکرا کر بولا۔

"تُو نے تو میری طبیعت صاف کر دی۔ کیا پڑھ کر پھونک دیا سعید صاحب نے تجھ پر؟ کہیں سچ مچ ہی "بیجیا" کا سایہ تو نہیں ہو گیا تجھ پر؟"

"اپنے جیسا سمجھا ہے کیا؟" فرحت نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں نے اس بے چاری کا پرچھاواں تک نہیں دیکھا۔"

فاخر ہنس پڑا۔ "اوہو...... بے چاری، پرچھاواں! کیا حسین و جمیل عنوانات چھانٹے ہیں

جن کا غمگین اور ناقابل فراموش انجام آج اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ بس وقت وقت کی بات ہے۔ ان دنوں زندگی کس قدر متحرک اور تیز رفتار لگتی تھی۔ اور اب دن کتنی سستی اور اذیت سے گزر رہا تھا۔ اس کی امیدوں کا گلستان اجڑ گیا تھا۔ درخت جیسے بے برگ و بار ہو گئے تھے...... ننگی شاخوں پر وحشتیں ناچ رہی تھیں...... ارمانوں کی باڑھ زرد ہو کر جھڑی جا رہی تھی۔ ہر طرف رخصتِ بہار کا ماتم بپا تھا...... تیز اور خشک ہوائیں سوکھے پتوں کو اپنے خزاں رسیدہ شانوں پر اٹھائے، اڑائے پھر رہی تھیں۔ جاتی ہوئی بہار بھی کتنے عبرت ناک اور حسرت انگیز مناظر اپنے عقب میں چھوڑ جاتی ہے۔ بیتے دنوں کی یاد میں بوند بوند اشک بار ہوتا ہے۔ ایسا ہی رُلا دینے والا خزاں آلود موسم اس پر بھی سایہ فگن تھا۔

آگ جس زمین پر جلتی ہے، سچ معنوں میں اس کی تپش سے وہی زمین ہی واقف ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی اس کے دل میں جھانک سکتا تو تب بھی پتہ نہ چل سکتا تھا کہ وہاں محرومیوں اور اپنی تذلیل کا کتنا شدید الاؤ دہک رہا ہے۔ کاش! میں نے اس کے سنائے ہوئے اشعار پر بھی توجہ نہ دی ہوتی...... اے کاش! میں نے یونیورسٹی کا رخ ہی نہ کیا ہوتا۔ کاش! میں اس کے خیالوں کو اپنے ذہن سے کھرچ کر اکھاڑ پھینکنے پر قادر ہوتی۔ آہ! یہ میری مجبوری اور بے بسی...... آخر میں اس کی آنکھیں اپنی لاچاری پر خود بخود ہی چھلک پڑیں اور وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگی۔

اک ابھی آس ہے مرے سینے میں
دل نہیں، آپ ہیں مرے سینے میں
تجھ سے جو گھاؤ ملے دل کو ہیں
کتنی لذت ہے زہرِ ذات کا پینے میں

٭٭٭

Famous Urdu Novels

"یار فرحت! تُو نے تو میرا دل ہی توڑ دیا۔" فاخر نے ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"اب کیا تم توڑ دیا میں نے تجھ پر اور تیرے دل پر؟" فرحت نے حیران ہو کر پوچھا۔ وہ دونوں ابھی ابھی رات کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے اور حسبِ معمول چہل قدمی کرتے ہوئے ایک سڑک کے کنارے چل رہے تھے۔

Free pdf Library

"اب دیکھ نا!" اس نے بڑے مصالحانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ "نمبر ایک، کلاس فیلو۔ نمبر دو، روم میٹ۔ نمبر تین، اکلوتا دوست اور نمبر چار، مسلمان۔ واسطے بہت سے رشتوں کے ہوتے ہوئے تیرا فرض ہے نا کہ تُو میرے مشکل یعنی آڑے وقت میں تھوڑا سنجیدہ ہو کر کچھ طریقے سے کام آئے۔ مگر افسوس کہ تجھے اپنا ایک بھی فرض یاد نہیں ہے۔"

"اچھا...... تو اب نئے نئے الزامات سوجھ رہے ہیں تجھے۔" فرحت نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔ "لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ اپنے الفاظ "سنجیدہ" اور "طریقے" کی وضاحت ذرا کھل کھلا کر کر ڈالیں۔"

"میرا مطلب ہے......" فاخر نے سر کھجاتے ہوئے ڈھٹائی سے وضاحت کی۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تُو کسی ترکیب و ترتیب سے سعدیہ کو اپنے گھر میں بلوا لے اور......"

"ابے او خبیث!" فرحت دانت پر دانت جما کر اس پر جھپٹا مگر ادرگرد دیکھ کر فقط ایک دھپ ہی رسید کر سکا۔ دونوں کی چہل قدمی رک گئی تھی۔ اب فرحت اس سے بری طرح نمٹ رہا تھا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

میرے یار سے۔ چلو میری شاعری تو تھی ہی بدنام، اب دوست کی نثر نگاری سنا کریں گے۔ میں کہتا ہوں یار! یہ سعید صاحب ہیں کیا چیز؟ اور ان کا وہ طلسماتی کمرہ......؟ آخر ایسی کشش اور سحر کیوں ہے ان لوگوں میں؟ میں ان کا کرائے دار بن کر شاعر ہو گیا اور تُو نثر نگار۔ واہ بھائی! یہ تو خوب مزے کا قصہ ہے۔"

فرحت بھی اس کی بکواس سن کر ہنس پڑا۔ "پاگل ہوا ہے کیا؟ کوئی شریف آدمی تیری یہ لن ترانی سن لے تو کیا کہے۔ اور مجھے تُو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش مت کیا کر۔"

فاخر نے بناوٹی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ہائیں! یہ کیا بات ہوئی بھلا؟ خدا کے واسطے یوں راستے میں وضاحت دے جانا فروا جیسے میں "ایا" کا شاعر ہوں ویسے ہی تُو "بیجا" کا نثر نگار ہو جا۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے چار۔"

فرحت جھینپ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر کس کے ایک گھونسا اس کی پیٹھ پر جڑ کر بولا۔ "کس قدر خرافات بھری پڑی ہے تیرے اندر۔ بات کو کھینچ کے کہاں سے کہاں اڑا دیا۔ میں ایک دفعہ پھر تجھے صاف بتائے دے رہا ہوں کہ مجھ پر تکیہ کر کے مت بیٹھے رہنا کہ میں تیری ملاقاتوں کے انتظامات کراتا پھروں گا۔ بس ابھی پردہ داری غنیمت جان کہ میں نے ابھی سعید صاحب کے سامنے تیرا بھانڈا نہیں پھوڑا۔"

"اب تُو میرا بھانڈا کیا پھوڑے گا، میں خود کسی دن "بیجا" کے لیے تیری نثر نگاری کا کیا چٹھا ان کے آگے کھول کے رکھ دوں گا۔" فاخر نے بھی بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"ضرور، ضرور جناب! آپ اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لیجیے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ سانچ کو آنچ نہیں ہوتی۔ اگر میرے قصے میں کچھ سچائی ہوگی تو میں تیری طرح "جھوٹا شاعر" اور "مکار عاشق" ثابت نہ ہوں گا جو یونیورسٹی کے کونے کھدروں میں عاشقانہ اشعار اور مجنوں کے انداز جیسے ڈائیلاگ سنا سنا کر بے چاری لڑکی کو بے وقوف بناتا پھروں اور جب آزمائش کا وقت آئے تو "محبت مر نہیں سکتی" کا نعرہ لگا کر آرام سے پیچھے ہٹ جاؤں۔ ارے، ہم تو پکے کھرے پٹھان ہیں جو اپنی بات کے دھنی ہوتے ہیں۔ جان چلی جائے مگر آن نہ جائے۔ اگر تیری اس "بیجا" کے حضور تیرے نثر نگار بن بھی جائیں تو خالی خولی محبت، الفت بگھارنے کی بجائے سیدھا سیدھا اماں کو بھیجیں گے ان کے گھر رشتہ مانگنے کے لیے۔ لڑکیوں کی عزت تو اسی میں ہوتی ہے۔" اس کی ہر ہر بات فاخر کے دل پر ٹھک ٹھک ہتھوڑوں کی طرح چبھ رہی تھی مگر وہ سنبھالا لے کر بولا۔

"میاں! اڑا لو مذاق، جتنا بھی اڑا سکتے ہو۔ ایسا نہ ہو پھر "بیجا" اتنی مہلت ہی نہ دے۔ میں اس بھری پُری چاندنی رات میں اپنا یہ رومال پھیلا پھیلا کر دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے تجھے "ایا" کی ہمشیرہ "بیجا" سے ہی عشق ہو جائے اور تُو دودھوں نہائے، پوتوں پھلے۔ دونوں گلے گلے عشق کے سمندر میں اتر جاؤ بلکہ ڈوب ہی جاؤ۔ پھر پوچھوں گا میاں! اب کیا حال ہے تمہاری نثر نگاری کا؟" وہ جیب سے رومال نکال کر گھٹنوں پر پھیلا چکا تھا۔ فرحت اس کے بھونڈے سے انداز پر ہنس رہا تھا۔

"واہ فاخرا! تُو حرفوں کا بنا ہوا ہے۔ مجال ہے جو خود پر آنچ آنے دے۔ لیکن یاد رکھنا! میں بھی تیری چار سو بیسی میں نہیں آنے والا۔"

"جی ہاں، کیوں نہیں۔" فاخر نے ایک دلدوز آہ بھر کر بہت دیر کے بعد ایک شعر پڑھنا چاہا مگر چپ ہو گیا۔ فرحت اس کے منہ بنانے پر ہنسنے لگا۔

"ہاں ہاں...... اب کر لے مکاریاں۔ خوب جی بھر کے کر لے۔" وہ سوکھا سا منہ بنا کر بولا۔

"مکاری نہیں فروا، میں سچ سچ تیری طرف سے مایوس ہو چکا ہوں۔ میں تو خیر اوپر اوپر سے ہوں مگر تُو اندر سے بہت "میسنا" ہے۔ مجھے تو بہت پہلے سے پتہ تھا کہ تُو کسی مرض کی دوا نہیں ہے اسی لیے میں نے پہلے سے دل پکا کر لیا ہے تیری طرف سے۔ تُو تو پوری پوری رات آرام سے پڑ کر پھنکتا ہے۔ میں اکیلا ہی کھڑکی میں کھڑا اختر شماری کرتا رہتا ہوں یا پھر گھبرا کر "چٹھی نویسی" شروع کر دیتا ہوں۔"

"چٹھی نویسی؟" فرحت نے متحیر لہجے میں پوچھا، پھر فوراً ہی پریشان ہو کر بولا۔ "ابے الّو نے کہیں عشقیہ خطوط ارسال کرنے تو نہیں شروع کر دیے؟ ابے بھائی! میرے حال ناتواں پر رحم کر۔"

"تو، چل پرے ان کا چرچہ۔" فاخر نے بیزاری سے کہا۔ "ایک تو میں تجھ سے اور تیرے ان خسر صاحب سے بڑا تنگ ہوں۔"

"میرے خسر صاحب؟" فرحت کو جھٹکا لگا۔ "یہ کیا اول فول بکتا رہتا ہے؟"

"ہاں ہاں! ہونے والے خسر...... ہونے والے خسر۔" وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولا جیسے تصحیح کر رہا ہو۔

"بھئی مجھے تھوڑی سی بدپرہیزی ہی کرنا ہے۔ کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تُو نے اور سعید صاحب نے تو شاید میرے خلاف اکا کر رکھا ہے کہ ادھر میں بولا اور تُو نے شور مچانا شروع کر دیا۔ ان کا نام لے لے کر دھمکانے لگا، ڈراوے دینے لگا۔ مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟...... سن! میں نے تو اپنی دیوانگی کا یہ علاج تلاش کیا ہے کہ خود کلامی شروع کر دی ہے۔ دن ہو یا رات، تُو تو پڑا اینڈا کرتا ہے۔ میں عجب دیوانہ وحشت ہوں، تب جو جی میں آتا ہے اشعار یاد آئیں لکھ کر کاغذ پر، پھر اسے توڑ مروڑ کر ہی پھر اس نکالا کرتا ہوں۔ اور کیا کروں؟"

"اچھا! کبھی عمل کر کے بھی دکھاؤں تو ڈھیروں کاغذ کی گولیاں بنوایا کرتا ہوں۔ واہ صاحبزادے! آپ کے یہ ڈھنگ ہیں؟" فرحت آنکھیں پھیلا کر بولا۔

Free pdf library

"ہاں، ہاں۔ ڈھونڈ لے ڈھونڈ لے۔ اب اس میں بھی کوئی عیب نکال کہ یہ تیرا نیا حربہ ہے۔ جاسوسی کر سالے اب تُو میری۔ یہ تیرے ہی کام ہیں۔" وہ جل کھاتا ہوا اٹھ کر چل دیا۔ فرحت بھی مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ دونوں آہستہ آہستہ قدموں سے چلتے پارک سے نکل آئے۔ غالباً چودھویں تاریخوں کا چاند تھا جو شیشم کی بلند و بالا ٹہنیوں کی اوٹ سے جھانک جھانک کر سوتی جاگتی کائنات پر اپنی نقرئی کرنیں نچھاور کر رہا تھا۔ دونوں گھر کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیے۔ ہر طرف دودھیا چاندنی کا غبار چھایا ہوا تھا۔ نیم وا تبسم کے چل رہی تھی جیسے شرما شرما کر اٹکھیلیاں کر رہی ہو۔ سڑک پر کافی رونق تھی۔

گرمیوں کی راتیں یوں بھی رونقوں سے آباد رہتی ہیں۔ رات رات بھر ہی رونق کا سا سماں رہتا ہے۔ خصوصاً وہ جگہیں جہاں متوسط طبقہ رہتا ہو وہاں موسم گرما میں آنگن اور ٹیرس پر پنکھا لگا کر لوگوں کے سونے کے باوجود زندگی کے جاگنے کا سا سماں لگتا ہے جبکہ وہ علاقے جہاں لوگ اے سی زدہ بند کمروں میں پڑے سوتے رہتے ہیں وہاں کی سڑکوں پر سارا سال ایک ہی موسم نظر آتا ہے اور زندگی صرف کالے شیشوں کی گاڑیوں کے اندر یا گھروں میں دبیز پردوں کے پیچھے ہی جاتی ہے۔

پھولوں کی کیاریوں سے بھرے بڑے پارک میں سے اٹھنے والی موتیا، چنبیلی اور رات کی رانی کی

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

خوشبو بھری مستی اب تک ان دونوں کے تعاقب میں تھی۔ آتے وقت وہ دونوں باتوں اور بحث و مباحثے میں مصروف تھے مگر اب واپسی پر چپ کی چادر اوڑھے تھے۔ اپنی اپنی سوچوں کے گرداب میں ڈوبے ڈھیلے ڈھیلے قدم اٹھا کر گھر جا رہے تھے۔ چاروں طرف وہی رونقیں، وہی روز کی گہما گہمی تھی مگر فاخر کے وجود میں سناٹے در آئے تھے۔ سائیں سائیں کی آواز اس کے چاروں طرف گونج رہی تھی۔ نہ معلوم اس روح فرسا سناٹے میں ابھی اسے کتنا سفر طے کرنا تھا۔ وہ تو حسین جذبوں کا مارا ہوا، رومان پرور خیالات کا انسان کہاں اس تنہائی اور بے چارگی کا شکار ہو گیا تھا...... اپنے ہی تصورات میں ڈوبا چلا جا رہا تھا جیسے فرحت کی قربت کا بھی احساس نہ رہا تھا۔ یہ کیسا سرور تھا جو اسے بے چین کرنے کے باوجود مسرور کئے دے رہا تھا۔ سچ ہے عشق کی نگری کے بھید کوئی نہ جانے...... اس کے چار جانب یادوں کے جگنو جگمگ جگمگ کر رہے تھے جو بھی قریب آ کر جھلملانے لگتے تو کبھی دور جا کر ٹمٹمانے لگتے۔ حسین لمحات کی یادیں بارش کی طرح آس پاس چھم چھم کر رہی تھیں۔

اسی کیفیت میں چلتا ہوا وہ فرحت کی سنگت میں گھر پہنچ چکا تھا۔ سحر زدہ سا فرحت اس کے پیچھے یوں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا جیسے ڈر رہا ہو کہ اس کا یہ فسوں کہیں ٹوٹ نہ جائے، بکھر نہ جائے۔

✱●✱

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ آسمان پر تاروں کی بارات اتر آئی تھی۔ چاند بالکل سعدیہ کی آنکھوں کے سامنے جم کر رہ گیا تھا۔ شام کو تو اسے نیند سی آ گئی تھی مگر جب باہر سے کسی گاڑی کے گزرنے کی آواز آئی تو اس کی آنکھ کھل گئی اور اب جبکہ وہ جاگ ہی چکی تھی تو ایک دفعہ پھر سوچوں کے بھنور میں پھنس گئی۔

نیند تو انگریزی دواؤں اور کچھ اس کے ذہنی خلفشار کے سبب اچاٹ ہو چکی تھی۔ ان لمحات میں وہ کروٹیں بدل بدل کر [illegible] توجہ ادھر ادھر کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ بالآخر تنگ آ کر اس نے اپنے رکے ہوئے اشکوں کو بہہ جانے دیا۔ شاید انہیں روکنے کی ناکام کوشش میں وہ سخت اذیت کا شکار ہو رہی تھی۔ دل کا زخم اشک بن کر بہا تو ایک گونہ قرار حاصل ہوا اور ساتھ ساتھ ایک نامعلوم سی ندامت کا بھی احساس ہوا۔ وہ دیر تک دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرتی رہی۔ سوچوں کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی رہی...... ساری دنیا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی اور وہ مضطرب کیفیت میں جاگ رہی تھی۔ اس نے ایک حسرت سے نزدیک لیٹی بہنوں پر نظر کی، پھر کمرے کے کھلے دروازے کے باہر دیکھا۔ وہاں برآمدے میں اور بہن بھائی سوتے نظر آئے مگر اس کی اپنی نیند روٹھ چکی تھی۔ سعدیہ کی آنکھوں کے سامنے ہی سامنے آسمان کی بیکراں وسعتوں میں سفر کرتا ہوا چاند ڈھلنا شروع ہو گیا۔ چاندنی ماند پڑنے لگی۔ تاروں کی روشنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ فضاؤں میں بھیگی بھیگی سی باس رچنے لگی تھی جس میں موتیے کے پھولوں کی خوشبو کے ساتھ ساتھ سگریٹ کے دھوئیں کی تیکھی مہک بھی شامل تھی۔ اس نے ارادی طور پر گہری سانس لی۔ شاید کسی بات کا یقین کرنا چاہ رہی تھی۔

وہ بستر سے اٹھ کر کمرے سے باہر کھلنے والی کھڑکی کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ معاً اس کی نظروں کو دھوکا سا ہوا۔ لمحہ بھر کو وہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ اس نے کیا دیکھا...... شاید کوئی معمولی ترین چنگاری سی تھی جو کہیں دور کسی گوشے میں جل کر معدوم ہو چکی تھی۔ وہ چونک کر اور زیادہ غور غور کر

دیکھنے لگی مگر کچھ ہوتا تو نظر آتا۔ شاید رات کے ان بے چین لمحوں میں اس کی چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی یا کسی جانی پہچانی خوشبو نے پنکھ پھیلائے تھے۔ تتلی کی طرح چم چم کوئی حسین لمحہ نگاہوں کے سامنے اڑا تھا یا گنگناتی پائل کی طرح چھن چھن کسی کی یاد کے گھنگھرو چھن دل میں بج کر خاموش ہو گئے تھے۔ وہ کچھ بھی تو نہ سمجھ پائی۔ ہاں بے تابی سے اندھیرے میں آنکھیں گاڑ دیں۔ کل عالم اسی طرح خواب خرگوش کے مزے لوٹنے میں مصروف تھا۔ اس کے سب گھر والے بھی گہری نیند میں مدہوش تھے۔ فقط وہ تھی جو رات کے سناٹے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھے چلی جا رہی تھی۔

'شاید میرے ہی خیال کا کوئی جگنو تھا جو گھڑی بھر چمک کر بجھ گیا۔' اس نے بڑے شاعرانہ انداز میں سوچا۔ اسے ایک شعر یاد آ گیا۔

میری روداد محبت، آہ جیسے کوئی پھول
شاخ میں چٹکا، کلی بن کر کھلا، مرجھا گیا

'آہ...... وہ مجھے بھی اپنی طرح شعروں کی زبان سکھا گیا۔' سعدیہ نے ایک دلدوز آہ بھر کر کچھ سوچا اور خاموشی سے کمرے سے باہر برآمدہ عبور کرتے ہوئے صحن میں آ گئی۔ وہ کمرہ جو کرائے پر دینے کی غرض سے بنوایا گیا تھا، جہاں آج کل فرحت اور فاخر رہ رہے تھے، صحن کے کونے میں تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس طرف دیکھنے لگی جس کا ایک دروازہ اسی سمت کھلتا تھا جو کہ اب موٹی ترپال ڈال کر چھپا دیا گیا تھا اور جانے کیا ترکیب کی گئی تھی کہ کمرے سے روشنی کی ایک ہلکی ترین رمق بھی آج تک اس طرف جھلک نہ پائی تھی۔ تبھی سب گھر والوں کو بھی اس بات کا احساس نہ ہو پایا تھا کہ کوئی کرائے دار بھی رہتے ہیں۔ کافی دیر کھڑی وہ کچھ سوچتی رہی پھر اسی خاموشی سے واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی۔

سعدیہ اس احساس کے بعد [illegible] جا جا کر اٹک رہی تھی۔ یہاں تک کہ صبح دم اس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے دن نہانے کے بعد وہ اپنے بال سلجھا رہی تھی کہ معاً آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک نامعلوم سی اداسی کروٹ لے رہی تھی۔ دُھلی ہوئی چمپئی رنگت میں زرد زرد کلیوں کا حسن اتر آیا تھا۔ مگر اس کے چونکنے کا سبب اس کی چاند جیسی پیشانی پر چمکتا ہوا سیاہ نشان تھا۔ یہ وہی نشان تھا جو منزہ کی دادی نے زخم سے بہتا ہوا خون روکنے کے لئے ریشمی کپڑا جلا کر رفو کرنے کی کوشش کی تھی۔

کشادہ پیشانی پر اجلی اجلی رنگت کے درمیان سیاہ نشان ستارے کی طرح دمک رہا تھا۔ دنیا جہان کا حسن سمٹ آیا تھا اس ننھے منے سے نشان میں اور اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا باعث بن گیا تھا۔ امی ابا دونوں ہی آج کسی کی عیادت کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ بچے گھر پر تھے۔ سب نے بار بار اس نشان کو ٹوکا مگر سعدیہ کا دل و دماغ کہیں اور ہی تھا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر تازیہ اور چھوٹے بہن بھائی ادھر ادھر پڑ کے سو رہے۔ ہر طرف گرمی کی جلتی ہوئی دھوپ چھلا رہی تھی۔ گرم گرم لو کے تھپیڑے چلنا شروع ہو گئے تھے۔ گلی کوچوں میں سناٹا چھا گیا تھا۔ سعدیہ خاصی دیر جلے پیر کی بلی کی مانند اندر باہر گھومتی رہی۔ پھر جانے کیا سوجھی، موتیے کے جھاڑ کے پاس بیٹھ کر ملتانی مٹی سے بچوں کی تختیاں پوتنے لگی۔ یوں بھی چھوٹوں کی پڑھائی لکھائی کی ذمے داری اسی کے اوپر تھی۔ حمید کی تختی پوت کر رکھتے رکھتے اچانک اس کی نگاہوں نے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

عجب تماشا دیکھا۔ کاغذ کے کئی مڑے تڑے گولے کیاری میں پڑے تھے۔ اس نے بے اختیار ایک گولا اٹھالیا اور کھولنے لگی۔ اس پر کچھ درج تھا۔

میں تجھے بھول گیا ہائے تیری سادہ دلی
کوئی طائر بھی بھولا ہے نشیمن اپنا؟

سعدیہ نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

یہ شعر پڑھ کر جانے اس کے دل میں کیا جھماکا سا ہوا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے دوسرا مڑا تڑا گولا بھی اٹھالیا۔ اس پر بھی اسی قسم کے شعر درج تھے۔ یہ موتیوں جیسے حروف اور لکھائی وہ با آسانی پہچان سکتی تھی۔ پھر تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مزید کاغذوں کی متلاشی ہوگئی جیسے کسی بھکارن کو دو جہان کا خزانہ مل جائے...... وہ دیوانوں کی طرح جلدی جلدی دونوں ہاتھوں سے بٹورنے لگی۔ صحن کا کھلا دروازہ سامنے ہی تھا۔ کسی متوقع خطرے کے پیش نظر اس نے تیر کی طرح باورچی خانے کا رخ کیا۔ تھیلیاں وہیں چھوڑ دی تھیں۔ باورچی خانے میں پہنچ کر اس نے متوحش نظروں سے جائزہ لیا۔ چولہے پر دیگچی آنچ پر رکھی شام کے لیے کھد بد کھد بد پک رہی تھی۔ باقی ہر طرف سناٹا تھا۔ خود کو محفوظ پا کر اس نے مٹھی کھولی۔ کاغذ کے کئی گولے ہتھیلی پر دھرے تھے۔ اس کے پورے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس نے ایک ایک کر کے انہیں کھولنا شروع کیا اور ان پر درج تحریریں پڑھتی چلی گئی۔

کوئی ملال، کوئی آرزو نہیں کرتا
تمہارے بعد یہ دل گفتگو نہیں کرتا
کوئی نہ کوئی کڑی بیچ ٹوٹ جاتی ہے
تمہاری یاد سے جب بھی وضو نہیں کرتا

سعدیہ کے ہاتھ ایک اور کاغذ پر ٹھہری۔

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بے درد کوئی کیا ہوگا

ایک اور کاغذ ابھی وہ پڑھنے ہی جا رہی تھی کہ دوپہر کے سناٹے میں ایک تیز آواز کوئی نوک دار چھری کی طرح اس کی سماعت کے آر پار ہوگئی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔

"یہ کیا بی بیا؟"

اس نے لرز کر سامنے دیکھا۔ سید احمد صحن میں اس کے سر پر کھڑے تھے۔

"اتنا بڑا نقصان میرے ماتھے پر!" وہ بڑی تشویش اور تاسف کے عالم میں گویا ہوئے۔ نظریں اس کی عرق آلود پیشانی پر گڑی ہوئی تھیں۔

"آپ نے آج غور کیا ہے؟" ان کے استفسار پر بیوی بھی پیچھے ہی چلی آئی تھیں۔ "میں نے تو اسی دن اندازہ لگا لیا تھا۔ یہ سب اماں کا کیا دھرا ہے۔ مگر اب کیا کر سکتے ہیں۔ مجھے تو آپ نے بالکل ہی منع کر ڈالا تھا اس معاملے میں ان سے بات کرنے سے۔ اس لیے میں نے دس دفعہ قصد کر کے بھی نہیں جتلایا انہیں۔ لیکن ہے تو فکر کی بات۔"

بیوی کی دخل اندازی پر انہوں نے لہجہ بدلا۔

"لیکن...... اب کیا ہو سکتا ہے؟ جو ہوا سو ہوا۔ انہیں ٹوکنے کا فائدہ کیا تھا؟ نشان تو مٹنے سے رہا۔ ہاں، یہ ضرور ہوگا کہ ان کے دل پر چوٹ لگے گی اور مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں۔" اتنا کہتے کہتے انہوں نے جیب سے چند سکے نکال کر سعدیہ کو دیے۔

"گو بی بیا! ذرا لیموں لے آؤ، سکنجبین تو بنا لو۔"

"یا اللہ توبہ! کیا شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔" بیوی نے پسینہ پونچھتے پونچھتے باہر کا رخ کیا۔ وہ بولتی چلی جا رہی تھیں۔ "نصیب خود کا... پیدل چلتے چلتے دم نکل گیا مگر مجال ہے کہ کوئی رکشہ یا تانگہ ملا ہو۔ یہ گھروں میں ہی قید رہے تو اس ہے ورنہ باہر تو...... چیل انڈا چھوڑ رہی ہے۔"

ان دونوں کے باہر جاتے ہی سعدیہ دم سے پیڑھی پر ڈھے گئی۔ اتنی دیر میں اس کے ایک ایک مسام نے ڈھیروں پسینہ اگل دیا تھا۔ خوف و دہشت سے اندر ہی اندر گھگھی بندھ گئی تھی۔ کوئی دم جاتا تھا کہ وہ غش کھا کر گر چکی ہوتی!

اس نے کھلے اور ادھ کھلے سارے کاغذ کے گولے بٹورے اور پلک جھپکتے جلتے ہوئے چولہے میں جھونک ڈالے۔ پل بھر کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ تاہم اس وقت زیادہ سوچ بچار کا موقع نہ تھا۔ وہ جلدی جلدی تام چینی کے جگ میں سکنجبین بنانے کے لیے شکر اور نمک گھولنے لگی۔ باورچی خانے کی محدود سی فضا میں گرمی کی سوندھی خوشبو پھیل رہی تھی مگر سعدیہ ہر احساس سے عاری لگ رہی تھی۔ اچانک ہی لپیٹ میں لے لینے والی دہشت کی لہر جسم و جان میں سنسنی بن کر دوڑ رہی تھی۔ ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔ کسی نہ کسی طور جگ تیار کر کے پہنچا آئی تب کہیں جان میں جان آئی۔

آج پورے گھر میں باورچی خانہ ہی اس کا سب سے زیادہ محفوظ اور گویا امن کا گہوارا نظر آ رہا تھا۔ سب سے چھپ کر ساری دوپہر اس نے وہیں گزار دی۔ امی ابا کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ وہ پسینے میں تر بتر گھٹنے پیڑھی پر سر جھکائے بیٹھی اپنی عجیب عجیب سوچوں کے گرداب میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ان لمحات میں اس نے انتہائی تفصیل سے اپنے احساسات کا تجزیہ اور پھر اپنا محاسبہ کیا۔ ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو بار بار تنبیہہ بھی کرتی جارہی تھی۔

بہت کمزور طبیعت اور عقل سے پیدل ہوں میں۔ اپنے برے بھلے کی خبر نہیں ہے مجھے۔ نہ ہی والدین کی عزت اور ناموس کا احساس ہے۔ ابھی ایک پل میں کچھ سے کچھ ہو جانے کو تھا۔ ہائے اللہ! اگر جو ابا میاں کاغذ کے وہ ٹکڑے میرے ہاتھوں سے لے کر پڑھ لیتے...... اُف! میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ اماں تو جیتے جی مر جاتیں...... مجھ احمق سے تو وہ لڑکیاں بہتر ہیں جو ان پڑھ ہیں اور اپنے گھروں میں سکون سے بیٹھی ہیں۔ میں نے تو پڑھ لکھ کر گنوا دیا...... کون تسلیم کرے گا کہ میں یونیورسٹی میں پڑھنے جاتی ہوں...... یونیورسٹی کی طالبہ کو باشعور ہونا چاہئے لیکن میں نے تو اپنے تھرڈ کلاس ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا۔ افسوس! آج میں اپنی نگاہوں میں آپ گر گئی ہوں۔ ایسے فضول خیالات اور لاحاصل احساسات کی قدر کون کرے گا جیسے میرے ہیں۔ آج اس وقت تو میں بال بال بچ گئی...... لیکن اگر جو...... خدانخواستہ...... رنگے ہاتھوں پکڑی جاتی تو......؟

وہ شدید شرمندگی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے اپنے گال پیٹنے لگی۔

خیالات کے اسی ریلے میں بہتے کی...... طویل وہ بیت گئی۔ حتیٰ کہ ہانڈی دیکھنے کے لئے نازیہ آنکھیں ملتی ہوئی آن پہنچی۔ سعدیہ کو بیچ کی...... پریشان دیکھ کر چونکی۔ پھر چولہے پر نظر ڈالی جہاں کڑھی ابل ابل کر بہنے لگی تھی۔

"آپا" اس نے شاکی انداز میں...... بہن کو دیکھا مگر وہ جا چکی تھی۔

نازیہ چولہے کے پاس سے کڑھی صاف کرنے میں مصروف ہو گئی۔ سعدیہ باورچی خانے سے نکل کر سیدھی ہینڈ پمپ کی طرف چلی آئی...... فضا میں اذان فجر کی روح پرور آواز ابھر رہی تھی۔ اس نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ وضو کیا۔ سونے کے کمرے میں جا کر جائے نماز بچھائی اور نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ آنکھوں سے ایک سیل رواں بہہ نکلا۔

"اے اللہ! بے شک تو سب سے بڑا رحم فرمانے والا ہے۔ تجھے معاف فرمانا پسند ہے۔ بس اے عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والے مجھے بھی معاف فرما۔ میرے تمام کبیرہ و صغیرہ گناہوں کی پردہ پوشی فرما اور مجھے صراط مستقیم دکھا۔ اے اللہ! میں تیری بے حد کمزور و سیاہ کار بندی ہوں۔ مجھے اپنے متعین کردہ راستے پر چلنے کی ہدایت فرما۔ توفیق عطا فرما کہ میں غلط کاریوں سے بچوں۔ اے اللہ! مجھے پہلے جیسا صاف ذہن بنا دے۔ میرے دل سے "اس" کا خیال حرف غلط کی طرح مٹا دے۔"

رفتہ رفتہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہونے لگے۔

"اے میرے رب پاک!...... میں اپنا آپ تیرے سپرد کرتی ہوں۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ کیا برا ہے اور کیا بھلا...... میری آنکھوں پر خود فراموشی کا پردہ پڑ چکا ہے۔ میں اپنے بے پناہ چاہنے والے ماں باپ کو دھوکا دے رہی ہوں۔ انہیں مجھ پر جو بھروسہ اور اعتماد ہے اسے میں چکنا چور کئے دے رہی ہوں۔ وہ میری بے راہ روی سے بے خبر ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کی بے حیا بیٹی کن گمراہ کن سوچوں میں گم رہنے لگی اور کن اندھیروں کی مسافر ہو گئی ہے...... اے اللہ! تو مجھے اس گمراہی کے جال سے نکلنے میں مدد فرما۔ جو میرے حق میں بہتر ہے وہ کر دے۔ ندامت اور شرمندگی سے میں گڑی جا رہی ہوں۔ مجھے ہدایت دے اور مجھے اپنے والدین کی سعادت مند اور نیک بیٹی بننے کی توفیق عطا فرما۔"

وہ بارگاہِ ایزدی میں جھکی ہوئی بہت دیر تک راز و نیاز کرتی رہی۔ بہت سارے دنوں کا رکا ہوا لاوا بے قراری سے بہہ نکلا تھا۔ آس پاس کوئی دیکھنے والا تھا نہ سننے والا۔ اس نے جی بھر کر اشک بہا ڈالے۔ حتیٰ کہ سوئے ہوئے بہن بھائی ایک ایک کر کے جاگنے لگے اور سب کی چہکار سے دوپہر کا جامد سناٹا مجروح ہونے لگا۔

باہر آنگن میں شام اتر آئی تھی۔ اس نے بھی مصلیٰ سمیٹنا چاہا۔

⌘●⌘

فاخر اور فرحت کے مشترکہ کمرے میں بہت دنوں سے خاموشیوں کا راج تھا۔ فرحت دو دن کے لئے گھر گیا تو بس جا کر ہی رہ گیا۔ نہ کچھ خیر تھی نہ خبر۔ فاخر سارا سارا دن پڑا سوتا رہتا یا پھر شام کو ادھر ادھر گھومنے پھرنے کے بعد اس کا جی چاہتا کہ اتنا تھکاوٹ سے چور چور ہو جائے کہ پھر بستر پر جانے کے بعد سوائے سونے کے کسی بات کا ہوش نہ رہے اور وہ ہر سوچ و فکر سے نجات پا جائے۔

مگر افسوس...... کہ ایسا نہ ہو پاتا۔

بلکہ ہوتا یہ کہ لیٹتے لیٹتے بھی نیند اچٹ جاتی اور وہ بالآخر اٹھ کر ادھر ادھر بے قراری سے ٹہلنے پر مجبور ہو جاتا۔

جب سے جون کا مہینہ شروع ہوا تھا گرمی کو بھی پر لگ گئے تھے۔ بعض اوقات تو حبس اور گھٹن کی شدت سے اس کا دل ڈوبنے لگتا۔ کمرے کی واحد کھڑکی رات بھر کھلی رہنے کے باوجود گھٹن میں کمی نہ آتی تو کبھی کبھی وہ گھبرا کر گلی میں نکل آتا۔ دیر تک باہر کی کھلی فضا میں گھومنے سے گھبراہٹ اور وحشت میں کمی محسوس ہوتی تو کمرے میں واپس لوٹ آتا۔ بعض اوقات رات کے پچھلے پہر ٹیبل لیمپ جلا کر کسی پسندیدہ شاعر کا دیوان کھول کر بیٹھ جاتا اور صبح تک ورق گردانی میں مصروف رہتا۔ جب نیند اور تھکن سے نڈھال ہو جاتا تو خود کو بستر کے سپرد کر دیتا۔ نرم نرم سویروں کی گود سے ابھرتی مسکراتے چہرے والی صبح اپنی نقرئی کرنوں کا جال چاروں جانب پھینکتی تو ان ساعتوں میں اس کا کمرہ بھی خوشگوار اجالوں سے آباد ہو جاتا اور ایک عجیب سا سرور اس کے منتشر اعصاب پر چھانے لگتا۔ رات بھر کی گھٹن اور مچھروں کی یلغار بھی کسی طرف دُم دبا کر بھاگ نکلتے۔ وہ بے خبر ہو کر سوتا تو دن چڑھے تک سوتا رہتا۔ کافی عرصہ اس کے شب و روز اسی طور بسر ہوتے رہے۔

لیکن کب تک!

ایک دن وہ بھی اکتا گیا۔

گھر والوں کو بھی چکر دے دے کر پریشان ہو اٹھا تھا۔ اس نے بھی دو جوڑے اٹھائے، کمرے میں تالا لگا کر چابی حمید کے حوالے کی اور اپنے گھر کی راہ پکڑی۔ فرحت کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ کہہ کر بھی تھک چکا تھا۔ اس کو آنا تھا نہ آیا۔ ممکن ہے اسے گھر پر کوئی ضروری کام پڑ گیا ہو! مگر فاخر کے دل و دماغ جو پہلے ہی مختلف نوع کی کشمکش اور تفکرات کا مجموعہ بنے ہوئے تھے، مزید تاؤ کھا گئے۔

جانے سے پہلے وہ تمام دوپہر گھر میں گھسا الٹی سیدھی باتیں سوچتا رہا...... اور جلتا رہا۔ آج کا دن گرم بھی بے حد تھا۔ کمرے میں چھت کا پنکھا تو تھا نہیں۔ یہ دونوں اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ ایک عدد پیڈسٹل فین بھی لائے تھے، اسی کی مسلسل گھوں گھوں سے دوپہر کا سناٹا مجروح ہوتا رہا اور فاخر اکیلا پڑا بور ہوتا رہا۔ اسی بوریت اور اکتاہٹ کے زیر اثر رات آخری شو دیکھنے کے لئے بھی جا پہنچا۔ مگر فلم بھی اسے اچھی نہ لگی تھی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

شام ہوتے ہوتے کمرے کی گرمی، مسلسل تنہائی اور فرحت پر آنے والے بار بار کے غصے نے اسے بے بس کر دیا۔ سمجھ میں بس یہی آیا کہ وہ بھی اپنے گھر کا رخ کر لے۔ اور کچھ نہیں تو ان کا گلہ ہی کم ہو جائے گا۔ ایسے لمحے اسے ناصر کاظمی کے اشعار بے ساختہ یاد آئے اور وہ دھیرے دھیرے گنگناتا رہا۔ سر دھنتا رہا۔

او پچھلی رت کے ساتھی!
اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چنتا ہوں
تو جیون کی ہری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں

جون کی تپتی جلتی دوپہر بھی اس کے ساتھ ساتھ آہیں بھرتی رہی۔ اضطرار افسوس کرتی رہی۔ مگر فاخر کی تسلی تشفی کرنے سے قاصر رہی۔ آخری پیپر کے دن سے آج تک اسے سعدیہ کی ایک جھلک بھی نظر نہ آسکی تھی۔ بیسیوں دفعہ وہ اس دن کو اور ان منحوس گھڑیوں کو کوس چکا تھا جب محض دل لگی کے خیال سے اس نے اس جانِ قرار کو "محبت مر نہیں سکتی" کے بے جان دلائل کے ساتھ رخصت کر دیا تھا۔ مذاق اسے کس درجہ مہنگا اور جان لیوا پڑا تھا اس کی سنگینی وہ خود ہی محسوس کر سکتا تھا۔ یہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب لاکھ سر پٹخنے کے باوجود اس کا تدارک یا مداوا اس کی سمجھ اور اختیار سے باہر تھا۔ یہ سوچ مزید اس کا دم گھونٹنے لگتی تھی کہ وہ دونوں ایک ہی شہر کی چار دیواری میں قید تھے مگر ایک دوسرے سے بے خبر اور لاعلم تھے۔ سعدیہ کے اچانک بے ہوش ہو جانے کا سن کر کیسا تڑپا تھا وہ۔ اور ہزاروں ہی جتن کر ڈالے تھے کہ کسی طرح اس کی خیریت ہی معلوم ہو سکے یا کچھ سنے تو سہی۔ مگر فاخر کی کوئی ترکیب، کوئی تجویز کارگر نہ ہو سکی...... اور اس سلسلے میں وہ نامراد کا نامراد ہی رہا۔ مرے پہ سو دُرے فرحت کی غیر حاضری نے پورے کر دیے۔ اس کا کوئٹہ گھر جانے سے ویسے ہی برا حال تھا۔ وہاں بھی اس کے لیے کیا تھا سوائے گھر والوں کی جلی کٹی باتوں کے۔ تاہم اب کوئی جائے قرار نہ رہ گئی تھی کہ کوچۂ جاناں میں تو بے اعتنائی کے درد ناک جھکڑ چل رہے تھے۔ لاعلمی اور بے خبری کی زوردار آندھیاں چل رہی تھیں۔ محبت کی خزاں کی گرد آلود ہواؤں نے چاروں طرف سے احاطہ کر لیا تھا۔ وحشت سے گھبرا کر وہ گھائل پنچھی کی طرح چمن چمن سے کوچ کر گیا۔

پتے پتے بوٹے بوٹے نے اس کی درد میں ڈوبی ہوئی پکاریں سنی تھیں۔

تو جیون کی ہری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں
تو جیون کی ہری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں

اور...... نہ سنیں تو یہ صدائیں اک سعدیہ نے ہی نہ سنیں۔

✻●✻

"اپیا! یہ چابی احتیاط سے رکھ لیجیے۔ کرائے دار بھیا دے گئے ہیں۔"

ابھی خیر۔ سعدیہ اٹھتے اٹھتے پھر ڈھے گئی۔

ابھی ابھی تو رب سے "اسے" بھول جانے کی دعائیں مانگی تھیں۔

"حمید!" سعدیہ نے جیسے خواب میں اسے پکارا تھا۔

"جی اپیا!" اس نے پلٹ کر جواب دیا۔

"یہ چابی......" سعدیہ کی زبان لڑکھڑائی، پھر ساری قوتیں یکجا کر کے پوچھا۔ "کس نے دی؟ اور کس کی ہے؟"

"اپنے کرائے والے کمرے کی ہے۔ اور وہاں رہنے والے بھیا نے دی ہے۔" حمید نے سادگی سے بتایا اور دوبارہ چل دیا۔

"حمید......!" اب وہ تمام دعائیں اور مناجات فراموش کر کے اس کی طرف دوڑی۔ "کہاں بھاگے جا رہے ہو؟" اس نے بھائی کو کمرے کے دروازے پر جا لیا۔

"وہ لوگ...... تو کمرہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔"

"کون کہتا ہے؟......" حمید نے مندی مندی آنکھوں سے اپیا کو دیکھ کر پوچھ لیا۔ پھر بولا۔ "ایک دن کے لیے بھی نہیں گئے۔ بس آج گئے ہیں۔ کہتے تھے ہمارا زبانی امتحان وائیوا باقی ہے۔ پھر آئیں گے۔"

اب سعدیہ کی تمام حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔ دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا تھا۔ آج تو نئے انکشافات کا دن تھا۔ تاہم بہت سنبھل سنبھل کر بہت سوچ سوچ کر پوچھا۔

"نئے کرائے دار ہوں گے...... تم تو ہو ہی تھوڑے سے جھلکو سے۔"

حمید کو بہت برا لگا۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا۔ آئیں بائیں کر کے بولا۔

"آپ نے تو اپنا بس انصاف ہی کر ڈالا۔ میں کیسے جھلکو ہو سکتا ہوں بھلا؟ بالکل وہی والے کرائے دار ہیں۔ اپی انہوں نے تو آپ کی اور بجیا کی طبیعت کا احوال بھی پوچھا تھا مجھ سے، جب آپ دونوں بیمار ہو گئی تھیں۔"

سعدیہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ "حمید! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟...... کچھ خیال ہے تمہیں؟"

"اپیا! جو سچ ہے، وہی کہہ رہا ہوں۔ ان کی تعریف تو ابا جان بھی کرتے ہیں...... کہہ رہے تھے بہت خیال کرنے والے اور با اخلاق ہیں دونوں۔ اور سچ بھی ہے اپیا! ورنہ آپ اور بجیا، ہمشیرہ تو میری ہیں نا! ان کی ہمشیرہ تو نہیں ہیں لیکن وہ دونوں بہت فکرمندی سے طبیعت پوچھ رہے تھے۔" حمید نے نہایت عقیدت سے دونوں کی تعریف کی اور سعدیہ کو نئی نئی معلومات فراہم کرتا ہوا چلتا بنا۔

وہ تو چلا گیا مگر سعدیہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ جتنا دل و دماغ کو اس کی طرف سے پھیرنے کی کوشش کر رہی تھی، اتنا ہی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔

یہ خبریں تھیں بھی اس کے لیے فکر انگیز، تعجب خیز اور ساتھ ہی خوشی کا باعث بھی۔ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہو سکا تھا کہ فاخر اتنے دنوں سے نہ صرف یہ کہ یہیں رہ رہا تھا بلکہ اسے اس کے بے ہوش ہو جانے کا بھی علم تھا۔

گرمیوں کی وہ جھلسے جھلسے خوش آئند سندیسے دیتی شام تو جیسے تیسے گزر گئی مگر وہ رات کو لیٹی تو اپنے آپ سے کیے ہوئے تمام وعدے بھول بھال کر فاخر کے متعلق سوچتی چلی گئی۔ یہ احساس کہ وہ اس

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کے لئے فکرمند تھا اور جانے کتنا بڑا حوصلہ کر کے اس کی طبیعت کے بارے میں دریافت کرنے آیا ہو گا۔ سعدیہ کے صحن دل میں مرجھا جانے والے گل، وگلزار کو ایک نئی تازگی اور مہکی مہکی سی تراوٹ بخش گیا۔ رات منزلوں پر منزلیں طے کرتی گئی۔ نیلے فلک پر تاروں کی برات سجی تھی۔ چندا ماموں اپنے صدیوں پرانے جھلملاتے سفر پر رواں دواں تھے۔ اکا دکا چلنے والے جھونکے سونے والوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے چل رہے تھے۔ رات گئے چہل قدمی اور پارک کے ٹھنڈے ماحول سے لطف اٹھا کر واپس آنے والوں کے قدموں کی چاپ بھی ختم ہو چکی تھی۔ سعدیہ کی آنکھوں سے نیند آج بھی غائب تھی۔ اس تضاد کے ساتھ کہ احساسات بدل چکے تھے۔ آخری پہر کے دن سے آج شام تک کے صبر آزما اور تن من جلاتے خیالات اور رات کے اس بے رم جھم برستی ٹھنڈی پھوار میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے جلتی دوپہر بیت چکی ہو اور اجلی اجلی صاف و شفاف کرنیں بکھیرتی ہوئی چمکیلی صبح طلوع ہو چکی ہو۔

کل رات کی کیفیت یاد کر کے اس کی نگاہیں بے اختیار آنگن کی آخری حدوں کی طرف بھٹکنے لگیں۔ اچانک ہی جگنو کا سا جلتا بجھتا لمحہ … دستک دینے لگا۔ گیلی گیلی ہواؤں کے دوش پر سگریٹ کی جانی پہچانی سی مہک … یاد آتا چلا گیا۔ اپنی چھٹی حس کی بیداری پر اسے بے اختیار پیار سا آ گیا۔ ساتھ ہی … واقعہ تازہ ہوا تو دل و دماغ روشن ہو گئے۔

ایک لمحے کے لئے اس کے تمام … کھڑے ہو گئے۔

"اُف خدایا!" سانس سینے میں گھٹنے لگی۔

کافی دیر تک وہ بے حس و حرکت … اپنے حواس بحال کرتی رہی۔ دھیرے دھیرے حسیات بیدار ہوئیں تو وہ دوپہر والی بدحالی اور پھر نماز کے بعد کی، ہی ہوئی دعائیں فراموش کر کے فاخر اور اس کے لکھے ہوئے اشعار کی دنیا میں گم ہوتی چلی گئی۔ نگاہوں میں ہر طرف چھوٹے چھوٹے کاغذ اور ان پر موتیوں کی طرح جڑی ہوئی جگمگ جگمگ کرتی اس کی تحریر … مارنے لگی اور سعدیہ ایک نشے کی سی کیفیت سے مغلوب ہو گئی۔ لفظ تو کہاں یاد رہتا، مفہوم کی حد تک یاد تھا۔ رات ایک دم ہی فاخر کی سچائیوں کی گواہ بن گئی۔ اس کی پور پور فاخر کے جذبۂ صادق پر ایمان لے آئی۔ بغیر کسی رد و قدح، وہ پوری کی پوری فاخر کی طرف سے صاف دل ہو گئی۔ دل نے دماغ کو سمجھایا۔

"اس دن اس نے مذاق کیا تھا اور تم برا مان گئیں...... تم کیا سمجھیں، وہ ہرجائی تھا؟ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

اس کے اندر آپ ہی سوالات، آپ ہی جوابات کا جوار بھاٹا اٹھتا رہا۔ وہ آپ ہی آپ پُرسکون ہوتی گئی۔ دل آئینہ ہو گیا۔

چاروں طرف یقین اور اعتماد کے شفاف پاکیزہ پھول کھلنے لگے۔ بالآخر دلکش چہرے والی سچ کی دیوی مہربان ہو گئی تھی۔

یوں اچانک تیری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارہ ٹوٹے

⌘●⌘

فاخر سے پہلے فرحت کی واپسی ہو گی۔

اگلے دن ان کا وائیوا تھا۔

کمرے کی ظاہری حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ فرش پر ہر طرف سگریٹوں کے ٹکڑے، ماچس کی ڈھیروں تیلیاں اور پھٹے پرانے کاغذ اڑتے پھر رہے تھے۔ گرد اور مٹی اس کے سوا تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت دنوں سے بند رہا ہو۔

تالے کی چابی اسے سعید صاحب نے لا کر دی تھی اس لئے صحیح صورت حال معلوم نہ ہو سکی کہ فاخر کب سے غائب تھا اور کیا کہہ کر گیا تھا۔

فرحت نے خوب اچھی طرح کمرہ اور باتھ روم دھویا۔ کھڑکی، دروازے، پلنگ اور اکلوتی میز جھاڑی۔ گھر سے لایا ہوا کیری کا اچار، روٹیاں، چار پانچ شامی کباب اور راستے سے خریدے ہوئے کچھ … سب کچھ میز پر سجا کر رکھا اور فاخر کا انتظار کرنے لگا۔ گھر سے سویرے جلدی نکلا تھا۔ بھوک ابھی چمکی نہ تھی۔ پچھلے کئی … مسلسل ہوا اور اس وقت کی مشقت نے نیند طاری کر دی اور وہ انتظار کرتے کرتے پڑ کے سو رہا۔

گلی سے کوئی پھیری والا گھنٹیاں بجاتے گزرا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شام کے پانچ بج چکے تھے مگر فاخر کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ … دوڑ رہے تھے۔

اگرچہ اس کا گھر کراچی کی حدود میں ہی واقع تھا مگر یونیورسٹی سے کافی فاصلے پر تھا۔ دوسرے ان کے اطراف سے کوئی پوائنٹ … بھی تھی۔ … کراچی تو اب چار شہروں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ کہنے کو ایک … لگ جاتے ہیں اور اگر مطلوبہ روٹ کی سواری نہ ملے تو پھر کہنا ہی کیا۔ آدھا دن سفر ہی میں نکل جاتا ہے۔ اس لئے فرحت نے بھی یکسوئی سے پڑھنے کی خاطر یونیورسٹی کے نزدیک ہی رہنا گوارا کیا تھا۔ حالانکہ گھر جیسا آرام تو کہیں بھی مل سکتا مگر انسان کا مقصد … تو وقتی پریشانیاں بھی خاطر میں نہیں لائی جاتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ترجیحاً یہاں رہ رہا تھا۔ اس کمرے سے فاصلے اور وقت کی بچت تھی، آسانی اور سہولت میسر تھی جو زیادہ اہم بات تھی۔

فاخر کے انتظار سے تنگ آ کر اس نے اکیلے ہی کھانا کھا لیا۔

پانچ بجنے کے باوجود گلی دور تک ویران تھی۔ ہر طرف اب سہ پہر کا سناٹا چھا رہا تھا۔ ہر طرف پیلی پیلی تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ پرندے گھونسلوں میں بیٹھے چونچیں کھولے ہانپ رہے تھے۔ لوگ باگ گھروں میں بند تھے۔ اس وقت تو گلی کوچوں میں ٹھیلے والوں کی آمد و رفت بھی کم کم تھی۔

خدا خدا کر کے شام چھ بجے کے بعد چہل پہل کے آثار ہوئے۔ تاہم فاخر ہنوز غائب تھا۔ اب تو فرحت کو بھی فکر ہوئی۔ جوں جوں وقت بیت رہا تھا اس کی فکر پریشانی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس کا دل پڑھنے میں بھی پوری طرح نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا۔

'خدا خیر کرے...... معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا گزری؟...... کل تو وائیوا ہے۔ اس کی موجودگی ضروری ہے۔ غیر حاضر رہنے کا جواز بھی نہیں ہے۔ اگر وہ گھر گیا ہے تو اب تک کیوں نہیں آیا؟ تیاری بھی کرنی ہے۔"

دھیرے دھیرے ساتویں شام گہری ہونے لگی۔ فرحت کو ہول سا آنے لگا۔ مغرب سے ذرا پہلے اس نے سوچا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

باہر نکل کر کھڑا ہوتا ہوں۔ سعید صاحب نکلیں گے تو پھر معلوم کرتا ہوں۔ ممکن ہے انہیں علم ہو۔ دیر تو واقعی بہت ہو گئی ہے۔"

وہ اٹھنے کا قصد کر ہی رہا تھا کہ معاً بھڑا ہوا دروازہ آہستگی سے کھلا اور کوئی چپکے سے اندر داخل ہو گیا۔ فرحت نے نظر اٹھائی تو کھل اٹھا۔ اس کے روبرو فاخر کھڑا تھا۔

شام کے جھٹپٹے میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔

"ارے بے ایمان کہیں کا۔" وہ بھرپور خوشی سے چلایا۔ "اتنی راہ دکھائی آنے میں۔ کتنے دنوں سے غائب ہے تو؟"

جواب میں اس نے گرم جوشی دکھانے کی بجائے خود کو تھکے ہوئے انداز میں کرسی کے حوالے کر دیا اور فرحت کو خالی خالی نظروں سے تکنے لگا۔ فرحت کو جھٹکا سا لگا۔ فکرمندی سے پوچھا۔

"کیا ہوا؟...... خیریت تو ہے فاخر؟"

اتنا کہتے کہتے اس نے بغور دیکھا تو فاخر اسے کافی بدلا بدلا سا اور کمزور لگا۔ صورت اتری اتری اور رنگت کملائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"کچھ تو ہے۔ جس کی پردہ داری ہے۔" فرحت نے چھیڑا۔

"اچھا اب تو شاعری کرنے لگا ہے؟" فاخر نے صفحے کے گولے بنا کر کونے کھدروں کی طرف پھینکے۔

"نہیں بھئی...... شاعری تجھی کو مبارک۔ ہماری تو وہ نثر نگاری والی سیٹ مناسب ہے۔" فرحت نے در پردہ وار کیا۔

فاخر کو اچانک دیکھ کر واقعی خوش ہو گیا تھا مگر ان لمحوں میں اس کا چہرہ بجھا بجھا سا اور لپک لپک کر بولنا سب بیکار جا رہا تھا۔ فاخر کچ ہی بہت بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ تھکن تھی یا پھر طبیعت کا اضمحلال، ایک عجیب سی چپ تھی جو اس کی پوری شخصیت کا گھیراؤ کیے ہوئے تھی۔ اس حصار میں وہ چپ کی چادر اوڑھے بہت خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"اچھا چھوڑ فی الحال سب باتیں۔ کھانا کھا لے۔" فرحت نے مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔

"نہیں...... بس اب تو شعر سن۔ اگر یہ سیٹ میری ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔" اچانک فاخر نے ضدی لہجے میں کہا اور فرحت کے کسی رد عمل کا انتظار کیے بغیر شعر سنانے لگا۔

"کیا کیا نہ خواب ہجر کے موسم میں کھو گئے
ہم جاگتے رہے تھے مگر بخت سو گئے
اس نے پیام بھیجے تو رستے میں رہ گئے
ہم نے جو خط لکھے وہ ہوا برد ہو گئے"

فرحت سنانے میں رہ گیا۔ اس سے کوئی تبصرہ بھی نہ ہو سکا۔ فاخر کی بوجھل سی آواز دیر تک کمرے میں گونجتی رہی۔

آج فرحت نے گھبرا گھبرا کر اس کے "خط لکھنے" کے اعتراف پر جرح بھی نہ کی تھی۔ شاید بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی اس لیے۔

شعر سنا کر وہ چپ چاپ پلنگ پر لیٹ گیا۔ فرحت نے کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اور خود لیمپ آن کر کے پڑھنے بیٹھ گیا۔ فاخر سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا؟ فرحت کو معلوم نہ ہو سکا۔

بہت دیر گزر گئی۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ کافی دیر کے بعد وہ خود ہی اٹھ بیٹھا اور غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ کافی دیر تک فرحت کو پانی کی آواز آتی رہی جیسے شفاف پانیوں میں وہ اپنی ساری اداسی اور کسلمندی بہا ڈالنا چاہتا ہو۔

میز کے قریب بیٹھ کر جب وہ دوپہر سے سجا ہوا ٹھنڈا کھانا کھا رہا تھا تب فرحت کو ہوش آیا۔ وہ کتاب بند کر کے گویا ہوا۔

"آج...... رات کا کھانا تو غالباً گول کرنا پڑے گا۔"

"تم جانو۔" فاخر مختصر سا جواب دے کر لاتعلق ہو گیا۔

فرحت نے اسے گھور کر دیکھا۔ جی چاہا جبڑے پر ایسا گھونسا جڑ دے کہ اس کے حواس پر چھائی ساری برف پل بھر میں پگھل جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر طرح دے گیا اور دوبارہ کتاب میں کھو گیا۔

وہ کھانے سے فارغ ہو کر گنگناتا ہوا کمرے کے اندر ہی ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ کبھی کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا، کبھی کرسی پر بیٹھ کر اسے آگے پیچھے جھلانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔ کبھی پلنگ پر جا لیٹتا۔ ایک نہ اٹھائی تو بس کتاب ہی اٹھا کر نہ دیکھی۔

فرحت کی قوت برداشت جب بالکل ہی جواب دے گئی تو اس نے اپنا قلم بند کر کے رکھ دیا اور طنز کے پیرائے میں بولا۔

"معلوم ہوتا ہے وائیوا دینے کا ارادہ نہیں ہے۔ غالباً کسی تفریحی دورے پر تشریف لائے ہیں صاحبزادے۔"

"کیا مطلب؟" فاخر نے فوراً اس کے الفاظ پکڑ لیے۔ یوں لگا یار وہ نے آج پکڑی ہو یا بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ ایٹم بم کی طرح پھٹ پڑا۔ "بہت خوب...... بہت خوب کہ گویا آپ جناب تو یہیں کھڑے بیٹھے رہے اور آپ ہی بس کے بولے ہوئے۔ جاں بلب ہوئے ہوں اس کمرے سے۔"

فرحت ایک لمحے سے بھی کم میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ جھٹکا ہوا کرسی سے اٹھا اور بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔

"سمجھ گیا تیرا تھوبڑا کیوں سوجا ہوا ہے۔ ارے بات تو سن! اصل جو تاخیر تو کوئی وجہ تاخیر بھی تھی۔ معلوم ہے کیا ہوا؟"

"معاف کیجیے، مجھے کچھ نہیں سننا۔ آپ اپنی راہ لیں۔" فاخر نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

"او...... ہو ہو...... ہو......" فرحت پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ "کیسی فصیح و بلیغ اردو بول رہا ہے میرا یار۔ لگ رہا ہے ایم فل اور پی ایچ ڈی مکمل ہو گیا۔ دیکھ بہت ہو چکی۔ اب دوبارہ فاخر بن جا۔ ایسا نہ ہو میں پھر تیری سیٹ سنبھالنے پر مجبور ہو جاؤں اور نثر کی بجائے شاعر بن جاؤں۔"

فاخر نے بے ساختہ اُمڈ آنے والی مسکراہٹ ضبط کی اور خفگی سے جواب دیا۔

"نثر نگار ہو یا شاعر...... میری بلا سے۔"

"شکر ہے "کلف" کچھ تو کم ہوا۔" فرحت بہ آواز بلند بڑبڑایا۔ پھر مسرور ہو کر بولا۔ "یار! میری تو نانی محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا اس وجہ سے کسی صورت جلد واپسی ممکن نہ ہو سکی۔ رہتی بھی وہ ہمارے پاس ہی تھیں اس لیے آنے جانے والوں اور دیگر کچے والوں سے فرصت نہ مل سکی۔ ننھیال والوں کا تو ابھی تک تانتا بندھا ہوا ہے۔ اگر جو کل وائیوا نہ ہوتا تو آج بھی آنا ممکن نہ تھا۔ اور ایک یہ ہیں کہ ان

کے مزاج نہیں ملتے۔ نہ حال چال پوچھا، نہ حال احوال لیا، خالی خولی اٹھ گئے۔"
فاخر کی ناراضگی کا سارا ابخار پل بھر میں ہوا ہو گیا۔ آنکھوں کی سرد مہری مٹی، چہرے کا تناؤ کم ہوا، پیشانی کے بل کھلے تو لہجہ خود بخود نرم ہوتا گیا۔
"یار! اتنا تھا نا...... تُو تو بس یونہی گھنوں کی طرح منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ بتائے گا تو پتہ چلے گا نا۔ مجھے کیا معلوم نانی اماں وفات پا گئی ہیں...... بڑا افسوس ہوا یار! معاف کرنا میری بے ہودگی اور دل آزاری۔"
اب موضوعِ سخن بدل چکا تھا۔ دونوں دیر تک ایک دوسرے سے گلے شکوے کرتے رہے۔ حتیٰ کہ پہلے کی طرح شیر و شکر ہو گئے۔ فاخر تھوڑی دیر کے بعد تعزیت اور معذرت ایک ساتھ ہی کر رہا تھا۔ اس کی چاہ سن کر وہ حقیقتاً شرمندہ ہو گیا تھا اور بار بار اظہارِ ندامت کرنے لگا۔ فی الوقت ہر تذکرہ غضب ہو گیا۔ رات نے پوری طرح تمام کائنات کو اپنی سیاہ چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔ اب کمرے کے حبس میں بھی اضافہ ہو چلا تھا۔ دونوں چہل قدمی کی غرض سے کمرے سے باہر نکل گئے۔
یہ ایک گرم اور حبس آلود رات تھی۔ آسمان پر گہرا غبار سا چھا رہا تھا۔ ہوا خاموش تھی۔ ہر طرف گھٹن اور حبس کی چادر تنی ہوئی تھی۔
کھانے کی بجائے انہوں نے دہی کی ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پی اور بازار کی رونق اور گہما گہمی سے ہٹ کر دور تک سنسان کھائی ہوئی سڑک پر چہل قدمی کرنے لگے۔ حالانکہ دل چاہتا تھا مگر گرمی کی تیزی کا تقاضا تھا کہ باہر گھوم کر کچھ دیر تک جسم و جاں کو تازگی پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں...... تاکہ رات کے چند گھنٹے سکون اور اطمینان کے ساتھ پڑھنے میں صرف ہو سکیں۔
دل ہی دل میں فاخر کو آنے والی کل کا شدت سے انتظار تھا اور اتنے دنوں کے بعد سعدیہ سے ملنے کی بے پایاں خوشی ہو رہی تھی۔ مگر آج کی رات وہ حیرت انگیز طور پر سعدیہ کا ذکر گول کر گیا تھا۔ مگر فرحت حیرت زدہ تو بہت تھا۔ اضطرار بار بار اس کے لبوں تک آتے آتے تھم سا جاتا لیکن اس کی خاموشی کے پیش نظر اس نے بھی چپ سادھ لی۔
چاند کی آخری تاریخیں ہونے کی وجہ سے ماحول بجھا بجھا سا اور افسردہ تھا۔ وہ رہ رہ کر کوئی بھولا بھٹکا ہوا کا جھونکا بدن سے ٹکراتا تو گہرے سکون کا احساس جاگ پڑتا ورنہ گھٹن ہی گھٹن تھی۔ دل و نگاہ اداس...... ویران...... خاموشی اور سکوت کی بھی اپنی ایک الگ زبان ایک الگ کشش ہوتی ہے۔ جب لب ہلائے بغیر بہت سی باتیں کہہ دی جاتی ہیں۔ بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ نظارے بول رہے ہوں۔ وہ فضا محوِ کلام ہو جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ ایسی ہی خود کلامی اور خود بیانی کی کشش اور دلکشی گرمی کی اس یادگار رات میں دونوں دوستوں کو بانہیں پھیلا کر جکڑے ہوئے تھی۔
اس خاموشی میں ایک جاندار سحر تھا...... ایک دلنواز سا تعلق تھا...... ایک دلفریب سا احساس تھا۔
دونوں بہت دیر تک خالی سڑک پر ٹہلتے رہے۔ کبھی دو رویہ کھڑے پیڑوں کے سائے تلے آ جاتے، کبھی کھلی فضا میں پہنچ جاتے۔ یوکلپٹس کے اونچے پیڑوں کی اوٹ سے آج چاند کے روپہلے ٹکڑے کی بجائے میلا سا دھندلا دھندلا کھردرا سکیاں بھر رہا تھا۔ نرم نرم چاندنی سے خالی مناظر اونگھ رہے تھے۔ درختوں کی شاخوں پر بیٹھا کوئی پرندہ زور سے پر پھڑپھڑاتا تو فضا میں ارتعاش سا پھیل جاتا۔ خالی سڑک پر دور سے ایک تانگہ اندھیرے کی چادر سے نمودار ہوا۔ کوچوان اونچے سُروں میں

ایک مشہور فلمی نغمہ گنگناتا گزر گیا۔ تھوڑی دور تک چاروں طرف تانگے کی "ٹخ ٹخ" گونجتی رہی۔ فرحت گانا سن کر آپ ہی آپ ہنسا تو اندھیرے میں اس کے دانتوں کی سپیدی جھلک پڑی۔
"یار فاخر! کچھ تم بھی سناؤ...... تاکہ وقت کٹے۔"
"گویا میں داستان گو ہوں...... تم کسی چوپال میں بیٹھے ہو۔" فاخر نے خوشگوار موڈ سے جواب دیا۔
"ایسا ہی سمجھ لو۔ کیا حرج ہے؟ ویسے میں داستان کی نہیں، شاعری کی بات کر رہا ہوں۔"
"لیکن محترم! یہ جاڑے کی لمبی رات نہیں بلکہ گرمی کی مختصر سی شب ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ لیکن پھر فوراً ہی اس کے بھاری لہجے کا سحر لمحات کے سحر سے گلے ملنے لگا۔ فضاؤں میں خیالات کے پھول کھلنے لگے۔ لیکن ان پھولوں کی بُو باس جاں سوز تھی۔ دلگداز تھی۔ وہ حرماں نصیب آنکھ سے ٹپک پڑنے والے آنسو کی طرح بے چین تھا۔ بے قرار اور بے تاب تھا۔

یا ہجر اور مرے چاروں طرف تنہائیاں
چن رہا ہوں تیری یادوں کی سلگتی کرچیاں
آہ! وہ موسم وہ پہلے اور کنارہ نہر کا
یاد آتی ہیں مجھے بچپن کی ساری شوخیاں
اپنی بربادی کا میں جا کر کسے الزام دوں
اپنے ہاتھوں سے ڈبوئی ہیں میں نے اپنی کشتیاں

اس کے خاموش ہوتے ہی فرحت نے گھر کی طرف قدم بڑھائے۔ فاخر بھی سر جھکائے ساتھ چل دیا۔ ان برمحل اشعار کا اشارہ سمجھ کر فرحت کے دل پر کچھ اثر تو ہوا تھا مگر ظاہر کر کے اسے مزید طول کرنا نہیں چاہتا تھا۔
"یار! ابھی کشتیاں کہاں ڈوبی ہیں؟ ابھی تو کل ناؤ پار لگنے والی ہے۔" اس نے دانستہ فاخر کو چھیڑا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دبا دبا سا سانس لے کر رہ گیا۔
"اچھا بھیا! مت بول۔ تیری مرضی۔" فرحت نے تھک ہار کر شکست مان لی۔ "مگر اتنا تو بتا دے گھر جا کر بیمار پڑ گیا تھا کیا؟ اتنا کمزور کیوں ہو رہا ہے؟"
"ہاں...... آں......" فاخر نے اسے ٹالا۔ "آج چھوڑ یار! کل کچھ باتیں کریں گے۔"
فرحت بس اس کی صورت دیکھ کر رہ گیا تھا۔

✖●✖

سعدیہ دائیو اوے کر باہر نکلی ہی تھی کہ فاخر لپک کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ سعدیہ نے نظریں اٹھا کر اسے بہ غور دیکھا۔ لمحہ بھر کے لئے جی دھک سے رہ گیا اور جو کچھ سوچا بھی نہ تھا وہ وقوع پذیر ہو گیا۔
وہ انکار کئے بغیر چپ چاپ اس کے ساتھ چلتی ہوئی اپنی مخصوص جگہ پر جا بیٹھی۔ جہاں جی میں عہد کئے بیٹھی تھی کہ خواہ قیامت ہی کیوں نہ آ جائے، اس ستمگر کی طرف دیکھنے کی نہ بات کرے گی مگر وقت آیا تو بالکل ہی بودی ثابت ہوئی۔ سارے عہد و پیماں پل بھر میں ہوا ہو گئے۔
پھر وہ تھی...... اور فاخر تھا۔
"فاخر! کیا ہو گیا؟...... کتنے کمزور دکھائی دے رہے ہو؟"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اس کے جواب میں فاخر کی تیز اور گرم جوش سرگوشی گونجی۔

"یہ...... یہ پیشانی پر کیا چمک رہا ہے؟...... نظر کا ٹیکا لگا کر آئی ہو کیا؟"

سعدیہ نے بے ساختہ پریشان ہو کر ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا اور شرمندہ سی ہو کر جواب دیا۔

"یہ...... یہ تو بس...... چوٹ کا نشان ہے۔ میں گر...... گر گئی تھی......" اس کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔

اب پریشان ہونے کی باری فاخر کی تھی۔ یاد اسے سب کچھ تھا بلکہ ازبر تھا۔ وہ اپنی جگہ ایک مضطرب جھونکے کی طرح لہرا گیا۔ بے تابی سے اس کا ہاتھ اپنی مضبوط مٹھی میں جکڑا اور نگاہیں اس کی شیشہ پیشانی پر گاڑ دیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ نظر ٹکانا مشکل ہو گیا۔

چاندی جیسی پیشانی پر وہ سیاہ نشان واقعی نظر کا ٹیکا بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے چمپئی رنگت والے معصوم چہرے کی دلکشی کو چار چاند لگ گئے تھے۔ سعدیہ کی بے خبری اور معصومیت پر وہ ششدر تھا۔ بے اختیار کہہ اٹھا۔

"آہا...... ایسا دلکش!!"

معلوم نہیں اس نے سیاہ نشان کو کہا تھا یا اس کی صبیح پیشانی کو کہا تھا یا پوری کی پوری سعدیہ ہی اس کے لئے "دلکش" تھی۔

اس کے لہجے میں ستائش ہی ستائش بھری تھی۔ پیار ہی پیار گھلا تھا۔ محبتوں، اپنائیتوں کا ٹھاٹھیں مارتا بحر ذخار تھا جو ہر طرف بہہ نکلا تھا۔ شاید کلیوں کے چٹکنے کی آواز کا نام ہو "دلکش"...... یا شاید بہاروں کو کوئی عنوان دیا جائے تو کہلائے "دلکش"...... پھولوں سے جھکے نغمے کا نغمہ گنگنایا...... پروا کے جھونکے بہکے۔ فاخر خود ہی بے ساختہ ہنس پڑا۔

"بس آج سے تمہارا نام ہے دلکش...... دلکش...... دلکش۔"

سعدیہ کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ اس کی مدہوشی کو ہوش آیا تو وہ اور فاخر دور دور تک اکیلے تھے۔ تیسرا کوئی بھی نہ تھا۔ وہ جھجکتے ہوئے فاخر سے گھبرا کر دور ہوئی۔ وحشی ہرنی کی طرح دونوں ہاتھوں سے اسے پرے ہٹایا تھا۔

"میرا نام...... میرا نام بدل دینے کا سوچنا تک نہیں...... معلوم ہے یہ میری پیاری دادو کا رکھا ہوا ہے۔"

"تو پھر ہم اپنی...... بیٹی کا نام رکھ دیں گے...... "دلکش"۔"

ان لمحوں میں فاخر کی شوخی اور سرمستی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"اف توبہ!" سعدیہ شرم سے دہری ہو گئی۔ بے حساب غصہ اور بے شمار شرم ایک ساتھ ہی حملہ آور ہو گئی۔ خود پر ہزار بار نفرین بھیج کر اور کچھ نہ سوجھا تو اٹھ کر چل دی۔ دل ہی دل میں ابال اٹھ رہے تھے۔ خود کو لعنت ملامت کرتی جا رہی تھی۔

"بہت ہی بے غیرت اور بے حیا ہو چکی ہوں...... کیا رشتہ ناتا ہے فاخر سے میرا؟...... کیسی کیسی بے ہودہ باتیں سن رہے ہیں کان میرے؟...... خدانخواستہ اماں بابا سن لیں تو......"

"سعدیہ...... سعدیہ......" فاخر پیچھے دوڑا چلا آیا۔ "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو...... میرا مقصد تمہیں ناراض کرنا نہیں تھا۔ بس یونہی بک دیا...... بات تو سنو...... دیکھو، جانے دو۔ اب غصہ تھوک دو...... آئندہ کے لئے میرے والد بزرگوار کی بھی توبہ۔" اس نے جلدی سے ہاتھ جوڑ لئے۔

سعدیہ نے رخ پھیر کر دھیرے سے جواب دیا۔ "اب دیر بھی بہت ہو گئی ہے۔ گھر پر انتظار ہو رہا ہو گا میرا۔ جانے دیں۔"

"ابھی تو میں نے اپنا پچھلا کہا سنا معاف نہیں کرایا، تم جانے کی بات کرنے لگیں۔" وہ سوکھا سا منہ بنا کر بولا۔ "اگر گھر جا کر دوبارہ بے ہوش ہو گئیں تب میں کیا کروں گا؟"

"تو آپ کا کیا نقصان ہو گا؟" وہ اسی طرح بولی۔ "گروں گی میں...... چوٹ مجھے لگے گی...... بابا جان میرے دوڑیں گے دوا دارو کے لئے۔ کبھی حکیم جی کو بلائیں گے کبھی ڈاکٹر صاحب کو...... آپ اپنے کمرے میں چین، سکون سے گاتے بجاتے رہیے گا۔"

"نہیں، نہیں...... اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ اب مجھ میں ایسی تاب ہے نہ مجال۔" فاخر نے اتنا کہتے کہتے اسے دوبارہ گھاس کی سیج پر لا بٹھایا۔

"اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں آپ؟" اس نے بگڑ کر پوچھا۔

"آپ سے...... آپ ہی کا سوال ہے۔" وہ پھر بہکنے لگا۔ لیکن پھر فوراً کان پکڑ کر بولا۔ "معاف کر دیجئے۔ آئندہ نہیں۔"

سعدیہ کو ہنسی آ گئی۔ اب ایسے بھولے لڑکے سے کیا جھگڑتی۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے لاکھ بار۔" سعدیہ کی مسکراہٹ سے وہ شہ پا گیا اور اس کے سامنے گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "ایک تو ابھی تم لڑکیوں کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ کب کیا برا مان کر خفا ہو بیٹھو۔ اس لئے ہر وقت ہی ڈر لگا رہتا ہے۔"

سعدیہ نے دھیرے سے کچھ طنز کیا۔ "اگر اتنی ہی ڈرا دینے والی مخلوق ہیں تو یوں کھلے عام دوسروں کی جان پر نہ بنا دیں۔ اور مہربانی فرما کر آج میرے سامنے اپنی بے سری شاعری کی کتاب بند رکھئے گا۔ خبردار اگر...... آدھا شعر بھی پڑھا تو۔"

"اس "پابندی" پر کون نہ مر جائے اے خدا!"

"مرنے کی ضرورت ہے نہ جینے کی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ "اگر آج آخری اور تھوڑی دیر کا ساتھ منظور ہے تو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ورنہ مجھے اجازت دیں۔"

وہ گھبرا کر بولا۔ "جانے کی کوشش مت کرو۔ تمہاری ہر شرط منظور ہے لیکن......" پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ "آج جانے کی ضد نہ کرو، یونہی......"

"پھر...... پھر شعر پڑھا......" وہ بگڑی۔

"اسے شعر نہیں کہتے دلکش!...... اوہ...... اوہ...... میرا مطلب ہے سعدیہ!" وہ بوکھلا کر تاویلیں پیش کرنے لگا۔ آنکھوں سے شرارت ٹپکی پڑ رہی تھی۔ اس دفعہ وہ خشمگیں نگاہوں سے گھور کر رہ گئی۔ بولی کچھ نہیں۔

تھوڑی دیر تک پھولوں کی دلنواز مہک میں دونوں مسحور سے چپ بیٹھے رہے۔ اب سورج چڑھ کر بالکل سامنے آ ٹھہرا تھا۔ دھوپ کی تپش اور شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ صرف اس گوشے میں سبزے کی بہتات اور گھنے سایوں کی وجہ سے قدرے سکون اور ٹھنڈک کا احساس باقی تھا ورنہ تو یہ ایک گرم ترین دن تھا۔

کافی دیر بعد وہ گویا ہوا تو بہت سنجیدہ تھا اور ایسا ان کی دوستی میں یہ پہلا لمحہ تھا۔

"سعدیہ!" فاخر نے گلا کھنکارتے ہوئے بات شروع کی۔ "آخری پرچے کے دن...... جو کچھ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بے ہودگی مجھ سے سرزد ہوئی اور دانستہ طور پر میں نے تمہارا دل دکھایا، اس کے لیے میں تم سے دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں...... حالانکہ میرے تصور میں بھی اس کا گزر نہ تھا۔ جو کچھ بعد میں ہوا میرا خدا گواہ ہے میرا مقصد وہ نہ تھا جو اس وقت تم نے سمجھا اور میری جانب سے ملال دل میں لائیں۔ حقیقت فقط اتنی سی ہے کہ وہ محض لمحاتی دل لگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں صرف تم سے مذاق کر رہا تھا لیکن وہی دل لگی بعد میں حادثہ بن گئی۔ کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ میرا مذاق تمہیں اتنی شدید اذیت سے دوچار کرنے کو ہے تو میں جان سے گزر کر بھی یہ ستم نہ ہونے دیتا۔ سعدیہ! اس دن کے بعد سے میں لمحے لمحے کی موت مرا ہوں۔ میں ہنسنا تک بھول بیٹھا تھا۔ پچھتاوے اور پشیمانی کے گرم جھکڑوں نے میرا تن من جلا ڈالا۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو اپنا مافی الضمیر تم پر ظاہر کر سکوں۔"

سعدیہ نے درمیان میں کچھ بولنا چاہا مگر فاخر نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ خود بولتا رہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ دھوکا یا فریب کیا ہوتا ہے؟ فطرت کس چڑیا کا نام ہے؟ میرے خمیر میں بے نوائی تو ہو سکتی ہے، بے وفائی نہیں۔ کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہوگی۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ تمہاری ذات سے عشق ہے...... تم کو چھو کر گزرنے والی ہوا سے عشق ہے...... تم میرے لیے وہ خوشبو ہو جو جسم و جاں کی بقا کے لیے لازم ہے۔ تم سے خدانخواستہ بچھڑ جانا میرے لیے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لینے کے مترادف ہے۔ وقت سے پہلے میں تم سے اور بہت ساری اپنے دل کی باتیں کرنے سے گریزاں تھا تو اس کا کچھ سبب تھا اور ہے جو انشاءاللہ زندگی بخیر، ایک دن ضرور آئے گا جب میں کھل کر بتاؤں گا۔ لیکن آج میں خود کو اس اظہار کے لیے مجبور پا رہا ہوں۔ اس لیے تھوڑی سی کیفیت اپنے قلب و جگر کی تم سے بیان کر رہا ہوں...... میرا مقصد تمہیں اپنی جانب سے اطمینان دلانا ہے تاکہ تم......"

وہ ذرا کی ذرا رکا۔ جھک کر بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اب پھر اس کے لہجے میں اس کی فطری شوخی سمٹ آئی۔ آنکھوں میں شرارت ناچنے لگی۔

"تم...... گھر جا کر بے ہوش نہ ہو جانا......"

سعدیہ جو اس کی انہونی باتیں سن کر گم صم بیٹھی تھی، اس کے پٹڑی بدلتے ہی چونک پڑی۔ مسکرا کر بولی۔

"آخر آگئے نا اپنی اوقات پر۔"

یہ کہتے ہوئے اپنی فائل اٹھا کر فاخر کو دے ماری۔ فاخر نے فائل کیچ کر کے گھاس پر ڈال دی اور بیلے کی چند موٹی موٹی کلیاں توڑ کر اس کی طرف اچھال دیں جو ساری کی ساری سعدیہ کی گود میں گریں جنہیں وہ دونوں ہاتھوں کی اوک میں بھر کر خوشبو کشید کرتے ہوئے سرشار سی ہو گئی۔ فاخر نے گہری نظر سے اس کی کیفیت نوٹ کرتے ہوئے چہک کر شعر پڑھا۔

"نذر کرتا رہا میں پھول سے جذبات اسے
جس نے پتھر کے کھلونے سے مجھے بہلایا"

"اچھا......!" سعدیہ نے ترچھی نظروں سے گھورا۔ "اٹ شٹ شعر پڑھ پڑھ کر خود ہی خوش ہوتے رہتے ہیں۔ بھلا کس نے آپ کو پتھر کے کھلونے سے بہلایا؟ اور آپ نے پھول کے نذر کیے؟"

فاخر نے شوخی سے اس کے آنچل اور ہاتھوں کو تاکا جہاں پھول مہک رہے تھے۔ دونوں ایک

ساتھ ہنس پڑے۔

"سعدیہ! آخری پیپر کے دن جو میں نے تمہارا دل دکھایا، تم نے مجھے معاف کر دیا نا؟" فاخر نے سرگوشی میں دریافت کیا۔

"جائیے، آج آخری ملاقات کے صدقے میں نے آپ کو معاف کیا۔" اس نے بڑے شاہانہ انداز میں جواب دیا۔ "معاف کیا میں نے آپ کو...... بلکہ...... سات خون معاف۔"

"لیکن!" فاخر نے فوراً ٹوکا۔ "آخری ملاقات مت کہو۔"

"بہت خوب۔" وہ روہانسی ہو کر ہنسی۔ "آپ کے خیال میں گنجائش باقی ہے؟"

"سو فیصد۔" وہ مستحکم لہجے میں بولا۔ "بہرصورت امید بہار رکھ۔"

"دیکھیں گے۔" سعدیہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ پھر فکرمندی سے پوچھا۔ "میری بات درمیان میں رہ گئی۔ میں پوچھتی ہوں بیمار ہو گئے تھے کیا؟"

"جی نہیں۔" اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

"تو پھر...... ایسے ڈبلے ڈبلے کیوں لگ رہے ہیں؟"

"غلط...... قطعی غلط۔" وہ اسی انداز میں بولا۔ "اپنی نظر ٹیسٹ کراؤ۔"

سعدیہ کا لہجہ شاکی ہو گیا۔ "میں دیکھ رہی ہوں آپ برابر میری ہر بات رد کیے جا رہے ہیں۔ کم سے کم آج کے دن ایسا تغافل برتنا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے۔ بقول شاعر

اپنے خوابوں کو کہیں چھوڑ کے بچھڑنے والے
کس کو معلوم ہے پھر کون کدھر جائے گا"

فاخر تڑپ کر بولا۔

"بہت بزرگی بگھارنے لگی ہو۔ عقل میں بھی ہر بار یوں کو خوب دیمک لگی ہے۔ نہ کوئی کہیں جا رہا ہے اور نہ ہی خدانخواستہ بچھڑ رہا ہے۔ بھلائی کی امید رکھنی چاہیے۔ باقی رہا تمہارا سوال کہ میں کمزور ہو گیا ہوں تو مودبانہ گزارش ہے کہ میں بفضل خدا بخیر و عافیت ہوں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ کمزور و لاغر میں فقط آپ جناب اور برادرم فرحت صدیقی کو ضرور نظر آیا ہوں۔ اس "اطلاع" کا شکریہ۔ والسلام...... فلاں ابن فلاں۔"

سعدیہ اسے خالی خالی نظروں سے بیٹھی دیکھتی رہی۔ وقت بہت کم تھا۔ بچھڑنا تو بہرحال تھا ہی!

گئے دنوں کے تعاقب میں تتلیوں کی طرح
ترے خیال کے ہمراہ کر رہی ہوں سفر
میں سوچتی تھی ترا قرب کچھ سکوں دے گا
اداسیاں ہیں کہ کچھ اور بڑھ گئیں مل کر

※●※

جونہی سعدیہ گھر میں داخل ہوئی اس کی پہلی نظر دادی صغریٰ پر پڑی جو سامنے برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی چھالیاں کتر رہی تھیں۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے نظر بھر کر اسے تاڑا اور اس سے قبل کہ وہ چپکے سے کمرے میں جا گھستی انہوں نے بڑے دلار سے اسے پکارا۔

"بی بیا!...... ادھر آؤ بیٹا!"

"جی دادی جان؟" اس نے مستعدی سے جواب دیا اور ان کے قریب آ بیٹھی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

دادی نے چھالیا کترنا چھوڑی۔ دائیں ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کر اس کا پورا چہرہ اوپر اٹھایا اور انگوٹھے سے مسل کر بہ غور پیشانی کے سیاہ نشان کا معائنہ کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے مشاہدے کے بعد ان کی سوچ میں ڈوبی آواز ابھری۔

"مٹ سکتا ہے...... بالکل مٹ سکتا ہے۔ اس میں چنداں مشکل نہیں۔" اس اعلان کے ساتھ ہی سارا گھر ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

صحن کے کونے میں بیٹھی کپڑے دھوتی امی جان تیزی سے ہاتھ پونچھتی ان کی طرف آئیں۔

"اے ہائے اماں! یہ تو آپ نے بہت اچھی خبر سنائی۔ اگر کوئی ایسی ترکیب ہو جائے تو میرا آزار دور جاتا رہے۔ اللہ جانتا ہے میں نگاہ بھر کے اس کی صورت ہی نہیں دیکھتی۔ دل ہولنے لگتا ہے۔"

"اب ایسی کوئی ہولنے والی بات بھی نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولیں۔ "وہ تو مجھے اتنے دنوں سے دھیان نہیں آیا۔ ورنہ یہ گوڑ مارا نشان رہتا نہ نشان کا باپ۔ نہ ہی تم نے اس سے پہلے ذکر کیا۔ بہت دنوں سے تو میرا آنا بھی نہیں ہو رہا تھا۔ خیر...... دیر آید، درست آید۔ اب اللہ تمہارا بھلا کرے تم یوں کرو۔" انہوں نے نہایت حکیمانہ انداز میں کہا۔ "تھوڑی سی ہلکوی لے کر اسے خوب مہین مہین پیس لو۔ ایک ذرا سی ہلدی بھی ساتھ ملا لینا۔ پھر صبح ایک دن میں یہ آمیزہ اس نشان پر لگاؤ۔ اس کے علاوہ دوسرا کام یہ کرو کہ ایک دیگچی میں خوب پانی کھولاؤ۔ اس کھولتے ہوئے پانی پر موٹی چادر اوڑھ کر خوب بھپارا لو بعد ازاں روئی کے پھائے سے آہستگی سے اس نشان کو چھیڑتے رہنا ہے۔ رفتہ رفتہ......"

ان کی ترکیب جاری و ساری تھی کہ سعدیہ پیچھے سے کھسک لی۔ باورچی خانے میں نازیہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ سعدیہ کو بھی شرمندگی ہوئی تھی۔ دادی کی نظر سے بچ کر باورچی خانے میں پہنچی تو نازیہ کی ہنسی کو اب تک بریک نہیں لگ سکے تھے۔ ایسا کی شکل پر بجنے والے بارہ نے نہلے پہ دہلا کر دیا۔

"کھانا لے کر کیا میں جاؤں یہاں سے؟" امی نے پکار کر کہا۔

"اچھا! باہر دادی ہیں۔" نازیہ نے بے ساختہ جواب دیا۔

سعدیہ بگڑ کر کچھ کہنے کو تھی کہ باہر سے صغریٰ دادی نے اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

"اے بی بیا! کہاں گئیں تم؟ بٹیا! اللہ کی سنوار ہو تم پر۔ ہم پہر بھر سے بیٹھے انتظار میں دیے چھوڑ رہے ہیں اور تو اندر پڑ رہی جا کر!"

سعدیہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ساری رنجش بھول کر گھگھیائی۔ "اب کیا کروں نازیہ! جلدی بول۔ کیسے جان چھڑاؤں ان سے؟"

"میں کیا جانوں؟" نازیہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "امی جان کب سے گلے شکوے لیے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کھول لی اپنی نسخوں کی پٹاری۔ اب تو اللہ میاں بچائیں یا بابا جان بچا سکتے ہیں تمہیں ان کی "ڈاکٹری" سے۔ باقی کس کی مجال ہے بھلا؟"

باہر دادی تھیں کہ آواز پر آواز دیے جاتی تھیں۔ ناچار اسے باہر جانا پڑا۔

"جی دادی جان؟" وہ اُن کے قریب جا کر منمنائی۔ "کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"اے بٹیا! کہنا کیا ہے؟" وہ چھالیہ پھانک کر گویا ہوئیں۔ "اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں کہ تیرا ماتھا کیسے اُجلا کروں؟ ایک تم ہو کہ اندر سو رہیں جا کر۔ تمہارا سارا علاج اور دوا دارو بھی بتا ڈالا

ہم نے۔"

"دادی! میں سوئی نہیں جا کر۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔ "کھانا کھانے کا خیال تھا۔ ابھی آئی ہوں پڑھ کر۔"

"اوئی بچی! یہ تین چار بجے کھانے کا گوڑا کون سا وقت ہے......؟" انہوں نے ایک انگلی پر کتھا، دوسری پر لگا ہوا چونا چاٹ کر کہا۔ "لگتا ہے تمہارا "اسکول" عرش معلیٰ پر بنا ہوا ہے جو اتنی بھری دوپہر میں چھٹی ہوئی۔ تمہارے باپ کے دو کمروں والے اسکول میں تو ماسٹر جی نے گھنٹوں پہلے گھنٹی بجوا دی تھی۔"

"ارے دادی جان! یہ بھی کوئی اسکول ہے؟" سعدیہ نے خود پر سے ان کی توجہ ہٹتی دیکھی تو جلدی سے انہیں باتوں میں لگایا۔ "اب اس اسکول میں محنت اور توجہ سے جب میں پڑھاؤں گی تب دیکھئے گا ہوتا کیا ہے۔"

"ایں...... یہ کیا کہا تم نے؟" دادی کی پھرکی گھوم گئی۔ انہوں نے فوراً چیخ پکار شروع کر دی۔

"اے سعید کی دلہن!" انہوں نے پاٹ دار آواز میں ہانک لگائی۔ "یہ میں کیا سن رہی ہوں؟"

"کیا ہو گیا اماں!...... کیا ہوا؟" دوسری چارپائی پر لیٹی امی جان بڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"سنا تم نے یہ صاحبزادی کیا فرما رہی ہیں؟" دادی نے سخت شکایتی لہجہ اختیار کیا۔ "میں تمہیں پہلے بھی منع کر چکی ہوں کہ اب اس کا پڑھنا لکھنا بند کرا دو۔ بس بہت ہو چکا یہ سب۔ مگر تمہاری ناقص عقل ہے کہ اس میں کچھ آتا ہی نہیں۔ اور اب سن لو کیا کیا ارادے ہیں صاحبزادی کے...... خود پڑھ چکیں تو اب دوسروں کو پڑھائیں گی۔ ان کے دماغوں میں خشکی نہ ہو گی تو کیا ہو گا؟ کھڑے کھڑے چکرا کر گریں گی تو کیا ہو گا...... پھر روتی ہو گی ہائے میری بچی کو کیا ہو گیا...... میں کہتی ہوں سعید کی دلہن! ہوش کے ناخن لو۔ ان کی عمریں اب رشتے ناتے طے ہو جانے کی ہیں یا پڑھنے پڑھانے کی۔ واہ واہ! تم نے خوب آنکھوں پر پٹی ڈالی ہے۔ تم تو یوں لگتا ہے تمہیں بھی نئے زمانے کی ہوا لگ گئی ہے۔"

دادی صغریٰ اپنے جوش و خروش سے بول رہی تھیں کہ ان کی آواز سے دوپہر کا سناٹا گونج رہا تھا۔

امی جان کی نیند ہوا ہو گئی۔

"ارے اماں! آپ تو بہت ہی خفا ہو گئیں۔" وہ جلدی سے ان کے قریب آ بیٹھیں۔

"اے جاؤ۔" وہ مزید بگڑ کر بولیں۔ "بیٹھی آنکھیں بند کر کے بیٹھی ہو۔ یاد رکھنا اتنا ہی پچھتاؤ گی۔ ہر کام کا ایک وقت ہوا کرتا ہے...... اور یہ سارے کام عورتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ مرد بچہ کیا جانے ان سارے دھندوں کو...... خیر...... اب سعید احمد سے کرنی پڑے گی اس موضوع پر بات۔"

"اماں!...... اماں! آج کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" امی واقعی پریشان ہو کر بولیں۔ "سوت نہ کپاس، کوری سی لٹھم لٹھا۔ ابھی کہیں سے معقول رشتہ آیا ہی نہیں تو آخر میں کیا کروں؟ یہی سوچتی ہوں کہ جب خدا کو منظور ہو۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ بیٹھی نصیبوں کو روتی رہو۔" دادی نے جل کر جواب دیا۔ "لیکن...... اتنا پلے میں باندھ رکھو کہ ادھر لڑکی بالی کا سن زیادہ ہوا اور لوگوں نے "مسی کھسی" کہا۔"

"مسی کھسی؟" نازیہ سعدیہ کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھتے رکھتے کھلکھلائی۔ سعدیہ بھی منہ دبا دبا کر ہنسنے لگی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"اچھا! مس کھیسی کسے کہتے ہیں؟ کسی لڑکی کا نام ہے کیا؟" سعید جو منہ دھو کر آیا تھا، ان کے قریب ہی کھڑے ہو کر پوچھنے لگا۔

"چلو بھاگو یہاں سے۔" نوالہ توڑنے سے پہلے سعدیہ نے اسے گھر کا۔

"چلئے مت بتایئے۔ میں دادی سے پوچھ لیتا ہوں۔" وہ نہایت معصومانہ انداز میں کہہ کر دادی صغریٰ کی طرف چل دیا۔

"ادھر آؤ گدھے کہیں کے۔" سعدیہ نے جلدی سے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ لیکن سعدیہ کے سمجھانے سے قبل نازیہ نے وضاحت کر دی۔

"جن لڑکیوں کی عمر بیس سال سے زیادہ ہو جائے، دادی صغریٰ جیسی خواتین انہیں "مس کھیسی" کا خطاب دے ڈالتی ہیں۔"

سعدیہ اسے گھور کر رہ گئی۔

⌘●⌘

"چند کلیاں نشاط کی چن کر
مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں"

فرحت دیر سے یہی گردان سن رہا تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ فاخر غسل خانے میں تھا اور یہ پلنگ پر۔

وہ ابھی ابھی تشریف لایا تھا اور یہ بہت پہلے کا آیا ہوا تھا۔ کھانا بھی کھا چکا تھا اور اب اونگھتے پنکھے سے فیض یاب ہوتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ فاخر کی نغمہ سرائی سر بکھیرنے لگی۔ فرحت نے کڑھنا شروع کر دیا۔

فاخر نے غسل خانے سے نکلتے ہی پورا پنکھا اپنی طرف موڑ لیا۔

"رخ ادھر کرتا ہے یا نہیں؟" فرحت غرایا۔

"لے بھی لے۔" اس نے جلدی سے پنکھا اس کی طرف پھیر دیا مگر ساتھ خود بھی اس کے پلنگ پر آ بیٹھا۔

"یا خدا! کتنی گرمی ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں زور زور سے سر میں چلا رہا تھا۔ گنگنانا بند کر دیا تھا۔ فرحت نے کچھ جواب نہ دیا، چپ پڑا رہا۔ بڑی دیر تک دونوں کے درمیان خاموشی حائل رہی۔ حتیٰ کہ فرحت سو گیا تو فاخر اکیلا بور ہوتا رہا۔ کرنے کو کوئی کام بھی نہ تھا۔ دماغ طرح طرح کے خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آج سعدیہ سے ملاقات ہونے کے باوجود قلب و نظر نڈھال تھے۔ ساری سہ پہر جی ہی جی میں اس سے کی ہوئی باتوں کی گونج سماعت سے ٹکراتی رہی۔ وہ اس کی گفتگو سے کوئی چندن بات، کوئی میٹھا حرف، کوئی خوشبو جذب، کوئی رس بھرا خوش آہنگ احساس کشید کرتا رہا، روح کی گہرائیوں میں اتارتا رہا۔ لیکن ایک لامتناہی بے چینی خوشی کے ساتھ ساتھ...... کچھ نہ کر سکنے کا سدا بہار دکھ اندر ہی اندر کلیجہ چاٹ رہا تھا۔ ایک خوف پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔

شاید وہ بھی اونگھ ہی گیا تھا کہ فرحت نے جگا دیا۔

شام ہو چلی تھی۔ چاروں طرف مدھم مدھم اندھیرے سرسرا رہے تھے۔ پنکھا بند تھا۔ گرمیوں کا تحفہ

لائٹ جا چکی تھی۔ یہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ فرحت بھی پسینے میں تر بتر تھا۔ حبس اور گرمی سے برا حال۔

تالا بند کر کے دونوں کمرے سے نکل بھاگے۔

سب سے پہلے انہوں نے نزدیک دکان سے ٹھنڈی دہی کی میٹھی لسی پی، پھر ٹہلتے ہوئے آ کر پارک میں بیٹھ گئے۔

پارک کی کھلی فضا میں انہیں سکون کا احساس ہوا۔ فرحت کا موڈ خود بخود بحال ہو چکا تھا۔ اطمینان کا سانس لیتے ہی اس نے زبان کھولی اور سنجیدگی سے بولا۔

"فاخر! میرے خیال میں اب وہ وقت آ چکا ہے کہ ہم یہ کمرہ خالی کر دیں اور سعید صاحب کا شکریہ ادا کر کے ان کا کرایہ بے باق کر دیں۔"

فاخر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سانس رکنے لگا۔

ذرا سی دیر کے لئے تو وہ چپ کا چپ رہ گیا۔ اس سے بولا بھی نہ گیا لیکن فرحت اپنی ہی رو میں کہتا چلا گیا۔ اس کی کیفیت سے بے خبر۔

"اگر ہم عقلمندی سے کام لیتے تو دانو... پہلے ہی یہ کام کر سکتے تھے۔ بیکار میں اتنے دن تک کمرہ بند پڑا رہا اور کرائے میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہم دونوں ہی احمق ہیں۔ بہر حال اب تاخیر سے کام نہیں لینا چاہئے۔"

چند لمحات تھم تھم کے گزرے۔ جیسے اس کے ارادے سہم گئے ہوں۔

جب فاخر کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو فرحت نے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا اور اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہو گیا بھائی؟ کچھ تو بول... میرے لئے کا ہے..."

فاخر نے گہرا سانس کھینچ کر ایک جھرجھری لی اور بینچ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے...... کہاں چل دیئے صاحبزادے؟" فرحت نے بارعب آواز میں ڈانٹا اور ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا لیا۔ "فرار ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو بات ہے یہاں روبرو بیٹھ کر کرو۔ گھبراؤ مت۔"

"یار! کیا بات کروں؟" فاخر نے تھکے ہارے مسافر کی طرح ہتھیار ڈالتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

فرحت نے اس کی ہمت بندھائی اور پچکار کر بولا۔ "نہیں، نہیں...... حوصلہ کیوں ہار رہے ہو؟ جو کچھ دل میں ہے کہہ ڈالو...... خوف اور اندیشہ کس بات کا ہے؟ یوں خاموش رہنے سے کیا حاصل ہو گا؟"

فاخر نے بناوٹی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ "اب میں کیا کہوں؟ سب معلوم تو ہے تمہیں۔ تم واقف حال ہو میرے۔"

"وہ تو خیر درست ہے۔" فرحت نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا، کیا جائے؟ میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ اب تو ہمارا بھی ساتھ چھوٹنے کو ہے۔"

"یار! یوں مت کہہ۔" فاخر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گلوگیر لہجے میں کہا۔ "میرے دل پر چوٹ سی لگتی ہے۔ طبیعت پہلے ہی بہت پریشان ہے۔"

"تو بھیا! اس پریشانی کا حل نکال۔ میرے خیال میں تو لاحاصل پریشانی مول لینا بیکار ہے۔"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو؟"

فاخر نے ایک سانس کھینچ کر کہا۔

"کاش! ایسا کچھ میرے اختیار میں ہوتا۔ میں اپنے آپ سے لڑ کر بے بس اور مجبور ہو چکا ہوں۔ تم اسے لاحاصل کہو، فضول یا بیکار۔ اب تو اسی کے خیال اور اسی کے تذکرے میں سکونِ دل محسوس ہوتا ہے۔"

"چلو تو پھر قصہ ہی تمام ہوا۔" فرحت نے مذاق اڑایا۔ "تم سعید صاحب کے کمرے میں بیٹھے آہیں بھر کر سکونِ دل حاصل کرتے رہنا، بندہ تو کل ہی بستر گول کر جائے گا۔"

"نہیں دوست ایسا غضب مت کرنا۔" فاخر نے گھبرا کر کہا۔ "دیکھا میں بے موت مارا جاؤں گا۔ مجھے اکیلا کرنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"معلوم نہیں کیا کیا اول فول بکتا رہتا ہے۔ اپنی سمجھ سے باہر ہے یہ سب۔" فرحت نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

فاخر نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اس وقت اس کی عقل ٹھکانے نہیں تھی۔ کمرہ چھوڑ دینے کے تصور سے وہ پہلے ہی اکثر ہول کھاتا رہتا تھا۔ اس وقت فرحت کی باتوں نے مزید اسے اندیشے میں مبتلا کر ڈالا تھا۔ آج کے دن سعدیہ سے رخصت ہونے کے بعد سے وہ فرحت کے ساتھ بہت ساری باتیں کرنا چاہ رہا تھا تاکہ جی کا غبار بھی نکلے اور زندگی کی موجودہ الجھن کا کوئی مناسب حل بھی ہاتھ آ سکے۔ لیکن فرحت نے تو رختِ سفر باندھنے کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ فاخر کی آئی عقل بھی جاتی رہی۔

جب وہ بہت دیر تک نہ بولا تو فرحت نے دوبارہ زبان کھولی۔

"فاخر! میں تمہیں کھل کر بتا دوں کہ مجھے تم سے کام لینا ہے۔ ہم اور تم رزلٹ آنے تک تو ہم لوگ فارغ ہیں۔ اب سعید صاحب کے کمرے میں پڑے رہنا پیسے اور وقت کا زیاں ہے۔ اگر ہوسٹل میں ہوتے تب بھی تو اپنے اپنے گھروں کی طرف کوچ کرنا پڑتا۔ مانتا ہوں کہ دل کی لگی بری ہوتی ہے لیکن...... کلاس ختم...... یہ عورتوں کی کہانی ہے، آخر کار بیشتر یہی کہانی بار بار دہرائی جاتی ہے۔ تم بھی اسے جان کر بھول جاؤ۔"

"فرحت!" فاخر کے لہجے میں کرب تھا۔ "افسوس کہ تم مجھے سمجھ نہیں پائے یا پھر سمجھنا نہیں چاہتے۔ اتنے دنوں کے ساتھ میں، میں اور تم بارہا اس موضوع کو دوہرا چکے ہیں۔ میرا خیال ہے تم نے میرا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ کیا تمہیں میرے جذبوں کی سچائی پر یقین نہیں آیا؟" فاخر نے بےچارگی بھرے انداز میں کہا۔

"تم کو تم سے زیادہ جان چکا ہوں۔ مگر تمہیں یاد ہوگا کہ تمہارے خیالات کی مخالفت بھی میں نے ہی کی تھی۔ اور بھرپور طریقے سے تمہیں ان لاحاصل راہوں کا راہی بننے سے منع کیا تھا۔ سنجیدہ ہو کر بھی اور غیر سنجیدگی سے بھی۔ بسا اوقات تمہیں کھلے الفاظ میں اور لڑ جھگڑ کر بھی سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ تم یقیناً اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے لیکن تم شروع سے ہی میرے سمجھانے کی نفی کرتے رہے۔ اب بھی یہ تو دانا کہہ گئے کہ اپنے کیے کا کچھ علاج ہی نہیں۔ سو تمہیں بھی صبر و برداشت سے کام لینا چاہیے۔"

فاخر نے اس کی طویل سچائی غیر معمولی تحمل سے سنی، بھی، غور کیا اور اسے تسلیم بھی کر لیا مگر نتیجتاً

انداز میں گویا ہوا۔

"تم...... یہ بھی تو کہا کرتے تھے کہ...... اگر تم نے سعید صاحب کی صاحبزادی کو دھوکا دینے کی کوشش کی تو...... تمہارا سر توڑ دوں گا...... گردن مروڑ دوں گا۔"

فرحت کو اس کے انداز پر ہنسی آ گئی مگر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اب یہ تو معلوم نہیں کہ تم مجھے اپنی گردن مروڑ دینے اور سر توڑ دینے کی ترغیب دے رہے ہو یا یہ کسی خاص بات کی تمہید ہے۔ تاہم تمہاری بات کا بھی تسلی بخش جواب حاضر ہے۔ اس جواب میں تمہارے پچھلے سوال کا جواب موجود ہے۔ گردن مروڑ دینے کی دھمکی میں اس زمانے کے آغاز میں دیا کرتا تھا جب پہلے پہل مجھ پر انکشاف ہوا کہ تم سعدیہ میں انٹرسٹڈ ہو۔ ظاہر ہے میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ ایک شریف انسان، جن سے ہم واقف بھی ہیں اور ان کے کرایہ دار بھی ہیں، ان کی صاحبزادی کے احساسات سے تم کھیلو، اسے فریب دو۔ پھر جوں جوں وقت گزرا، میں نے تمہیں اس معاملے میں سنجیدہ اور کسی حد تک سچا دیکھا تو رفتہ رفتہ یہ دھمکی دینا چھوڑ دی۔"

فاخر کی آنکھیں اس کے دلی احساسات کی غماز بن گئیں اور ہیرے کی کنی بن کر دمکنے لگیں۔ بچوں کی طرح چہک کر بولا۔

"اور...... اب اسی زبان سے تم صبر کر لینے کی تلقین کرنے لگے۔ کیوں؟...... آخر کیوں؟ یہ کیسا حق دوستی ہے؟ اور کچھ نہیں تو کمرہ چھوڑ دینے کی دھمکیوں پر اتر آئے۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ سب میرے لیے ناممکن ہے؟ ابھی تم نے کہا، رفتہ رفتہ تم نے مجھے "کسی حد تک" سچا پایا۔ "کسی حد تک" مت کہو فرحت! میری سچائیوں سے...... مجھ پر بڑا ظلم ہوگا۔ ستم ہوگا۔"

"یار! بات طول کھینچتی جا رہی ہے۔" فرحت نے پھر بند باندھا اور ٹوک دیا۔ "مان لیا۔ مان لیا سرکار کہ آپ ہر طرح سے سچے ہیں بلکہ سچوں کے بادشاہ ہیں۔ مگر اس سچ سے نمٹنے کا کوئی حل بھی تو ہوگا؟"

"اسی لیے تو میں تم سے مشورہ کرنا چاہ رہا تھا۔" فاخر جلدی سے بولا۔ "تم نے یکایک ہی کوچ کا نقارہ بجا دیا۔ ظاہر ہے میری پریشانی دوچند ہوئی ہے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ سعید صاحب کا کمرہ تو چھوڑنا ہے۔ کب تک بے سبب پڑے رہیں گے۔ لیکن ذرا تھمو۔ دو سانس لینے دو۔ ذہنی طور پر آمادہ ہو لینے دو۔ تمہیں یاد ہوگا گزشتہ شام میں نے کہا تھا کہ کل تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ تم نے سوچا کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟"

فرحت جو اس کی بات پہ غور کر رہا تھا، منہ بنا کر بولا۔

"سوچنے یا غور و فکر کرنے کی کیا بات ہے جو میں سوچوں۔ ظاہر ہے تم تو وہی کہتے ہو مرغے کی ایک ٹانگ کہ فرحت! خدا کے واسطے مجھے سعید صاحب کے در دولت سے محروم مت کر دینا۔"

"نہیں...... اس کے علاوہ کوئی بات ہے۔" فاخر نے سر ہلا کر کہا۔ "تم جتنا بھی مذاق اڑا لو، میں برا ماننے کی حس گنوا بیٹھا ہوں۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ کوئی آخری فیصلہ کیا پھر جلدی جلدی بولنے لگا۔

"بات یہ ہے فرحت! کہ گھر میں تو میں زندگی کا قیمتی ترین راز آؤٹ کر کے دیکھ چکا ہوں۔ اماں کا پارا آسمانوں تک پہنچ گیا۔ ہمشیرہ نے تھوڑی سی ہامی بھری ہے انہیں ہموار کرنے کی لیکن...... حقیقت یہ ہے کہ حالات سازگار نہیں ہیں۔ اس طرف سے تو میں بہت دل برداشتہ ہو کر آیا ہوں۔"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"مہمان!....... ہاں، حمید بھی تو کہہ رہا تھا۔"

"وہ....... الّو کی دُم۔" فرحت کو پہلی مرتبہ غصہ آیا۔ "یوں شرما رہا تھا خبیث جیسے اسی کی سگائی ہو رہی ہو۔"

"لیکن فرحت! مجھے تو سعدیہ نے کل ایک لفظ تک نہیں بتایا اس بارے میں۔ یہ کیسی پردہ داری ہے یا بے خبری ہے؟" فاخر کی حیرت کسی طور کم نہ ہو رہی تھی۔

"بھئی کیا بھروسہ ان لڑکیوں کا۔ کہیں کچھ، کریں کچھ۔" فرحت نے منہ بنا کر جواب دیا۔ اس وقت وہ بہت کبیدہ خاطر ہو گیا تھا۔ فاخر اس کی صورت دیکھ کر رہ گیا، بولا کچھ نہیں۔ دل میں سعدیہ سے شکوہ تھا۔

ذکر کرتے ہیں ترا مجھ سے بعنوانِ جفا
چارہ گر پھول پرو لائے ہیں تلواروں میں

بے اختیار آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

باورچی خانے کے باہر قریبی کیاری کے برابر سل رکھی ہوئی تھی۔ نازیہ سل کے قریب بیٹھی چھوٹی چھوٹی امیاں چھیل رہی تھی۔ ہاتھ برق رفتاری سے حرکت میں تھے مگر کان برابر کسی کی سن گن میں لگے تھے۔ ہونٹوں پر شرمیلی سی میٹھی مسکان چمک رہی تھی جیسے بیلے کی کلیاں آمدِ بہار کے استقبالیہ گیت کی منتظر ہوں۔ باورچی خانے کے اندر جلتے چولہے کے سامنے بیٹھی سعدیہ کسی سوچ میں گم تھی۔ آج ارہر کی دال اور چاول پکانا اس کے ذمے تھا۔ اندر کمرے میں دادی صغریٰ، امی جان اور بابا جان میں چپکے چپکے باتیں چل رہی تھیں۔ گاہے گاہے سعدیہ گردن بڑھا کر دیکھتی تو اس کی نگاہ سیدھی نازیہ کے مسکراتے چہرے پر جا ٹکتی۔

"کاش! میں بھی نازیہ کی طرح وقت سے پہلے کوئی روگ نہ پالنے والی بے خبر اور ایک جذبۂ لاحاصل سے لاعلم لڑکی ہوتی۔ تب میری روح، میرا دماغ کتنا ہلکا پھلکا ہوتا۔ زندگی کتنی سہل ہوتی۔ بے خبری بھی شاید ایک نعمت ہے۔"

وہ اس کی خوبصورت مسکراہٹ دیکھ دیکھ کر سوچے جا رہی تھی۔ چاول دم پر رکھ کر اس نے لہسن کے جوے چھیلے اور دال بگھار دی۔ رات کے کھانے کی بچی ہوئی بیسن کی بھجیا گرم کر کے رکھی۔ دادی کے لیے دو پھلکے ڈال کر دسترخوان میں دبا کر رکھ لیے۔ باہر نازیہ بھی چٹنی کو آخری مرحلے میں لے آئی تھی۔ فضا میں ہرے پودینے اور کچی کیریوں کی اشتہا انگیز خوشبو دال چاول کے بگھار سے مل کر گندھ ہو رہی تھی۔ امی جان تیزی سے چلتی ہوئی آئیں اور پوچھتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئیں۔

"چٹنی میں سفید زیرہ نہیں لیا بیٹی؟"

"جی امی جان!" نازیہ نے سل پونچھتے ہوئے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"سعدیہ! دسترخوان لگاؤ۔ تمہارے بابا اور دادی کو بہت بھوک لگی ہے۔" انہوں نے دونوں ہانڈیاں چیک کیں اور واپس چلی گئیں۔ مسلسل باتیں کر کر کے بھی دادی صغریٰ کا موضوعِ گفتگو بدل نہ سکا تھا۔ انہوں نے کھانے کے دوران بھی وہی سلسلہ جاری رکھا۔

"یہ تو مثل مشہور ہے کہ لڑکی والے کا گھر بھی خالی، پیٹ بھی خالی۔ لیکن اگر مناسب وقت پر لڑکیوں کے لیے مناسب بر نصیب ہو جائیں تو یہ بڑے مقدر کی بات ہے۔ اول تو تم نے پڑھانے پڑھانے میں منوں پیسہ اُٹھا دیا۔ دوسرے اب وقت تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔ ہر چیز کے دام مول ہو رہے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں مولا نے میری دعائیں قبول فرمائیں جو ایسے بڑھیا رشتے اپنی جناب سے بھیج ڈالے۔ واہ، واہ! کیا خوبی کی بات ہے کہ دونوں لڑکے سگے بھائی اور یہاں ہماری لڑکیاں سگی بہنیں۔ کنبہ ان کا بڑا ہے تو یہ بات اور بھی اچھی ہے۔ لڑکی تو بھرے گھر میں جا کر ہی سجتی ہے۔ ایسا بھی کیا گھرانا کہ کوئی بات کرنے والا ہی نہ ہو۔ اکیلے دُکھ سُکھ سہتے رہو۔ جہاں چار بندے ہوتے ہیں

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فرحت متحیر ہو کر بے یقینی سے اسے گھورنے لگا۔

"بھائی! اس طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے؟" فاخر نے سادگی سے پوچھا۔ "تو کیا سمجھا تھا میں واقعی سعدیہ سے فلرٹ کر رہا تھا؟ اسے بے وقوف بنا کر چھوڑ دینے کا ارادہ تھا میرا؟ نہیں بھائی! نہ میں غلط تھا، نہ ہوں اور نہ ہی کبھی اس کے حق میں کسی بھی دھوکا دہی کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ میرے حساب سے تو بہت وقت ضائع ہوا ہے۔ مجھے پچھلے برس ہی اماں کو رشتے کے لیے سعید صاحب کے ہاں لا بٹھانا چاہیے تھا جیسا کہ میں سعدیہ کو روزِ اول سے پسند کرتا آیا ہوں مگر......" اچانک فاخر اپنی جگہ سے اٹھا اور گھاس پر فرحت کے روبرو بیٹھ گیا۔

"فرحت......!" اس نے پہلے دن کی طرح اس کے گھٹنے پکڑ لیے۔ "مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے فرحت! میں اپنے گھر والوں سے قطعی مایوس ہوں۔ میں جانتا ہوں اس معاملے میں اماں بے بس ہیں۔ ہم دونوں بھائی بچپن سے ہی اپنے بڑے ابا کی صاحبزادیوں سے منسوب ہیں۔ بھائی صاحب کی شادی کو تو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ صاحبِ اولاد ہیں وہ...... بھابی جب میرے ارادے سے آگاہ ہوں گی تو ایک کہرام مچا دیں گی۔ طوفان کھڑا کر دیں گی۔ ان کی چھوٹی بہن کا معاملہ ہے۔ اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ میں شروع سے ہی کس الجھن کا شکار رہا ہوں۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں نے قصداً کچھ نہیں کیا۔ سب کچھ از خود ہوا ہے۔ میں نے ان کی [illegible] کو اگنور کیا نہ سعدیہ کو ورغلانا چاہا۔ ہر جگہ مجبور و بے بس ہوں۔"

"چلو چھٹی ہوئی۔" فرحت نے [illegible] لمبا سا سانس لے کر تبصرہ کیا۔ "والدین کا کیا ہوا فیصلہ بھی رد کر رہے ہیں۔ بھاوج کی بہن [illegible] اتنی کھلی کھلی واردات کر لیں اور اب بھی دعویٰ ہے پارسائی کا۔ یعنی آپ بے بس ہیں، مجبور ہیں [illegible] کسی کو اگنور بھی نہیں کیا اور کسی کو ارادتاً بھی نہیں چاہا [illegible] پاؤں رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ تو گھر سے بھی پٹے گا اور سعید صاحب سے بھی جوتے کھائے گا۔ غضب خدا کا، پیچھے رحم [illegible]۔ اتنی لمبی داڑھی تیرے پیٹ میں رہی اور مجھے کبھی ہوا تک نہ لگنے دی اور آج سنائی تو تیز کام چلا دی۔ [illegible] بھی [illegible]"

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

"تو گالیاں بھی دے تو سن لوں گا۔" فاخر نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ "لیکن میرا ساتھ نہ چھوڑ۔ بس میرے کہنے سے خالہ بی کو سعید صاحب کے گھر میری خاطر ضرور بھیج دے۔ ساری زندگی تجھے اور تیری والی "بجیا" کو دعائیں دوں گا۔"

"اوہو......" فرحت بھڑک کر بولا۔ اسے اپنا دکھ یاد آ گیا۔ "اب اپنی غرض کے لیے "بجیا" کی یاد آ گئی۔ خود تو "اپیا" کے شاعر بنے ہوئے ہیں اور میں ابھی "شہ پارے" کا نام تک نہیں معلوم۔"

"ہاں، یہ تو حقیقت ہے۔" فاخر نے فوراً اعتراف کیا۔ "لیکن اس میں میری بے حسی اور بے خبری کے ساتھ تمہاری عدم دلچسپی کو بھی دخل ہے۔ ہمیشہ میرے پیچھے ہی لٹھ لیے پھرتے ہو۔ اپنے لیے منہ سے آج پھوٹے۔"

"خیر...... جانے دے۔ یہ تو ایک اضافی ذکر آ گیا۔ تو اپنی فکر کر۔" فرحت اٹھتے ہوئے بولا۔ "اب آج تو نے ایسی فرمائش کر ڈالی ہے کہ مجھے آزمائش میں ڈال دیا۔ خیر چلو، پہلے پیٹ پوجا پھر دیکھیں گے کام دوجا۔"

فاخر اسے امید بھری نگاہوں سے دیکھتا ساتھ چل دیا۔

خاصی رات گئے دونوں سڑک گشت کرتے ہوئے گھر کی طرف چلے تو فرحت نے کہا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ کمرہ فی الحال نہیں چھوڑتے۔ کل اپنے گھر چل دیں گے۔ میں اماں کو تیرا پیغام ڈالنے کے لیے امید ہے تیار کر لوں گا۔ انشاء اللہ ہفتے عشرے میں یہیں اپنے کمرے میں بقیہ باتیں کریں گے۔"

فاخر فرطِ مسرت سے اس سے لپٹ گیا۔

⌘●⌘

اگلی صبح گھر جانے سے قبل یہ دونوں تالے کی چابی دینے کے لیے رُکے۔ فرحت نے دروازہ بجایا۔ فوراً حمید کی شکل نظر آئی۔ خوب اُجلے کپڑے پہنے، آڑی مانگ نکالے۔ آنکھوں میں بھر بھر سلائی سرمہ چمک رہا تھا۔ ان دونوں پر نگاہ پڑتے ہی دانت نکال کر گویا ہوا۔

"لائیے چابی مجھے دے دیجئے بھائی جان! ابا جان تو بہت مصروف ہیں۔ وہ...... اپیا اور بجیا کے رشتے طے ہو رہے ہیں نا۔ کئی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو......"

ان دونوں کی بے انتہا ہونق شکلیں دیکھ کر اس کا آدھا جملہ منہ میں ہی رہ گیا۔

"حمید بھائی! اپیا بلا رہی ہیں۔" [illegible] بہن نے آ کر حمید کو اپیا کا پیغام دیا تو وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر مڑنے لگا۔

فاخر کے سر پر کسی نے جیسے [illegible] آسمان اور زمین کی گردش تھم گئی۔ چند لمحوں کے لیے وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ شاید دل کا [illegible] سے اس کا [illegible] ٹوٹ چکا تھا۔

"فرحت!" اس نے جیسے ڈوبتے ہوئے تنکے کا سہارا لیا ہو۔ آواز میں بے پناہ کرب تھا، التجا تھی۔ دکھ کے [illegible] محسوس ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی تو فرحت کی بھی گم ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں [illegible] تھے۔ حمید چابی لے کر جا چکا تھا۔

پھر فرحت نے ہی ہوش بحال کیے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تنگ گلی میں گھس گیا۔ مبادا کوئی دیکھ لے یا سن لے تو سعید صاحب کی شرافت پر تو دھبا آ جاتا۔ فی الحال چابی کا تقاضا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دونوں ایک نزدیکی ہوٹل میں جا بیٹھے۔ نکلے تو گھر جانے کے لیے تھے مگر...... فاخر...... فرحت اس کی کیفیت سے ڈر سا گیا تھا۔

وہ دونوں کافی دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ فرحت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ فاخر کا تقاضا تھا کہ واپس اپنے کمرے میں چلو۔ وہ حالات کے نئے رُخ کا قریب سے مشاہدہ کرنے پر بضد تھا۔ جبکہ فرحت کا خیال تھا کہ اب کوچۂ جاناں کی آوارہ گردی فضول اور لاحاصل تھی۔ وہ بڑی لجاجت اور خوشامد سے اصرار کرنے لگا۔

"فرحت! ایک دفعہ چلا چل! وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ یہاں ہوٹل کے ماحول میں تو اور بھی زیادہ وحشت ہو رہی ہے۔ پھر بعد میں تو بے شک گھر چلے جانا۔ دماغ بے کار ہو رہا ہے میرا۔ سفر کرنے کا حوصلہ نہیں رہا آج۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" فرحت نے معقول جواب دیا۔ "مگر ابھی چابی لوٹائی، ابھی پھر مانگنے چلا جاؤں یہ اچھا نہیں لگ رہا۔ معلوم نہیں کون ہوگا، کتنے مہمان آئے ہوں گے۔ سعید صاحب کیا خیال کریں گے۔" فاخر کے چوٹ کھائے ہوئے جگر سے لہو ٹپکنے لگا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

وہاں رونقیں بھی ہوتی ہیں۔ بس تم اللہ کا نام لو اور جلدی جلدی رسم کر ڈالو۔ دو مہینے پیچھے شادی۔ بیاہ ور خصتی سب کر ڈالنا۔ اللہ اللہ اور خیر صلا۔ دو فرضوں سے بری ہو جاؤ گے۔'' دادی اماں اپنی ہی بولی میں بولتی چلی گئیں۔ نازیہ اور سعدیہ اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا لے کب کی باورچی خانے میں جا گھسی تھیں۔ سعید احمد نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

''بس اماں! میرے ذہن میں تھوڑا سا یہ خیال رکاوٹ ڈال رہا تھا کہ کاش لڑکے تعلیمی قابلیت کے لحاظ سے اتنے کمزور نہ ہوتے تو بہت اچھا ہوتا۔ تعلیم انسانی ذہنوں کو جو شعور اور جلا بخشتی ہے وہ کچھ دوسری ہی کیفیت ہوتی ہے۔ یوں تو آگے بچیوں کے نصیب۔''

دادی کو پلیٹ چاٹتے چاٹتے طرارہ سا آ گیا۔

''اے، میں کہتی ہوں تمہاری یہ خالی خولی کتابیں کا بیاں، روٹی کپڑا اور گہنے نہیں بن سکتیں۔ لڑکے زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں تو کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ یہ دیکھو کہ وہ کہاں کس قدر رہے ہیں۔ کتنا بڑا ہوٹل ہے ان کا۔ ایک نے پورا چائے خانہ سنبھال رکھا ہے تو دوسرے کی اسی ہوٹل میں دودھ دہی کی بھی سجائی دکان ہے۔ تجھے پلے پلائے سانڈوں کے سے موٹے تازے لڑکے اور پھر......'' دادی نے جھوٹے برتن اپنے سامنے سے ہٹانے اور حمید کو پاندان لانے کا حکم دے کر بات پوری کی۔

''مجھے سب میں قابل اطمینان بات لگی ہے کہ وہ کسی بھی لے جوڑے جہیز کی تمنائی نہیں ہے۔ وہ صاف سب کے بیچ کہہ گئی ہے اے وہ تو بہت منگنی پٹ بیاہ کے حق میں ہے۔ وہ تو میں نے بچے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیا۔ اللہ نے ان کو بہت دیا ہے۔ اس معاملے میں وہ لوگ بہت صاف نیت ہیں۔ تمہیں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ یہ گھڑی آئی ہے کہ گھر بیٹھے مولا نے مراد پوری کی۔ ایک کے بجائے دو بچیوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاؤ گے۔ تم کہو تو میں کل ہی رضامندی دے دیتی ہوں۔ پھر رسم کی تاریخ بھی طے ہو جائے گی۔''

امی جان بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ بابا جان نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ دادی نے بالآخر پالا مار ہی لیا تھا۔

نازیہ ابھی سے سوکھے ہوئے کپڑے اتار کر تہہ کرنے میں مصروف تھی۔ سعدیہ جھوٹے برتنوں کے ڈھیر کے سامنے بیٹھے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس پر سے قیامت بیت گئی تھی۔ سینے میں بائیں طرف مدھم لے پر سسراتی دھڑکنیں رو رو کر بین کر رہی تھیں جنہیں کوئی سننے والا تھا نہ سمجھنے والا۔ کے حال دل سناتی؟

میں جوگن میں دیوانی لوگو!
میری ایک کہانی لوگو!
چھوڑ کے محل کھڑا ویں پیتیں
چل دی یوں مستانی لوگو!
میری آنکھ کے جل تھل جیسا
کب دریا میں پانی لوگو!

ﷺ●ﷺ

آنکھ کھل جاتی ہے جب رات کو سوتے سوتے
کتنی سونی نظر آتی ہے گزرگاہ حیات

ذہن و وجدان میں یوں فاصلے تن جاتے ہیں
شام کی بات بھی لگتی ہے بہت دور کی بات

اپنے گڈمڈ خیالات سے لڑتا جھگڑتا سوتو وہ سرِ شام ہی گیا یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ اس کے پراگندہ احساسات پر غفلت سی طاری ہو گئی تھی مگر پھر ایک جھٹکے سے بیدار بھی ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ خالی الذہن رہا۔ وہ کہاں ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ کون ہے؟ کچھ یاد نہ آ سکا۔ اس کے تئیں سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ کوئی جھنجھٹ، کوئی مسئلہ، کوئی سوال کچھ نہ تھا۔

اچانک کہیں قریب ہی سے لڑکیوں بالیوں کے گانے اور ہنسنے بولنے کی بہت ساری ملی جلی آوازیں ابھریں۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ قریب ہی دوسرے پلنگ پر فرحت بے خبر سو رہا تھا۔

آہستہ آہستہ سوچنے سمجھنے کی حس بیدار ہوئی۔ منتشر سوچیں یکجا ہونے لگیں تو ذہن قدرے ہوشیار ہوا۔ احساس جاگا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے اور زندہ سلامت ہے۔ تھرماس سے نکال کر دو تین گلاس ٹھنڈے پانی کے چڑھا گیا پھر رومال سے پسینہ خشک کرتا ہوا باہر گلی میں نکل آیا۔

سعید صاحب کی طرف کا گیٹ بند اور پورا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہیں بھی زندگی کے آثار نہ دکھائی دیے۔ گیتوں کی آواز رہ رہ کر کہیں دور سے آ رہی تھی۔ ڈھولک کی مدھم تھاپ پر شاید کوئی تھرک رہا تھا۔ تاخیر کافی دیر کان لگائے سنتا رہا مگر کچھ کا قرار لٹ چکا تھا۔ کچھ کھو دینے کا شدید احساس دل میں پھانس بن کر اٹھ رہا تھا۔ اپنے کچھ بھی نہ کر سکنے کا ملال مسلسل بچھو کی طرح ڈنک مار رہا تھا۔ بار بار دیوانہ وار یہ خیال ستا رہا تھا کہ دوڑتا ہوا جائے اور سعید صاحب کی چوکھٹ پر دم دے دے۔ کواڑوں سے سر ٹکرا کر سوچ اور احساسِ محرومی سے بیگانہ ہو جائے۔

رات کی تاریکی، سناٹا، خاموشی اور تنہائی میں اسی ایک خیال نے دل و دماغ کا محاصرہ اس شدت سے کرنے لگا کہ وہ اپنے آپ سے ڈر گیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی دم جائے گا اور وہ اس خیال پر عمل کر بیٹھے گا۔ وہ جلدی سے اپنی دیوانی سوچوں کو جھٹک کر کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کا دل ہی بجھ جاتا تھا کہ کس طرح عمل کر اس نے بچ گئی۔

تمام ہی کی، ہماری داستاں چھیڑی ستاروں نے
سحر کو تھام کر بے ساختہ رونے لگی شبنم

اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں رگڑیں اور پھر کسی سوچ میں پڑ گیا۔

فضا کی آنکھ بھر آئی، ہوا کا رنگ اڑا
سکوتِ شب نے بھی چپکے سے تیرا نام لیا

اس کے چہرے پر جنوں وحشتیں ناچ رہی تھیں۔

فرحت کے بیدار ہوتے ہی اس نے یہاں سے جانے کی رٹ لگا دی۔ وہ بے چارہ آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔

''ابھی کل دوپہر سے شام تک یہ حالت تھی کہ اسی کمرے میں واپسی کے لئے منے جا رہے تھے۔ اصرار پر اصرار ہو رہا تھا۔ ایک ضد اور رٹ لگا رکھی تھی۔ اور جب یہ غریب اپنی غیرت اور خودداری بالائے طاق رکھ کر کمرے کی چابی واپس لے آیا تو رات بھر میں کمرہ کھانے کو دوڑنے لگا، گویا خوفناک پنجرہ بن گیا۔'' فرحت نے اسے لتاڑا۔ اس کا بدستور یہی مطالبہ تھا۔

"کہیں بھی چلو، بس یہاں سے چلو۔ نکلو اس گھر سے، ان فضاؤں سے۔"

ناچار ایک دفعہ پھر رختِ سفر باندھا گیا، چابی واپس دی گئی اور وہ بچے وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن اس مرتبہ فرحت نے اپنے گھر کا رخ کیا تھا اور اس کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے بھی کچھ پس و پیش نہ کی اور ایک فرمانبردار بچے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے لگا چلا گیا۔

وہ کوئی شہر تھا یا دشت، یہ تو یاد نہیں
کہیں سے دیر تلک آنسو بہا کے لوٹ آئے

گھر پہنچ کر فرحت کو نہایت ہی افسوس ناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ دروازے میں یہ بڑا تالا لٹکا منہ چڑا رہا تھا۔ پڑوسن نے بتایا کہ اماں کو اچانک ملتان جانا پڑ گیا۔ کیونکہ بجی کے سسر صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ پڑوسن کو فرحت کے لئے ضروری ہدایات بھی دے گئی تھیں اور تالے کی چابی بھی۔ پوری تفصیل سن کر یہ دونوں بے حد دلبرداشتہ ہوئے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ فاخر کا یہ حال کہ دل و دماغ کہیں، قدم کہیں...... ایک دن کے اندر اندر اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر لگتا تھا جیسے برسوں کا بیمار ہو۔ اچانک ہی اس نے نئی فرمائش جڑ دی۔

"اب تم میرے ساتھ گھر چلو۔ بس بہت شہر نوردی ہو چکی۔"

فرحت کو ہنسی آ گئی۔ "شہر نوردی کی بھی خوب رہی...... یہ کہو تم نے مجھے گھن چکر بنانے کی قسم کھا لی ہے۔"

فاخر نے ایک دبا ہوا سانس باہر نکالا اور آہستہ سے بولا۔ "بس یہ آخری بات میری مان لو۔ ممکن ہے پھر میں رہوں نہ میری بات۔"

فرحت سناٹے میں رہ گیا۔ بے وقت بچھڑنے والے جگری دوست کی زبان سے ایسے مایوسی کے کلمات سن کر اس کا دل اندر ہی اندر گھبرا گیا۔ اماں کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی یوں بھی تھی۔ مہمان دوست کے کس کام کا تھا وہ؟ کچھ فاخر کی کیفیت بھی پیشِ نظر تھی لہٰذا چند جوڑے کپڑے اٹھائے اور دونوں عازمِ سفر ہوئے۔ اماں کی واپسی کے ابھی دور دور تک امکانات مفقود تھے۔ ظاہر ہے وہ اکلوتی بجی کے سسر کی وفات پر پرسے کے لئے گئی تھیں۔ وہ بھی دوسرے شہر۔ اس رشتے کے علاوہ بھی مزید عزیز داری تھی اس لئے چالیسویں سے قبل تو وہ کسی صورت بھی گھر نہ آ سکتی تھیں۔ ویسے بھی یہی دونوں بچے ان کا کل جہان تھے۔ میاں تو کب کے دوسرا جہان بسا چکے تھے۔ جاتے جاتے بجی کے فرض سے سبکدوش کر گئے تھے۔ فرحت البتہ ابھی زیرِ تعلیم تھا لیکن گزر اوقات کے لئے اچھی معقول جائیداد ورثے میں چھوڑ گئے۔ جو کئی دکانوں اور ایک بلاک دو گھروں پر مشتمل تھی۔ ایک میں یہ دونوں ماں بیٹا رہائش پذیر تھے، دوسرا ماہانہ کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ اس طرح سے ملا جلا کر ان لوگوں کو گھریلو اخراجات کی طرف سے بے فکری تھی بلکہ کنبہ نہایت مختصر ہونے کی وجہ سے معقول بچت بھی ہو جاتی تھی۔ اس معاملے میں ماں بیٹا خوش نصیب ہی تھے۔

فاخر کی حالت کے پیشِ نظر فرحت نے مناسب کرائے پر ایک ٹیکسی حاصل کر لی تھی۔ اتنے عرصے کی دوستی میں وہ پہلی مرتبہ اس کے ہاں جا رہا تھا۔ شروع کے دو گھنٹے تو فاخر بھی بیٹھ کر سفر کرتا رہا۔ بعد میں ڈرائیور کو پورا اتا پتہ سمجھا کر پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا اور فرحت فرنٹ سیٹ پر آ گیا۔

جولائی کے ابتدائی ایام تھے۔ ٹھیک دوپہر کا وقت...... سورج بیچ آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ گرمی ہی گرمی تھی۔ یوں لگ رہا تھا گرمی صاحبہ آج نہ پڑیں تو آئندہ بھی

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

مہربان نہ ہو سکیں گی۔

کراچی شہر کے پُر رونق علاقوں سے نکلنے کے بعد ہر طرف ہو کا عالم، دور تک بل کھاتی سڑک، جنگلوں، میدانوں، ریتیلی پہاڑیوں کے درمیان اونچی نیچی، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں، ویران راستے، جھاڑ جھنکاڑ اور خودرو پودوں سب پر موسم کا اثر غالب تھا۔ گرمی کی شدت سے کوئی جانور یا پرندہ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سورج تھا کہ ایک وسیع و عریض دہکتا ہوا الاؤ۔ ڈرائیور انتہائی صبر و تحمل سے اپنے فرائض کی بجا آوری میں منہمک تھا۔ بار بار پسینہ خشک کرتا ہوا فرحت بھی چپ چاپ بیٹھا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ پیچھے لیٹے ہوئے فاخر کا برا حشر تھا۔ بار بار پہلو بدل کر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگتا۔

اندرون سندھ کا علاقہ شروع ہوا تو گرمی کی شدت میں مزید اضافہ محسوس ہوا۔ ایک جگہ فرحت نے دیکھا کہ شدید گرمی اور تپتی دھوپ سے بے پرواہ ایک برات دھما دھم ڈھول تاشے بجاتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ پیچھے پیچھے چار پانچ بیل گاڑیاں ٹھک ٹھک کر چل رہی تھیں جن پر براتی عورتیں اور بچے پسینے میں نہائے ایک دوسرے پر دم سادھے جانوروں کی طرح بے حس پڑے ہانپ رہے تھے مگر خوشی سے بھی نہال ہوئے جا رہے تھے۔

مین روڈ سے دائیں طرف لہراتی، بل کھاتی ہوئی کچی، پتلی اور بدترین سڑک کے آخری سرے پر نئی طرز سے سر اٹھائے کھڑی عظیم الشان عمارت حویلی تھی، کوٹھی یا جہازی سائز بنگلہ۔ فرحت، فاخر کی شاندار رہائش گاہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ فاخر گھرانے سے بھی ایسا آن بان شان والا لگتا تھا۔ حیران و پریشان فرحت آسمان کے مغربی کونے سے بے پناہ گرد و غبار کو تیزی سے اٹھتے دیکھ سکا جو آن کی آن میں زور دار آندھی کی صورت میں پھیل کر ہر شے کو آنکھوں کے سامنے دھندلا گیا۔ گرد و غبار میں لپٹا ہوا پہلا ہی جھونکا بروقت اور تنومند درخت ہوا کہ اگر ڈرائیور ہوشیار نہ ہوتا اور بروقت رفتار کنٹرول نہ کرتا تو ٹیکسی کسی بھی وقت چاروں طرف سے اٹھنے والے مٹی کے طوفان اور اندھا دھند بگولوں سے لپٹ کر اڑتے کاغذوں، تنکوں، جھاڑ جھنکاڑ اور پتوں نے ٹیکسی کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ فرحت نے جلدی جلدی سارے شیشے چڑھا دیے۔ خاک اور دھول کے ساتھ ساتھ جانے کیا کچھ اڑتا پھر رہا تھا۔ ٹیکسی کے اندر ہونے کے باوجود سائیں سائیں کی خوفناک آوازوں کے سوا کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔ اس جگہ ایسی ہیبت ناک اور طوفانی آندھی ان لوگوں نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ ناچار ڈرائیور نے ٹیکسی ایک طرف کر کے روک دی۔

فاخر جس کی آنکھ لگ گئی تھی، وہ بھی اٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف کی افراتفری کا جائزہ لے کر وہ فوراً ہی صورت حال سمجھ گیا اور بولا۔

"یار! شدید گرمی میں اس طرف عموماً یہی ہوتا ہے۔ اب تم دیکھنا ممکن ہے کہ تھوڑی دیر میں بارش ہونے لگے۔ پھر دیکھنا یہاں کا موسم۔"

اور یہی ہوا بھی۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ کھلے آسمان سے موٹی موٹی بوندیں برسنا شروع ہو گئیں۔ گرد و غبار آن کی آن میں بیٹھنے لگا اور برساتی جھونکوں کے ساتھ جلترنگ بجاتی بارش کی بوچھاڑیں پڑنے لگیں۔ ذرا سی دیر میں یوں لگنے لگا جیسے آندھی نام کا ایک جھونکا بھی نہ کبھی چلا ہو۔ موسم کے تغیر پر فرحت حیران رہ گیا۔ آسمانوں سے برستی شفاف بوندوں نے ایک دم ہی پھرتی دکھائی۔ تاحدِ نگاہ نظر آنے والی عمارت کے نئے سے نقوش واضح ہونے لگے تھے۔ سرمئی چکنی سڑک پر ٹپاٹپ بوندیں برس رہی تھیں اور دور دور تک لگے ہوئے جامن اور آم کے پیڑوں نے نہا کر خوشی سے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

فاخر نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ٹیکسی سیدھی کھلے ہوئے پھاٹک سے داخل ہوتے ہوئے اندر جا کر رک گئی۔ پھاٹک جسے ان دیکھے ہاتھوں نے نہایت چابک دستی سے کھول دیا تھا اور یہ دو عدد باوردی چوکیدار تھے۔ اب فرحت نے غور کیا تو خود کو ایک نہایت خوبصورتی اور مہارت سے سجے ہوئے دلکش باغیچے میں پایا۔ دنیا کا کون سا ایسا حسین و جمیل موسمی پھول تھا جو وہاں مسکراتا، مہکتا ہوا نظر نہ آ رہا تھا۔ اونچے اونچے بلند و بالا پیڑ بھی تھے جن کی چھاؤں میں گہری سبز مخملیں گھاس بچھی ہوئی تھی۔ ہر طرف کسی ماہر و جفاکش باغباں کی فنکاری کے مناظر لہرا رہے تھے۔ سرخ بجری کی روش پر ٹیکسی کے رکتے ہی دو ملازم اڑتے ہوئے آئے اور ان کا سامان لے کر چلتے بنے۔ ایک نے بڑھ کر ان کے سر پر بڑی سی چھتری تان دی تھی۔ فرحت نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کرنا چاہا مگر فاخر نے منع کر دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر چل دیا۔ تب فرحت کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ وہ بخار میں بری طرح پھنک رہا تھا۔

"ارے...... تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔" وہ چلا پڑی۔

"معمولی سا ہے۔" فاخر نے بے پروائی سے جواب دیا۔

✱●✱

بارش تیزی سے پچھلے ساون کو مات دیے رہی تھی۔ مسلسل ایک گھنٹے سے بڑی بڑی شفاف بوندیں آسمان سے زمین کی طرف رواں دواں تھیں۔ پرندوں کی ڈاریں اپنے بھیگے بھیگے پر زور زور سے پھڑپھڑاتی اپنے گھونسلوں کا رخ کر رہی تھیں۔ ہوا کے بوجھل سے بیلے جھونکوں اور بارش کے زور سے سید احمد کے صحن میں لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے زمیں بوس ہو رہے تھے۔ برآمدے میں لوہے کی مضبوط کڑیوں سے بندھا ہوا بچوں کا جھولا مسلسل ہل رہا تھا۔ رسیاں اور تختہ ہل رہا تھا مگر اس وقت کوئی بچہ جھولنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ چھوٹی دونوں ایک کمرے میں گڑیاں بیٹھی کھیل رہی تھیں۔ حمید اور مجید ایک چارپائی پر بیٹھے ان بچی کھچی کیریوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے جو چند روز قبل دونوں نے آم فرش کر کے آٹے کے ڈبے میں دبا دی تھیں۔ سید صاحب اور بیگم گھر پر موجود نہیں تھے۔ کیونکہ آج ان کا پھر وہاں لے کر جانے والی تھیں دادی صغریٰ۔ نازیہ باورچی خانے میں گڑ والے چاول پکا رہی تھی۔ یوں تو وہ سدا کی خوش مزاج اور ہنس مکھ لڑکی تھی لیکن آج کل اور بھی زیادہ خوش باش ہو گئی تھی۔ اس وقت پہلے تو موسم کا اثر، دوجے والدین کی غیر حاضری۔ کبھی تو وہ ناہید اختر بن جاتی۔

"آتی ہے پون جاتی ہے پون"

پھر ذرا سی دیر میں اخلاق احمد کی آواز بنانے لگتی۔

"ساون آئے، ساون جائے، تجھ کو پکاریں گیت ہمارے"

چند بول گا لینے کے بعد وہ پھر سے ناہید اختر کی طرح گنگنانے لگتی۔

"ساون کے دن آئے بالم، بھولا کون بھلائے"

کافی دیر سے اس کا گیت مالا اسی صورت جاری و ساری تھا۔ حتیٰ کہ اس کے چاول تیار ہو گئے اور سارے گھر میں میٹھے چاولوں کی میٹھی سی خوشبو اڑنے لگی۔

بارش کی شدت کم ہو کر ہلکی ہلکی پھوار میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ برآمدے میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھی سعدیہ صحن میں تسلسل سے گرتی بوندوں کو انہماک سے دیکھے جا رہی تھی۔ گاہے گاہے گردن اٹھا کر

گرجتے برستے آسمان پر بھی نظر ڈال لیتی تھی جہاں سیاہ بادلوں کے چہرے کے پرے اڑتے پھر رہے تھے۔ حمید اور مجید نے اب چوسے ہوئے آموں کی گٹھلیاں تاک تاک کر صحن میں مارنی شروع کر دی تھیں مگر خلاف معمول سعدیہ نے انہیں ڈانٹا اور نہ منع کیا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ چاولوں سے بھری ہوئی رکابی اٹھائے گنگناتی نازیہ اس کے قریب پہنچی تو اس کا ستا ستا چہرہ اور اداس سی بوجھل آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ خود بخود اس کی گنگناہٹ کو بریک لگ گیا لیکن دونوں میں سے کسی کے بھی بولنے سے پہلے ہی سونف کی سوندھی سوندھی مہک نے بچوں کو خبر کر دی اور وہ سب اپنی اپنی مصروفیات ترک کر کے آندھی طوفان کی طرح کھلکھلاتے، شور مچاتے بھاگے اور چاولوں کی پلیٹ جھپٹ لی۔ ایک خوشگوار سا ہنگامہ مچ گیا۔

"بجیا! مجھے...... بجیا! مجھے......"

"ارے ارے...... صبر سے...... صبر سے۔" وہ بوکھلا کر چیخی۔

اس نے سب کو قاعدے سے بٹھا کر چاول بیچ میں رکھ دیے اور دھمکایا۔

"ایک دانہ بھی اگر گرا تو پٹائی۔ معلوم ہے کتنی مکھیاں آ رہی ہیں آج کل۔ سارا دن صفائی کر کر کے ادھ موئے ہو جاؤ۔"

بچوں سے نمٹ کر وہ دوبارہ باورچی خانے میں گئی۔ اس دفعہ وہ اپنے اور سعدیہ کے لئے چاول لائی تھی مگر اس نے صاف منع کر دیا۔

"نہیں بھئی۔ مجھے نہیں کھانا ہے...... جی۔"

"اللہ...... ایسا! کھا کر تو دیکھئے۔ بے حد مزیدار ہو رہے ہیں۔" نازیہ نے چٹخارا بھر کر کہا۔

"ابھی امی جان آ گئیں تو بیسن منگوا کر دیں گی۔ پھر خوب پیاز اور ہری مرچوں والے پکوڑے بھی بنائیں گے۔ بابا جان کو بھی بہت پسند ہیں نا۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ اکیلی بولے جا رہی ہے۔ اس کی ایسی خاموشی ہے۔ وہ بھی شرمندہ ہو کر چپ ہو گئی۔

بچے کھا پی کر دوبارہ اپنی مصروفیات میں کھو گئے تھے۔ نازیہ رکابیاں اٹھا کر لے گئی۔ برتن دھو کر آئی تو سعدیہ کو اسی انداز میں بیٹھے پایا۔ مینہ اسی طرح برس رہا تھا۔ بوندوں میں تھوڑی سی کمی آنے کے بعد پھر سے طوفانی جھکڑ شروع ہو گئے تھے۔ آسمان سے پانی جھلملاتے موتیوں کی صورت ایک تسلسل سے برسے جا رہا تھا۔ گھروں کی چھتوں سے پرنالے بہہ نکلے تھے۔ جب دادی صغریٰ ان دونوں کو لے کر گھر سے روانہ ہوئی تھیں تو بارش کے آثار نہیں تھے بلکہ سڑی گرمی کی دوپہر سنسنا رہی تھی۔ حبس سے دم گھٹتا لگ رہا تھا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹائیں جھوم کے اٹھی تھیں اور پل کی پل جل تھل کر ڈالا تھا۔ اس سال جم کر برس رہا تھا۔

نازیہ کافی دیر سعدیہ کے قریب بیٹھی رہی۔ مگر جب وہ اپنی سوچوں کے گرداب سے باہر نکلی ہی نہیں تو نازیہ نے خود ہی اسے مخاطب کر لیا۔

"ایسا پانی تو بہت زوروں میں پڑ رہا ہے۔ امی جان اور بابا جان ابھی تک واپس نہیں لوٹے۔ تھوڑی دیر کا کہہ کر گئے تھے۔"

"ایں...... ہاں، ہاں......" سعدیہ کو چونکنا پڑا۔ اس نے تشویش بھری نظروں سے گرجتے برستے آسمان کو دیکھا اور بیزاری سے بولی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"ہمارے گھر والوں کو بھی تو رشتے داریاں بڑھانے کا خوب شوق چرایا ہے۔ تم دیکھ لینا، میرا دل کہتا ہے کہ دادی خوار کرا کے دم لیں گی ہم لوگوں کو۔"

"ہائے اللہ!...... خدا نہ کرے۔ اپیا! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" نازیہ نے دہل کر کہا اور دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے۔ "اپیا! ایسے معاملات میں بہت سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے۔ آپ کو شاید احساس نہیں کہ آپ کیا کہہ گئیں۔ اب وہ لوگ ہم دونوں بہنوں کو پسند کر کے دوپٹے بھی اوڑھا گئے۔ ہاتھ پر پیسے بھی رکھ گئے۔ اس رسم کے بعد باقی کیا کسر رہ گئی؟ خدا نہ کرے کہ بابا جان کی عزت پر کوئی حرف آئے۔"

سعدیہ کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے رُکھے انداز میں کہا۔

"ایک تو تم بہت بے وقوف ہو۔ کو حقیقت کی سو کھلیاں کی۔" لیکن پھر وہ اپنی بات کی وضاحت کیے بغیر چپ ہو گئی۔ نازیہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے ہر پہلو سے غور کرنا چاہا مگر یہ بات اس کے پلے نہ پڑ سکی۔

"توبہ ہے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "یہ اپیا تو سدا کی مشکل سوال ہیں۔ نہ کچھ کھل کر بتائیں نہ ... رسم والے دن بھی اپیا ... الجھی الجھی ہوئی تھیں۔ ایک میں بے وقوف ہوں جسے ہنسی پر قابو نہیں۔ ابھی تو وہ گھرک دیتی ہیں...... معلوم نہیں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اپیا کی طرح خاموش رہنا میں کیسے بنالوں؟ حالانکہ بہت کوشش کرتی ہوں کہ ان کی طرح سنجیدہ رہوں مگر پھر بھول جاتی ہے۔"

وہ چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی، الجھتی رہی۔ لیکن ...... الجھن سے پوچھا۔

"اپیا! آپ کو اپنا 'وہ والا' دوپٹہ پسند نہیں آیا؟" جواب میں سعدیہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بغیر اپنی رو میں بہتی گئی۔ "اتنا پیارا تو ہے۔ ستاروں جڑا۔ بس ہم دونوں کے رنگ میں ذرا سا فرق ہے۔ آپ نے اپنے سارے پیسے بھی بچوں میں بانٹ ڈالے۔"

سعدیہ سر اٹھائے ... تیز نگاہوں سے گھورے جا رہی تھی۔ لیکن پھر اچانک ہی اسے چھوٹی بہن کی سادگی پر پیار آ گیا۔ اپنے رویے میں لچک پیدا کی اور نرمی سے پوچھا۔

"تم نے کیا کیے اپنے پیسے؟"

"میں نے......" اپیا کی دلچسپی دیکھ کر وہ خوش ہو گئی اور جوش و خروش سے بتایا۔ "میں تو ان پیسوں کا سوٹ بناؤں گی بڑھیا سا۔" کہتے کہتے وہ خود ہی شرما گئی۔ چہرے پر قوس قزح کے سارے رنگ بکھر گئے۔ سعدیہ کو بہت رشک آیا۔ بے چارگی میں اپنی اور اس کی کیفیت کا موازنہ کرنے لگی۔ اپنی روح میں پھیلے بکھرے سناٹوں میں خزاں آلود افسردگیوں اور کانٹوں کی بے درد کھٹک کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

اسی اثناء میں دروازے پر سواری رُکنے کی آہٹیں ابھریں ساتھ ہی کچھ آوازیں بھی۔ یہ سب چونک کر بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ خیال سچ ہی ثابت ہوا۔ بارش کی ٹپ ٹپ میں دروازہ دھڑدھڑانے کی آوازیں سُر ملانے لگیں۔ حمید اپنی سرگرمیاں چھوڑ کر بھاگا اور رم جھم برستی بارش میں بھیگتا گیا اور آن واحد میں گیٹ کھول دیا۔

بابا جان، دادی، امی پانی سے شرابور ٹھٹھکتی ہوئی حالت میں اندر داخل ہوئے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر لڑکیوں کی جان میں جان آئی ورنہ فکر اور تردد سے اندر ہی اندر سوکھ رہی تھیں۔ دادی بہ آواز بلند

اعلان کرتی چلی آ رہی تھیں۔

"اے ابھی خاصی بارش تھم گئی تب نکلے تھے گھر سے۔ اے لو راستے ہی راستے میں چھاجوں مینہ برس گیا۔ لے کے کپڑے بھی سب بھیگ گئے۔"

✲●✲

کوئی ایک ہفتے تک تو فاخر کو خبر ہی نہ ہو سکی کہ وہ زمین میں ہے کہ آسمان میں۔ بخار اتنا تیز، غفلت ایسی شدید، گھر کی خواتین کا جو حال تھا وہ تو فرحت کو معلوم ہی نہ ہو سکا لیکن فاخر کے ابا میاں اور بھائی صاحب کی پریشانی اور بے تابیاں دیکھ دیکھ کر فرحت خود ہول ہول گیا۔

اگر چہ وہ شہر سے حویلی تک کا فاصلہ خود ناپ نہ چکا ہوتا تو اندازہ کرنا محال تھا کہ وہ فاخر کے ساتھ شہر میں ہے یا گھر میں۔ گھر کیا، اس کے ابا میاں نے اس کی بیماری کے دوران حویلی میں ایک چھوٹا موٹا ہسپتال قائم کر ڈالا تھا۔ شہر کے بہترین ڈاکٹرز کی خدمات حاصل کر لی گئی تھیں اور اگلے دن ہی مختلف رپورٹس نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ فاخر کو ملیریا ہو گیا ہے۔

اس کی بیماری کے دوران خود فرحت کا جی نہ مانا کہ وہ اسے اکیلا ماندہ چھوڑ کر چلا جائے۔ دوسرے پھر وہاں سب کا رویہ اس کے ساتھ اتنا پیار اور اپنائیت لیے ہوئے تھا کہ اسے ماحول کے نئے پن کا ذرہ بھر بھی احساس نہ ہو پایا۔ جانے کو تو وہ اماں کے پاس ملتان بھی جا سکتا تھا مگر نہ گیا۔ یہاں فاخر کے ابا میاں کی مکمل ... لائبریری میں اس کی تنہائی دور کرنے کا بہترین سامان موجود تھا۔ چنانچہ اچھی کتب کا مطالعہ اور فاخر کی تیمارداری ان دو کاموں نے اسے باندھ لیا۔

صحت یابی کے بعد فاخر کے ہونٹوں پر ایک چپ سی لگ گئی۔ وہ خاصا کمزور اور تھکا تھکا سا ہو گیا تھا۔ پہلے بھی وہ گھر کے اندر ... کم ہی رہتا تھا اب بالکل ہی مہمان خانے میں فرحت کے ساتھ اٹھ آیا تھا۔ بعض اوقات گھنٹوں خاموش رہتا۔ ابا میاں خاموشی سے اس کی کیفیت کا مشاہدہ کرتے رہتے۔ اس کے ناشتے، کھانے پینے، دواؤں اور پرہیزی چارٹ کا پورا حساب کتاب ایک ملازم کے سپرد تھا جس کی ... فاخر کو ڈانٹ پلا دی۔

"تم کیسے میزبان ہو؟ اپنا خیال ہے نہ دوست کا۔ وہ غریب دل میں کیا خیال کرتا ہو گا؟ کہیں باہر نکلا کرو۔ خود بھی گھومو، اسے بھی گھمانے لے جاؤ۔"

اس برس ساون کا یہ مہینہ فرحت کے لیے بے پناہ خوشیوں اور مسرتوں کا پیامبر بن گیا۔ فاخر کا ساتھ، اس کی گہری دوستی اور پھر اس کے گھر والوں کی شفقتیں اور اپنائیت اسے نعمت غیر مترقبہ لگنے لگی۔ یہ دونوں اکثر میلوں گھوم آتے۔ وہ تو آج تک کراچی اور کراچی کی پرہنگام زندگی سے باہر ہی نکلا ہی نہ تھا۔ یہاں اسے بیک وقت دونوں ہی مزے مل رہے تھے۔ حویلی کے اندر شہروں جیسی پرتکلف رہائش اور لطف ... اور حویلی سے باہر دور دور تک، ارد گرد ابا میاں کی اراضی لہلہا رہی تھی۔ سرسبز کھیتوں کے سلسلے، شاداب و گھنیرے باغوں کی لہلہاہٹ، شوریدہ سر ندی کا شور، طیور جنگل کی چہچہاہٹ اور پھر کیف آور تنہائی........

گو کہ فاخر یہاں آ کر بہت خاموش اور کم گو سا ہو گیا تھا یا پھر بیماری نے اسے لاغر اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ تاہم فرحت چونکہ اس کے حال دل سے آگاہ تھا اور اسے معلوم تھا کہ سعدیہ کی وجہ سے وہ کن حوصلہ شکن اور جاں سوز حالات سے گزر کر آیا ہے اس لیے وہ خود بھی دانستہ طور پر اسے چھیڑنے سے گریزاں رہتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ شاید اسی طرح دھیرے دھیرے اسے بھول جانے پر قادر ہو

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

جائے گا اور رفتہ رفتہ اس کے زخم پر وقت از خود مرہم بن جائے گا۔ آج کل فاخر نے خود بخود ہی اشعار پڑھنا اور سنانا بھی ترک کر رکھا [illegible] اس کی رنگت بہت ماند پڑ گئی تھی۔ شانے جھک سے گئے تھے۔ بال بکھرے رہتے۔ آنکھوں میں بے کچھ کھو دینے کا ملال پڑاؤ ڈالے رکھتا۔ ساون کا موتی لٹاتا حسین موسم اور رم جھم برستی پھواریں اس کے تن من میں آگ سی لگا جاتیں۔ مگر شاید اس کے اندر کے ہر وقت چہچہانے والے شاعر نے چپ رہنا سیکھ لیا تھا۔ رہتا وہ ہر وقت فرحت کے ساتھ تھا مگر چپ چپ۔

اکثر وہ دونوں سرسبز چراگاہوں میں دور تک رائیڈنگ کرتے۔ یہاں آ کر فرحت نے گھوڑا دوڑانا سیکھ لیا تھا۔ اس بادلوں بھری دوپہر میں بھی وہ دونوں ساتھ ساتھ ترائی میں اُگے جنگل میں گھوڑے ایک پیڑ سے باندھ کر گھومتے پھر رہے تھے۔ ایک تالاب کے کنارے مینڈکوں اور جھینگروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ بارش سے بوجھل نم ناک جھونکے انگوروں کی بیلوں میں اٹھلاتے سرسراتے پھر رہے تھے۔ بعض چھوٹی چھوٹی بیریوں میں کھٹ مٹھے بیروں کے انبار لگے ہوئے تھے جنہیں ننھی منی چڑیاں پھدک پھدک کر کتر رہی تھیں۔ دھلے دھلے ہرے پتوں سے اٹے پیڑوں کی چھاؤں اور ساون کے ہریالے جھونکوں نے ان اطراف کو بہشت کی مثال بنا ڈالا تھا۔ سبزے کی مہک اور تراوٹ، فضاؤں کی تازگی اور دلکشی نے فرحت کو سر سے پاؤں تک اپنا اسیر بنا ڈالا تھا۔ وہ فاخر کے ساتھ سیر کرنے کے لئے باہر آتا تو گھنٹوں مسحور سا اس کے ساتھ ساتھ [illegible] فرحت سے لطف اندوز ہوتا رہتا۔ آج ان لمحات میں اس سے رہا نہ گیا اور بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔

"فاخر...... یار آج تو کچھ سناؤ دوست، دن گزر گئے تم سے کچھ سنے ہوئے۔"

ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ فاخر کی دلکش آواز رنگ برنگی فضاؤں میں رس گھولنے لگی۔ شاید وہ پہلے ہی گنگنانے کے موڈ میں تھا۔

"مٹی کی مہک سانس کی خوشبو میں اتر کر
بھیگے ہوئے سبزے کی ترائی میں بکھر جائے
بوندوں کی چھما چھم سے بدن کانپ رہا ہے
اور مست ہوا رقص کی لے تیز کئے جائے
ہر بھر کے پاؤں سے لپٹنے کے گھنگھرو
بارش کی ننھی تال پہ پازیب جو چھنکائے
انگور کی بیلوں پہ اتر آئے ستارے
رکتی ہوئی بارش نے بھی کیا رنگ دکھائے"

"واہ...... سبحان اللہ۔ کیا خوب منظر کشی کی ہے۔" فرحت نے بے اختیار تعریف کی۔ ساتھ ہی اسے دلی اطمینان کا احساس بھی ہوا۔ آج پہلی دفعہ ہی ایسا ہوا تھا کہ اس کے اشعار میں ہجر و فراق یا وصال محبوب یا پھر حسین دوست کا تذکرہ ناپید تھا۔ ایک دفعہ پھر فرحت کو گمان گزرا گویا فاخر اسے "بھولنے" کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔

"اے اللہ! سچ ایسا ہو جائے۔"

وہ ابھی مصروف دعا تھا کہ فاخر کی خوبصورت آواز پھر گونجی۔

یونہی نہیں بہار کا جھونکا بھلا لگا

تازہ ہوا کے ساتھ یاد پرانی بھی ساتھ ہے

"اُف خدایا!" فرحت نے ٹھنڈا سانس لیا۔ دعا پوری ہونے سے پہلے ہی ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔ وہ بے بسی سے فاخر کے تپے ہوئے چہرے کی طرف تکتی دیکھ کر رہ گیا۔ پھر کچھ کہے بغیر آگے بڑھ کر درخت سے گھوڑوں کی رسیاں کھولنے لگا۔

"کیوں، مزید شعر نہیں سنو گے؟" فاخر نے سادگی سے دریافت کیا۔ فرحت نے جواب نہیں دیا۔

"ارے بھائی! کچھ تو پھوٹ منہ سے۔" اس نے پرانے انداز میں پوچھا۔

"کیا پھوٹوں؟...... کچھ پھوٹنے کے قابل چھوڑتا ہے تو؟" فرحت نے منہ بنا کر جواب دیا اور اپنا گھوڑا کھول کر اس کی زین درست کرنے لگا۔

"ابھی سے چل دیا؟...... دیکھ، ابا میاں تو کہیں گے۔"

"تو کہنے دے۔" وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور لاپرواہی سے بولا۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ فاخر گھوڑا دوڑاتا ہوا اس سے آ ملا اور پکار کر پوچھا۔

"کچھ بتاؤ تو کیا برا لگ گیا؟ ابھی تو اچھے بھلے تھے۔"

"کیا خاک اچھے بھلے تھے؟" اس نے [illegible] "کبھی تو ایسے شعر سناتے ہو کہ دل خوش ہو جائے۔ اور پھر اسی دل [illegible] کو پکڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔ خدا کی پناہ ہے تم سے بھی۔" فاخر نے دبا دبا سانس لیا پھر رک رک کر شعر پڑھا۔

"میں نے [illegible] ہوا کر دیکھا ہے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا؟"

فرحت نے مڑ کر اس پر ایک ملامت بھری نظر ڈالی، اپنے گھوڑے کی راسیں کھینچیں اور اسے حویلی کی طرف سرپٹ دوڑا دیا۔

⁂●⁂

حویلی پہنچ کر اس نے تھوڑی دیر فاخر کا انتظار کیا مگر جب وہ نہ آیا تو جھنجھلاہٹ میں اس نے کھانا منگوا کر کھایا۔ وہ گاؤں میں [illegible] پیاز والے پراٹھوں کے ساتھ کسی نے کھانے کا لطف دوبالا کر دیا تھا۔ ملازم نے برف میں لگے ہوئے آم لا کر رکھے مگر اس سے مزید بے مروتی برتی نہ جا سکی۔ کھانا تو فاخر کے بغیر کھا لیا تھا مگر آم اکیلے کھانا اس کے دل نے گوارا نہ کیا۔ حتیٰ کہ انتظاری انتظار میں آنکھ لگ گئی۔

شام ڈھلے ایک زوردار کڑاکے سے اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں بھیگے اندھیرے پھیلے ہوئے تھے اور فاخر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دور کہیں بادل دھما دھم گرج رہے تھے اور ہوائیں فراٹے بھر رہی تھیں۔ وہ جھپٹ کر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ مغرب کی طرف سیاہ گھنگھور گھٹائیں جھوم جھوم کر جمع ہو رہی تھیں۔ کوئی دم جاتا تھا کہ وہ پورے زوروں میں برس پڑتیں۔ عین اسی لمحے فرحت کی نگاہ یہاں سے دکھائی دینے والے باغ کے ایک گوشے کی طرف جم کے رہ گئی۔ تراشیدہ گھاس پر فاخر دونوں ہاتھ بغلوں میں دیئے آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ برساتی ہواؤں کے تیز جھونکے اس کا کلیوں والا ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا اُڑائے لئے جا رہے تھے۔ چیختی آندھی نما ہوائیں اور امڈتی گھٹاؤں سے رم جھم رم جھم برستی پھواریں...... وہ موسم کے تمام تغیرات سے بے نیاز اور بے پرواہ لگ رہا تھا۔ یہ بھی اس وقت اتفاق ہی تھا کہ اس وقت تک کسی دوسرے کی اس پر نگاہ نہیں پڑ سکی تھی۔

فرحت دیوانہ وار کمرے سے بھاگا اور سرپھرے بگولے کی مانند اس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

"یہ کیا دیوانگی ہے؟...... اتنی بارش میں کیا کر رہے ہو یہاں؟"

فاخر نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

"آ جاؤ...... تم بھی دیوانے ہو جاؤ۔"

"خدا نہ کرے۔" فرحت نے فوراً کہا پھر اس کا ہاتھ تھام کر کمرے کی طرف کھینچتا ہوا بولا۔ "چلو، چلو! جلدی اندر چلو۔ دوبارہ بیمار پڑنے کا ارادہ ہے کیا؟...... ابا میاں نے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔ میں حیران ہوں تمہاری عقل کہاں گھاس چرنے چلی گئی۔"

اسی وقت زوردار تڑاکے سے سیاہ بادلوں پر آسمانی بجلی دودھاری تلوار کی طرح یہاں سے وہاں تک لہراتی چلی گئی۔ فرحت بدک کر بھاگا۔ فاخر بھی اس کے ساتھ ہنستا ہوا برآمدے میں آ گیا۔

مینہ خوب زور و زور سے برسنے لگا تھا۔ آسمان سے ایک عظیم الشان، صاف و شفاف پانیوں والی آبشار تھی جس نے زمین کی طرف رخ کر لیا تھا۔

"چلو کپڑے بدلو فوراً۔" فرحت نے اس کے گھنے بالوں میں اٹکے پانی کے قطروں اور بھیگے لباس کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے چھوڑو دوست اگر یہی ہوش ہے۔" اس نے بے پرواہی سے جواب دیا۔ "تم سناؤ، موڈ درست ہو گیا؟...... دوپہر میں کیوں منہ پھلائے بیٹھے تھے؟"

"یہ بھی خوب رہی۔" فرحت کی اتنی بڑی بات پر کہنے لگے۔ "خود ہی پوز کرتے ہو گویا اسے بھول گئے اور پھر خود ہی اس کی یاد میں بیٹھ کر ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتے ہو تو دوسرا سالا گدھا ہے جو تمہارے پیچھے دم ہلاتا پھرے۔"

فاخر کے ہنستے ہوئے چہرے پر گھٹا چھا گئی۔ آج یوں بھی وہ بہت دنوں کے بعد ہنسا تھا۔ مگر ہنستے ہی لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ وہیں پڑی کرسی پر بیٹھ کر بالوں سے پانی کے قطرے جھاڑنے لگا۔ نظر فرحت پر بھی تھی۔

"کیوں...... اب اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کی کیا بات ہے؟" فرحت نے کھسیا کر پوچھا۔

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ صرف بارش مدھر لے میں گیت گاتی رہی۔ گرج اور چمک بھی عروج پر تھی۔ بجلی بار بار چمکارے مار رہی تھی۔ سیلی سیلی ہوائیں دکھے ہوئے دلوں میں کسک اور نامعلوم سا گداز پیدا کر رہی تھیں۔

"فرحت!" اس کی گمبیر آواز میں آنسوؤں کی نمی اور درد جدائی کی تپش جھلک رہی تھی۔ "میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی ہر کوشش کر کے دیکھ لی۔ تمہیں ممکن ہے یاد نہ ہو مگر میں وہ جولائی کی وہ دوپہر کبھی فراموش نہیں کر سکتا جس روز میں نے پہلی مرتبہ سعدیہ کے رشتے کی بات سنی تھی۔ تم سے کیا چھپانا ہے۔ بے شک مجھے میری اب تک کی زندگی کا سب سے خوفناک ترین شاک لگا تھا۔ میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جب میں نے تم سے تمام باتیں مکمل کر لیں اور تمہیں راضی بھی کر لیا کہ تم اپنی اماں جان کو سعید صاحب کے ہاں پیغام دے کر بھیجو گے، تب یہ انکشاف ہو گا کہ اس کا رشتہ طے ہو گیا۔ خدا گواہ ہے فرحت! ایسا کچھ نہیں ہے کہ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی ہو۔ لاکھوں دفعہ اسے متاع غیر کہہ کر اپنے دل خانہ خراب سے نکال باہر کرنا چاہا مگر افسوس کہ ایک دفعہ بھی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ حالانکہ میں اس امر سے خوب واقف ہوں کہ وہ میری دسترس سے باہر ہے۔ اس

میں دوش میں اسے بھی نہیں دے سکتا کیونکہ ظاہر ہے وہ شریف زادی ہے۔ گھریلو اور غیور گھرانے کی لڑکی ہے۔ والدین کے طے کیے ہوئے رشتے سے کیونکر انحراف کر سکتی ہے۔ میرے حق میں بول جانا یقیناً اس کی شرافت کے منافی ہو گا۔ بلاشبہ اس معاملے میں وہ بے بس ہو گی۔ مگر میں کیا کروں فرحت! میں خود کو بھی بالکل بے بس پاتا ہوں۔ جتنا جتنا اسے بھول جانے کی کوشش کی، اتنی اتنی وہ زیادہ یاد آئی۔ اور اب میں ہار چکا۔ میں نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔ ناممکن ہے کہ میں اس کو بھول جاؤں۔"

ابا میاں جو اندرونی دروازے سے ابھی ابھی اس برآمدے میں داخل ہونے کو تھے، ٹھٹھک کر وہیں رک گئے۔ انہیں فرحت کی آواز سنائی دی۔

"میں تو بھیا! اس معاملے پر جس قدر غور کر سکتا تھا، کر چکا۔ اپنی عقل سے باہر ہے اس گتھی کو سلجھانا...... خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا اور تم کس حد تک خود کو برباد کر کے دم لو گے۔"

فاخر نے بے انتہا مایوسی کے عالم میں شعر پڑھا۔

"میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں"

"چلو چھٹی ہوئی۔" فرحت نے کہا۔ "تم نے تو ایک شعر میں کیفیت دل بیان کر کے قصہ تمام کر دیا، اب ہم کیا کریں؟ ہمیں اجازت عنایت فرمائیے۔ ہم بھی اپنے گھر کی راہ لیں۔ پورا مہینہ بھر ہو گیا ڈیرے ڈالے۔"

فاخر نے جواب نہیں دیا۔ کسی خیال میں کھویا بیٹھا رہا۔ فرحت ہی دوبارہ گویا ہوا۔

"سچ تو یہ ہے میں بالکل بھی سنجیدہ ہوں۔ ضروری نہیں کہ چاپلوسی کرنے آئیں۔ انہیں سعید صاحب کے گھر لے کے جاؤں گا۔ تم تو بھی ایسا کو شریف زادی کا خطاب دے کر اور صاحب کے ہو گی اتنا بڑا جگر کہاں سے لاؤں؟ بھئی ہم تو بیچارے خواستگار بن کر جائیں گے۔"

فاخر بے بسی سے اس کی صورت تکنے لگا۔

"ہاں ہاں...... میں کچھ غلط نہیں کہہ رہا۔" فرحت نے بڑے وثوق سے کہا۔ "تمہاری تو پانچوں گھی اور سر کڑاہی میں ہے۔ ایسا نہ ملی تو کیا ہوا جھگڑے کی مانگ تو ہر صورت میں سلامت ہے نا۔ ہاں کرتے ہوئے بھی بھاوج کی ہمشیرہ کو بیاہ لاؤ گے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گھر والے بھی خوش، خود بھی خوش۔ سرا سر گھاٹے میں رہیں گے ہم، جسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ اتنے بڑے سہارے ہو گئے، نہ منگنی ہے نہ سگائی۔ اب ڈائریکٹ لگائی کا بھی انتظام نہ کریں کیا؟ ویسے بھی بیچارے رشتہ جوڑنے والے تم ہو۔"

فاخر مسکرا دیا۔

"تم تو سٹھیا گئے ہو۔ حمیدہ نے کہا تھا بیا اور بیچارا دونوں کے......"

"یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔" فرحت نے خم ٹھونک کر جواب دیا۔ "نثر نگار ہیں ہم، شاعر نہیں۔ تم تو اپنی جھگڑے کی مانگ کو پیارے ہو چکے۔"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟" فاخر نے بلبلا کر جواب دیا۔ "میں بہت دیر سے تیری ساری چونچیں

برداشت کر رہا ہوں۔ ذرا سنبھل کر رہنا۔ ایسا نہ ہو کہ اٹھا کر برستی بارش میں پھینک آؤں۔ کان کھول کر آخری دفعہ سن لے اور اس سڑے ہوئے کھوپڑے میں بھر لے کہ میں کسی شیخرے کی مانگ وانگ کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر بدقسمتی سے سعدیہ سے کوئی سلسلہ نہ بھی ہوا ہوتا تب بھی میں بھابی جان کی ہمشیرہ سے بھی شادی نہ کرتا اور نہ اب کروں گا۔ یہ میرا ہمیشہ سے پہلا اور آخری فیصلہ ہے۔ اس میں سعدیہ کے خیال کو قطعی کوئی دخل نہیں ہے۔ میرا قطعی فیصلہ ہے یہ۔"

"یار شاعر تو تُو ہے مگر مجھے اس وقت ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

یہ راہِ وفا ہے سو شکایات تو ہوں گی
دستورِ وفا ہے کہ شکایت نہ کیجیے"

"تو میں کون سے دفترِ شکایات کھول بیٹھا ہوں؟...... اب تُو دوست ہے تو تجھے بھی حالِ دل نہ بتاؤں؟" فاخر نے بڑے کرب سے کہا۔

ان دونوں کے عین عقب میں کھڑے ابا میاں کی سرخ ڈوروں والی بڑی بڑی آنکھیں ان کی باتیں سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔

چھاجوں چند برس جانے کے بعد اب موٹی موٹی بوندوں کا تار ٹوٹ گیا تھا، تاہم ہلکی ہلکی پھوار مسلسل پڑ رہی تھی۔ فضائیں ٹھنڈی ٹھنڈی اور دھلی دھلی ہو گئی تھیں۔ کسی درخت کی ڈالیوں میں چھپی ہوئی کوئل کوکنے لگی تھی۔

✽●✽

رات کی کوکھ سے نرم گرم سویروں نے جنم لیا تھا۔ مشرقی کونے سے سورج کا پُرجلال چہرہ پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تھا۔ کالے بادل جو کل کے بڑے خوب برس چکے تھے اور اب ڈھلے ہوئے بگلوں [illegible] آسمان کی [illegible] کی چھوٹی چھوٹی منڈیروں پر تھرک رہی تھیں۔ نیچے آنگن سے مرغیوں کی کوکوں اور دادی صغریٰ کی بڑبڑاہٹ سنائی دیے جا رہی تھی۔

"لو جی اب تو زندہ رہنا ہی عذاب ہو گیا...... کاہے کو اب زندہ رہیں گے۔ اب تو بیبا! بڑی بڑی توندوں والے ہی زندگی کے مزے لوٹیں گے۔ سچ ہے جو دونوں ہاتھوں سے بٹورے گا وہی چاروں ہاتھوں پیروں سے کھائے گا بھی۔ اے اناج پر ہی کوئی آگ لگ گئی۔ باقی کیا دھرا رہ گیا۔ انسان اور پھر نہ کھائے گا تو کیا چٹنی سے بھی روٹی نہ کھائے گا...... ہائے غضب! ایسی کمر توڑ مہنگائی بھلا کہاں دیکھی تھی ہم نے؟ اے لو آٹا، دال، سبزی سب مہنگا ہو گیا۔ ہمارا زمانہ گزرے کوئی صدیاں نہیں بیت گئیں۔ اچھا خاصا بکرے کا گوشت بارہ روپے سیر اور چنے کی دال ڈیڑھ روپے سیر کھائی ہے۔ کھانڈ پونے دو روپے کی سیر بھر آ جاتی تھی اور اب......"

تھوڑی سی دیر کو ان کا نشریاتی پروگرام معطل ہو گیا بلکہ تتر بتر ہو گیا کیونکہ وہ صبح سے جو مونگ کی دال کی بڑیاں توڑ توڑ کر چارپائی پر سکھا رہی تھیں، ان میں سے دو بڑیاں کسی طرح سے ایک مرغی کے ہتھے چڑھ گئی تھیں۔ وہ انہیں اپنی چونچ میں دبائے آنگن میں ادھر ادھر لیے پھر رہی تھی مگر کھا لینے کی نوبت ہی نہیں آ رہی تھی۔ باقی مرغیاں اور چوزے بڑے منظم طریقے سے اس کا گھیراؤ کرتے پھر رہے تھے۔ اسی دوران ان کی بہو نے چلا کر انہیں اس چوری سے آگاہ کر دیا تھا۔

"ہش...... ہش...... چوٹی کہیں کی۔" انہیں غصہ آ گیا۔ زرخ نامہ چھوڑ کر بیٹھے بیٹھے انہوں نے

مرغی کو گالی دی۔ "کیسی مردار ہے، بیسوا کہیں کی۔ اے یہ تو وہی کہاوت ہو گئی کہ دکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔"

"دادی!...... دادی!......" گھر کے کسی کونے سے ان کا منجھلا پوتا چیخ پڑا۔ "اوپر کی بجائے بڑیاں آپ چارپائی کے نیچے پکا رہی ہیں۔"

"ایں......؟" انہوں نے ہڑبڑا کر چارپائی کے نیچے جھانکا۔ واقعی پانچ سات تازہ بڑیاں زمین پر جگہ جگہ گیلی ہوئی دکھائی دیں۔

"اے موت پڑے الو نے یہ کیا کر ڈالا؟" وہ پوتے پر پلٹ گئیں۔

"دادی! میں نے کیا کر دیا؟" اس نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

"اتنا مجھ سے زبان چلاتا ہے؟ ٹھہر، پاجی کہیں کا۔" انہوں نے جوتی اٹھائی اور غضبناک ہو کر اس کی طرف پھینکی۔ لڑکا جان بچا کر بھاگا اور بوکھلا کر باہر نکل گیا۔

اب ان کی سرگرمیوں میں تھوڑی سی تبدیلی واقع ہو چکی تھی اور بہت سنبھل سنبھل کر بڑیاں توڑ رہی تھیں۔ مبادا کوئی ایک آدھ بڑی داغِ مفارقت دے کر مالی نقصان کا باعث بن جائے۔ رفتہ رفتہ ان کا ٹوٹا ہوا نشریاتی رابطہ دوبارہ بحال ہونے لگا [illegible] کے دوران انہوں نے عین وہیں سے جوڑا جہاں سے چھوڑا تھا۔

"دانے دانے پر آگ برس رہی ہے۔ [illegible] ہیں وہ کس کو رو رہی ہیں بیٹھ کر۔ ایسی مہنگائی پہلے دیکھی نہ سنی۔ [illegible] سے اٹک اٹک کر رکھا ہے۔ حکیم جی نے بکرے کا گوشت کھانے کو [illegible] پہلے خبر ہو گئی۔ لو جی! بکرے کا گوشت ہی آسمان پر چڑھ گیا [illegible] ارے ابھی ایک گوشت رہ گیا تھا [illegible] ہے، موئے سلف کا باوا آدم [illegible] بے چارے کھلائیں اولاد کو۔ سو رنگ کی بیماریاں نہ جکڑیں تو اور کیا ہو گا۔ حکیم جی ہر بیماری کو کہیں غذا کی کمزوری ہے۔ بھئی [illegible] خاک غذا خوراک دی جائے۔ پہلے اس اللہ ماری مہنگائی کا علاج تو کر لو۔ ابھی کل ہی چنے کی دال ڈھائی روپے [illegible] آئی۔ بھلا کیا اوقات ہے چنے کی دال کی۔ ابھی ایوب خان کے دور میں ڈیڑھ دو روپے سیر تھی۔ اے میں پوچھتی ہوں کیا پاکستان میں اب چنے کی پیداوار نابود ہو گئی؟ ایک دانے سے سیکڑوں دانے بنتے ہیں، ہاں ہم جانتے نہیں کیا۔" ان کے ہاتھ میں آخری چند بڑیاں رہ گئی تھیں کہ پوتی پکاری۔

"دادی!...... دادی! آپ کی کوئی ملنے والی آئی ہیں۔"

انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آنے والی کو پہچان کر ان کا پوپلا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

✽●✽

دوپہر بھر کا سفر کرتا ہوا فرحت گھر پہنچا تو خلافِ توقع اماں جان کو گھر پر موجود پا کر کھل اٹھا۔ سفر کی ساری کلفت جاتی رہی۔

"ارے میری پیاری اماں جان!" وہ لپک کر ان کی گود میں جا پڑا۔ انہوں نے بھی خوب چمٹا لیا اور چٹاچٹ بلائیں لے ڈالیں۔

"کہاں چلے گئے تھے بے گمان؟"

"آپ بھی تو چلی گئی تھیں۔"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"میری تو مجبوری تھی۔" انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "آہ...... ہا...... کیا بھلے انسان تھے عالیہ کے سسر بھی۔ بے چارے پانچ دن کے اندر اندر چٹ پٹ ہو گئے۔ یہ ڈیل ڈول...... ایسے اونچے لمبے، بچے گئے۔ مرحوم کہتے دل پھٹتا ہے۔ نہ کبھی بیمار پڑے نہ کبھی دوا دارو کی ضرورت پڑی۔ بس رات کے رات پیٹ میں درد اٹھا۔ سینے میں جلن چبھن بتا رہے تھے۔ لڑکے ہاتھوں ہاتھ ڈاکٹر کے ہاں لے گئے۔ وہ اللہ کا بندہ سمجھ نہ پایا۔ دوا دے کر گھر بھیج دیا۔ آدھی رات کو تیز درد ہوا۔ بڑے ہسپتال لے گئے تو پتہ چلا معاملہ سارا دل کا ہے۔ بس جی جنہوں نے عمر بھر ڈاکٹر کا منہ نہ دیکھا تھا، ڈاکٹروں کے ایسے ہتھے چڑھے کہ پانچویں دن مر کر ہی گھر پہنچے۔ ایک کہرام مچ گیا۔ میں پہنچی تو عالیہ کی ساس کو غشی پر غش آ رہے تھے...... آئے ہائے، کیسے انسان دوست آدمی تھے کیا بتاؤں۔ ایک خلقت اُمڈ پڑی تھی آخری صورت دیکھنے کے لیے۔"

اماں جان بہت دیر تک اسی کی باتیں کرتی رہیں، آہیں بھرتی رہیں۔ دوپہر میں انہوں نے لوکی کا رائتہ بنایا تھا۔ پڑوسن جو ان کی کرائے دار بھی تھی، کہنے لگی۔

"خالہ جان! آ گئی ہو۔ چھوڑو، کہاں پکاتی پھرو گی۔"

اس نے گھڑی مسور کی دال اور بگھارے چاول پکائے تھے، ساتھ میں کچی کیری کی لونجی پلیٹ بھر کے دے گئی تھی۔ اماں جان کا گزارا اسی میں ہو گیا تھا۔ بیٹے کو دیکھ کر لپک جھپک فرزانہ سنبھالتی باورچی خانے میں گھس گئیں۔ پاؤ بھر قیمہ رکھا تھا، آلو ڈالے، پیاز، ہری مرچیں کتریں، باتیں کرتے کرتے بگھارا، چار چپاتیاں ڈالیں۔ جب تک وہ نہا کر نکلا، انہوں نے کھانا لگا دیا۔

بارشوں کے بعد آج خوب ہی گرمی ہو رہی تھی۔ در و بام جھلس رہے تھے۔ زمین سے گرم گرم لپٹیں نکل رہی تھیں۔ اوپر سے لائٹ چلی گئی۔ کھانا کھاتے کھاتے فرحت کا پسینہ دھاروں کی طرح بہہ نکلا۔ اماں ہاتھ سے پنکھا جھلنے لگیں۔

"اب تم بتاؤ، اتنے دن کہاں رہے۔ زبانی امتحان تو تمہارا کبھی ہو چکا تھا۔ کرائے دارنی کہتی تھی فاخر کے ساتھ گئے ہیں۔"

"جی ہاں!...... فاخر کے ساتھ ہی تھا۔" فرحت نے جواب دے کر پانی بھرا، گلاس منہ سے لگا لیا۔ کھانا وہ سیر ہو کر کھا چکا تھا۔ خود ہی برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ آیا۔ اماں سے پنکھا لے کر خود جھلنے لگا اور بولا۔ "اس ایک ماہ میں بہت ساری باتیں، انہونی ہو گئی ہیں اماں جان! جو آپ سے کرنے کی تھیں مگر ایک لحاظ سے اب وہ بے فائدہ بھی ہو گئیں۔"

انہوں نے شوق اور تجسس کے عالم میں پوچھا۔

"کھل کر بتاؤ...... ایسی کیا باتیں ہیں جو پہلے تو کرنا چاہ رہے تھے اور اب ایک مہینے میں نہ کہنے کے لائق ہو گئیں۔ کہو، بے فکر ہو کر کہو۔"

ان ماں بیٹے کے درمیان دوستوں کی سی بے تکلفی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فرحت ماں کو فاخر کے رشتے کے لیے سعید صاحب کے ہاں بھیجنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی اماں کی افتاد طبع سے بھی خوب واقف تھا۔ جانتا تھا کہ وہ ایسے رشتوں ناتوں والے کام با آسانی نمٹانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ مگر بعد میں حالات ہی پلٹا کھا گئے تھے۔ تاہم اس وقت انہیں کل حالات سے آگاہ کر دینے میں اسے کوئی قباحت بھی دکھائی نہ دی۔ اپنی ایک ماہ کی طویل غیر حاضری کی وجوہات بھی تو بتانا تھیں۔ چنانچہ اس نے فاخر کے ہاں جانے سے پہلے کے تمام حالات جو کرائے کا کمرہ لینے کے بعد پیش آئے تھے، مختصراً انہیں کہہ

سنائے۔ پھر فاخر کے خیالات جو اس نے سعید صاحب کی فرزندی میں آ جانے سے متعلق کہے تھے وہ بھی بتا دیے۔ اماں جان اس کی بات بغور سن رہی تھیں۔ بیٹے کی وجہ سے وہ فاخر کو بھی مثل اپنی اولاد کے ہی چاہتی تھیں۔ اس کے متعلق ان کے خیالات اچھے تھے۔ سر ہلا کر انہوں نے تائید کی۔

"خیر ان حالات میں لڑکے کا خیال اور ارادہ کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا۔ شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکے لڑکی کی رضامندی کو ملحوظ خاطر خود ہمارا مذہب رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ فاخر تو یوں بھی سلجھی ہوئی طبیعت کا باشعور لڑکا ہے۔ مجھے تو قباحت نظر نہیں آتی۔"

ان کی شہ پا کر فرحت خوش ہو گیا۔ پُر جوش ہو کر بولا۔

"بس اماں جان! ساری گڑبڑ اس کی پرانی والی نسبت نے مچا دی۔ وہ شاید اپنے گھر میں کوشش کرتا رہا ہو گا۔ جب تک اس نے سوچ بچار کر کے مجھے آپ سے مدد لینے کے لیے تیار کیا تب تک ان کے ہاں کہیں دوسری جگہ سے کوئی مناسب رشتہ آ گیا۔"

اماں نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"اسی لیے تو میں بچپن کی منگنی، رشتے کے خلاف ہوں۔ ہمارے سارے بڑے بوڑھے اسی مزاج قاعدے کے تھے۔ بات کے متعلق ہر پہلو کو جانے بوجھے بغیر بچوں کو اپنے سخت ترین فیصلوں کا پابند کر جاتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم کہ بڑے ہو کر بچے کیسے نکلیں گے، کیسے نکلیں۔ خوش قسمت ہیں ایسے لوگ جو اندھیرے میں چلائے گئے تیروں سے فیض اٹھا پاتے ہیں۔ ورنہ تو اللہ معاف کرے رو رو کے گزرتی ہو گی۔"

اچانک انہیں اپنی بات ادھوری لگی۔ وہ دوبارہ بولنے لگیں۔

"ہاں۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ فاخر میاں، سعید صاحب کے ہاں نوکری کا اصرار تو کرتے رہے مگر اس صورت میں کہ اپنے بزرگوں کی بجائے پیغام وہ ہماری معرفت دلواتے۔ فرض کرو کہ لڑکی والے مان جاتے تب وہ اپنی دلہن کو رخصت کرا کے کہاں لے جاتے؟"

فرحت نے افسوس بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ایسا موقع تو آنے ہی نہ پایا۔ سوچا تو بے چارے نے بہت کچھ تھا۔ شروع میں تو میں بھی اس سے لڑتا جھگڑتا رہا تھا مگر پھر اس کا پکا ارادہ جان کر اس کی مدد کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔ گو کہ اپنی کم عقلی کی بناء پر میں نے بھی اس انداز سے اسے نہیں کریدا تھا مگر اب غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا یہ فیصلہ خوب ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد کیا تھا۔" فرحت تھم کر تھوڑی دیر کسی بات پر اٹکتا رہا، پھر ایک گہرا سانس کھینچ کر بولا۔ "اماں! یہ محض اتفاق ہے کہ مجھے اس کے ساتھ اس کے گھر جانا پڑ گیا۔ ورنہ میں ہمیشہ اندھیرے میں ہی رہتا۔ کیونکہ اس معاملے میں اس نے کبھی مجھے احساس ہی نہیں ہونے دیا۔"

فرحت اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ دفعتاً بجلی آ گئی۔ چھت کا پنکھا ایک دم ہی گھوں گھوں کر کے چل پڑا۔ کمرے کی فضا میں فوراً تازگی سی دوڑ گئی۔ اماں خوش ہو گئیں۔ پنکھیا انہوں نے ساتھ ہی رکھ دی۔ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر انہوں نے بیٹے کی طرف کروٹ لے لی اور بصد شوق پوچھا۔

"کیا الجھا الجھا کر بول رہے ہو...... ٹھیک طرح سے بتاؤ...... پہیلیاں مت بجھواؤ۔"

فرحت نے بلا تامل اسٹارٹ لے لیا۔

"ارے اماں! کیا عرض کروں میں آپ سے فاخر کے رہن سہن کا احوال۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ پورا

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

رئیس زادہ ہے، رئیس زادہ۔ شہر کے مضافات میں ایسی حسین و جمیل رہائش گاہ جیسے قصے کہانیوں میں ہوتی ہو گی۔ بہترین پتھر کی بنی ہوئی حویلی جس کے اطراف میں نہایت اعلیٰ درجے کی پھول پھلواری اور موسمی پھولوں سے آراستہ باغیچہ۔ اور باہر نکل جائیں تو میلوں تک پھیلی ہوئی اراضی جس میں ہر قسم کی اجناس اور فصلیں لہراتی ہیں۔ کیا تعریف بیان کروں میں وہاں کے باغات کی۔ یقین جانیے کئی مرتبہ فاخر کے ساتھ جانا ہوا تو میں حیران ہی رہ گیا۔ آموں کے اتنے گھنے باغات کہ اندر گھسو تو دن دہاڑے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ مالی لالٹین جلائے گھومتے ہیں۔ اتفاق سے مجھے یہ جولائی کا پورا مہینہ وہیں رہتے گزر گیا۔ کم و بیش ہر روز ہی بارش برستی۔ ساون کا بھرپور لطف پایا میں نے وہاں اور جی بھر کے آم کھائے۔ کیا کیا بتاؤں آپ کو۔ وہ تو فاخر کو اس دوران ملیریا بخار آنے لگا تھا ورنہ اور بھی زیادہ مزہ آتا۔ اس کے ابا میاں اور بھائی صاحب بھی بہت خوش اخلاق اور مخلص انسان ہیں۔ مالی حالات تو میری سوچ سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہیں اس لئے میرا خیال ہے کہ اس نے بھی اپنے مستقبل کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا۔"

"ہاں یہ تو تمہارا خیال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔" اماں سوچ میں ڈوب کر ابھریں۔ "ظاہر ہے پرائی بیٹی بیاہ کر لانا آسان تو نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے مستقل والدین کی لاعلمی میں۔ اول تو لڑکی والوں کو منا لینا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ دوسرے لڑکی کے بہتر مستقبل جس میں رہائش سے لے کر اس کے دیگر تمام اخراجات وغیرہ [illegible] ہوتے ہیں، ان سب ہی ضروریات کی ضمانت ہونی چاہئے ہوتی ہے۔ جبکہ ہر زمانے میں اولیت [illegible] ہے۔ اور [illegible] میں پیسے کوڑی کو۔"

فرحت جو والدہ کی صداقت آمیز گفتگو نہایت توجہ سے سن رہا تھا بڑے یقین سے بولا۔

"جی ہاں! مجھے لگتا ہے کہ فاخر نے ان معاملات پر غور کر لیا تھا [illegible]۔ اب تو بقول شاعر

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

"بہرکیف!" اماں نے نہایت فیصلہ کن انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی۔ "یہ طے ہے کہ فاخر میاں اگر ہم سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو ہم [illegible] ان کا ساتھ ضرور دیتے اور آگے جو کچھ ہوتا اس سے بھی نمٹ لیتے۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے کروٹ بدل لی۔ فرحت مسکرانے لگا۔ وہ اپنی والدہ کی افتاد طبع سے خوب واقف تھا۔

✻●✻

ساری رات موسلا دھار مینہ برستا رہا تھا۔ کڑاکے کی بجلی چمکتی رہی تھی اور سیاہ بادلوں کے پانی بھرے غول جھوم جھوم کر آئے تھے۔ جولائی کا مہینہ بھی اختتام پذیر تھا۔ شاید اس ساون کی یہ آخری بارش تھی جو ایسی دھواں دھار برسی تھی کہ سب کچھ جل تھل ہو گیا تھا۔ بادل برس برس کر تھک گئے تو جگہ جگہ سے پھٹ گئے اور گہرا نیلا آسمان دکھائی دینے لگا۔

صبح جب باغوں میں کوئل کوک رہی تھی اور منہ بند کلیاں کھل رہی تھیں تو صغریٰ دادی کمر پکڑے ڈگمگ ڈگمگ کرتی سعید احمد کے گھر کی طرف چل دیں۔ آج ان لمحوں میں ان کا دم خم، لب دم تھا۔ اسکول موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ سے آج کل بند تھے اس لئے نہ صرف یہ کہ بچے بلکہ سعید احمد بھی زیادہ تر گھر میں ہی نظر آتے تھے۔ دادی نے خود کو بیچ آنگن چارپائی پر گرا لیا اور پاٹ دار آواز میں دہائی دی۔

"الٰہی! غارت کر ڈال ہمیں ستانے والوں کو...... ہائے ہم لٹ گئے...... بے موت مارے گئے۔ یا اللہ! اب میں کیا جواب دوں اپنے بیٹے بہو کو؟"

"خدا خیر کرے۔" کہتی ہوئی سب سے پہلے امی جان دوڑیں۔ ایک ایک کر کے سب ان کے اردگرد جمع ہو گئے مگر وہ حواس میں کب تھیں۔ ململ کے دوپٹے میں منہ چھپا چھپا کر بیچ بیچ آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ سعید احمد ان کے سامنے بیٹھ گئے اور گھبرا کر پوچھنے لگے۔

"کیا ہوا اماں؟...... کچھ بتائیے تو سہی۔ خیریت تو ہے؟"

"ارے میرے لعل! خیریت کہاں ہے؟...... ہم تو لٹ گئے...... لٹ گئے ہم۔" انہوں نے اس قدر بلبلا کر، رو کر کہا کہ سب دہل کر رہ گئے۔

"ارے بیٹا!...... میرے چندا! مجھے معاف کر دے۔" اچانک انہوں نے سعید احمد کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "میں تیری بڑی گناہ گار ہوں۔ بڈھی ہو گئی مگر انسانوں کی پہچان نہ آئی۔ مجھے نہیں آ رہی سب کو کیا منہ دکھاؤں اور کیا کہوں بیٹا!"

قریب کھڑی سعدیہ کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ دادی کی روتی ہوئی صورت پہ غور کرنے لگی۔ اس کے دُکھے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"کچھ......" اتنے میں سعید احمد کی آواز گونجی۔ "بی بیا! پانی پلاؤ دادی کو۔ ٹھنڈا پانی لاؤ۔"

وہ چونک کر بھاگی اور پانی کا بھرا گلاس ان کے ہاتھ میں لا تھمایا۔

سعید احمد نے یہ وقت تمام [illegible] وہ صرف پانی [illegible]۔ بچوں کو دور ہٹنے کی ہدایت کی پھر بیوی کو اشارہ کیا۔ اس نے نہایت شیریں آواز میں [illegible] دریافت کیا۔

"اماں! کہیں رشیدن (بہو) نے تو کچھ نہیں کہا؟...... وہی بچوں پر ہو گئی ہو گی۔"

"ارے بیچاری وہ رشیدن پر۔" انہوں نے بے ساختہ [illegible] جواب دیا۔ "مجال نہیں رشیدن کی کہ میرے معاملات میں بول جائے۔ یہ آگ تو تمہاری حرافہ سمدھن نے لگائی ہے ساری۔"

"توبہ اللہ!" ان کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں آپ؟"

"ارے تو کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی۔" وہ روتا دھونا موقوف کر کے اچھل پڑیں۔ "میں تو اچھی خاصی اپنے گھر میں بیٹھی بڑیاں توڑ رہی تھی۔ نہ سان نہ گمان، نہ خیر نہ خبر۔ دیکھا تو منہ اٹھائے چلی آ رہی ہیں۔ مان نہ مان، میں تیرا مہمان۔ اے آئیں نہ آئیں، تمہارے گھر آئیں۔ میری دہلیز کا ہے کو چڑھیں؟ میرا تو دیکھتے ہی ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ شکل پہ پھٹکار برس رہی تھی کم بخت ماری کے۔ ماتو پھٹکار منوں چھٹ رہی تھی۔"

سعید احمد بھونچکا ہو کر ان کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ امی بے صبری سے چلا پڑیں۔

"اماں! خدا کے واسطے ٹھیک سے بتائیے۔ کیا ہو گیا؟"

"اے ہونا کیا تھا؟" وہ چمک کر کہنے لگیں۔ "مجھ پر تو دو دن ہو گئے یہ قیامت ٹوٹے ہوئے۔ پوتی نے کہا آپ کی کوئی ملنے والی آئی ہیں۔ سر اٹھا کر جو دیکھا تو منہ لٹکائے کھڑی ہیں۔ خیر بھئی بٹھایا، پانی پلوایا، خیر صلا پوچھی تب وہ منہ سے پھوٹیں۔ فرمانے لگیں۔

"صغریٰ چاچی! تم نے یہ رشتہ کرایا تھا، تمہی ختم کراؤ۔ کیونکہ لڑکوں کا جس تاؤ جی سے جھگڑا ٹنٹا چل رہا تھا، اب اللہ کا کرم ہے برادری کے بڑوں نے دباؤ ڈال کر صلح صفائی کرا دی ہے۔ اصل میں میرے دونوں لڑکے انہی کی دونوں لڑکیوں سے منگے ہوئے ہیں۔ اب تم جانو اپنا پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔

"اللہ سب کی بگڑی بنائے۔ ہماری تو بن گئی بھئی۔"

اتنا کہہ کر صغریٰ دادی نے دوبارہ دوپٹے میں منہ چھپا لیا اور جھپٹ کر سعید احمد کے گلے لگ کر رونے لگیں۔ لیکن اس دفعہ کسی نے بھی ان کی دلجوئی نہیں کی بلکہ کسی کو ہوش ہی نہ رہا۔ بڑے تو بڑے، بچوں کے بھی حواس جاتے رہے تھے۔

سعید احمد کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ انہوں نے بہ مشکل تمام خود کو دادی کی گرفت سے آزاد کرایا اور ادھر ادھر دیکھے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اندر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی امی جان نے دوہتھڑ سینے پر مارے۔

"ہائے، ہمارے کرم پھوٹ گئے...... یہ کون سی کرنی ہمارے آگے آگئی خدایا!"

نازیہ سکتے کے عالم میں تھی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ چھوٹے بہن بھائی سہم کر ایک دوسرے کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔ سعدیہ جو اب تک بھی چیختی اور روتی ہوئی دادی کا بہ غور مشاہدہ کر رہی تھی، ماں کی آہ و زاری کی صدا سنتے ہوئے جیسے بیدار ہو گئی۔ اس کی چھٹی حس جو کچھ پکار پکار کر کہہ رہی تھی، سچ ہو گیا تھا۔ لمحے بھر کے لیے دل شانت ہو گیا۔ روح ہلکی پھلکی ہو گئی۔ یوں لگا کسی نے بھڑکتے ہوئے الاؤ پر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی الٹ دیا ہو۔ بے چینیوں کو قرار مل گیا۔ بے تابیاں پرسکون ہو گئیں۔ خلش، چبھن، کسک اور ذہن و دل کو بے قرار و بے سکون کر ڈالنے والے احساسات مٹتے چلے گئے۔ فنا ہوتے چلے گئے۔ مگر دوسرا لمحہ ان تمام محسوسات پر حاوی تھا۔ ماں کی حالت، باپ کے ڈگمگاتے قدم، بہن کی وحشت اور چھوٹے بہن بھائیوں کی حیران سی کیفیت۔ یہ ایک کٹھن ترین اور صبر آزما گھڑی تھی۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش کی۔ یک بہ یک اس کے چاروں طرف کھل اٹھنے والے گلزار [illegible] جیسے [illegible] کی سماعت میں صور اسرافیل پھونک ڈالا۔

"شرم کی جا ہے تمہارے لیے سعدیہ! وہ خبر جو پورے گھر کے لیے باعث زحمت ہے، تم اپنے لیے باعث رحمت سمجھ رہی ہو؟ [illegible]" ضمیر کی آواز نے اسے چونکا ڈالا بلکہ جھنجوڑ دیا۔ ایک جھرجھری سی لے کر اس نے اپنی خود غرضی پر سو بار لعنت بھیجی اور سب سے پہلے نازیہ کو چونکایا اور وہاں سے اٹھا کر منہ ہاتھ دھونے کے لیے بھیج دیا۔ ماں کا بیٹے سے زیادہ برا حال تھا۔ شانوں سے تھام کر برآمدے میں چارپائی تک لائی اور اپنے نرم نرم، گداز ہاتھوں سے ان کی کمر دبانے لگی۔ بیٹی کا محبت بھرا لمس پا کر جانے کیوں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ صحن میں بیٹھی صغریٰ دادی اکیلی رہ گئیں۔ سارے میں ان کی آواز گونج رہی تھی۔

"ارے جھاڑو پھری سدھن کا منہ ٹوٹ گیا۔ اری میا! کیسے اطمینان سے کہہ گئی۔ "رسم والا سامان تم اپنا لے لو، ہمیں ہمارا دے دو۔""

امی جان نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ بچے بے بسی سے ماں اور دادی کو دیکھنے لگے۔ معاً باہر کی کنڈی بجی۔ کنڈی بجنے کی آواز ہر آواز پر غالب آ گئی۔ حمید بھاگ کر باہر گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ سر جھکائے آہستہ قدموں واپس آیا اور دھیرے سے سعدیہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"آپا! وہ کرائے دار بھیا آئے ہیں۔ چابی دے دیں۔"

سعدیہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

✻●✻

"اگر ایسی ہی عجلت ہے بیٹا! تو تم خود جا کر فاخرہ کو یہ خبر دے دو۔ پھر وہ جانے اور اس کا کام۔"

اماں جان نے فرحت سے تمام قصہ سن کر رائے دی۔

"ارے اماں! آپ اسے رہنے دیجئے۔" فرحت بہ ضد ہو کر بولا۔ اس وقت اس کا چہرہ اندرونی خوشی سے چمک رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رقص کرنے لگے۔ "اور یوں بھی فاخرہ نے سارے معاملات میں ہم ہی کو اختیار دے رکھا ہے۔ اب میں اسے منگنی ٹوٹنے کی اطلاع کرنے جاؤں۔ تب تک معلوم نہیں کیا ہو۔"

اماں کو ہنسی آگئی۔

"ارے لڑکے! دیوانہ ہوا ہے کیا؟...... یہ بھی گڑیا گڈے کا بیاہ ہو گیا کیا؟ یوں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جاتی ایسے معاملات میں۔ ابھی تو وہ بے چارے خود دلگیر و دل گرفتہ بیٹھے ہوں گے۔ تسلی سے جاؤں گی۔"

"اچھی اماں جان! یوں مت کیجئے۔ دیکھئے، آپ نے قول دیا تھا مجھے۔" فرحت نے بے حد لجاجت اور خوشامد سے کہا۔ "آپ کو نہیں معلوم یہ میرے دوست کی زندگی و موت کا سوال ہے۔ قدرت نے اپنی مہربانی سے یہ موقع خود بہ خود مہیا کیا ہے۔ اسے ضائع کرنا عقل مندی کے منافی ہوگا۔ مجھے معلوم ہے اس کے گھر والے بھی اس کے حق میں نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے تو اس نے آپ کو مختار کیا ہے۔ اس کو یہ اطلاع پہنچانے جانا وقت کا زیاں ہے۔ ممکن ہے اس اثناء میں کوئی دوسرا ہی فتنہ اٹھ کھڑا ہو۔ آپ تم اللہ کا نام [illegible] بات تو ڈال آئیے [illegible]"

"یا اللہ! کس قدر چرب زبان ہو گیا ہے۔" اماں جان نے مسکرا کر ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "ایسے جلد بازی میں نے کہیں دیکھے نہ سنے۔ اچھا بیٹا [illegible] لیکن اتنی اجازت تو دو، میں کرائے دارنی کو ساتھ لے لوں۔ [illegible] ایک [illegible] ہیں۔" وہ جلدی جلدی جائے نماز تہ کر کے کھڑی ہو گئیں۔

آج ہی تو فرحت اپنے کپڑے دھو کر لیٹنے گیا تھا تو حمید سے یہ خبر سن کر آندھی طوفان کی طرح بھاگا آیا تھا۔

کرائے دارنی جھٹ ساتھ جانے کو تیار ہو گئی اور اماں کو خوب دلاسا دیا۔

"دیکھو آنے میں کیا حرج ہے۔ مثل مشہور ہے جہاں بیری ہو، وہاں پتھر آیا ہی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں لڑکی والے بھی اعتراض نہیں کرتے۔ ظاہر ہے انسانی رشتے ناتے یونہی طے ہوا کرتے ہیں۔ انسان ہی انسان کی دوا ہوا کرتا ہے۔"

اماں جان مطمئن ہو گئیں۔

اگلے دن یہ دونوں خواتین فرحت کے ساتھ سعید احمد کے گھر جا پہنچیں۔ منگنی ٹوٹ جانے والے واقعے کے بعد اب ان کے ہاں تناؤ خاصا کم ہو گیا تھا، تاہم سعید احمد بالکل ہی خاموش ہو کر رہ گئے تھے۔ امی جان کی صورت تو اتر کر ہی رہ گئی تھی۔

اماں نے جا کر اپنا تعارف خود ہی بڑے اعتماد اور بردباری سے کرا دیا تھا۔ امی اس وقت اکیلی ہی برآمدے میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھیں۔ لڑکیاں ادھر ادھر تھیں۔ یہ سن کر کہ وہ کرائے دار لڑکوں کی والدہ محترمہ ہیں، امی نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ خندہ پیشانی سے استقبال کر کے اپنے قریب بٹھایا۔ ابھی اماں جان کی پہلی نگاہ سعدیہ پر پڑی۔ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ وہ ہینڈ پمپ چلا چلا کر کیاریوں کو سیراب کر

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

رہی تھی۔

"ابھی! یہ لڑکی ہے یا پری؟" انہوں نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کی بلند پیشانی پر دمکتا ہوا دلکش سیاہ نشان دمک دمک کر اماں جان کو لبھانے لگا۔ انہوں نے نہایت شد و مد سے سوچا۔

"مجھے یقیناً ایسی لڑکی کی ضرورت اور تلاش تھی۔ بس یہی میرے فرحت کی دلہن بنے گی۔"

وہ تصور ہی تصور میں اُسے اپنی بہو کے روپ میں دیکھنے لگیں۔

❖❖○❖❖

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

"واہ! کیا معصوم چہرہ بھی ہے۔"

اماں جان نے بھرپور تعریف کی۔ بھاپ اُڑاتا چائے کا مگ فرحت کو تھمایا اور خود اپنا کول پیالہ تھام کر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"اچھا پسند آئی آپ کو؟" فرحت نے خوش ہو کر پوچھا۔

اماں کو سعید احمد کا گھرانا بہت پسند آیا تھا۔ جب سے ہو کر آئی تھیں، خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں۔ تمتماتے چہرے سے بولیں۔

"گودڑی میں لعل ہے، گودڑی میں۔ کیسا فرحت سے بتایا ہے مولانے اسے۔ مجھے تو خدا کی قدرت نظر آئی اس لڑکی میں۔ اور ماشاءاللہ اطوار بھی پیارے۔ خدا گواہ ہے اگر تم نے منع نہ کر رکھا ہوتا تو میں اسی وقت رشتہ دے کر...... اور...... ہاں کروا کر آتی۔"

فرحت نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔

"اللہ اللہ...... اس قدر پسند آگئی آپ کو۔ یہ اندازہ نہیں تھا مجھے۔"

"خیر...... سب قدرت اللہ کی بنائی ہوئی ہیں۔" اماں جان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"مجھے اطمینان اس بات سے زیادہ ہوا کہ تم نے جیسا بتایا تھا، گھرانہ اس سے بھی بڑھ کر شریف اور سفید پوش ہے۔ فی زمانہ یہ امر خوش بختی ہے رشتہ داری میں اضافہ کرنے والوں کی۔ بچوں کو ایسی تربیت دی ہے دونوں میاں بیوی نے کہ واہ واہ، سبحان اللہ۔ سچی بات ہے میں تو بہت متاثر ہوئی ہوں۔ اتنے سادہ اور شفاف لوگ ہیں گویا آئینہ۔ چراغ اٹھا کر بھی تلاش کرتی تو نہ مل پاتے۔ مجھے تو قدرت کا اشارہ دکھائی دے رہا ہے۔ ورنہ کہاں تم لوگوں کا کرائے کا کمرہ لے کر رہنا اور کہاں آنے بہانے میرا وہاں جا پہنچنا! ایسے معقول گھرانے قسمت سے ملتے ہیں۔ چائے پینے میں تو جتنی دیر ان کے ہاں بیٹھی، ان کے رہن سہن اور طور طریقے دیکھ کر مطمئن ہوتی رہی۔ اتنی پڑھی لکھی اور لائق فائق لڑکیاں مگر غرور، نخرہ نام کو نہیں۔ اوپر سے ایسی موہنی، حسین صورتیں کہ کیا بتاؤں؟"

اماں اپنے ایجاد کردہ الفاظ میں دوبارہ تعریف و توصیف پر اتر آئیں۔ وہ لڑکیوں کے متعلق یوں وضاحت کر رہی تھیں گویا فرحت نے نہ دیکھی ہوں۔ معاً فرحت کو سعدیہ (آپا) کے ساتھ ساتھ "بچیا" یاد آگئی۔ ورنہ اماں سے یہ سارے واقعات بیان کرنے سے آج تک اسے "بچیا" بے چاری بھی یاد نہ رہی تھی۔ اس کا تذکرہ تو فاخر اور اس کے درمیان بطور مذاق ہوا کرتا تھا۔ ماں کی بات سن کر اس نے تجسس اور بے تابی سے پوچھا۔

"اماں! کیا بہت ساری لڑکیاں ہیں؟"

"ہیں تو کئی ایک۔" انہوں نے سوچ کر جواب دیا۔ "مگر مجھے جو تمہارے لئے پسند آئی، اس کا

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

جواب نہیں ہے۔ بس کیا بتاؤں؟"

"ایں!" فرحت کو کرنٹ لگا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "میرے لئے...... ہم...... میرے لئے!"

"تو اس میں ایسی حیران ہونے والی کیا بات ہے؟" اماں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ "اگر مجھے ایسا گھرانہ پہلے ہی مل گیا ہوتا تو اللہ رکھے دو تین بچوں کے باپ ہوتے۔ کاہے کو میرا آنگن اس قدر سونا سونا پڑا رہتا۔"

"اماں!...... اماں! یہ کیا فرما رہی ہیں آپ؟" فرحت کے اب تک چھکے چھوٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

"اچھا۔ تو میں نے ایسی کون سی سمجھ میں نہ آنے والی بات کر ڈالی؟" اماں نے اسے گھور کر دیکھا۔ "ایسی نیک بخت لڑکیاں دیکھی نہیں آج کل۔"

"کون سی لڑکیاں آپا؟...... کن لڑکیوں کی بات کر رہی ہیں؟" اچانک ان کی کرائے دارنی اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ہاتھ میں بڑے اہتمام سے خوان پوش سے ڈھکی ہوئی ٹرے تھامے تھی۔

"ارے وہی سعید صاحب کی لڑکیاں، جہاں آج ہم تم گئے تھے۔" اماں نے اس کی بات کا جواب دیا۔

وہ فوراً لہک کر بولی۔ "ارے ہاں...... خوب یاد دلایا آپ نے...... کیا خوب لوگ ہیں۔"

"اماں!" فرحت نے دہائی دی۔ وہ اب تک شاک میں تھا۔ "ابھی...... آپ نے مجھ سے کیا فرمایا تھا؟"

اماں مسکرا دیں اور کرائے دارنی کو مخاطب کر کے بولیں۔

"ارے بی! ذرا تم ان کی تسلی کر دو۔ ہم نے کیسی بے مثال لڑکی ان کے لئے دیکھی ہے۔ یہ ابھی تک ہمیں نادان سمجھتے ہیں شاید۔"

کرائے دارنی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"سعدیہ...... وہ جو صحن میں پائپ لگا کر کیاریوں کو پانی دے رہی تھی۔ بعد میں پانی کا جگ اور گلاس بھی لے کر آئی تھی؟"

"ارے وہی گلابی سوٹ والی۔" اماں نے بے پرواہی سے کہا۔ "کب سعدیہ، نازیہ تو کچھ یاد نہیں۔ باقی سب تم نے ٹھیک بتایا۔ ارے میں تو لڑکیوں کی اماں کا اترا اترا سا منہ دیکھ کر خاموش رہ گئی۔ ظاہر ہے ابھی انہیں پہلی بات جانے کا ہی بہت ملال ہو گا۔ ورنہ اپنا ارادہ بڑی خوشی اور چاہت کے ساتھ ان پر ظاہر کر کے اٹھتی۔ ہیں تو سب ہی پیاری۔ بس قدرتی بات ہے کہ پہلی نظر ڈالتے ہی......" وہ معلوم نہیں کیا کیا بتا رہی تھیں مگر باقی کی ساری باتیں فرحت کے سر پر سے گزر رہی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے سمجھنے بوجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو چکی ہوں۔ وہ یک ٹک ان دونوں خواتین کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جس امر کا کبھی خواب و خیال تک نہ گزرا تھا، وہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ کرائے دارنی کی تشریح جاری تھی۔

"ارے ہاں آپا!...... میں تو سب پہ غور دیکھ اور سن رہی تھی۔ سب ہی اسے سعدیہ سعدیہ کہہ کر پکار رہے تھے۔ خوب گورا گورا سا رنگ ہے۔ ماتھے پر کالا سیاہ نشان ہے۔ اس سے چھوٹی والی کا نام نازیہ ہے۔ دونوں بہنوں میں عمر کا تو کچھ خاص فرق معلوم نہیں ہوتا۔ شکل شباہت، قدوقامت، ڈیل ڈول اور بال سب کے ایک جیسے ہیں۔ ہاں رنگت کا بہت فرق ہے۔ نازیہ کی رنگت ذرا دبی سی ہے مگر آواز

بہت میٹھی اور پیاری ہے۔"

"اور تم یہ کیا لے آئیں......؟" اماں نے خوان پوش سے ڈھکی ہوئی ٹرے کی طرف دیکھ کر دریافت کیا۔

"بس کیا ہے؟ کچھ مت پوچھئے آپا!" کرائے دارنی یک بہ یک اداس ہو گئی۔ "آپ بھول گئیں! آج سے اگست کا یادگار مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ پورے سوا مہینے تک میرے گھر سے مسجد کا کھانا جاتا رہے گا۔ یہ ہماری مرحومہ ساس کی وصیت بھی ہے اور خاص تاکید بھی۔ اگست کا مہینہ ہمارے خاندان کے لئے بہت اہمیت والا ہے۔ 14 اگست 1947ء میں ہم چند لوگ ہی تو جانیں بچا کر پاکستان آ پائے تھے۔ میں اپنے سگے چچا کے ہاں بیاہی گئی۔ فسادات میں میرے ابا، چچا، ان کی دیگر اولادیں سب کی سب کام آ گئی تھیں۔ یہ مہینہ کیا آتا ہے، مجھ سارے زخم اور سارے دکھڑے تازہ ہو جاتے ہیں۔ قریبی رشتوں میں ہم دونوں کے علاوہ میری ساس یعنی چچی زندہ بچی تھیں۔ ان کا انتقال پچھلے برس ہوا ہے۔ اللہ بخشے اپنے ہاتھوں سے مسجد میں کھانا بھجوایا کرتی تھیں۔ ان کے بعد یہ فرض میرے ذمے آن پڑا ہے۔ اس وقت بھی فرحت میاں سے کہنے آئی تھی کہ یہ ٹرے نمازیوں کو پہنچا آئیں۔"

کچھ دیر بعد فرحت نے گھومتے ہوئے سر اور پراگندہ منتشر خیالات کے ساتھ خالی ٹرے لا کر اس کے حوالے کی اور خود اوپر کا زینہ چڑھ کر چھت پر چلا گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہاتھ پاؤں کا دم نکل گیا ہو۔ لیکن اب دونوں خواتین کا موضوع گفتگو بدل چکا تھا۔

***

فرحت پر نگاہ پڑتے ہی فاخر نے ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا اور بے تحاشا بھاگتا ہوا آ کر اس سے چمٹ گیا۔

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے......

"ہم نہ آتے تو آپ آ جاتے...... سرکار کے پاؤں میں مہندی لگی ہے کیا؟" فرحت نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

"ہمارے آنے کا ارادہ تو تھا......" فاخر نے ایک گہری سانس کھینچ کر جواب دیا۔ پھر اسے بغور دیکھتے ہوئے شعر پڑھا۔

"ہم کو تو درد دل ہے، تم زرد کیوں ہو ایسے
کیا میری ہی تمہیں کچھ بیماری ہو گئی ہے"

فرحت کا چہرہ فق ہو گیا۔ تاہم بات بدل کر بولا۔

"اماں تو ملتان سے آ گئی تھیں۔ کب تک ان سے دل لگاتے؟ باتیں کرتے کرتے بھی دل اوب گیا۔ اب تمہاری طرف چل دیئے۔ تم سناؤ کیسے ہو؟"

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی"

"یہ تو پرانی اطلاع ہے۔ کوئی نئی تازی سناؤ۔" فرحت نے منہ بنا کر کہا۔

"نئی تازی بھی تمہارے پاس ہو گی۔" فاخر نے معنی خیز انداز میں کہہ کر اسے بغور دیکھا۔

"ہاں...... آں...... سب خیریت ہیں۔" فرحت نے بہ مشکل تمام خود کو روکا، ورنہ دل تو سب کچھ کہہ دینے کو مچل رہا تھا۔ فاخر جو ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے جا رہا تھا، اچانک خود ہی چونک گیا اور

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

سنبھل کر بولا۔

"ارے، میری بھی بے دھیانی نہیں جاتی۔ سفر کرتے ہوئے آئے ہو، تھک گئے ہو گے۔ چلو اٹھو، نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ تازہ دم ہو جاؤ۔"

فرحت نے بھی اسی میں خیریت جانی اور دانستہ خاموشی اختیار کر لی۔ دل میں سینکڑوں قسم کے خیالات آ رہے تھے، جا رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کیوں آ گیا؟ اور اب کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہئے؟ کس طریقے سے فاخر کے کام آئے کہ حق دوستی ادا ہو۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سفر کی تکان اتارنے کے بہانے تھوڑی دیر کے لئے لیٹ گیا۔ فاخر بھی اس کا موڈ دیکھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ اس کے نکلتے ہی فرحت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھکاوٹ کے باوجود نیند کوسوں دور تھی۔ اب اسے حالات کی سنگینی کا پوری طرح احساس ہوا۔ اندر ہی اندر فکر اور ہزار اندیشوں سے اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

فاخر کا اترا اترا چہرہ اور گری ہوئی صحت دیکھ کر ضمیر ملامت کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں یہ خوشخبری فاخر کے گوش گزار کر ڈالے اور صاف الفاظ میں یہ نیا انکشاف کر دے کہ "ابا" اور "چچا" کی منگنیاں ٹوٹ چکی ہیں۔

مگر......... اس سے آگے کیا تھا.........؟ یہ سوچ کر ہی اس کے خیالات کی ڈوری الجھ پڑتی۔ وہ اپنی اماں جان کو سعدیہ کے گھر سے .... کے تحت گیا تھا اور وہ وہاں سے کیا سوچ کر اٹھی تھیں۔ بیٹا ہونے کے ناتے ان کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ جانتا تھا، جو ان کے جی میں سما جائے، وہ ہر قیمت پر کر گزرتی تھیں اور یہاں تو اب پسند کی بہو لانے کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ گو کہ اس مسئلے پر اس نے اماں کے منہ سے ایک بار بھی یہ نہیں سنا تھا مگر جیسا کہ وہ اپنی بڑی بہن سے اظہار خیال کر رہی تھیں اس کی رو سے لگ یہ رہا تھا کہ ان کا پہلا فیصلہ ہی آخری فیصلہ بھی ہے۔

حالات کے اچانک پلٹا کھا جانے سے گھر کے ماحول میں اس کی سوچیں اس قدر پریشان کن ہو گئی تھیں کہ اس نے فوراً ہی .... اختیار کر لی تھی۔ ہم آئے ہیں اماں کو سعید احمد کے ہاں جانے سے اشارتاً روک کر آیا تھا اور یوں بھی وہ بغیر فرحت کے جا بھی کیسے سکتی تھیں۔ فاخر کے ہاں آ کر بھی وہ پریشان ہو گیا تھا۔ دل سے دوست کے کام آنا چاہتا تھا۔ مگر کیسے.........؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اگرچہ فاخر کو حقیقت حال سے آگاہ کرتا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو جاتا اور فوراً واپس جا کر اس کا پہلا مطالبہ بھی ہوتا کہ اماں کو سعید احمد کے گھر بھیجو۔ ظاہر ہے اس سلسلے میں ان دونوں کے درمیان بہت پہلے باتیں طے ہو چکی تھیں۔ چنانچہ بات ادھر تو وہیں سے شروع ہو جانے کے سو فیصد امکانات تھے، جہاں پر جولائی میں ختم ہو گئی تھی۔ یہ بھی عجیب رخ تھا حالات کا!

کرنے کو تو وہ اماں سے اس سلسلے میں کھل کر بات کر سکتا تھا۔ کیونکہ خود اسی نے اماں کو تیار کر کے سعید احمد کے ہاں بھیجا تھا۔ مگر یہ کیسی الجھن تھی کہ اماں سب کچھ جان کر بھی ان کی شرافت پر اتنی مہربان ہو گئی کہ فاخر کی بجائے اپنے بیٹے کے لئے پسند کر کے آ گئیں اور وہ بھی کسے؟ سعدیہ کو.........

قدرتی بات ہے فرحت کی جان پر بن گئی تھی۔

مگر وہ چاہتے ہوئے بھی اماں کو ٹوک سکا اور نہ ہی جواب طلبی کر سکا۔ اول تو وہ اپنی اماں کے طوفانی مزاج سے واقف تھا۔ ان کو ضد یا چ میں مبتلا کرنے کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ دوسرے وہ فاخر کے گھر والوں کی طرف سے بے بھروسا تھا۔ چنانچہ یہاں آنے کا ایک اہم ترین مقصد یہ بھی تھا کہ کسی

FAMOUS URDU NOVELS

حتمی اور آخری فیصلے پر پہنچنے کے بعد کوئی ایسی صورت حال بنائے کہ فاخر کا رشتہ سعید احمد کے ہاں لگ بھی جائے اور اماں کا دل بھی نہ ٹوٹے۔

وہ ابھی اسی الجھن میں مبتلا تھا کہ معاً اس کی سماعت میں فاخر کی دلگداز آواز اور مانوس سا لہجہ ٹکرایا۔ وہ دھیرے دھیرے سُروں میں گنگنا رہا تھا اور یہ گنگناہٹ دل کے تاروں کو چھیڑتی، روح کی گہرائیوں میں اک درد ناک سا احساس جگاتی رفتہ رفتہ اسی کمرے کی طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

"تو پچھلی رت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چنتا ہوں
تو جیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں
آئی رت مجھے روئے گی
جاتی رت کا جھونکا ہوں"

اس کی بھاری سی آواز میں کچھ کھو دینے کا اداس تاثر فرحت کے پریشان دل و دماغ کو جھنجوڑنے لگا۔ اس کی قوت برداشت جواب دینے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں پکا فیصلہ کر لیا۔

"میرے لئے اتنی بڑی اطلاع کو چھپانا ممکن ہے۔ اب نتیجہ کچھ بھی ہو، میں سعدیہ کے متعلق اسے بتا کر بری الذمہ ہو جاؤں گا۔"

یہ فیصلہ کر کے فرحت سنبھل کر بیٹھ گیا اور ٹکٹکی باندھے بھڑے ہوئے دروازے کو دیکھنے لگا۔

"تو جیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں"

ان دو مصرعوں کی تکرار میں دروازے پر آ کر تھم گئی۔

"فاخر!" کہیں قریب سے ابا میاں کی بارعب آواز ابھری۔

"جی ابا میاں!" فاخر کے قدموں اور آواز دونوں کو بریک لگ گیا۔

"تم صاحبزادے فوراً نہر پار والے گاؤں چلے جاؤ۔" انہوں نے اسے باہر روک لیا۔ "ابھی ایک آدمی خبر لے کر آیا ہے کہ وہاں بلوے کا اندیشہ ہے۔ تمہیں معلوم ہے بچوں کے کسی کھیل کے وہاں آباد ہیں۔ جھگڑا تو بچوں کے آپس میں لڑ پڑنے کی وجہ سے ہوا ہے مگر اب تنازعہ بڑوں میں شروع ہو گیا ہے۔ سنا ہے ایک دوسرے کے لئے لاٹھیاں ڈنڈے جمع کئے جا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو بات بڑھ جائے۔ لہٰذا تم فوراً جاؤ اور جس طرح بھی بن پائے ان میں صلح صفائی کرا دو۔"

"ابا میاں!......... میں......... میں........." فاخر منمنایا۔

"کیوں، کیا ہو گیا؟" انہوں نے تعجب سے کہا۔ ساتھ ہی ڈانٹ بھی پلا دی۔ "کب تک تم بچے رہو گے میاں؟......... تعلیم کے ساتھ ساتھ زمین جائیداد کا حال احوال بھی دیکھتے رہا کرو۔ تمہارا شاکر (بھائی صاحب) نے ٹھیک نہیں لے رکھا ان ذمہ داریوں کا۔ آج اس کی غیر موجودگی میں تو یہ قصہ ہو گیا ہے ورنہ مجال تھی کسی کی........." انہوں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اچھا، تو فرحت کو ہمراہ لے جاتا ہوں۔" فاخر کی آواز سنائی دی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"نہیں......" ابا میاں نے دو ٹوک جواب دیا۔ "مزارعوں کے لڑائی جھگڑے میں مہمانوں کا کیا کام۔ وہ ویسے بھی تھکا ماندہ آیا ہے۔ مجھے پہلے کی نسبت سست بھی لگ رہا ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بات ہے۔ تم کو اس کے بغیر جانا ہوگا گن مین حشمت خان اور ڈرائیور تمہارے ساتھ ہوں گے۔ بس دیر مت کرو۔ باہر جیپ تیار کھڑی ہے۔ تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔"

فرحت اندر سکتے کے عالم میں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ اس نے پوری گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔ یہی وجہ تھی جب ابا میاں دروازے کا پردہ سرکا کر اندر داخل ہوئے تو وہ یک ٹک اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہیں اچانک سامنے پا کر وہ گڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور ادب سے سلام کیا۔ ابا میاں نے شفیق لہجے میں جواب دے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے ایک کرسی پر ٹک گئے۔

"اور میاں! سناؤ، اچھے تو ہو؟...... گھر میں سب خیریت ہے؟"

"جی...... جی...... اللہ کا کرم ہے۔ سب خیر خیریت ہے۔"

"تم لوگوں کا رزلٹ کب آ رہا ہے؟"

"دیکھیں...... سنا ہے اگست کے آخری ہفتے میں امید ہے۔"

"ہوں......" انہوں نے سوچ میں ڈوبے ڈوبے بھی "ہوں" کی۔ تھوڑی دیر تک گہری خاموشی طاری رہی۔ دفعتاً انہوں نے فرحت کو [illegible]۔

"یونیورسٹی میں...... فاخر کس لڑکی میں دلچسپی رکھتا ہے؟" انہوں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

فرحت کے دیوتا کوچ کر گئے۔ اسے لگا ابا میاں کی آنکھیں نہیں، ایکسرے مشین ہیں جو اس کے اندر تک جھانکنے کا ہنر جانتی ہیں۔ [illegible] وہ بہت [illegible] گزر گئے۔ فرحت سے جواب بن نہ پا رہا تھا۔ ابا میاں نے اپنا سوال دہرایا نہیں تھا، بس اطمینان سے اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے بیٹھے تھے۔ نگاہوں میں خفگی تھی یا نرمی، وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھ کر ان کا عندیہ جاننے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

پھر اچانک فرحت کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ اس کی پریشان خیالی کو راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے ڈٹ کر مقابلہ آرائی کا جواز دکھائی دینے لگا۔ اس وقت کی گفتگو اور صورت حال میں اسے تائید غیبی کا اشارہ نظر آیا۔ گو کہ مزید غور و فکر کا موقع تھا نہ وقت تاہم اس نے موقع غنیمت جانا۔ دل ہی دل میں خدا کو یاد کیا اور تمام تر حوصلوں اور جسارتوں کو یکجا کر کے کہہ گزرا۔

"ہے ایک لڑکی...... بہت شریف اور اچھے گھرانے کی لڑکی۔"

"ہوں......" ابا میاں نے ایک گہری سانس کھینچی۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کمرے کے اندر ٹہلنے لگے۔

فرحت کو اپنا آپ چور محسوس ہونے لگا۔ ان کی خاموشی پر طبیعت سہم سی گئی۔ کچھ لمحے پہلے کی خود اعتمادی متزلزل ہونے لگی۔ نظر نیچی کیے چپ بیٹھا تھا۔

"مجھے...... بہت پہلے...... فاخر کے اندر ہونے والی کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس...... بخوبی ہو گیا تھا۔" وہ ٹہلنے کے دوران شاید خود کلامی کر رہے تھے۔ "لیکن...... میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ تبدیلی درحقیقت کس نوعیت کی ہے؟...... وہ مجھے بہت بدلا بدلا سا لگنے لگا تھا۔ بہت زیادہ شوخ و چنچل تو وہ کبھی بھی نہ تھا۔ اس کے بچپن میں بھی شاید ایسا کوئی دن نہیں ہے، جب اس نے کبھی ماں کی

گود میں لیٹ کر کوئی ضد یا فرمائش کی ہو...... اس کی نسبت شاکر اپنی ماں سے بہت لاڈ اٹھوایا کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں کے مزاج اور عادات میں نمایاں تضاد رہا ہے۔ شاکر تعلیمی امور کے ساتھ ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال اور کاموں کی طرف بھی متوجہ رہا اور تعلیم سے فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد تو مکمل طور پر میرا سرگرم بازو بن گیا۔ مگر فاخر میں شروع سے ہی ایسے آثار موجود نہ تھے۔ تعلیم کے سوا کبھی اس کی دوسری کوئی ترجیح نہ ہوتی تھی۔ زمین جائیداد کی ذمہ داری سے کوسوں دور بھاگتا رہا۔ لیکن میری نظر میں یہ سب قابل گرفت نہ تھا۔ میں بچوں پر جبر کا قائل بھی نہیں رہا۔ مجھے قدرت نے کم ہی اولاد سے نوازا ہے۔ ایک بیٹی اور دو عدد بیٹے۔ اولاد جنت کا میٹھا میوا ہوا کرتی ہے۔ اور میری اولاد تو خدا کے فضل و کرم سے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ اپنی ماں اور باپ کی بھی فرمانبردار اور سعادت مند ہے۔ تو کیا میں ان کی جائز خواہشوں اور تمناؤں کو پورا نہیں کر سکتا؟...... یوں بھی میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب انہی لوگوں کا ہے۔ اس لیے کسی ظلم و ستم یا جبر و تشدد کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جولائی میں جب فاخر تمہارے ساتھ یونیورسٹی سے آیا تو آتے ہی بیمار ہو گیا تھا۔ اس لیے میں زیادہ غور نہ کر سکا۔ تاہم تمہاری واپسی سے ایک دن قبل تم دونوں کی آپس میں ہونے والی گفتگو اتفاقاً میں نے سن لی تھی۔ اس سے قبل کہ میں تم [illegible] جا چکے تھے۔ ان دنوں میں نے شدت سے محسوس کیا کہ...... فاخر کی شخصیت بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ سے کم گو رہا ہے مگر ان دنوں بہت زیادہ [illegible] اور الجھا الجھا [illegible]۔ گھر کے اندر بہت کم گیا۔ اس کی والدہ مجھ سے بہت دفعہ شکوہ کرتی رہیں مگر میں نے [illegible] فاخر سے باز پرس نہیں کی۔ جب وہ کسی سے کچھ نہیں کہتا، کچھ نہیں طلب کرتا تو اسے کیا [illegible] کی دنیا سے برآمد ہوتا تو ادھر ادھر گھومتا گنگناتا رہتا۔ ایک مصرعہ تو اس کا [illegible] ہر وقت اس کی زبان پر رہتا ہے...... تو جیون کی ہری بھری گلی...... آخر اس کے جیون پر کیا بیت گئی [illegible] تم مجھے مکمل کر جاؤ گے؟ میں تم سے اس "ہری گلی" کی مفصل معلومات چاہتا ہوں۔"

فرحت جو سکتے کے عالم میں منہ کھولے ابا میاں کی غیر متوقع اور حیرت انگیز تفصیلات سن رہا تھا، اپنا نام سن کر ہوش و حواس کی دنیا میں آ گیا۔ وہ اسے منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ گو کہ اس کے دل کے دھڑکنے کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا تاہم اسے یقین ہو چکا تھا کہ بالآخر وہ لمحہ آ پہنچا ہے جب ہر نوعیت کی پردہ داری فضول تھی۔

جب وہ تمام داستان فاخر اور سعدیہ سنا چکا تو اسے یوں محسوس ہوا گویا ایک وزنی بوجھ سے نجات مل گئی ہو۔ دل و دماغ ہلکے پھلکے ہو گئے۔ لیکن دوسری جانب ایک جامد سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ ہر بات کا پہلے سے ہی ٹھیک ٹھیک اندازہ ہونے کے باوجود ابا میاں چپ کے چپ رہ گئے۔ آنکھوں میں کسی شدید کشمکش کے آثار نمایاں تھے۔

فرحت نے جھجکتے ہوئے اپنی اماں جان کا قصہ بھی گوش گزار کر ڈالا تھا۔ جسے سن کر وہ دھیرے سے مسکرا کر بولے تھے۔

"ظاہر ہے، محبت کرنے والی ماؤں کی پہلی ترجیح اپنی اولاد ہوا کرتی ہے۔"

ان کے تبصرے سے فرحت کو پہلی مرتبہ قدرے اطمینان کا احساس ہوا۔ ابا میاں خاصی دیر تک تمام قصے کے ہر پہلو پر غور کرتے رہے اور دل ہی دل میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ فاخر کی سچائی اور نیت کی طہارت میں انہیں کوئی شبہ نہ تھا۔ بالآخر انہوں نے کھنکار کر فرحت کو مخاطب کیا اور

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

صاف لہجے میں گویا ہوئے۔

"قافر کے علم میں ابھی کوئی بات لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے پہلے تم میری ملاقات کا بندوبست اپنے ان عزیز (ہیڈ مدرس) صاحب سے کرو جو سعید صاحب کے دوست بھی ہیں۔"

"جی بہت بہتر۔" فرحت حیرت زدہ بھی تھا اور خوش بھی۔

⌘●⌘

"منہاج الدین! یہ تم ہو......؟"

خلاف معمول ابا میاں کافی اونچی آواز میں بولے تھے۔ ہیڈ مدرس صاحب نے اپنے بالکل مقابل کھڑی شخصیت کو نیچے سے اوپر تک بغور دیکھا اور فوراً ہی حیرت اور مسرت سے بے ساختہ چلائے۔

"یاور حسین!...... میرے دوست...... میرے بھائی!"

ان کے حلق سے ایک گرج دار قہقہہ بلند ہوا۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سے تیر کی طرح لپکے اور گرمجوشی کے ساتھ ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے۔ قریب کھڑا فرحت یہ ناقابل یقین واقعہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ملاحظہ کر رہا تھا۔ مارے حیرت کے [illegible] جھپکنا بھول گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرے کی محدود فضا میں بھونچال سا آ گیا۔ ابھی ابھی تو وہ ابا میاں کے ساتھ ہیڈ مدرس صاحب کے ہاں آیا تھا۔ ان کا ارادہ ان دونوں کو [illegible] گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد حالات سکون پذیر ہوئے تو ابا میاں نے فرحت کی [illegible] شاباش دی۔

"واہ میاں! تم نے تو ہم دونوں کو ملا ڈالا۔ اسے کہتے ہیں نیک نیت کا خلوص اور منہ مانگی مراد۔" [illegible] دوست کو اچانک اپنے گھر میں دیکھ کر وہ پھولے نہ سما رہے تھے۔ منہاج الدین صاحب خوشی خوشی اندر باہر بھاگے پھر رہے تھے۔ ابا میاں کے منع کرتے کرتے کھانے کا انتظام کر لیا۔ بیٹھے خوشبو دار آموں سے [illegible] کے سامنے بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے اور مسکراہٹوں کے پھول بکھیر رہے تھے۔

فرحت کی حیرت میں کمی واقع ہوئی تو اس نے اپنے گھر چلے جانے کی کوشش کرنا چاہی مگر ہر دفعہ ابا میاں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"میاں! کیا تمہیں یہ معلوم کرنے کی بھی جستجو نہیں کہ ہماری دوستی......" ہیڈ مدرس منہاج الدین نے ان کی بات کاٹ دی اور اپنی مخصوص گرج دار آواز میں گویا ہوئے۔

"برخوردار! تم کتنا دماغ لڑاؤ گے۔ ہماری دوستی تقسیم ہند سے بھی پہلے کی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے لنگوٹیے یار ہیں۔ زمانہ تعلیم سے دوستانہ ہے ہمارا۔ تحریک پاکستان میں ہم نے شانہ بشانہ اور قدم سے قدم ملا کر حصہ لیا ہے۔ صعوبتیں اور مصائب ہنس کھیل کر اٹھائے ہیں۔ حتیٰ کہ......"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر خالی پیالی رکھی اور ابا میاں کی طرف زوردار آواز میں ہنستے ہوئے دیکھ کر چلائے۔ "یار! یاد ہے وہ گولے کا ڈبا؟"

ابا میاں کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹوں کی کلیاں چٹک اٹھیں لیکن وہ زبان سے کچھ نہیں بولے۔ اسٹارٹ دوبارہ انہوں نے ہی لیا۔

"بیٹے برخوردار! اعلان پاکستان ہوتے ہی ہم جیسوں کی جان کے لالے پڑ گئے۔ پتہ نہیں کیسے

بچے اور کیسے ہم نے جان بچائی اور بہ مشکل تمام پچاسوں خونی نگاہوں سے بچتے بچاتے اسٹیشن پہنچے میں کامیاب ہو گئے اور ہزاروں جان جوکھم کے بعد گولے کے ایک ڈبے میں بیٹھ کر پاکستان کی طرف عازم سفر ہوئے۔ اس یادگار دن کے محسوسات آج بھی تازہ ہیں۔ مجھے تو آج اپنے اس بچپن کے دوست یاور حسین کو دیکھ کر ماضی کے سارے بیتے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے تصویر کی طرح گھومتے نظر آ رہے ہیں۔"

اس دفعہ ابا میاں بول پڑے۔ ان کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"کتنی ان تھک محنت اور بیش بہا قربانیوں کے عوض یہ پاک سرزمین ہمیں نصیب ہوئی ہے اور کس کس آگ کے دریا کو عبور کر کے اس دھرتی کو چھونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے؟ نئی نسل کو ان دشواریوں کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اگر صحیح معنوں میں ہمارے بچوں کو اس کا ادراک ہو جائے تو وہ ہر لمحہ سجدہ شکر ادا کرتے نہ تھکیں۔ غلامی کا طوق اتار پھینکنے میں ایک طویل مدت کی جدوجہد اور لاکھوں ہستی اور عزیز از جان زندگی بھر کے اثاثوں کی قربانیوں کا دخل ہے۔ ہمارے بچوں کی یہ خوش نصیبی ہے کہ انہیں بنا بنایا گھر مل گیا ہے جہاں انہیں ہر طرح کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ اپنے آباؤ اجداد سے پوچھو جنہوں نے آزادی کے [illegible] چراغ اپنے لہو سے [illegible] کے روشن کیے ہیں۔ اگست 47ء میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جو صحیح سلامت اپنے [illegible] کی سلامتی کے ساتھ پاکستان تک پہنچ جانے میں کامیاب ہو سکا۔ مگر یہاں [illegible] سکون کا سانس لیا۔ ہم دونوں دوست بھی آزمائش کی اس گھڑی میں اپنے [illegible] بے شمار زخم اپنی روحوں میں اتارنے کے بعد سرخرو ہوئے ہیں...... اپنے [illegible] بھی ان پیارے اور دائمی محبت کرنے والے رشتوں کو کون فراموش کر سکے گا۔"

ابا میاں کی بڑی بڑی [illegible] آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ کچھ ایسا ہی حال منہاج الدین صاحب کا بھی تھا۔ فرحت دونوں بزرگوں کے درمیان حد درجہ متاثر سر جھکائے بیٹھا تھا کہ ابا میاں کو [illegible] کوئی بات یاد آ گئی اور انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"ارے! [illegible] یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تم آج تک کہاں تھے؟ میری کھوج کیسے لگی تمہیں؟...... تمہیں کیمپ میں جو [illegible] تھیں [illegible] اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ تم شہر کی بجائے ابھی [illegible] آباد ہو گئے تھے۔ کراچی میں میری تمہاری جو ملاقاتیں بعد میں بھی کبھار ہوتی رہی ہیں ان میں تفصیل معلوم کرنے کا بھی موقع ہی نہیں مل سکا۔ اور آج تو میرا خیال ہے کئی برسوں بعد ملے ہیں ہم!"

"ہماری آج کی ملاقات ان کی مرہون منت ہے۔" ابا میاں نے فرحت کی طرف اشارہ کیا۔

"اپنے فرحت میاں!" منہاج الدین صاحب نے تعجب سے اسے دیکھا۔ فرحت مسکرانے لگا۔

"یار! حیرت ہے۔" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بڑبڑائے۔ "میری بے خبری ملاحظہ ہو کہ برابر انہیں دیکھ بھی رہا ہوں، باتیں بھی کر رہا ہوں مگر یہ نہیں سمجھ رہا کہ یہ تمہارے ساتھ آئے ہیں یا تم ان کے ساتھ آئے ہو؟...... ان کی خیر صلا پوچھی نہ حال احوال لیا۔" فضا میں ایک دم ہی خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔

"ٹھہرو بھئی! یہ تمام داستان آپ کو ہم سناتے ہیں۔" ابا میاں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فرحت نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور خود بھی ہمہ تن گوش ہو گیا۔ تمام

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بات سن لینے کے بعد منہاج الدین صاحب نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا جو ان کی دلی مسرت کا غماز تھا۔ پھر گویا ہوئے۔

"اس کو کہتے ہیں جوڑ سے جوڑ ملنا۔ میں کہتا ہوں یاور حسین! جس سعید احمد کی تفصیل تم پوچھ رہے ہو، اس سے فقط ایک ملاقات تو کر کے دیکھو۔ میرا تم سے دعویٰ ہے کہ تم گویا اپنے آپ سے ہی ملو گے۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا تھمے، پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگے۔

"تم یہاں، کراچی شہر میں بڑھتی ہوئی مہنگائی اور گھٹتے ہوئے وسائل کے درمیان ہر وقت ضروریات زندگی سے برسرپیکار اس جواں ہمت باپ کے متعلق سوچو جو سات آٹھ افراد خانہ کا کفیل ہو۔ تمہیں وہ کیسا لگے گا یاور! لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اس جیسا مثالی اور پُرسکون گھرانہ کہیں نہ پاؤ گے، جس کا بچہ بچہ قناعت پسند اور صابر و شاکر ہے۔ زیورِ تعلیم سے آراستہ اور سعادت مند ہے۔ میں گزشتہ پینتیس برس سے سعید احمد اور اس کے گھرانے سے آشنا ہوں۔ اس کی بچیوں کا جہیز اور اثاثہ ان کی تعلیم و تربیت اور ہنرمندیاں ہیں۔ میری دلی دعا ہے اللہ تمہارے ارادے میں برکت اور سچائی ڈال دے۔ قادرِ مطلق تمہیں ان کا قدرشناس بنا دے۔ اتفاق کی بات ہے کہ آج کل سعید احمد بہت زیادہ فکرمند اور ملول ہے۔ اتنا خاموش میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ میری اہلیہ کا ان کے ہاں آنا جانا ہے۔ بتاتی ہیں ان کی دو بڑی بچیوں کے رشتے طے ہونے تھے جو آناً فاناً ختم بھی ہو گئے۔ سعید احمد نے اس واقعے کا بہت گہرا اثر لیا ہے۔ گھر میں ان کی بڑی بیٹی بھی پریشان ہیں۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا ہے کہ یہ سب کچھ ان گرمی کی تعطیلات کے دوران ہوا ہے اس لئے میں تمام عرصے سے بے خبر رہا۔ ابھی پرسوں تو اسکول کھلے ہیں۔ اسی دن سعید احمد کی صورت نظر آئی۔ کل اس کی دو روزہ چھٹی کی درخواست آ گئی ہے اور ایسا میری یادداشت میں پہلی بار ہوا ہے [illegible] کچھ حالات معلوم ہوئے۔ شام کو اس کے ہاں جانے کا قصد کر رہا ہوں۔"

ابا میاں نے متاثر ہو کر کہا۔ "یہ تو تم نے خوب ہی سنائی۔ برائے مہربانی اس ملاقات میں ہمیں بھی شامل کر لو۔ لیکن ایک بات تو بتاؤ [illegible] سعید احمد سے کہ تم نے ان سے عزیز داری نہیں بڑھائی؟"

منہاج الدین صاحب کھل کر مسکرائے۔

"بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔ مگر برادرم! اولادِ نرینہ میں قدرت نے ہمیں صرف یہی واحد بچہ عطا فرمایا ہے۔ معراج الدین۔ بڑی تینوں بیٹیوں کے فرض سے ہم سبکدوش ہو چکے ہیں۔ ہماری اہلیہ بھی معراج الدین کے لئے سعید احمد کے ہاں حاضر ہونے کی متمنی ہیں۔ لہٰذا...... اب ایسا کریں گے آگے تم، پیچھے ہم دستِ سوال دراز کئے چلتے ہیں۔"

"بسر و چشم۔" ابا میاں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "ہم تیار ہیں۔"

اس پر منہاج الدین صاحب بہت سنجیدہ ہو کر کہنے لگے۔

"یار! ایک بات کھل کھلا کر کہہ دینا چاہتا ہوں۔ صرف اس لئے کہ سعید احمد کو میں اس کی جوانی سے دیکھتا پرکھتا آ رہا ہوں۔ آدمی بہت حساس اور کم گو ہے۔ بہت شریف النفس اور سادہ لوح۔ اس کا گھرانہ ایک سفید پوش گھرانہ ہے۔ اس کا پس منظر صرف اتنا ہے کہ وہ تقسیم پاک و ہند کے وقت اپنا پورا خاندان قربان کر کے فقط ایک والدہ کے ہمراہ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ ہندوستان میں اس کا خاندان کن بلندیوں پر فائز تھا یا نہیں لیکن اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ صرف اور صرف اپنے زور

بازو سے کیا۔ اس کے مزاج میں کسی طرح کی ریاکاری اور سازش نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے فی زمانہ سادہ لوحی کس حد تک ترقی اور جدید زندگی کی آسائش حاصل کر سکتی ہے۔ بس ایسا ہی اس کا گھرانہ بھی ہے۔ جہاں تمہیں شرافت، پاکبازی، رکھ رکھاؤ اور دیانت داری تو نظر آئے گی مگر دولت کے انبار اور دنیاوی نام و دھام نظر نہیں آئے گا۔ یاور حسین! یہ سب خدا گواہ ہے میں اس لئے نہیں کہہ رہا کہ خدانخواستہ مجھے تمہاری نیت پر کوئی شک ہے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ دور میں لڑکی کے گھرانے، تعلیم، سلیقے اور بسا اوقات اچھی سیرت، صورت اور بہترین کردار تک کی قدر و قیمت اس وقت کچھ وقعت نہیں رکھ پاتی اگر فقط ان کے باپ کی حیثیت مضبوط نہ ہو۔ بعض جگہ رشتے، باپ کی بلند ساکھ، اونچا مرتبہ اور معاشرے میں سماجی مقام کا تعین دیکھ کر طے ہونے لگے ہیں۔ رشتے داری بانا ایک نیلام گھر بن چکی ہے۔ کوئی بھی بولی مالی تحفظات کی بہتات اور اعلیٰ ترین و مہنگے سے مہنگے جہیز کو جانچے بغیر نہیں لگائی جاتی......"

"استغفر اللہ!" ابا میاں نے ہاتھ ہلا کر انہیں خاموش کرا دیا اور فیصلہ کن الفاظ میں بولے۔ "ایسا کچھ بھی نہیں ہے منہاج الدین!...... میرا اب کچھ میری اولاد کا ہی ہے۔ اس وقت ایک دوسرا مسئلہ بھی درپیش ہے۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے فرحت کی اماں جان کا لڑکوں کے اصرار پر سعید احمد کے ہاں جانا اور ان کے بدلتے خیالات کی روداد سب کہہ سنائی۔ منہاج الدین صاحب ایک دفعہ پھر گرج گرج کر قہقہے لگانے لگے۔ ان کی گونج دار آواز سے در و دیوار گونجنے لگے۔ وہ پیٹ پکڑ کر ہنس رہے تھے۔

"اماں! دیکھا طوفانِ بدتمیزی ہے۔" ابا میاں نے کھسیا کر کہا۔ فرحت بھی انہیں حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ کھل کر ہنس چکے تو رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولے۔

"مجھے اس لئے ہنسی آئی کہ [illegible] بن گئی کہ یک نہ شد، دو نہ شد، تین شد۔"

ابا میاں بھی ہنس پڑے اور کہنے لگے۔

"اسی لئے تو کہتے ہیں کہ لڑکیاں تو گھر میں [illegible] ہوتی ہیں جہاں ہر طرح، ہر وضع کا پھل آ سکتا ہے۔"

"سچ فرمایا آپ نے۔" منہاج الدین صاحب کو پھر ہنسی آ گئی مگر چلا کر نہیں، دھیرے سے۔ فرحت دل ہی دل میں دونوں دوستوں کی نوک جھونک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ فاخر بے حساب یاد آ رہا تھا۔ وہ جس سے چھپ کر بھاگ لیا تھا مگر بہت خوش تھا۔

دونوں صاحبان کے درمیان نہایت نیچی آواز میں کوئی مشورہ طے پا رہا تھا۔ فرحت بظاہر "ہمدرد صحت" کے مطالعے میں مصروف تھا۔

⌘●⌘

تین اگست کی شام اپنی سانولی زلفیں در و دیوار پر نچھاور کرنے کو بے قرار ہے۔ گزرتے لمحوں کی پائل چھما چھم بج رہی ہے...... فرحت کے گھر کا سرخ چھوٹی چھوٹی قصوری اینٹوں سے جڑا صحن یہاں سے وہاں تک صاف ستھرا پڑا ہے۔ باورچی خانے کے قریب گھڑونچی میں پانی سے لبالب بھرے گھڑوں پر پڑے موتیے کے پھولوں سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ برآمدے میں بچھے تخت پر صاف ستھری چاندنی پر اُجلے اُجلے گاؤ تکیے رکھے ہیں۔ موسم نہ خنک ہے نہ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کرم۔ بس جی کو بھلی لگنے والی رُت کا سماں ہے۔

معاً گھر کے سناٹے میں باہر کسی گاڑی کے رُکنے کی آہٹ اُبھری۔ فرحت تیزی سے چلتا ہوا ڈیوڑھی سے نمودار ہوا اور اماں جان کو خبردار کر کے اسی عجلت سے واپس چلا گیا۔ اماں جان نے اپنے غرارے کے پائنچے سنبھالے اور قریبی کمرے کی چلمن اٹھا کر اندر چلی گئیں۔ یہاں بید کی بنی ہوئی ایک کرسی رکھی تھی جس کے سامنے مونڈھے پر ان کا بڑا سا قلعی دار پاندان رکھا تھا۔ وہ بڑی تمکنت کے ساتھ وہیں بیٹھ گئیں۔

ذرا سی دیر میں منہاج الدین صاحب کھنکارتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے عقب میں ابا میاں نظریں نیچی کیے چل رہے تھے۔ فرحت ان دونوں حضرات کی رہنمائی کرتا ہوا برآمدے میں لے آیا۔

آداب و تسلیمات کے بعد نشست کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ فرحت دوپہر میں آ کر اماں جان کو ضروری حالات سے آگاہ کر چکا تھا اور ان کی آمد و ملاقات کی اجازت لے چکا تھا۔ انہیں بٹھا کر دوڑا گیا اور تازہ کیا ہوا حقہ لا کر ان کے بیچ دھر دیا۔

منہاج الدین صاحب نے لمحہ بھر غور کیا پھر ایک بلند و بانگ قہقہے کے ساتھ حقے کی نے اپنی طرف گھمائی۔ ان کی گونج دار آواز سارے [illegible] میں گونج گئی۔

"کیا یاد دلا دیا برخوردار تم نے۔۔۔۔ یہ اپنے لیاقت علی خان (فرحت کے ابا) کا مشہور زمانہ حقہ ہے نا! جس کے بغیر ہم ایک پل بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ صد افسوس! حقہ تو ہے، پینے والا نہیں ہے۔"

ان کی آواز بھرا گئی۔ ضبط کی کوشش میں ابا میاں کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ چلمن کی اوٹ میں اماں جان کے کلیجے پر گھونسا لگا مگر بڑے حوصلے والی خاتون تھیں۔ چپ سادھے پان کی گلوریاں بناتی رہیں۔ دونوں حضرات حقے کی [illegible] اماں جان نے گلوریاں تیار کر لیں تو فرحت نے خاصدان باہر پہنچا دیا۔ انہوں نے ایک ایک گلوری کلے میں داب کر آداب عرض کیا۔

منہاج الدین صاحب نے جلدی جلدی دو تین کش لے کر نے ابا میاں کی طرف پھیر دی اور بہت متانت سے کہنے لگے۔

"بھائی جان! اس موقعے پر اب مناسب ہو گا کہ میں ان کا تعارف کرا دوں۔۔۔۔۔ یہ ہیں یاور حسین۔ اپنے لیاقت علی خان، یہ اور میں، ہم تینوں ہی ہم مکتب و ہم نوالہ و ہم پیالہ گہرے دوست رہے ہیں۔ آج صبح سو کر اٹھتے وقت میرے تو کہیں وہم و گمان تک میں نہ ہو گا کہ آج کا دن اس قدر یادگار اور مبارک ہو سکتا ہے کہ عہد ماضی یوں یاور حسین کی صورت میں مجسم ہو کر سامنے آئے گا کہ ہم سب بچھڑے ہوؤں کو یکجا کر جائے گا۔ گو کہ اس وقت لیاقت علی خان ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر یہ کیا کم ہے کہ آپ اور اس کی سب سے اہم نشانی فرحت میاں موجود ہیں۔ جس زمانے میں آپ کی شادی نہیں ہوئی تھی مگر آپ لوگ دلی ہی میں رہتے تھے، تقسیم پاک و ہند سے پہلے، اس وقت سے ہم تینوں کے درمیان دوستی کا رشتہ استوار تھا۔"

ان کے خاموش ہوتے ہی ابا میاں نے چونک کر دریافت کیا۔

"کیا بھائی صاحب بھی۔۔۔۔۔ دلی کی ہیں؟"

اماں جان، جن کا دل آج بار بار اپنے مرحوم شوہر کا ذکر سن کر پہلے ہی پگھلا جا رہا تھا، اب دلی کا نام سن کر رو دیں۔ بے اختیار شعر پڑھا:

"جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے"

یہ سننا تھا کہ یاور حسین کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ماحول ہی بدل کر رہ گیا۔ کسی نے کلیجا چٹکی سے مسل ڈالا تھا۔ درد دل تھما تو منہاج الدین صاحب نے دوبارہ ذکر نکالا۔

"بھائی جان! اپنے یاور حسین کا دوسرا تعارف یوں ہے کہ۔۔۔۔۔ یہ فرحت میاں کے دوست فاخر حسین کے پدر بزرگوار بھی ہیں۔ قدرت کے انتظامات ملاحظہ ہوں کہ باپوں کا دوستانہ تھا تو آگے اولادوں کو بھی اس پائیدار تعلق میں باندھ دیا اور ایک نہایت مناسب موقع پر آ کر تمام واقعات کی گرہ اس طرح کھلی کہ آج ہم سب ایک دوسرے کے سامنے ہیں۔ کاش کہ آج لیاقت علی ہمارے درمیان موجود ہوتا تو یقیناً یہ تمام باتیں اس سے ہوتیں۔ ویسے آپ اس کی قائم مقام ہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں سارے اختیارات آپ کو جاتے ہیں۔ ہماری توقعات آپ سے وابستہ ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ان کے بچے کی خوشیاں لوٹانے میں مددگار بلکہ مونس و غمخوار ثابت ہو سکتی ہیں۔"

چلمن کے پیچھے بیٹھی ہوئی اماں جان نے ان کی بات پر غور کیا اور ان کے لبوں پر ایک معنی خیز تبسم رینگ گیا۔ مگر وہ خاموش رہیں۔

اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کو رکے پھر بہت سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"ان تمام احوال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ۔۔۔۔۔" انہوں نے نہایت مناسب اور چنے ہوئے الفاظ میں پوری حکایت کہنی شروع کر دی۔ گو کہ اماں جان ساری تفصیل تشریح اور وضاحت سے واقف تھیں، تاہم انہوں نے ٹوکنا غیر مناسب جانا۔ تحمل سے ان کا بیان سنتی گئیں۔

نزدیکی حصوں کے گرد لپٹی ہوئی عشق پیچاں کی بیل میں پوشیدہ فرحت کان لگائے سب سن رہا تھا اور دل ہی دل میں [illegible] جا رہا تھا۔ آج دن بھر کے واقعات اسے ایک طویل خواب کی مانند لگ رہے تھے۔

منہاج الدین صاحب خاموش ہوئے تو گھر کی فضا پر ایک گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ باورچی خانے سے برتنوں کی آوازوں [illegible] اماں جان کے حسب ہدایت مصروف تھی۔

ابا میاں اور منہاج صاحب نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ اماں جان کی خاموشی دونوں کو مضطرب کر رہی تھی۔ حقہ بھی خاموش تھا۔

"بھائی جان! ویسے تو آپ اپنی مرضی کی مالک و مختار ہیں۔ ظاہر ہے ایسے معاملات میں ہر کوئی اپنی اولاد کے لیے خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو میری تجویز سے اختلاف ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو میں آپ سے معذرت خواہ ہوں کہ آپ کا دل دکھایا۔"

چلمن کی اوٹ سے اماں جان کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

"فرو!۔۔۔۔۔ فرو!" دفعتاً انہوں نے فرحت کو پکارا۔ اس کے ہاتھ تازہ گلوریاں بھجوائیں، خود بھی ایک گلوری منہ میں رکھی۔ پھر نہایت ٹھہرے ہوئے انداز میں گویا ہوئیں۔

"منہاج بھیا! آپ نے یہ کس طرح اندازہ کر لیا کہ مجھے آپ کی رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے؟ کسی معاملے میں خاموشی کا مطلب دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ گو کہ مجھے ہرگز معلوم نہ تھا کہ فاخر میاں سے درحقیقت ایسی گہری اور قریبی قرابت داری نکل آئے گی۔ تاہم قدرتی طور سے ہم اس بیٹا کو اس سے

Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

محبت اور انسیت رہی ہے۔ میں اسے مثل اپنی اولاد کے چاہتی ہوں۔ لہٰذا اس صورت میں جب کہ فرحت نے فاخر میاں کا عندیہ میرے کان میں ڈال دیا تو کیسے ممکن تھا کہ میں وعدہ خلافی یا بدعہدی کرتی؟...... میں سمجھتی ہوں ایسا فعل میری شرافت اور وقار کے منافی ہوتا۔"

منہاج الدین صاحب حیران رہ گئے۔ "تو کیا...... فرحت نے غلط بیانی سے کام لیا ہے؟"

فرحت بوکھلا کر ان کی صورت تکنے لگا۔

اماں جان ایک بار پھر ہنس پڑیں۔

"دھیرج...... دھیرج بھیا! رائے زنی میں محتاط رہیے۔" ایک لمحہ توقف کر کے وہ نہایت متانت سے گویا ہوئیں۔ "سعید صاحب کی بڑی بیٹی کو بلاشبہ میں نے پہلی نظر میں ہی پسند کر لیا تھا لیکن...... فاخر میاں کے لیے۔"

فرحت کے سر پر کسی نے پہاڑ دے مارا۔ وہ دیدے پھاڑ کر رہ گیا۔ سٹی تو ابا میاں اور منہاج صاحب کی بھی گم ہو گئی۔ اماں جان نے سب کی حیرت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کمال اطمینان سے کہا۔

"منہاج بھیا! اور خصوصاً بڑے بھائی صاحب! آپ سے یہ کہنے میں، میں قطعاً جھجک محسوس نہیں کر رہی کہ لاکھ کسی کو بھی اپنی اولاد کی مثل چاہا جائے مگر شادی بیاہ کے معاملات اس قدر نازک ہوتے ہیں کہ بغیر حقیقی والدین کے طے ہوتے اچھے معلوم ہوتے ہیں نہ ہمارا مذہب اور رسم و رواج اس پابندی سے آزاد کرتے ہیں۔ اور یہی بات ہے جو بچوں کو رب کی دعاؤں اور خوشیوں کے سائے میں بندھے ہی سجتے ہیں۔ آپ بتلائیے کیا میں نے غلط کہا؟"

"ہرگز نہیں۔" دونوں صاحبان کی زبان سے بیک وقت نکلا۔ ابا میاں تو ان کی معاملہ فہمی اور وضع داری پر ششدر رہ گئے۔ ان کی دوراندیشی سے مطمئن ہو کر انہوں نے دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔

"یہاں سب سے گمبیر مسئلہ یہ تھا، جیسا کہ مجھے فرحت کی زبانی معلوم ہوا کہ فاخر میاں کی وجہ سے یہ معاملہ اپنے گھر والوں کے بیچ نہیں رکھ پا رہے تھے یا دوسرے لفظوں میں کہا جائے یوں بھی کہ انہیں یقین نہیں تھا کہ گھر سے ہاں ہو گی۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دل بیٹھا جاتا تھا کہ بچے نے چاروں طرف سے کس قدر ناامید ہو کر مجھ سے آس لگائی ہو گی؟ سعید صاحب کا گھرانہ دیکھ لینے کے بعد تو میری فاخر سے ہمدردی دوچند ہو گئی۔ ان لوگوں کا قاعدہ قرینہ اور ماں بیٹیوں کی عادات و مزاج اور دیگر خوبیوں پر خدا گواہ ہے میں دل و جان سے لٹو ہو گئی۔ لیکن اندر ہی اندر پھر دھکڑ لگی ہوئی تھی کہ یہ بیل کس طرح منڈھے چڑھے گی؟ اول تو یہ کہ گھر والوں کی غیر موجودگی میں اگر میں ابتدائی اقدام کروں بھی تو کیونکر؟ پہلی بار ہی ان بچیوں کے ساتھ جو ہوا، وہی ستم کیا کم تھا کہ میں جانتے بوجھتے ان پریشان حالوں کو کشمکش میں مبتلا کرنے کے لیے ایسا رشتہ لے پہنچتی، جس میں لڑکے کے اللہ رکھے والدین ہوتے ہوئے بھی ناموجود ہوتے۔ اللہ ہر بیٹی والے کا بھلا کرے۔ ان معاملات کا کم از کم میرے ضمیر پر بے حد بوجھ تھا۔ چنانچہ بہت غور کرنے کے بعد میں نے جو ترکیب کی اس کے نتیجے میں فرحت سیدھا آپ کے ہاں جا پہنچا۔ حالانکہ یہ بہت خطرے والی بات تھی مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے مولا سے لو لگائی۔ نوافل کی منت مانی، ہر نماز کے بعد اللہ سے دعا کرتی رہی کہ خدایا! تو ہی سب کچھ بہتر کرنے والا ہے۔ میری نیت میں کھوٹ نہیں ہے۔ یہ تو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ فرحت آپ کے ہاں جا کر کس طرح اس بات کو کھولے گا، ایک بہت بڑا سوالیہ نشان یہ بھی سر پر

ننگی تلوار کی طرح آنکھوں پر لٹکا رہا کہ کہیں جذباتی ہو کر فرحت جاتے ہی فاخر سے نہ سب کچھ کہہ ڈالے۔ تب کیا ہوگا؟ ان کے دل و دماغ پر کیا گزرے گی؟ تاہم اس وقت آپ لوگوں کو دیکھ کر یقین آ رہا ہے کہ میرے رب کی رحمت کس قدر بے پایاں ہے۔ سچ ہے کہ ہم بندے ہی ناشکرے اور لاعلم ہیں۔"

منہاج الدین صاحب نے دیر سے رکا ہوا سانس خارج کیا اور ابا میاں کی طرف دیکھ کر زور سے ہنس پڑے۔ دلی خوشی اور مسرت ان کے بشرے سے چھلک رہی تھی۔ خود ابا میاں حیران بھی تھے، مطمئن بھی اور خوش بھی۔

"بھابی جان! آپ نے تو ساری مشکلیں ہی حل کر ڈالیں۔" منہاج صاحب نے بے ساختہ اعلان کیا۔ "اب اصل مرحلہ شروع ہوگا۔ یعنی سعید احمد کے ہاں سوالی بن کر جانے کا۔"

"جی ہاں۔" اماں جان نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ "اور وہاں جانے کو میں خود دل و جان سے تیار بیٹھی ہوں۔"

"بہت خوب۔" ابا میاں نے پہلی بار براہ راست گفتگو میں حصہ لیا۔ "اگر جو آپ کا ساتھ ہو جائے تو کیا کہنا۔ زہے نصیب۔"

اب ان تینوں کے درمیان کچھ اس نوعیت کی بات چیت شروع ہو گئی اور آپس میں چپکے چپکے صلاح مشورہ ہونے لگا۔ باورچی خانے میں برتنوں سے پکار کرانے والی بھی اپنی آج کی ذمہ داری سے بہ حسن و خوبی سبکدوش ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے فرحت کی مدد سے ناشتے کے لوازمات ان مہمانان گرامی کے سامنے سجا دیے۔

فرحت کے دل میں سیکڑوں لڈو ایک ساتھ پھوٹ پڑے تھے۔

***

Famous Urdu Novels

رات کے ساڑھے نو کا وقت تھا۔

سعید احمد کے مکان کا وہی کمرہ تھا جو کرائے پر اٹھا رکھا تھا اور جس میں فاخر اور فرحت رہا کرتے تھے۔ اس وقت سعید احمد ایک پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ چہرے پر تفکرات کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ آنکھوں میں ویرانی تھی۔ چہرے سے برسوں کے بیمار نظر آ رہے تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے چھت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ تسبیح ہاتھ میں لیے ان کی بیوی اندر داخل ہوئیں۔ قریب بیٹھ کر ان کے چہرے پر پھونک ماری پھر آہستہ سے بولیں۔

"آپ کہاں تک انتظار کریں گے؟ ممکن ہے آج وہ نہ آئیں۔ بس اب اندر چلیے۔ دوا کا وقت بھی ہو گیا ہے۔"

"ہاں، ہاں...... چلتے ہیں۔ ذرا ٹھہرو۔" انہوں نے کسی خیال سے چونک کر جواب دیا پھر کروٹ بدل کر لیٹے رہے۔ بیوی انہیں بے بسی سے دیکھ کر وہیں بیٹھ گئیں۔ کافی دنوں سے ان کے گھر کے در و دیوار پر اداسیاں بسیرا کیے ہوئے تھیں۔ وہ اس دن کو رو رہی تھیں جب صغریٰ دادی کی معرفت سعدیہ اور نازیہ کے رشتے طے ہوئے تھے اور پھر آناً فاناً ایک ماہ کے اندر اندر ٹوٹ بھی گئے تھے۔ بس وہ دن گیا اور یہ دن آیا، گھر کی فضا اور ماحول بدل کر رہ گئے تھے۔ بظاہر تو سعید احمد نارمل ہی دکھائی دیتے تھے مگر خاموش سے ہو کر رہ گئے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ گہری خاموشی علالت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ ان کے روزمرہ کے معمولات متاثر ہونے لگے اور وہ اسکول ڈیوٹی تک سے کترانے لگے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

تھے۔ گھر میں سارے بچے سہم سے گئے تھے۔ صغریٰ دادی ان کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں اور اپنے لائے ہوئے رشتوں کو خود ہی جھولی پھیلا پھیلا کر کوسنے میں مصروف رہتیں۔ آج کل وہ پورا کا پورا ہمدرد دواخانہ بنی ہوئی تھیں۔ ہمہ وقت کوئی نہ کوئی ٹوٹکا استعمال کرنے پر کمربستہ رہتیں۔ مگر جب دیکھتیں کہ ان کے نسخوں پر سعید احمد توجہ نہیں دے رہے تو کلس کر خود کو ہی برا بھلا کہنے بیٹھ جاتیں۔ غرضیکہ انہیں اپنی کوتاہی کا احساس ہونے لگا تھا اور یہ ایک انہونی بات تھی۔ یا یہ کہا جائے کہ سعید احمد سے سچی محبت تھی۔ اس وقت بھی مغرب کے بعد اٹھ کر گئی تھیں۔

آج کچھ دیر پہلے فرحت بھی آیا تھا۔ سعید احمد سے تو ملاقات نہیں ہو سکی تھی، تاہم حمید کو منہاج الدین صاحب کے آنے کی اطلاع دے کر چلا گیا تھا۔ تب سے اب تک سعید احمد سراپا انتظار بنے ہوئے تھے اور اس کمرے میں آ لیٹے تھے۔

سعید احمد کے ٹال دینے پر بیوی مایوس ہو کر جا چکی تھیں۔ تب باہر سے کسی بڑی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی اور کسی نے دستک دے کر حمید کو پکارا۔ سعید احمد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے مگر اس سے قبل کہ باہر نکلتے، حمید، فرحت اور منہاج الدین صاحب کے ہمراہ کمرے میں آ چکا تھا۔ علیک سلیک کے بعد سب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ منہاج الدین صاحب نے ابا میاں کا تفصیلی تعارف کرایا۔

چائے وغیرہ کے بعد فرحت بہانے سے رفوچکر ہو گیا اور ان تینوں بڑوں کے درمیان نہایت اہم اور حساس قسم کی گفتگو شروع ہو گئی۔

ایک گھنٹے کے مختصر ترین وقفے میں سعید احمد اور ابا میاں یوں شیر و شکر ہو گئے تھے جیسے مدتوں سے ایک دوسرے سے آشنا رہے ہوں۔ منہاج الدین صاحب جو آج کی ملاقات کے ہیرو تھے، وہ خود بھی اس ذہنی ہم آہنگی اور یگانگت پر دنگ تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا بچھڑ جانے والے آج مل گئے ہوں۔ جو معاملات مہینوں اور سالوں میں طے ہوتے ہیں، وہ ان تینوں کے درمیان کی ساعتوں میں طے پا گئے اور وقت کا کچھ اندازہ بھی نہ ہو پایا۔ ایک ایسی نازک گفتگو جس کے آغاز کے لئے بسا اوقات الفاظ بھی نہیں مل پاتے، تین اگست کی اس مبارک شب میں بغیر کسی خواری بحث و مباحثے کے بحسن و خوبی اختتام پذیر ہو گئی اور ان خوش نصیبوں کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی جو ان لمحوں میں اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے کو یاد کر کے آہیں بھر رہے تھے۔

بیٹیوں کے باپ ہونے کے ناتے سعید احمد اپنی زندگی کے حسین ترین اور یادگار موقع پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ آنکھیں پرنم تھیں۔ پسینے میں سر کے بال پیشانی پر چپک گئے تھے۔ قمیص سینے اور شانوں سے گیلی ہو رہی تھی۔ باتوں باتوں میں انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ کب سینے پر رکھا بوجھ لمحوں میں بھاپ بن کر اڑ گیا تھا۔ آج تقدیر ان کی معصوم اور ہونہار اولاد پر ہزار جان سے نثار تھی۔ ان کے خوش آئند مستقبل آب زر سے لکھے جا رہے تھے۔ ان پر خوش نصیبوں کے در ایک دم ہی وا ہو گئے تھے جن سے اڑ کر آنے والے معطر و دلنواز جھونکے شاہراہ حیات کے ایک تھکے ماندے باپ کے دل سے اٹھنے والی سچی دعاؤں کے نذرانے مسکرا مسکرا کر وصول کر رہے تھے جس کا بے رحم لوگ پہلے ہی قدم پر دل توڑ چکے تھے۔ زندگی اور زندگی کی لطافت سے بے نیاز و بیگانہ ہو جانے میں کسر ہی کون سی باقی رہ گئی تھی؟ مگر آج رحمتِ خداوندی کو بھی جوش آ گیا تھا اور اس نے مایوس و نا امید ہو کر اپنے آپ میں سمٹ جانے والے سعید احمد کی غیرت و خودداری کو سولی پر چڑھ جانے سے بچا لیا تھا۔

ایک وہ وقت تھا جب سعید احمد فقط اپنی والدہ کے ہمراہ 14 اگست کی یادگار تاریخ میں اپنا گھر بار،

باپ اور بہن بھائی قربان کر کے اس سرزمین پاک پر اترے تھے۔ اور ایک یہ وقت تھا کہ 14 اگست کی یادگار تاریخ ان کے زخموں کا پھاہا بن جانے کو تھی۔

ابا میاں اور منہاج الدین صاحب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ فاخر کی برات 14 اگست کے متبرک دن، جشن آزادی کے حسین لمحات کو مزید یادگار بنانے کے لئے سعید احمد کے ہاں اترے گی۔

دوسری پُرمسرت اور حیرت آفریں بات یہ تھی کہ یہی اصرار فرحت کی اماں جان کا بھی تھا۔ گوکہ اس وقت وہ موجود نہیں تھیں، تاہم فرحت کے نزدیک ترین اور بااختیار سرپرست کی حیثیت سے منہاج الدین صاحب بہ نفس نفیس موجود تھے اور ہر فیصلے میں پیش پیش تھے۔ ان دو سوالوں کے علاوہ تیسرا سوال انہوں نے اپنے صاحبزادے سراج الدین کے لئے یہ کہہ کر کیا تھا کہ سعید احمد اپنی چھوٹی بیٹیوں میں سے کسی بھی ایک کو اس کے لئے نامزد کر لیں، شادی چار برس کے بعد عمل میں آئے گی۔ گوکہ عام دل و دماغ کے حامل افراد کے لئے ایک ہی رات میں، وہ بھی ساعتِ اول ہی یہ تمام فیصلے ناقابل یقین امر کی طرح ہوں گے، تاہم حقیقت یہی تھی۔ جس کی کئی ایک وجوہات میں سرفہرست وجہ بذات خود منہاج الدین صاحب اور سعید احمد سے ان کے دیرینہ تعلقات اور گہرا اعتماد تھا۔ ابا میاں کے سوال کے ساتھ شرط منسلک تھی۔

"صرف دلہن چاہئے۔ اس کے حصے کا [illegible] بچیوں کو دے دیا جائے۔"

اماں جان کہاں پیچھے ہٹنے والوں میں سے تھیں۔ فقط ایک شعر کہلوایا تھا۔

"سیرت کے ہم غلام ہیں، صورت ہوئی تو کیا!
سرخ و سپید مٹی کی مورت ہوئی تو کیا!"

سعید احمد کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ بیوی کی غیر موجودگی میں اتنے بڑے بڑے فیصلے ہو گئے تھے۔ تاہم آخر میں انہوں نے دونوں حضرات کا شکریہ ادا کر کے دادی صغریٰ کو بلوایا تھا۔ تمام تفصیل سن کر وہ شکرانے کے نفل ادا کرنے دوڑ پڑیں۔ زندگی میں پہلی بار ان کی گفتگو بند رہی۔

ایک طویل اور نتیجہ خیز نشست کے بعد ابا میاں نے فرحت کو اگلی صبح سویرے ہی فاخر کے پاس چلے جانے کی ہدایت کے ساتھ گھر چھوڑا اور برق رفتاری سے آندھی طوفان کی طرح بہاولپور کی طرف عازم سفر ہو گئے جہاں ان کے بڑے بھائی ولاور حسین رہائش پذیر تھے جو ابا میاں کے سمدھی بھی تھے۔ یعنی ان کی بڑی بہو بیگم کے والد بزرگوار اور شاکر حسین کے سسر صاحب۔ ایک لمحہ آرام کے بغیر وہ راتوں رات بھائی سے مل کر آخری فیصلہ کر لینے کے متمنی تھے۔ آخر کو وقت کم تھا...... اور مقابلہ سخت!

✻●✻

اگر جو ریت کا پورا ٹیلا سونے کا بن جاتا...... یا اس چھوٹی سی شوریدہ سر ندی میں اچھلتا لہریں مارتا شفاف پانی دفعتاً دودھ کی سپیدی میں تبدیل ہو جاتا، تب بھی فاخر کو اس درجہ خوشی اور حیرت نہ ہوتی، جس قدر کہ اچانک فرحت کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ سن کر ہوئی۔ بات کو پوری طرح سمجھ جانے کے بعد اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس وقت وہ اپنی رہائش گاہ سے خاصی دور کھیتوں کو سیراب کرنے والی ایک ندی کے کنارے اپنی لامتناہی سوچوں میں گم ڈبکیاں لگا رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹا سا کنکر اٹھا کر پانی میں پھینک دیتا اور بس!

جب بھی اس کے اعصاب زیادہ منتشر ہوتے یا وحشتوں میں اضافہ ہوتا وہ اسی طرف آ نکلتا تھا اور گھنٹوں ندی کے اس کنارے بے مقصد بیٹھے خود کو بہلانے کی کوشش کرتا رہتا۔ آج بھی وہ سہ پہر سے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بھی موجود تھا۔ اس وقت سورج سامنے والے ٹیلے کے عقب میں ڈوبنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ جنگل کی فضا میں شام دبے پاؤں اتر آئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ہریالی جھاڑیوں میں ننھی منی گلہریاں اور سرخ سرخ چمکدار آنکھوں والے خرگوش پھدکتے پھر رہے تھے۔ تب ایک ملازم فرحت کو یہاں پہنچا گیا تھا۔

فرحت جب اسے الف سے یے تک تمام تفصیل سنا چکا تو فاخر کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فرحت کی بتائی ہوئی ہر بات پر اسے مکمل یقین تھا۔ مگر دل و دماغ ایک نامعلوم احساس کا شکار ہو گئے۔ بالآخر ردعمل کے طور پر اس کے بدن میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ ایک توانا مرد ہوتے ہوئے بھی اس کے اعصاب پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ دل و دماغ میں بے یقینی کا دھواں سا بھر گیا۔ شاید مایوسیوں اور نامرادیوں کی انتہا کو چھو لینے کے بعد اچانک پلٹا کھا جانے والے کرشماتی حالات نے اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ ناامیدیوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی کی کوکھ سے جنم لینے والی روشنی کی کرن نے براہ راست اس کی بصارت و سماعت کو ایسا متاثر کیا کہ وہ بے اختیار سسکیاں بھرتا ہوا سیدھا ہوا اور فرحت کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ رتجگوں پہ رتجگا مناتی آنکھوں سے ساون بھادوں بہہ نکلا۔ سعدیہ سے بچھڑ جانے کے بعد وہ پہلی مرتبہ بیٹھا اور خوب جی کھول کے رویا۔ اپنی چتا میں اس نے فرحت کا حال دل ایک دفعہ بھی نہ پوچھا اور نہ ہی "بجیا" کا نام لے کر اسے چھیڑا، نہ مبارک باد دی جو اچانک ہی بے سان و گمان اس سے منسوب کر دی گئی تھی۔ خبر نہیں کس قبولیت کی گھڑی میں فاخر نے ان دونوں کا نام ازراہِ مذاق ایک ساتھ لیا تھا اور "دل جلا" کر دعا مانگی تھی۔

رات کا کھانا کھا کر وہ دونوں حویلی کی وسیع و عریض چھت پر سونے کے لئے لیٹے تو فاخر ان لمحات میں بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ اسے کسی پل قرار نہ تھا۔ فرحت اس کی بے تابیوں کو خوب سمجھ رہا تھا مگر چپ تھا۔

Famous Urdu Novels

بالآخر چاند کا من موہنا چہرہ دیکھ کر فاخر مچل گیا۔ اس حسین و جمیل شاعری نے اس کی روح کو سرشار کر دیا۔ اس کی بھاری سی دلگداز آواز کا سحر ایک جھٹکے سے بیدار ہو گیا اور چاندنی میں چاندی کے پھول کھل اٹھے۔ جگنوؤں کی طرح جگمگ جگمگ جھلملاتے الفاظ، بارش کے قطرے سے چھن چھن جیسے شفاف احساسات، پائل کی چھم چھم کے مانند بجنے لگے۔ فرحت دم سادھے لیٹا تھا۔

آج تو وہ بھی اس خبر سے باخبر تھا کہ "بجیا" کا حقیقی نام "کاظمیہ" ہے۔ اس لئے یہ ساری شاعری اسے اپنے احساسات کی بھی ترجمان لگی۔

ذرا سا تو ٹھہر اے دل......
ابھی کچھ کام باقی ہیں
ابھی آنگن میں مجھ کو سوچ کے کچھ نئے پودے لگانے ہیں
ابھی ان شوخ ہونٹوں کے کئی انداز ہیں، جن کو
مرے ہونٹوں پہ کھلنا ہے
ابھی اس جسم نے مجھ سے
بہت سی بات کرنی ہے
ابھی اس دل کے جانے کتنے ہی زخم ایسے ہیں، جن کو
مجھے اپنے بدن میں، روح میں بھرنا ہے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اس کے ساتھ جانے کتنے رستے ہیں
اکٹھے جن پہ چلنا ہے
ابھی کچھ ایسے وعدے ہیں
کہ جن کو پورا کرنے کا کئی برسوں سے لمحہ ہی میسر آ نہیں پایا
ابھی وہ وقت آنا ہے
ابھی وعدے نبھانے ہیں
ابھی کچھ شعر ایسے ہیں کہ جو میں کہہ نہیں پایا

تاروں بھری رات نے پاؤں دھرتی، کافوری اجالوں والی صبح کی طرح رواں دواں تھی۔ ہوا کی پالکی پر سوار شبنم کے قطرے آسمانوں سے زمین پر اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔ سیلی سیلی ہواؤں کے جھونکے دلوں سے میٹھی میٹھی چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ فاخر کی گائی ہوئی نظم کا سرور ابھی فضاؤں میں رچا ہوا تھا کہ کہیں سے کوئل کی کوک بھی اس میں مدغم ہونے لگی۔ باغوں سے آنے والی پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ تاروں کی دلکش چھاؤں میں دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہنس دیئے۔

کائنات کا ذرہ ذرہ ہنس پڑا۔ فضاؤں نے جھک کے کسی کا نام لیا۔

دونوں نے اپنے اپنے حصے کا پیغام وصول کر لیا۔ پھولوں سے گندھے، خوشبو سے لدے، آنے والی خوشی آسودہ گھڑیوں کے پیامبر یادگار لمحے جو ہر بشر کی زندگی میں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی انداز میں ضرور آتے ہیں مگر......

کہیں حاصل زندگی ہوتے ہیں تو کہیں لاحاصل......

Famous Urdu Novels

⁂

14 اگست کا سہانا اور یادگار دن تھا۔

ساری قوم پورے جوش و خروش اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر یوم آزادی منا رہی تھی۔ ننھے منے بچوں سے لے کر پیر فرتوت اور ہر شعبۂ حیات سے منسلک مرد و زن اس دن کی اہمیت و حرمت سے آگاہ تھے۔ اک جشن اور خوشی و سرور کا عالم تھا۔

تقسیم پاک و ہند کے وقت لاکھوں مسلمانوں کی طرح اپنا گھر بار لٹا کر پاک سرزمین کو نئے سرے سے آباد کرنے والے سعید احمد کے ہاں دو براتیں ایک ساتھ اتریں۔

تحریک پاکستان کے وقت پیش پیش رہنے والے بیدار مغز اور سچے جذبوں سے مزین کارکنوں میں شامل ابا میاں، منہاج الدین صاحب اور فرحت کی اماں جان نے آج اپنا کہا کر دکھایا اور عین 14 اگست کے دن نہایت کروفر سے براتیں سجا لائے تھے اور اس یادگار دن اور تاریخ کو مزید یادگار بنانے کی مثال قائم کر دی تھی۔

دونوں براتیں اس شان دار اور یادگار انداز میں پہنچیں کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھے۔ مدتوں یاد رہ جانے والا سماں تھا۔ سعید احمد کی گلی کے دونوں اطراف سے داخل ہونے والی براتیں نہایت سج دھج کے ساتھ آمنے سامنے کھڑی تھیں اور فضا میں فوجی بینڈ خوشی کی دھن بکھیر رہے تھے جس پر بجتے ہوئے رقاص زبردست علاقائی رقص پیش کر رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ محلے کے بچے، عورتیں، کھڑکیوں، دروازوں

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اور چھتوں پر کھڑے تھے۔ آج خوشی میں خوشیاں مکمل مل گئی تھیں۔ ایسی خوشی کا رنگ بڑا اچھا، پکا اور دیرپا ہوا کرتا ہے۔ فاخر اور فرحت دلہا بنے ہوئے شہزادوں کی طرح لگ رہے تھے۔ آنکھیں دبی خوشیوں اور سچی مسرتوں کی غماز تھیں۔ دونوں دلہاؤں کا بانکپن اور روپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ خوابوں کی تعبیر مجسم ہو کر سامنے جو آ گئی تھی۔

دونوں کے نکاح اسی بیرونی کمرے میں پڑھائے گئے جہاں کچھ عرصہ پہلے وہ کرائے دار کی حیثیت سے رہے تھے۔ آج دونوں اسی گھر کے داماد ہو گئے تھے۔ مانوس فضاؤں کا سحر فاخر اور فرحت کو گرفت میں لئے ہوئے تھا۔ فاخر کے احساسات دو آتشہ ہو رہے تھے۔

نکاح کے بعد جب احباب بغلگیر ہو کر دلہاؤں کو مبارکباد پیش کر رہے تھے تب فاخر کو ہوش آیا اور اسے احساس ہوا کہ اس کا جاں نثار دوست بھی نکاح کے حسین بندھن میں بندھ چکا ہے۔

وہ بے اختیار دونوں بازو پھیلا کر فرحت سے لپٹ گیا۔

حالانکہ منہاج الدین صاحب اور ابا میاں کے مشترکہ فیصلے کی وجہ سے دونوں ہی براتوں میں بہت کم لوگ تھے، تاہم سعید احمد نے اپنے قریبی پڑوسی کا بڑا سا گھر کھلوا لیا تھا اور براتیوں کے قیام و طعام کا مناسب انتظام کر رکھا تھا۔ بے شک یہ ان کی زندگی کا ایک اہم ترین اور نازک ترین موڑ تھا اور انہیں اپنی معصوم بیٹیوں کی عزت کا مکمل اور اک و احساس تھا۔

براتی کھانا کھانے کے لئے دوسرے مکان میں جانے لگے تو ان دونوں نے بھاری بھرکم سہروں سے نجات حاصل کی اور آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

"ایبا" کا ساتھ مبارک ہو بڑے بھائی!" فرحت نے سرگوشی میں کہا۔

فاخر چونک گیا ... "تمہیں بھی مبارک ہو۔"

دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

"ہو جائے کوئی شاعری وائری؟" فرحت نے اسے چھیڑا۔

"ہوئی ہے...... لیکن تجھے سنانے والی نہیں ہے۔" فاخر نے دوٹوک جواب دیا۔

Free pdf Library

***

امی جان اندر باہر بھاگی پھر رہی تھیں۔

گھر کے برآمدے میں یہاں سے وہاں تک دو بریاں سجی ہوئی جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ ایسے نک سک سے درست اور مکمل عروسی ملبوسات، چمکتے اور جھلملاتے زیورات اور شادی کے دیگر لوازمات تھے کہ نظر ٹھہرنی مشکل تھی۔ دیکھنے والیوں کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ لوگ سعید احمد کی بیٹیوں کی قسمتوں پر رشک کر رہے تھے۔ دونوں بریوں میں ایک سے بڑھ کر ایک زیور، کپڑا تھا۔ براتی خواتین میں فرحت کی اماں جان سب میں نمایاں تھیں۔ انہوں نے دادی صغریٰ کو دونوں بریوں کی تفصیل سے آگاہ کر دیا اور اب وہ دیگر خواتین کو سعدیہ اور نازیہ کے چڑھاووں کی معلومات بڑی تسلی اور فخر کے ساتھ گوش گزار کرتی جا رہی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ پوتیوں کو دعاؤں سے بھی نوازتی جا رہی تھیں۔

اندر کمرے میں محلے بھر کی لڑکیاں بالیاں جمع تھیں۔ باتوں، چہلوں اور قہقہوں میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ نازیہ، سعدیہ کو دو مختلف گوشوں میں پردے تان کر دلہن بنایا جا رہا تھا۔

نازیہ کی دلی کیفیت تو نازیہ ہی جانے مگر پچھلے دس دن سے سعدیہ کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں!

اپنی اچانک شادی کی جو تفصیلات اس کے کانوں نے سنی تھیں وہ اسے پتھر کا بت بنا گئیں۔ قدرت کے انتظامات، رحمت و فیاضی نے اسے گنگ کر ڈالا۔ اس سلسلے میں وہ نازیہ سے کسی طرح کا تبادلہ خیال کرنے سے قاصر رہی۔ آخر کہے تو کیا کہے؟...... گزشتہ دس دنوں میں معلوم نہیں کتنی مرتبہ اس کی سماعت سے فاخر کے کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت ٹکراتی رہی، جو اس نے سعدیہ سے اپنی آخری ملاقات میں نہایت اعتماد کے ساتھ کہے تھے۔

"کسی کو تو کسی سے محبت ہوتی ہو گی مگر مجھے تم سے عشق ہے...... تمہارے نام سے عشق ہے...... تم کو چھو کر جانے والی ہوا سے عشق ہے...... تم میرے لئے وہ ہوا ہو، وہ خوشبو ہو جو جسم و جاں کی بقا کے لئے لازم ہوتی ہے۔ تم سے خدانخواستہ بچھڑ جاؤں، میرے لئے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لینے کے مترادف ہے۔ وقت سے پہلے تم سے یہ سب کہنے سے گریزاں تھا تو اس کا کچھ سبب ہے۔ انشاء اللہ زندگی بخیر ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب میں کھل کر اپنے قلب و نظر کی کیفیت کہہ سکوں گا۔"

اور آج...... ان یادگار لمحات میں، جب کہ اس کا اسی فاخر سے نکاح ہو چکا تھا، اس کے ہاتھوں میں فاخر کے نام کی مہندی رچی تھی، کلائیوں میں سہاگ کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں اور اسے سر سے پاؤں تک فاخر کی دلہن بنا کر سجایا جا رہا تھا تو سعدیہ کے احساسات پر جیسے خوابوں کی سی کیفیت طاری تھی۔

"خدا نہ کرے یہ سب کچھ محض خواب ہو!" اسے ایک جھرجھری سی آ گئی۔

بیش قیمت زیورات کے بعد اب اسے گجرے پہنائے جا رہے تھے۔ وہ پوری کی پوری مہکتا ہوا پھول بن چکی تھی اور چنبیلی کی ڈالی کی طرح لچکی جا رہی تھی۔ تب اس کی سماعت سے ایک ہلکی سی سرگوشی ٹکرائی۔

"سنا تم نے ... بڑی والی کی سسرال ... آیا ... صرف دلہا ہے اور بس!"

دوسری نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ساس نندوں کو دیکھا ہے۔ وہ دیکھو صغریٰ خالہ کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔"

Famous Urdu Novels

Free pdf Library

کسی نے لقمہ دیا۔ "ارے کم عقل! وہ تو نازیہ کی ساس ہے۔ بڑی کی سسرال سے تو کوئی چڑیا کا بچہ بھی نہیں آیا۔ بس بھئی اپنے اپنے حوصلے والے لوگ ہیں۔ ہم تو کبھی اکیلے لڑکے کو اپنی لڑکی نہ دیں۔ کیا خبر کل کلاں کو لڑکی کا کیا حال کرے؟ لاکھ ابھی نہ کہلانے کے باوجود ساس نندیں ضروری تو ہوتی ہیں منگنی بیاہ کے موقع پر۔ اکیلا لڑکا بھلا اچھا لگتا ہے دلہن لے کے جاتے؟"

لڑکیوں کی ریل پیل میں سرگوشی کرنے والی آوازیں پتہ نہیں کہاں مدغم ہو گئیں مگر سعدیہ کا تمام جسم سراپا سماعت بن کر پوری گفتگو سن چکا تھا۔ اس کے ایک ایک مسام نے پسینہ اگلنا شروع کر دیا تھا۔ مہکتے ہوئے پھولوں پر سرخ سرخ دہکتے ہوئے شعلے برس گئے۔ شہنائیوں کی نشاط انگیز لے پر صحراؤں کے بگولے رقص کرنے لگے تھے۔ بھری بہار پہ زرد خزاؤں کا تسلط اس کے حساس دل پر پنجے گاڑ چکا تھا۔

ہم نے تو وادی شبنم کی تمنا کی تھی
زندگی دے گئی تپتا ہوا صحرا ہم کو!

دونوں لڑکیوں کی سسرال والوں نے اپنی ضد پوری کر لی اور اپنی اپنی بہو کو بغیر جہیز کے رخصت

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کرالیا۔ ہر کام بہ حُسن وخوبی انجام پایا۔

سعید احمد نے دامادوں کو دس دس ہزار روپے نقد سلامی میں دیے۔ رخصتی کے وقت دونوں دلہاؤں کو اندر بلایا گیا تو دادی صغریٰ جو صبح سے ٹکے والا گلابی دوپٹہ اوڑھے پھر رہی تھیں انہوں نے اپنی فرمائش داغ دی۔

"اپنی اپنی دلہن کو دولہا خود گود میں اٹھا کر رخصت کرائیں گے۔"

بے ساختہ مسکراہٹوں کی چھاؤں میں آنسوؤں کے ریلے بہہ نکلے۔ فاخر اور فرحت نے خوشی خوشی ان کی فرمائش پوری کر ڈالی۔ فاخر کا ارمانوں سے لبریز سینہ دھک سے رہ گیا۔ پھولوں سے بھری ڈالی تو اس نے بازوؤں میں سمیٹ لی تھی مگر...... یہ پھول خوشبو سے محروم تھے۔

❖❖❖○❖❖❖

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

اچانک ہی نازش کی آنکھ کھل گئی تھی۔

سب کچھ نہیں تھا مگر سانسیں الجھنے لگیں۔ طبیعت وحشت زدہ سی تھی۔ گھبرا کر وہ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے باہر آ گئی۔

باہر کی فضا دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ آسمان یہاں سے وہاں تک سیاہ بادلوں سے اٹا پڑا تھا۔ پُروا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ گہرے بادلوں نے وقت کا درست اندازہ دشوار بنا دیا تھا مگر برآمدے میں لگا گھڑیال بتا رہا تھا کہ نماز عصر کا وقت ابھی باقی ہے۔ سب کچھ فراموش کر کے نازش عجلت سے وضو کرنے لگی اور وضو کرتے ہی اس کی کچھ دیر قبل کی ساری وحشت اور گھبراہٹ رفوچکر ہو گئی تھی۔

آج ۱۴ اگست کا یادگار اور سنہرا دن تھا۔

اس کے دونوں بھتیجے ریحان اور سلمان آج اسکول سے خاصی لیٹ آئے تھے اور اسکول کے جشنِ آزادی کی تفصیلات ساری دوپہر گھر والوں کو سناتے رہے تھے۔ ریحان کو ملی نغمہ سنانے پر چھوٹی سی ٹرافی بھی بطور انعام ملی تھی جبکہ سلمان بے چارہ کوئی بھی انعام نہ جیت پایا تھا کہ شام کو وہ ابو کو کیا دکھا کر شاباشی وصول کرے گا۔ چنانچہ کھانے کی میز پر ہی معمولی نوک جھونک زوردار ہنگامے میں تبدیل ہو گئی۔ نازش کے ساتھ ساتھ مجبوراً بھابی کو بھی محاذ جنگ میں کود جانا پڑا۔ گھمسان کا رن پڑا۔ دونوں جانب سے زبردست فائرنگ کے جواب میں بالآخر بھابی نے ایٹمی ویٹو پاور استعمال کیا تب جنگ بندی کا آغاز ہوا اور دونوں فریق کمرہ بند ہو کر روتے روتے سو گئے۔ کافی دیر بعد بھابی بھی انہی کے پاس پڑ کر سو رہیں اور نیند کا یہ غلبہ اب تک جاری وساری تھا۔ فقط نازش کی آنکھ کھل پائی تھی۔

ابھی وہ جائے نماز پر ہی تھی کہ فرخ نے اندر جھانکا۔ اسے نماز پڑھتے دیکھ کر شوخی اور شرارت سے لبریز لہجے میں گویا ہوا۔

"اخاہ تو جناب مسلمان ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے جنوں سے دوستی ہو گی۔"

اس کی غیر متوقع آمد اور ریمارکس سے نازش کو نماز پڑھنا دوبھر ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی رکعت پوری کر کے سلام پھیرا تو نگاہ سیدھی اسی سے چار ہوئی۔ وہ جھٹ سے آداب بجا لایا اور خوش ہو کر پوچھا۔

"وعلیکم السلام! جیتی رہیے۔ خوش رہیے۔ جم جم جئیں۔ آپ تو بہت ہی تمیزدار بچی بن گئی ہیں۔ ماشاءاللہ نمازوں میں بھی سلام کرنا نہیں بھولتیں۔"

نازش جانتی تھی کہ اب اس کی زبان کو بریک لگنا مشکل ہے۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فرخ چند لمحے اسے چپ چاپ نگاہوں میں اتارتا رہا پھر جیسے ہی اس نے منہ پر ہاتھ پھیرنے چاہے گلدان سے نکال کر جھٹ سے ایک گلاب کا پھول اس کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔

جائے نماز سمیٹتے سمیٹتے وہ خفگی سے بولی۔

"آپ کبھی بھی شرارت سے نہیں چوکتے ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہیں، آپ کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ نماز میں خلل ڈالنا کتنے بڑے گناہ کا سبب ہوتا ہے۔"

وہ اثر لئے بغیر ہنستا ہوا بولا۔

"محترمہ ہم پر آپ کا رعب نہیں چلے گا۔ ہمیں معلوم ہے آپ کی عبادتوں کی حقیقت۔"

نازش کو بیچ بچ غصہ آنے لگا۔ بگڑ کر بولی۔

"کیوں، کیوں؟...... کیا معلوم ہے آپ کو حقیقت؟"

وہ اور بھی اترا کر بولا۔ "ارے جانے دیجئے۔ کیوں کھلواتی ہیں اپنی پول۔" پھر اس کی تپی ہوئی صورت دیکھ کر جلدی سے بات بدلی۔

"اچھا اچھا، زیادہ موڈ خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا تو صرف اعتقاد تھا بھابی سلامی کہ مجھ پر اپنی حجرے کی پھونک مار دیجئے تاکہ میں بھی آپ کی طرح نمازی پرہیزگار بن جاؤں اور میری مشکلات میں آسانی ہو۔"

اتنا کہتے کہتے وہ اپنا چہرہ بالکل اس کے قریب لے آیا۔ نازش نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی اور دور ہٹ کر بولی۔ "کیا بات ہے؟...... آج بہت بری طرح سوجھ رہی ہے۔ کہیں سے کوئی لمبی سی رشوت ہاتھ آ گئی ہے کیا؟"

وہ سگریٹ سلگاتا ہوا سنجیدگی سے بولا۔

"خیر، مجھ سے شرارتوں کی بات تو مت کرو۔ کھری اور کھری نیت کا بے ضرر سا بندہ ہوں۔ نہ رشوت دیتا ہوں نہ لیتا ہوں۔ ہاں انعام وغیرہ کا قاعدہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ بھابی آنکھیں ملتی ہوئی اندر داخل ہو کر بولیں۔

"کس انعام کی بات ہو رہی ہے بھئی...... فرخ تم کب آئے؟"

فرخ نے انہیں سلام کرتے ہوئے تیزی سے بات بدلی۔

"میں نازش سے کہہ رہا تھا بھابی! کہ ہمارے طفیل انہوں نے تصویروں کی نمائش میں دوسرا انعام حاصل کر لیا مگر ہمیں ایک دعوت سے بھی نہ نوازا۔"

نازش اس کی ذہانت پر دنگ رہ گئی۔ بھابی نے فراخ دلی سے جواب دیا۔

"ہاں ہاں...... دعوت کیوں نہیں ہوگی۔ مگر یہ تو بتاؤ اس وقت کیسے آنا ہوا؟ آج چودہ اگست پر کہیں انوائٹ نہیں تھے؟ ڈاکٹر صاحب تو صبح کے گئے اب تک نہیں آئے ہیں۔ لو، اب تو بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔"

"آپ کے ڈاکٹر صاحب تو اپنے کسی مریض کو پیارے ہو گئے ہیں۔ اس لئے نہیں آئے۔ اور میں جشن آزادی کی ایک تقریب سے تازہ بہ تازہ مٹھائی کھا کر آ رہا ہوں۔ اب جی چاہ رہا تھا کچھ گرما گرم چنے اور چٹ پٹے پکوان کھانے کو۔ باہر جھانک کر دیکھئے، موسم بھی تو کس غضب کا ہو رہا ہے۔ گھٹائیں ہیں کہ برسنے کو تلی ہیں۔ بھلا اس موسم میں کوئی سویا کرتا ہے؟...... اور ایک یہ آپ کی کاہل اور کام چور نند ہیں جو مہمان نوازی کے قاعدے قرینے سے ناواقف......" وہ شرارت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ بھابی نے فوراً مداخلت کی اور خفگی سے بولیں۔

"ارے! تم نے مجھے جگا لیا ہوتا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے؟...... اچھا تم چل کر ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ میں انتظام کرتی ہوں۔"

"آپ رہنے دیجئے بھابی جان! میں کچن میں جا رہی ہوں۔" نازش جلدی سے بولی۔ "میں نے کب انکار کیا تھا۔ یہ خود ہی دو کی چار لگاتے ہیں۔"

فرخ ہنستا ہوا بھابی کے ساتھ چلا گیا اور یہ کچن میں آ گئی۔ چاندنی بوا کو ساتھ لگا کر اس نے جلدی جلدی بہت سارے پکوڑے اور پاپڑ تلے۔ ہری مرچ، پیاز اور لیموں کی چٹنی بنوائی۔ ورقی سموسے اور شامی کباب بھابی ہمیشہ ہی فریز رکھتی تھیں، وہ نکال کر تیار کئے۔ تھوڑا اچار، کیچپ علیحدہ پیالیوں میں سجایا۔ چاندنی بوا چائے دم کرنے لگیں۔ دور کہیں بادل دھما دھم گرج رہے تھے۔ آسمان کے مشرقی گوشے سے سیاہ گھنگھور گھٹائیں پرے کے پرے باندھے چلی آ رہی تھیں۔ اب تیز برساتی جھونکے فراٹے بھرنے لگے تھے۔ کوئی دم جاتا تھا کہ برسات کی پری ناچ اٹھتی۔ فضا دھواں دھواں ہو رہی تھی اور موسم بھیگا بھیگا۔

نازش نے ایک ڈونگا گلاب جامنوں سے بھرا...... شکور کے حوالے لوازمات سے بھری ٹرالی کر کے بوا کو چائے پہنچانے کی تاکید کی اور خود ٹہلتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔ عین اسی وقت حویلی کے گیٹ پر زوردار ہارن کے ساتھ دو گاڑیاں آ کر رکیں۔ اسی لمحے آسمان پر بادل ایک زبردست گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ بجلی دو دھاری تلوار کی طرح سیاہ بادلوں پر یہاں سے وہاں تک لہرائی اور کوندی۔ شکور نے بھاگ کر پورا گیٹ کھول دیا۔ دونوں گاڑیاں برق رفتاری سے چلتی ہوئی پورچ تک آ کر رکیں۔ آسمان ایک دم ہی پرنالے کی طرح بہہ نکلا۔ آن کی آن میں موسلادھار بارش برسنے لگی۔

Famous Urdu Novels

※●※

ابا میاں کی تاکید کے مطابق رخصتی کے بعد فاخر دلہن کے ہمراہ گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ تو گیا تھا مگر اس کے دل و دماغ پر قیامت گزر رہی تھی بلکہ اس کی پوری ہستی زلزلوں کی زد پر تھی۔ دلہن پوری طرح اس پر لدی ہوئی تھی۔ اگر جو فاخر نے سنبھال نہ رکھا ہوتا تو یقیناً لڑھک چکی ہوتی۔ فاخر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پہلو میں نرم و نازک پنکھڑیوں کا بے جان ڈھیر ہو اور بس! وقت ایسا تھا کہ وہ چیخ سکتا تھا نہ کسی سے مدد طلب کر سکتا تھا۔

Free Pdf Library

دلہن کو رخصت کرنے والے پیچھے رہ گئے اور گلیوں کے پیچ و خم سے نکلتے نکلتے جلد ہی فاخر والی گاڑی تنہا رہ گئی۔ چونکہ دونوں دلہنیں ایک ساتھ رخصت ہوئی تھیں اس لئے کسی کو کچھ احساس بھی نہ ہو سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام براتی فرحت سمیت لے گیا اور فاخر کی گاڑی نہایت اطمینان کے ساتھ ڈیفنس کی اس کوٹھی کی طرف عازم سفر ہو گئی جو ابا میاں پہلے ہی خرید کر فاخر کو دے چکے تھے۔ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہو رہا تھا۔ پلاننگ ابا میاں اور منہاج الدین صاحب کی تھی۔

دو تین سڑکیں گھومنے کے بعد ڈرائیور پریشان ہو گیا۔ چودہ اگست ہونے کی وجہ سے کافی رش تھا۔ کئی سڑکوں سے عظیم الشان جلوس گزر رہے تھے۔ حد نگاہ تک ہری ہری جھنڈیوں اور پرجوش نعروں کے سوا کچھ دکھائی و سنائی نہ دے رہا تھا۔ ٹریفک جام تھا۔ اس وقت گرمی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

دوپہر کے بعد اُمڈ کر آنے والی گھٹاؤں نے اچانک ہی سورج کو ڈھانپ لیا اور ہوا میں سنسناہٹ بھر دی۔ پہلے جھکڑ کے ساتھ ہی ڈرائیور منمنایا۔

"صاحب! ہر راستہ بلاک پڑا ہے۔"

"تم کوشش کرو اور کسی ہسپتال تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔" فاخر نے گھبرا کر ہدایت کی اور ہاتھ بڑھا کر گاڑی کے شیشے گرا دیے۔ رخصت کرنے والوں نے وقت رخصت اسے کڑھائی کی ہلکی سی چادر اوڑھا دی تھی۔ اوپر سے کلیوں اور پھولوں کا مہکتا سہرا باندھ دیا گیا تھا۔ گھبراہٹ اور وحشت میں فاخر نے اس کا سہرا الٹ ڈالا۔ دلہناپے کے قدرتی رنگ و روپ سے دمکتا معصوم چہرہ مٹی ہو رہا تھا۔ ٹیکا کہیں اوپر ہی بالوں میں اٹک گیا تھا۔ پسینے کے قطروں سے بھیگی ہوئی پیشانی پر بالوں کی لٹیں چپک گئی تھیں۔ گردن بار بار ڈھلکی جا رہی تھی۔ فاخر کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"ڈرائیور! جلدی کرو...... جلدی کسی ہسپتال تک پہنچو۔"

سامنے ہی جلوس آتا دیکھ کر ڈرائیور نے نہایت مہارت سے راستہ بدلا اور گاڑی کو دوسری سڑک پر ڈال دیا۔ پھر فوراً ہی روہانسی آواز میں بولا۔

"ادھر آگے تو شامیانہ لگا پڑا ہے۔" یہ کہتے کہتے اس نے گیئر بدلا اور ایک تنگ گلی میں مڑ گیا۔

"سعدیہ...... سعدیہ!" فاخر نے اس کے منہ پر جھک کر شدت سے پکارا مگر جواب ندارد۔ اس کی بے قراری اور تڑپ آخری حدود کو چھونے لگی۔

"یا اللہ!...... میری مدد فرما۔" کوئی راستہ نہ پا کر اس نے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ آج زندگی میں سب سے بڑی تمنا پوری ہو بھی رہی تھی تو کس انداز میں۔ وہ چند گھنٹوں کی دلہن دنیا کے ہر انقلاب سے بے خبر شاید زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہی تھی۔

"سعدیہ...... میری زندگی...... میری روح سعدیہ!" فاخر بلند آواز میں چیخ اٹھا۔ "مجھے چھوڑ کر مت جاؤ...... مت جاؤ سعدیہ۔"

اس نے جنونی انداز میں اس کے بے حس و حرکت سراپے کو جھنجوڑ ڈالا۔ ڈرائیور کے ہاتھ بہکیا گئے۔ گاڑی لمحہ بھر کے لیے بھری سڑک پر اچھلی مگر فوراً ہی فٹ پاتھ سے ٹکرا کر تھمی اور ساتھ ہی انجن دم سادھ گیا۔ عین اسی وقت بادل زوردار آواز میں گرجے اور برساتی بھوتے طوفانی انداز میں فراٹے بھرنے لگے۔ موسم کے تیور لمحہ بہ لمحہ بگڑتے جا رہے تھے۔ سیلی سیلی ہواؤں کے دوش پر سوار فاخر کی ہذیانی چیخ قریب سے گزرتی گاڑی میں صاف سنی گئی۔ ڈاکٹر منان نے ہنگامی بریک لگائے اور برق رفتاری سے فٹ پاتھ سے ٹکرا کر رک جانے والی گاڑی کی طرف دوڑ پڑے۔

"کیا ہوا؟...... کیا بات ہے؟" کہتے کہتے انہوں نے پچھلی سیٹ پر نظر دوڑائی۔ عروسی جوڑوں میں ملبوس سجے سجائے دلہا دلہن دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔ چند لمحوں تک ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا۔ وہ چکرائے ہوئے کھڑے رہ گئے۔ فاخر ایک ہمدرد چہرہ پا کر تڑپا اور فریاد کی۔

"پلیز ہیلپ می...... پلیز ہیلپ می۔"

ڈاکٹر منان کے رگ و پے میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ انہوں نے کھڑکی سے ہی جھک کر پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ دلہن کی نبض ٹٹولی۔ پپوٹے پلٹ کر دیکھے اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہدایت کی۔

"آئی ایم ڈاکٹر۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے۔"

※●※

چودہ اگست کی چھٹی اور پھر بارش۔ چنانچہ کلینک بند اور اسٹاف غائب تھا۔ تاہم ڈاکٹر منان نے آن کی آن میں ایمرجنسی نافذ کر دی۔ پورا گھر الرٹ ہو گیا۔ کہاں کی چائے اور کدھر کے پکوان! ڈاکٹر صاحب کے ایک اشارے پر شکور نے ناشتے سے بھری ٹرالی چھوڑ کر لپک کر مہمانوں والا بڑا کمرہ کھول دیا۔ اوّل تو سجی سجائی گاڑی، اوپر سے دلہا دلہن کی غیر متوقع اپنے گھر میں آمد۔ بھابی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ فرخ کو موجود پا کر ڈاکٹر منان کو اطمینان ہوا۔ ان کے کلینک کا ایک دروازہ کوٹھی کے اندر کھلتا تھا۔ فرخ اور شکور اسٹریچر کھینچ لائے۔ موسلا دھار برستی بارش میں دلہا سمیت ڈاکٹر منان اور فرخ نے مل کر ہر بات سے بے خبر دلہن کو سہولت کے ساتھ کمرے میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر منان نے سوائے دلہا کے سب کو کمرہ بدر کیا اور ضروری طبی امداد کے لیے سرگرم ہو گئے۔ ان لمحات میں ان کی مستعدی اور پیشہ ورانہ مہارت قابل تعریف تھی۔

آج کی عجیب و غریب صورت حال سے گھر بھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کوئی بات آئی ہو یا نہ آئی ہو مگر بالوں سے ڈاکٹر تک سب کے سب دلہا کی سرخ سرخ پھولوں سے سجی ہوئی گاڑی دیکھ کر خواہ مخواہ مسرور ہوئے جا رہے تھے اور لاشعوری طور پر اسی بند دروازے کو پُراشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جہاں وہ دونوں موجود تھے۔ ڈرائیور پھول بابا کے پاس چلا گیا تھا۔

نازش ابھی ابھی سب کو چائے سرو کر رہی تھی۔ ایک اڑتی سی نظر میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا کہ وہ دونوں دلہا دلہن کے روپ میں تھے مگر وہ پہلی نگاہ میں فاخر اور سعدیہ کو پہچان گئی تھی۔ بے حد مشکل تھا وہ اس نے اپنی حیرت میں ڈوبی ہوئی چیخ کو روکا تھا۔ تب سے اب تک وہ مسلسل حیران و پریشان تھی۔ اگر جو فرخ موجود نہ ہوتا تو یقیناً بھابی سے سب کہہ گزرتی!

"واہ کیا حسین کپل ہے۔" فرخ نے با آواز بلند تبصرہ کیا۔

"ہاں...... اس میں تو کوئی شک نہیں۔" بھابی بولیں۔

"میں نے اپنی زندگی میں ایسی خوبصورت، نزاکت اور معصومیت ایک ساتھ کہیں نہیں دیکھی۔ دلہا بھی کیا شاندار اور پیارا ہے۔ لیکن معلوم نہیں دلہن بے چاری پر کیا گزری؟...... مجھے تو ہوش میں معلوم نہیں ہو رہی۔"

اچانک ریحان نے سب کو چونکا دیا۔ "ممی!...... ان دلہا دلہن کی برات کہاں ہے؟...... موٹر تو ایک ہی ہے۔"

"ارے ہاں...... سچ تو ہے۔" سب چونک کر ایک دوسرے کو تکنے لگے۔

"ممی! میں ڈرائیور سے پوچھ لوں جا کر؟" سلطان نے پیشکش کی۔

"ہرگز نہیں۔" بھابی نے سختی سے منع کیا۔ "خدا جانے کیا معاملہ ہے۔ ڈرائیور سے معلوم کرنا مناسب نہیں ہے۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔" فرخ نے ان کی تائید کی۔

"اب تو آپ کے ڈاکٹر صاحب ہی فارغ ہو کر تمام واقعات پر روشنی ڈال سکیں گے۔ اس لیے انتظار فرمائیے اور لیجیے، یہ پکوڑا کھائیے۔" بھابی مسکرا کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں مگر ان کا سارا دھیان بند کمرے کی طرف تھا۔

"کیا بات ہے، آپ محترمہ بہت چپ چپ سی ہیں۔ کہیں ان دلہا دلہن سے کوئی رشتے داری تو

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

نہیں ہے؟...... جائیے عیادت کر آئیے۔'' فرخ، بھابی کو چھوڑ کر نازش کے پیچھے لگ گیا۔
نازش اس کی قیافہ شناسی پر حیران رہ گئی لیکن دانستہ خاموش رہی۔
''کیوں بھابی صاحبہ! نازش کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نہیں ہو گئی اس وقت؟'' فرخ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے بھابی سے گواہی چاہی۔
''نئے نئے ''گلو'' گھڑنے میں ماہر ہیں لوگ۔'' نازش جان بوجھ کر با آواز بلند بڑبڑائی۔
''اور...... جناب نئے نئے الفاظ ایجاد کرنے میں۔'' اس نے بھی برجستہ جواب داغا۔
بھابی ہنستے ہوئے اٹھ کر کسی کام میں مصروف ہو گئیں۔ فرخ باقاعدہ نوک جھونک کے موڈ میں تھا مگر نازش طرح دے گئی۔ ناشتے کا بچا کھچا سامان اٹھا کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ اس وقت اس کا دماغ کہیں اور ہی تھا۔ فرخ کی مسلسل موجودگی اب اس کی جھنجلاہٹ کا موجب بنی جا رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا وہ فوراً چلا جائے اور یہ مکمل یکسوئی سے کچھ غور و فکر کر سکے۔
باہر بارش پھر سے برس رہی تھی۔ آسمانوں سے زمین کی طرف شفاف بوندوں کا ایک تسلسل تھا جو آبدار موتیوں کی لڑی کے مانند پھسلا چلا آ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کچن میں کھڑی بارش کی آواز سنتی رہی لیکن آج بوندوں کا جلترنگ بجانے سے قاصر تھا۔ سچ ہے پریشان خیالی میں کائنات کا کوئی منظر قابل توجہ معلوم نہیں ہو سکتا۔
تنگ آ کر وہ بھابی کی تلاش میں نکلی۔ فرخ، ریحان اور سلطان کے ساتھ مستیوں میں مگن تھا۔ نازش کو تعجب ہوا۔ خلاف معمول وہ اب تک گیا نہیں تھا۔ تاہم اس وقت بچت ہو گئی اور یہ اس کی نگاہ میں آئے بغیر بھابی کو ڈھونڈ لینے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ مہمان خانے کے برابر والے کمرے میں جھکی ہوئی مل گئیں۔ ان کی صورت بھی بڑی ہو رہی تھی۔
''بھابی! آپ نے غور سے دیکھا، وہ دونوں کون ہیں؟'' نازش نے ان پر نظر پڑتے ہی سوال کیا۔
''کون ہیں؟'' انہوں نے حیران ہو کر اسی سے پوچھا۔
''دونوں کے دونوں میرے یونیورسٹی فیلو ہیں۔'' نازش نے بے حد ادائی انداز میں انکشاف کیا۔
''اوہ...... میرے خدا!'' بھابی نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''مگر...... وہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟...... تمہارے بھائی جان کے ساتھ کیوں آئے ہیں؟ اور...... اکیلے اکیلے کیوں ہیں؟...... آخر ان کے ساتھ اور بھی تو لوگ ہوں گے ہی۔''
''بھابی جان! کہیں......'' نازش کچھ کہتے کہتے ہچکچا کر تھم گئی۔
''ہاں ہاں...... بولو۔'' بھابی نے بے صبری سے حوصلہ افزائی کی۔
''ہم...... میرا مطلب ہے۔''
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ جھلائیں۔
''ایک تو ویسے ہی ہول ہو رہا ہے اور اوپر سے تم بے زار کرنے لگیں۔ خدا کے واسطے پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو بتانا ہے صاف صاف بتا ڈالو۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔''
''وہ...... میرا خیال ہے ان دونوں نے کنگ...... کورٹ میرج کر لی ہے۔'' بالآخر ہمت کر کے نازش کہہ ہی گئی۔
''یا اللہ رحم۔'' بھابی آنکھیں پھاڑ کر رہ گئیں پھر تڑپ کر بولیں۔ ''ارے بیٹا! میں تو تمہیں یونیورسٹی بھیج کر پچھتائی۔ جانے کیسے کیسے اول جلول کلاس فیلو تھے تمہارے۔ ایک وہ مس رخشندہ تھیں جو آج

تک لاپتہ ہیں۔ دوسری تم ہو، جس کے شادی بیاہ کے نام سے سارے فیوز اڑ جاتے ہیں۔ اب رہی سہی کسر ان دو نو واردوں نے پوری کر ڈالی۔ بھلا تمہیں یہ خیال کیوں آیا کہ کورٹ میرج کر لی؟...... کیا بغیر ماں باپ کے ہیں یہ دونوں؟''
''نہیں...... یہ بات نہیں ہے بھابی جان!'' وہ کھسیانی ہو گئی۔ ''بات یہ ہے کہ یونیورسٹی میں ان دونوں...... یعنی سعدیہ اور فاخر کی آپس میں بہت زیادہ انڈر اسٹینڈنگ ہوا کرتی تھی لیکن سنا تھا کہ دونوں کے گھریلو حالات ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے اس لئے مجھے ایسا خیال آیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ بہ ظاہر دونوں اکیلے نظر آ رہے ہیں۔ کوئی باقاعدہ برات وغیرہ ہے، نہ باراتی۔ اس لئے قدرتی امر ہے کہ میرا دھیان کورٹ میرج کی طرف گیا ورنہ کوئی تو ساتھ ہونا چاہئے تھا ان کے۔''
''چلو کوئی ساتھ ہو نہ ہو، تمہارے بھائی جان تو ساتھ ہیں۔'' بھابی نے پریشان سی ہنسی ہنس کر جواب دیا۔ پھر اضافہ کیا۔ ''دوسری جانے والی تم نکل آئیں۔ یعنی کلاس فیلو۔''
نازش کو بھاوج کے ریمارکس سے کوفت ہو رہی تھی مگر بولی کیا۔ جانتی تھی وہ اس وقت ٹینشن میں ہیں۔ مگر تو خود اسے بھی لاحق تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر منان کو دلہا دلہن کے ساتھ بند ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا۔ اس دوران وہ صرف ایک بار باہر نکلے تھے اور فرخ کو ایک کاغذ تھما کر دوبارہ اندر جا گھسے تھے جس کے بعد فرخ آندھی طوفان کی طرح گاڑی لے اڑا تھا اور جلد ہی اس کی واپسی کسی قسم کے انجکشن کے ساتھ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھابی سے اجازت لے کر چلا گیا۔ گویا اسے احتیاطاً روکا گیا تھا۔
خدا خدا کر کے ڈاکٹر منان برآمد ہوئے تو تھکن کے باوجود چہرے پر اطمینان کے آثار تھے۔ اب رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ بچوں کو بھی ہوم ورک کرنا تھا۔ بھابی کو اندر چائے بھجوانے کا کہہ کر جلدی جلدی غسل کرنے کے لئے چلے گئے۔ اب بھابی کو پکانے کی فکر ہوئی۔ دوپہر میں تو انہوں نے بہت دنوں کے بعد سیدھا سادا سا زردہ پلاؤ پکوا لیا تھا۔ ساتھ میں رائتہ اور شامی کباب تھے۔ کسی بھی عید، تہوار یا چھوٹی موٹی تقریب پر بھی زردہ بھابی کو بھی پکانا ہی ہوتا تھا۔ ایسے موقع پر ڈاکٹر صاحب خوب چسکیاں لے لے کر کھانا تناول کرتے۔ نازش بھی چھیڑنے سے نہیں چوکا کرتی تھی۔ بھابی نے جائزہ لیا تو کھانا کافی سے زیادہ تیار پڑا تھا۔ مہمانوں کا سوچ کر انہوں نے قیمہ، چپاتی اور کھیر کا اضافہ مناسب سمجھا اور کچن کا رخ کیا۔ نازش پہلے ہی پرتکلف سی چائے شکور کے ہاتھ بھجوا چکی تھی۔ ڈاکٹر منان نہا کر نکلے تو دونوں بچوں کو پیار کرتے ہوئے بال خشک کرتے ہوئے سیدھے کچن میں جا پہنچے۔ دونوں نند بھاوج مصروف تھیں۔
''کھانے میں کیا ہے؟'' انہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔
''زردہ پلاؤ۔''
''بہت خوب...... سچ مچ ہی شادی والا گھر ہو گیا۔'' وہ تیز آواز میں ہنسے۔
''ایں...... کس کی شادی؟...... کہاں کی شادی؟'' بھابی نے گھبرا کر چولہا بند کر دیا اور سیدھی ان کے سامنے آ رکیں۔
''ارے بھئی کی سجائی گاڑی موجود ہے۔ زردہ پلاؤ بھی پک گیا۔ اب تردد کیسا؟''
''کیا کہہ رہے ہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' وہ سچ مچ گھبرا گئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور جاتے جاتے بولے۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"دلہن کے ہمراہ اس کا ڈیا موجود ہے۔ تم کیوں گھبراتی ہو؟"
بارش منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔ بھابی پر ڈھیروں پانی پڑ گیا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے کھسیانی ہنسی ہنستے لپکیں۔
"اے میں کیوں گھبراؤں گی؟ گھبرائیں نہ گھبرائیں، ساتھ لانے والے گھبرائیں۔" انہوں نے میاں کو کمرے میں جا پکڑا۔ "آپ فرمایئے اصل قصہ کیا ہے؟ بہت اڑے اڑے پھر رہے ہیں۔"
انہوں نے ایک لمبی آہ بھر کر جواب دیا۔
"اڑے اڑے پھرنے دیا ہی کہاں "بڑوں" نے...... شروع ہی میں پر نوچ کر "کسی" کی کسٹڈی میں مقید کر ڈالا تھا۔"
"معلوم ہوتا ہے اڑنے کا شوق آج پورا کر لیا اتنے عرصے بعد۔" بھابی کہاں چوکنے والی تھیں، فوراً چوٹ کر گئیں۔ مگر وہ بھی انہی کے میاں تھے۔
"بارش ایسی دھواں دھار تھی کہ گیلے پروں سے اڑنے کے قابل ہی کہاں رہے۔ اور پھر دنیا کے ہر گوشے میں تو ایک "پری" کے پروں کا سایہ رہتا ہے سایہ فگن۔"
"اچھا بہت ہو چکی۔" وہ بگڑ کر بولیں۔ "مجھے بتائیے اس نو بیاہتا جوڑے کو کہاں سے ساتھ لگا لائے؟ کہیں لو میرج سے کورٹ میرج تک کے مراحل آپ نے ہی تو نہیں طے کروا دیے؟"
"لاحول ولا قوۃ۔" ڈاکٹر صاحب نے انہیں گھور کر پوچھا۔ "آپ کے زرخیز دماغ میں یہ خیال زریں کیوں کر آیا؟"
"میرے دماغ میں نہیں آیا۔" وہ چڑ کر بولیں۔ "بارش کہہ رہی ہے وہ دونوں اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتے ہیں۔"
"واہ! اسے کہتے ہیں حسن اتفاق۔ یقین جانیے اس اطلاع سے بہت تقویت حاصل ہوئی ہے۔"
"کیوں......؟" بھابی کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ "میں پوچھتی ہوں آخر یہ سب کیا ہے؟ اور اس میں آپ کا کردار کیا ہے؟"
"معالج......" ڈاکٹر صاحب نے انگوٹھے سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "ہم تو اس وقت ایک بیمار دلہن کے معالج ہیں۔ یہ تو ہوا ہمارا کردار۔ اب آپ فرمایئے، آپ نے آج کس خوشی میں زردہ پلاؤ پکوایا؟"
"جشن آزادی کی خوشی میں۔ آپ کو یاد نہیں ہے آج چودہ اگست ہے۔" بھابی نے برجستہ جواب دیا۔
"چلیے چھٹی ہوئی۔" وہ ہاتھ جھاڑ کر بولے۔ "آپ نے زردہ پلاؤ پکوا لیا، ان دونوں نے نکاح پڑھوا لیا۔ اب ہم سب مل کر جشن آزادی منائیں گے۔ فرخ کیوں چلا گیا؟ اسے بھی بلواؤ، کچھ کام اس کے ذمے بھی لگاتے ہیں۔"
وہ واقعی اس کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔ بھابی نے بھاگ کر ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور ساری تنک مزاجی بھول کر لجاجت سے پوچھا۔
"اللہ کچھ وضاحت کیجیے۔ اب تو میرا دم اوب گیا۔"
"ہاں ہاں...... ابھی آپ کا بھی دم بحال کیے دیتے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب مزے سے بولے۔
"خیال یہ آ رہا ہے بیگم صاحبہ! کہ آج سے آٹھ دس سال قبل یہ وقت ہم پر بھی آیا تھا۔ فرق بس یہ ہے

کہ اس وقت برسات کی پری برس برس جا رہی ہے لیکن اس رات جنوری کی یخ بستہ بھیگی......"
"بس، بس...... چل پڑا آپ کا چرخہ۔" بھابی نے مضبوطی سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"میری بات کا جواب دیں۔"
"چلیے پھر ہو جائیں دو دو ہاتھ۔ آپ کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی۔"
اتنا کہہ کر انہوں نے بیوی کو قریب بٹھایا اور بڑی متانت سے تمام تفصیل گوش گزار کر دی۔

⌘●⌘

اگست کا مہینہ تھا۔ بارش ہو جانے کی وجہ سے موسم پر ایک نکھار سا آ گیا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ برساتی ہواؤں کے جھونکے خود بخود ہی تن من کو بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ دور تک لہراتی ہوئی صاف ستھری سرمئی سڑک کے کنارے ابا میاں کی جہازی سائز کی کوٹھی اپنی روایتی شان کے ساتھ سر اٹھائے کھڑی تھی۔ جس کے پھاٹک پر صاحب خانہ کا نام جلی حروف میں جگمگا رہا تھا۔
تمام کوٹھی اور ملحقہ باغیچہ نہایت جدید، خوشنما اور حسین و جمیل انداز میں بنا ہوا تھا۔ کسی طرح کی کمی بیشی نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن اس کوٹھی نما حویلی کا اندرونی رہائشی حصہ خالصتاً ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا آئینہ دار تھا۔ جہاں کے قاعدے اور قانون اور اصولوں میں دخل اندازی کی کوئی جرأت کر سکتا تھا نہ پر مار سکتا تھا۔ زمانی بیگم اپنے گھر کے معاملات میں گویا ایک مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کو اپنے بتائے ہوئے اصول منوانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کا ماحول کسی بھی طرح کی گڑبڑ اور بے ترتیبی سے مبرا تھا۔ نصف صدی سے بھی زیادہ کے شریک زندگی ہونے کے باوجود ابا میاں نے ان کی خود مختاری کو کبھی چیلنج کیا نہ دخل انداز ہوئے۔ دونوں میاں بیوی عادت و مزاج میں یکسر مختلف ہونے کے باوجود [illegible] مثالی خوش نصیب اور ہر دلعزیز جوڑے کی حیثیت سے ایک خاص شناخت رکھتے تھے۔ کسی طرح کا جھول بظاہر ان کے ازدواجی معاملات میں نظر نہیں آتا تھا۔
اس وقت شام کے چھ بجے ہوں گے۔ [illegible] شمال رخ کمرہ اور وسیع و عریض دالان...... دالان سے آگے بڑھ کر چبوترا، پھر سیڑھیاں اتر کر ایک کشادہ سا صحن۔ چبوترے کے پہلو میں گیلریاں۔ زنان خانے کا یہ حصہ خاص زمانی بیگم کی فرمائش پر ترتیب دیا گیا تھا۔ پیچھے صحن میں ایک بڑا سا باورچی خانہ تھا جس میں اس وقت خاصی ہلچل دکھائی دے رہی تھی اور دو تین مامائیں ساون کے گیت گنگنا کر کئی اقسام کے میٹھے پکوان تیار کرنے میں مصروف تھیں۔
اندر کے بڑے کمرے میں پکے فرش بچھا ہوا تھا۔ سفید اجلی اجلی چاندنی، درمیان میں خوبصورت قیمتی قالین کے ساتھ گاؤ تکیے...... باہر دالان میں بھی دری اور چاندنی کا فرش تھا۔ دونوں اطراف میں بڑی بڑی بھاری بھرکم مسہریاں بچھی تھیں۔
آج زمانی بیگم کی چند ملنے والیاں آئی ہوئی تھیں۔ تازہ بہ تازہ پانوں کا دور چل رہا تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ آپس کی چہلوں اور قصوں میں وقت چٹکیوں میں کٹ گیا۔ دو مامائیں آ کر دسترخوان چن گئیں۔ تڑتڑاتے پکوانوں کی خوشبو سے فضائیں مہک اٹھیں اور ابھی کالی کالی بدلیاں بھی چھن چھن برسنے لگیں۔ زمانی بیگم نے باغ کی طرف کھلنے والے تمام دریچے کھلوا کر پردے ہٹوا دیے۔ ماحول میں ایک خوشگوار سی ہلچل مچ گئی۔ بیگم عزیز مسکرا کر بولیں۔
"زمانی آپا! آپ کے ہاں کے بھی مزے اور لطف ہیں کہ لوٹ پھر کے جی یہیں لگا رہتا ہے۔"

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

پکوان کے پکوان کھاؤ اور آنکھوں سے برسات کے حسین نظارے بھی لوٹو۔ واہ! باغیچے کا کیا دلفریب منظر سامنے ہے۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بوندوں کا جلترنگ!!"

زمانی بیگم سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ اچھا فربہ جسم۔ چہرے کے دلآویز نقوش اور اجلی اجلی رنگت۔ اب تو پھر بھی پچپن چھپن کے پیٹے میں تھیں مگر کسی زمانے میں حسینوں میں شمار ہوتا ہوگا۔ اس وقت دھانی رنگ کا ریشم کا چوڑی دار پاجامہ پہنے تھیں۔ دھانی ہی چنا ہوا دوپٹہ شانوں پر پڑا تھا۔ بھر بھر ہاتھ سونے کی چوڑیاں اور موٹے موٹے کڑے، کانوں میں جڑاؤ بندے اور گلے میں دو طرح کا قیمتی زیور پہنے ایک الگ شان دکھا رہی تھیں۔ بیگم عزیز کی بات سن کر ہنس پڑیں اور جواب میں بولیں۔

"بھئی تم نے تو خوب اچھی خاصی شاعری کر ڈالی۔ اب ایسا بھی کانٹوں میں مت گھسیٹو۔"

خاں صاحب کی بیوی ایک زوردار قہقہہ ابھر کر گویا ہوئیں۔

"خیر بھئی اس میں مبالغہ تو ہے نہیں۔ اتنی گواہی تو ہم بھی دیں گے۔" چچی جان اپنے ٹوٹے پھوٹے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولیں۔

"اے بی بیوا ایسے پکوان کھانے کا کیا فائدہ؟ خالی خولی باتیں بگھارے جاؤ اور کرائے جاؤ۔ اے بھئی! ساون منانے کا مزہ تو تب ہے کہ اونچے اونچے پیڑوں سے جھولے بندھے ڈلے ہوں۔ جگہیں پڑ رہا ہے ہوں، ساونیاں گا رہی ہوں [illegible] ہو اور باغیچوں میں آم......"

"ارے......" زمانی بیگم کو اچانک دھیان آ گیا۔ انہوں نے اپنی خاص ماما کو آواز دی۔

"دلاری!...... دلاری! دیکھ آم ٹھنڈے ہو گئے ہوں گے۔"

"جی بیگم صاحب!" دلاری بوتل کے جن کی طرح نمودار ہوئی۔ اس کے ہمراہ دو نوکرانیاں بڑی بڑی قابوں میں نفاست سے کاٹ کر سجائے ہوئے آم لا کر مہمان بی بیوں کے سامنے سجانے لگیں۔ ہر طرف آموں کی میٹھی میٹھی خوشبو پھیل گئی۔ سب کھل کھل کرتی ہوئی آموں پر ٹوٹ پڑیں۔ کھانے پینے سے فارغ ہو کر دوبارہ پانوں کا دور شروع ہو گیا۔ عزیز بیگم نے پان کی گلوری کلے میں داب کر پوچھا۔

"اے لو...... شاکر کی دلہن کہیں دکھائی نہیں دیں...... میکے گئی ہیں کیا؟"

زمانی بیگم نے جواب دیا۔ "اپنے کمرے میں ہیں۔ دو دن سے ننھے شاہ کو بخار ہے۔ اسی میں لگی ہیں۔"

"دوسرے جی سے ہیں شاید؟" خان صاحب کی بیوی نے رازداری سے پوچھا۔ زمانی بیگم نے متانت سے سر ہلایا۔

"جی ہاں...... آپ کا اندازہ درست ہے۔ خیر سے یہی بات ہے۔"

چچی جان نے لہک کر شعر پڑھا۔ "بھئی ہم تو ہر لمحہ یہی دعا کرتے رہتے ہیں۔

یا رب! رسولِ پاک کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ، بچوں سے گودی بھری رہے"

"آمین!" استانی جی نے پکار کر کہا۔ پھر اضافہ کیا۔ "اے بی! اب تم فاخر میاں کو بھی کھونٹے سے باندھنے کی تیاری کرو۔"

زمانی بیگم جواب نہ دے پائی تھیں کہ ان کی بہو شگفتہ اندر داخل ہوئیں اور سب کو نہایت ادب سے سلام عرض کر کے بیٹھ گئیں۔

خاں صاحب کی بیوی نے بڑی محبت سے دریافت کیا۔ "اب کیسی طبیعت ہے شاکر کی دلہن! شاہ میاں کی؟"

"پہلے سے بہتر ہیں...... سارے دن کے بعد اب سوئے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

استانی جی نے کہا۔ "بیٹی! صبح و شام نظر اتار دیا کرو۔ ماشاءاللہ بہت پیارا بچہ ہے۔ اللہ ہزاری عمر کرے۔ نظر گزر تو خود اپنے پیار کی بھی لگ جایا کرتی ہے۔"

شاکر کی دلہن، زمانی بیگم کی سگی بھانجی اور ابا میاں کی سگی بھتیجی بھی تھیں۔ عمر یہی کوئی چھبیس ستائیس برس کے لگ بھگ۔ اس وقت قیمتی کپڑے کا گلابی جوڑا زیب تن کیے، ہاتھوں میں تین تین زمرد والی چوڑیاں، گلے میں زمرد کا جڑاؤ نیکلس اور موتیوں والا گلوبند پہنے تھیں۔ پیروں میں بجنی والی پازیب۔ بیگم عزیز نے انہیں نظر بھر کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"زمانی آپا! چڑھاوے کے زیورات تو فاخر میاں کی دلہن کے لیے بھی تیار کروا لیے ہوں گے آپ نے؟"

زمانی بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔

"ہاں بی! اس طرف سے میں بے فکر ہوں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ شاکر، فاخر اللہ رکھے دونوں بھائی ہیں۔ اور ان لوگوں کو اللہ نظر بد سے بچائے۔ شگفتہ اور شگوفہ بھی بہنیں ہیں۔ جو کچھ میں شگفتہ کو چڑھاوا چڑھا چکی ہوں، اتنی ہی تول کا زیور شگوفہ کو بھی تیار کروا رکھا ہے۔ ماشاءاللہ دونوں بہنوں کی ہر چیز ایک سی ہے۔ اللہ سلامت رکھے، بیٹے بھی دونوں [illegible] آنکھوں کا نور ہیں۔ سب کچھ انہی لوگوں کا ہے۔ یہ چچی جان اور باجی سرور جہاں گواہ ہیں ہر کام انہی کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے۔ جو یاقوت اور موتی ان [illegible] اور بلکہ میری دور اندیشی کام آ گئی ورنہ اب اس زمانے میں وہ یاقوت اور موتی دستیاب بھی نہ ہو سکتے۔ دونوں بہوؤں کے ہیں بھی تو لے کے توڑے پیروں کے لیے جب ہی بنوا لیے تھے۔ ایک اضافی پازیب ان کی تھی تو شگوفہ کی بھی رکھی ہے۔ [illegible] لے ان کے ہاں کا بھی ایک سیٹ یونہی جوں کا توں رکھا ہے۔ ہاتھوں کی چار چار چوڑیاں، گلے کا ہار، کانوں کے بندے اور انگوٹھی۔ اور جیتے جیتے یہ شرط عائد کر دی تھی کہ چھوٹے کی شادی میں نکالنا یہ سیٹ اور ہماری طرف سے دونوں کی دلہنوں کو پہنا دینا۔ سو اللہ وہ موقع ساتھ خیریت کے لائے۔ شگفتہ کے ساتھ شگوفہ کو بھی مل جائے گا۔"

شگفتہ نے خوش ہو کر ناز بھرے انداز میں کہا۔

"خالہ جان! اب تو بسم اللہ کر کے کسی دن بری کے وہ جوڑے نکال لیجیے جو پچھلے ماہ آپ نے منگوائے ہیں تاکہ مشورہ ہو کہ ان پر کیا کیا کام کرایا جائے۔"

استانی جی بولیں۔ "بس دلہن! بری کے جوڑوں کی کٹائی، سلائی بلکہ قطع کرنے سے پہلے ہی زوردار مٹھائی ہونی چاہیے۔ پھر کام کا آغاز ہوگا۔"

خاں صاحب کی بیوی نے ٹکڑا جوڑا۔ "ہاں...... اللہ مبارک کرے۔ مٹھائی تو سب میں پہلے آئے گی۔"

"ہاں بھئی کیوں نہیں۔" زمانی بیگم نے جواب دیا۔ "جو سب لوگ کہیں گے، آ جائے گا۔ خدا وہ دن تو لائے۔ میں نے شگفتہ کے لیے گھرے پائنچوں کے پاجاموں، شلوار سوٹ اور غرارہ سوٹ کے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

علاوہ گیارہ ساڑھیاں چڑھائی تھیں۔ اس وقت کے کچھ کپڑے بڑھیا قسم کے فاخر کی بری کے لیے بھی خرید لیے تھے۔ ورنہ ذہن میں یہی تھا کہ کپڑے لتے کا رواج اتنا بدلتا رہتا ہے۔ پرانی وضع کے بارڈر، بیلوں اور کارچوبی کو آج کل کی لڑکیاں کہاں پسند کرتی ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے، سب سے رائے لے لی جائے گی۔"

بیگم عزیز نے دریافت کیا۔ "زمانی آپا! شاکر کی دلہن کو تو شاید آپ نے اپنا والا جھومر چڑھایا تھا؟"

"ہاں بی بی! یہ تو سچ ہے۔" انہوں نے تائید کی۔ "وہ جھومر ہمارے ہاں کا بے حد نایاب اور یادگار جھومر ہے۔ جو کئی جگہ سے ہوتا ہوا ہماری ساس کو چڑھا تھا۔ انہوں نے ہمیں چڑھایا، ہم نے اپنی بہو کو۔ ہاں یہ ہے کہ ہم نے بھی جان اور باجی سرور جہاں کی اجازت پر اپنی بہو کو چڑھاتے وقت اس جھومر کا سونا بدلوا دیا تھا لیکن موتی وہی ہیں جو نہایت نایاب ہیں۔ اب اللہ رکھے شگفتہ کے بعد شگوفہ کو بھی وہی جھومر چڑھایا جائے گا۔ لیکن ملکیت ان کی بھی نہ ہوگا بلکہ آئندہ شاکر کی بہو کو چڑھ جانے کے بعد اس کا بٹوارا کر دیا جائے گا۔ باجی سرور جہاں کا کہنا یہ ہے کہ اس جھومر کا قیام بس یہیں تک ممکن ہے۔ آگے زمانہ بہت بدل جائے گا۔"

کسی کی سمجھ میں بات آئی ہو یا نہ آئی ہو سب بی بیوں کے سر ہلنے لگے۔

اب شام بے حد جھک آئی تھی۔ بارش کا زور بھی ٹوٹ گیا تھا مگر بادل اسی طرح کے گھرے تھے۔ آنے والیوں کو زمانی بیگم نے اپنی موٹر سے ان کے گھروں کو بھجوانے کا انتظام کیا اور خود پاندان کھول کر بیٹھ گئیں۔

شگفتہ نے تشویش کے لہجے میں کہا۔

"خالہ جان! آج خالو میاں کو گئے بہت دیر ہو گئی۔ کوئی خیر خبر بھی نہیں۔ آپ کوئی فکر کیوں نہیں کر رہی ہیں؟...... آخر کہاں گئے ہیں؟"

زمانی بیگم نے کتھا چونا چاٹ کر بے پروائی سے جواب دیا۔

"وہ...... یہی ادھر ادھر گئے ہوں گے۔ ہماری ساری زندگی بیت گئی یہی ڈھنگ دیکھتے دیکھتے۔ قیام پاکستان سے قبل مسلم لیگ کے سرگرم رکن تھے تو اس دور کی حکومت کو مطلوب رہے۔ حتیٰ کہ انہی کے کارن ہمیں نقل مکانی کرنا پڑی۔ وہ تو اللہ بخشے ہمارے سسر نہایت چاق و چوبند اور وقت کے نبض شناس تھے۔ بٹوارے سے بھی کئی برس پہلے انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی عملداری کو اندر ہی اندر سمیٹنا شروع کر دیا تھا اور اپنے کئی گاؤں فروخت کر کے یہاں تمہارے والد کو روپیہ منتقل کرتے رہے تھے۔ ورنہ آج کچھ بھی نہ ہوتا۔ جو رنگ ڈھنگ تمہارے خالو میاں کے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو ہم کسی کوارٹر میں پڑے ہوتے۔"

شگفتہ نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔ "خدا نہ کرے...... خدا نہ کرے خالہ جان!...... دشمنوں کے کان بہرے۔"

"ہاں تو ہم کچھ غلط تو نہیں کہہ رہے۔" زمانی بیگم نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "آج تو بھلا چودہ اگست کا دن ہے۔ ان کے بغیر کوئی تقریب آزادی کی بھلا کیونکر ہو سکتی ہے؟ ہوں گے کسی نہ کسی جلسے کے مہمان خصوصی۔"

"چلئے یہ تو مانا۔" شگفتہ نے شوخی سے کہا۔ "مگر...... وہ صاحبزادہ فاخر حسین کہاں غائب ہیں؟ کیا وہ بھی جشن آزادی منانے میں مشغول ہیں؟"

"ہاں بھئی۔ ان کے بھی جشن منانے کے دن ہیں۔" زمانی بیگم نے فوراً جواب دیا۔ "باپ بیٹا نہلے پہ دہلا ہیں۔ نہ وہ کم رہے ہیں نہ یہ کم ہیں۔ بلکہ نیا دور ہونے کی وجہ سے ان میں تو زیادہ ہی گل پھول لگے ہوئے ہیں۔ دیکھتی نہیں ہو، وہ اللہ ماری یونیورسٹی سے جو وقت بچتا ہے باہر مردانے میں گزار دیتے ہیں۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے اندر آ بھی گئے تو باجی سرور جہاں کی گود میں سر دیئے پڑے رہے۔"

"اے دلہن! تم نے یہ کیا کہا؟" کسی کمرے سے برآمد ہوتی ہوئی سرور جہاں نے انہیں للکارا۔

"ہاں تو اور کیا؟" زمانی بیگم نے انہیں سہارا دے کر قریب بٹھاتے ہوئے جھجکے بغیر جواب دیا۔

"خدا جانتا ہے باجی! آپ کے دلارے میاں نے ہمارے کلیجے میں چھپ ڈال دی ہے۔ مجال ہے جو شاکر نے کبھی یہ طور طریقے کر کے دکھائے ہوں۔ خدا ایسی فرمانبردار اولاد سب کو دے۔"

سرور جہاں بھڑک کر بولیں۔ "اے تو فاخر میاں نے کیا نافرمانی کر دکھائی؟ تم تو ایسی باتیں کرتی ہو کہ ہمارا جی جل جاتا ہے۔ تو بھی اپنے پیٹ کی اولاد سے ہی بیر باندھ لیا۔"

شگفتہ کو ہنسی آ گئی۔ زمانی بیگم مسکراہٹ ضبط کر کے بولیں۔ "چلئے جانے دیجئے۔ خوب معلوم ہے، آپ اپنے لاڈلے پر ہرگز آنچ نہ آنے دیں گی۔ یہ بتائیے آپ کے گھٹنے کا درد کیسا ہے؟"

"درد کیسا ہے؟" انہوں نے کراہ کر جواب دیا۔ "برسات کے مہینے کیا آتے ہیں، ہم تو لنگڑے لولے، محتاج ہو جاتے ہیں۔ بڑھاپے کے جھگڑے یہی دن دکھاتے ہیں۔ دوپہر بھر بھولن بے چاری نے حکیم جی والے تیل کی مالش کی ہے۔ سینکائی کرتی رہی، تب کہیں جا کر اٹھنے کی ہمت ہوئی ہے۔"

اتنے میں دلاری ٹرے میں چائے کی پیالی لا کر ان کے سامنے رکھ گئی۔ باجی نہایت بے چینی سے اس طرف متوجہ ہو گئیں۔ ایک ٹکیہ اٹھا کر درمیان سے توڑی، بغور مشاہدہ کرنے کے بعد مطمئن ہو کر ٹکڑا منہ میں رکھ لیا۔ شگفتہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔ اب وقت خاصا ہو گیا تھا۔ گھرے بادل ہونے کی وجہ سے رات بے حد اندھیری اور خاموش لگ رہی تھی۔ باغیچے میں جگہ جگہ جگنوؤں کے جھرمٹ جھلملا رہے تھے۔ گیلی گیلی فضاؤں میں کہیں کہیں ...... بجھتے بجھتے دیپ ٹمٹما رہے تھے یا گویا ہوا میں چنگاریاں اڑتی پھر رہی تھیں۔

اچانک رات کے سناٹے میں دروازہ چرچرایا اور ابا میاں دھیرے سے اندر داخل ہو گئے۔ باجی انہیں دیکھ کر کھل اٹھیں۔

"آؤ بھیا!...... آؤ۔ یہاں ہمارے پاس بیٹھ کر چائے پیو۔" انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

ابا میاں نے جھک کر آداب کیا اور متانت سے بولے۔ "چائے میں نے راستے میں پی لی تھی باجی! اب طلب نہیں ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔ سرخ ڈوروں والی آنکھیں بھاری بھاری لگ رہی تھیں۔ زمانی بیگم اپنی جگہ بیٹھی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

تھوڑی دیر تک وہ سرور جہاں کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں مگر دھیان پورا کا پورا میاں کی طرف لگا ہوا تھا جو آج کئی دنوں کے بعد گھر میں گھسے تھے مگر تیوریوں کے بل نہیں کھلے تھے۔

خواب گاہ میں داخل ہوتے ہی انہیں شدید دھچکا لگا۔

ابا میاں مسہری پر بے ترتیب پڑے سو رہے تھے۔ انہوں نے تیز روشنی کا بلب بجھایا تھا نہ کپڑے

تبدیل کیے گئے تھے۔

یوں گویا کئی راتوں کے جاگے ہوئے ہوں!

⌘●⌘

ساعتیں ہیں یا ساون رت میں بھیگے بھیگے دلنواز جھونکے۔ شاہراہ حیات کا وہ حسین موڑ جو اگر وہ چاہنے والوں پر مہربان ہو جائے تو ارمانوں کی کلیاں کھل کر پھول بن جاتی ہیں۔ آج فاخر اور سعدیہ کے لیے بھی وہی مرادوں والی گھڑی آن پہنچی تھی۔

تم ہتھیلی کو میرے پیار کی مہندی سے رنگو
اپنی آنکھوں میں میرے نام کا کاجل کر دو

شام سے رات گئے تک نازش کو وصی شاہ کی یہ غزل رہ رہ کر یاد آتی رہی۔ کیا دن تھا وہ جب ایک دن چلتے چلتے اس نے فاخر کے منہ سے مصرع سن کر مکمل کیا تھا۔

"میرے احساس کو چھو کر...... مجھے صندل کر دو۔"

زندگی کے اس پہلو کو وہ جتنا سوچ رہی تھی، اتنا ہی حیران ہو رہی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دوسرے پر مر مٹنے والا وہ خوش نصیب جوڑا اپنی زندگی کا آغاز یوں اچانک اس کے اپنے گھر سے کرے گا۔ حالانکہ یونیورسٹی کے دور میں وہ ایک دوسرے کے صورت آشنا تھے اور بس!

ڈاکٹر صاحب نے جو کہا تھا وہ کر گزرے تھے۔

فرخ کی دوبارہ واپسی بہت سارے پھولوں، کلیوں، سہروں اور مٹھائی کے ساتھ ہوئی۔ وہ دلہا دلہن کا کمرہ سجانے کے لیے اپنی پسند کے مطابق خوب سارے جھلملاتے ہوئے تار اور جھالریں وغیرہ اٹھا لایا تھا۔ بھابی اس کا جوش و خروش دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں۔ آج کے انوکھے دن کی مصروفیات کو خود ان کی بھی گردن پر تھیں۔ ایک پاؤں پر اِدھر اُدھر۔

ڈاکٹر صاحب نے بالائی منزل کا ایک کمرہ ان کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ ڈرائیور سے یہ معلوم کر کے کہ ہر دو والی کوٹھی فاخر کی ہی ہے وہ خود حیران رہ گئے تھے۔ خود فاخر اور ڈرائیور کو بھی اس اتفاق کا علم بہت دیر سے ہوا تھا۔ تاہم یہ اطلاع صاحب کے لیے بیک وقت حیران کن اور خوش کن تھی۔ لیکن یہ سن کر کہ ان کی کوٹھی کا ایئر کنڈیشنر بند ہو جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنے ہاں رکھنا مناسب سمجھا تھا اور یہ فیصلہ انہوں نے دلہن کی حالت کے پیش نظر بھی کیا تھا۔ فاخر، سعدیہ کی حالت درست ہو جانے کے بعد اپنے تمام حالات سے انہیں آگاہ کر چکا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی فوری طبی امداد کے بعد سعدیہ کو ہوش آ گیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر صاحب نے اسے دوبارہ گہری نیند میں پہنچا دیا تھا گو کہ اب وہ انجکشن کے زیر اثر تھی مگر ان کا خیال تھا اب جو وہ سو کر اٹھے گی تو فریش ہو گی۔ فاخر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے قدموں کی دھول بن جاتا۔ وہ ان کے آگے بچھ بچھ جا رہا تھا۔ ان کی اور ان کی فیملی کی طرف سے اس کا دل تشکر اور ممنونیت کے احساسات سے لبریز ہو گیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران تھا کہ اس دنیا میں ایسے ایسے بے لوث اور کھری نیت و سوچ کے افراد بھی باقی ہیں جو اندر باہر سے یکساں خوبصورت ہوتے ہیں۔ مسلسل فکر اور پریشانی نے اسے دوپہر سے اب تک نچوڑ ڈالا تھا۔ بھابی کے اصرار پر اس نے کوٹھی سے اپنا ایک سادہ سا کرتا شلوار منگوا لیا تھا۔ دلہا کے پُرتکلف لباس سے نجات پا کر اس کی جان میں جان آئی۔ بے حد تھکن کے باعث وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا۔

بھابی کمرے میں آئیں تو تاسف سے بولیں۔ "ارے...... بے چارے کو......"

"ششش......" دلہن کی نبض دیکھتے ڈاکٹر صاحب نے انہیں خاموش کرا دیا پھر باہر آ کر بولے۔

"جو کچھ بھی ہے بس ٹھیک ہے۔ دونوں بچے سو رہے ہیں، سونے دو۔ آنے والی شب کی فکر کرو...... آج کی آج یہ فرض کر لو کہ ہم ان کے اماں ابا بھی ہیں، ساس سسر بھی۔ ان کے قیام و طعام کا بندوبست کر دو۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لائے۔ یہاں فرخ اور شہروز مل کر دلہا دلہن کا کمرہ سیٹ کر رہے تھے۔ ان کا جوش و خروش قابل دید تھا۔ یہاں کی سجاوٹ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔ وہ پیچھے میں شہروز فرخ کو دیکھ کر مسکرائے۔

"تم نے تو اپنی ساری نازک خیالی اور فنکاری آج ہی صرف کر ڈالی۔" بھابی نے بھی ٹکڑا جوڑا۔

"آخر کو مصور ہیں...... اپنی خوبی کیسے چھپائیں گے۔" اس نے شرارت سے جواب دیا۔ "آپ نے زردہ پلاؤ پکا کر اپنی گھرداری جتا دی۔ آپ کے "پیا" نے اپنی مسیحائی کا کرشمہ دکھا ڈالا تو بھلا ہم کسی سے کم ہیں کیا؟"

ڈاکٹر صاحب زور سے ہنس پڑے۔ فرخ نے مزید گوہر افشانی کی۔

"اور تو اور...... آج تو چاندنی بی بی بھی [illegible] اٹھائے ہوئے ہیں۔ بس ایک وہ محترمہ نازش صاحبہ ہیں جن کے لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔"

بھابی چونک کر بولیں۔ "تو...... اس خیال میں مت رہنا۔ سب میں زیادہ مصروف تو وہی ہے۔ کھانے کی تمام ذمہ داری زبردستی مجھ سے لے لی ہے۔ آخر وہ بھی یونیورسٹی کے ساتھی ہیں۔"

فرخ کے ہاتھ سے ہتھوڑی چھوٹ گئی۔ تعجب سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہیں بھابی جان؟...... آخر یہ قصہ کیا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب اس دوران نیچے چلے گئے تھے۔ بھابی، فرخ کی بات کا جواب تفصیل سے دینے بیٹھ گئیں۔

رات بارہ بجے سے پہلے ہی سعدیہ [illegible] کے بعد ہوش میں آ گئی تھی اور واقعی اب اس کی طبیعت بحال تھی۔ پھر اس کے بعد بھابی نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا کہ زیادہ ذہنی دباؤ اس کے لیے ضرر رساں بھی ہو سکتا ہے۔ کسی طرح بھی رات بخیریت گزارنی چاہیے۔ فرخ نے اپنے اسٹوڈیو میں مصوری سیکھنے والی کئی لڑکیاں بطور خاص ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر بلوائی تھیں جو شادی کی تقریب کے مطابق خوب بن ٹھن کر زرق برق لباسوں میں آ پہنچی تھیں۔ گھر کے اندر ایک دم ہی چہل پہل اور گہما گہمی بڑھ گئی تھی۔ کچھ کھانا بازار سے منگوا لیا گیا تھا۔ بھابی کی انتظامیہ لاجواب رہی۔ دلہن کی بے ہوشی کے دوران انہوں نے اس کے گہنے زیورات اسی کمرے میں محفوظ کر دیے تھے۔ تازہ گجرے، ہار، پھول فرخ لے آیا تھا۔ چنانچہ کھانے کے فوراً بعد ہی انہوں نے دو مشاق اور ماہر لڑکیوں کے سپرد دلہن کو کر دیا اور خود دیگر انتظامات کی تیاری میں لگ گئیں۔

انہیں بار بار افسوس ہو رہا تھا کہ کاش اس اچانک منعقد ہو جانے والی تقریب کا علم کم از کم آج صبح کے وقت ہی ہو جاتا تو یقیناً وہ اپنی چند ملنے والیوں کو مدعو کر کے دلہن کا سواگت اس کے شایان شان کر سکتیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اتنا ہی مناسب تھا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فاخر کو بھی دوبارہ دُلہا بنایا گیا۔ اس شادی میں گھر کا ہر ملازم حتیٰ کہ پھول بابا تک شامل تھے۔ سب کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ سعدیہ کو اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ وہ ایک بھرے پُرے گھر میں بیاہ کر نہیں آئی ہے۔ تقریباً ہر رشتہ اس کے سامنے تھا۔ اندر سے باہر تک ایک خوشگوار سا، ارمانوں بھرا ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

جب اسے نیچے سے اوپر اس کے کمرے کی طرف لے جانے کا موقع آیا تو بہنوں کا راستہ رُکوانا اور دُلہناپے کی ساری رسمیں بھابی نے لڑکیوں کے شور و غل اور قہقہوں چہلوں کے درمیان خوب جم کر اور دل سے ادا کیں۔ سعدیہ کے فرشتوں کو بھی گمان نہ گزر سکا کہ وہ فاخر کے بڑے بھائی صاحب کی بیوی نہیں ہیں۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں اسے ہر طرف، ہر جگہ اپنے سسرالی ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے لگ رہے تھے۔ اسے اپنے خالی خالی دل میں سکون و اطمینان کا گہرا احساس اترتا محسوس ہوا۔ رخصتی کے وقت سماعت سے ٹکرانے والی سرگوشیاں جھوٹ کا پلندا معلوم ہونے لگیں۔ سارے گھر میں فرخ کے مسلسل بدل بدل کر لگائے جانے والے شوخ شوخ شادی بیاہ کے گیتوں نے رنگ سا بھر دیا تھا۔ ہر کوئی مگن اور خوش تھا۔

خدا خدا کر کے رات کے دو ڈھائی بجے یہ سب ہنگامہ اختتام پذیر ہوا اور سب اپنے گھر گئے۔

تب ان دونوں کو حالِ دل کہنے سننے کا موقع ملا۔

"اگر جو اچانک تمہاری طبیعت خراب نہ ہو گئی ہوتی تو میں مر چکا تھا۔"

"یہ تو اُلٹ بات ہو گئی۔ لیکن...... آخر کیوں؟"

"مارے خوشی کے...... یقین جانو بے حساب خوشی مجھے زندہ نہ چھوڑتی۔"

"تب تو بہتر ہوا کہ میں بے ہوش ہی ہو گئی۔"

"آخر تم بے ہوش کیوں ہو گئی؟...... کیا ہو گیا تھا تمہیں؟"

"معلوم نہیں۔ ویسے تو میں بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ بس، وہ خواتین آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ سب سن کر پتہ نہیں میرے دل میں کیا ہونے لگا۔"

"کیا ہونے لگا......؟" فاخر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "اور وہ باتیں کیا تھیں، جنہیں سن کر تم نے دل پر اثر لیا؟"

"وہ کہہ رہی تھیں......" سعدیہ نے حرف بہ حرف تمام گفتگو سنا ڈالی۔

فاخر سناٹے میں رہ گیا۔ اس کے فرشتوں کو بھی گمان نہ گزر سکتا تھا کہ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ تاہم اپنی ساری کھسیاہٹ چھپا کر ہنسنے لگا۔

"اب کیا کہتی ہو؟"

سعدیہ کے صبیح چہرے پر تازہ گلابوں کی دلکشی چھا گئی۔ "جھوٹ بکتی تھیں سب کی سب۔"

فاخر نے دل ہی دل میں ڈاکٹر صاحب کی دور اندیشی اور دانائی کو سینکڑوں دعائیں دے ڈالیں۔

"لیکن...... امی جان سے ملاقات نہ ہو گی؟"

"ہاں...... آں......" فاخر نے سنبھل سنبھل کر سفید جھوٹ بولا۔ "تمہاری غفلت کے دوران برابر تمہارے پاس تھیں۔ پھر ان کی تھکاوٹ اور طبیعت کے پیشِ نظر بھابی نے زبردستی سونے کے لئے بھیج دیا تھا۔"

"ہاں، بہت اچھا کیا۔" وہ سادہ دل بالکل ہی مطمئن ہو گئی۔ مرکری ٹیوبز کی روشنی جھلملاتی ہوئی

دلہن کے معصوم چہرے پر براہِ راست پڑ رہی تھی۔ وہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ فاخر نے منہ دکھائی میں اسے کنگن پہنائے تھے جنہیں وہ بے خیالی میں ایک ہاتھ سے چھیڑے جا رہی تھی۔ کمرے کی فضا تازہ پھولوں، اُبٹن اور مہندی کی ملی جلی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ سہاگ کی خوشبو کی بھی اپنی ایک الگ شناخت ہوتی ہے۔

فاخر اندر اندر اس کی روشن پیشانی پر ستارے کی طرح دمکتے سیاہ نشان پر نثار ہوا جا رہا تھا۔ آج دُلہناپے کے سنگھار کی زد میں آ کر تو وہ نشان لاکھ بناؤ دے رہا تھا۔ چمپئی رنگت میں آج غضب کا نکھار تھا اور اس معصوم نکھار اور بے پناہ دلکشی کو چار چاند لگانے والا تھا وہی سیاہ نشان جو صبیح پیشانی پر ٹیکے کی طرح چمک رہا تھا، دمک رہا تھا۔ اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"آہ...... ایسا دلکش!"

فاخر کی تیز اور گرم جوش سرگوشی سے وہ سمٹ کر رہ گئی مگر آج وہ اسے روکنے یا ٹوکنے کا حق کھو چکی تھی۔ فاخر کی تمام تر شوخیوں اور مستیوں کو برداشت کرنا اس کے فرائض میں شامل ہو چکا تھا۔

"دلکش......" وہ ضدی بچے کی طرح مچلا۔ "بہت دلکش۔"

تازہ پھولوں اور کلیوں سے بھرا ہوا کمرہ سرگوشیاں کرنے لگا۔ "دلکش۔" عطرِ سہاگ کی خوشبو مسکائی "دلکش۔" وہ مدہوش ہو کر بہکتا چلا گیا۔ "دلکش...... خدا کی قسم! بہت دلکش۔"

"اُف توبہ!" وہ دُہری ہو گئی۔ خجالت سے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ لیکن یہ تو ان دونوں کی مشترکہ خواب گاہ تھی۔ یہ بے خودی کا باغیچہ تو تھا نہیں...... وہ اور ہنس دی۔

"سعدیہ!" وہ بہت دھیمے سُروں میں گویا ہوا۔ "...... تم سے کہا تھا کہ مجھے نہیں معلوم کہ دھوکا اور فریب کیا ہوتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کبھی میں یہ بھول جاؤں۔ میرے پاس ایسا کوئی تصور نہیں ہے۔ میرے ضمیر کی ہر دھڑکن کو تم سے محبت ہو گی۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ تمہارے نام سے عشق ہے۔ تم کو چھو کر گزرنے والی ہوا سے عشق ہے۔ تم میرے لئے وہ خوشبو ہو جو جسم و جاں کی بقا کے لئے لازم ترین ہوتی ہے۔ خدانخواستہ تم سے بچھڑ جانا، میرے لئے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لینے کے مترادف ہے۔ یہ تمام باتیں ایک دن میں نے تم سے کی ضرور تھیں مگر صرف کسی مجبوری کے تحت۔ ورنہ اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں موجزن احساسات اور جذبات فقط آج کی یادگار ساعت تمہارے حضور پیش کرنا چاہتا تھا۔ تم شاید یقین نہ کرو مگر حقیقت یہ ہے کہ تمہیں پہلی نظر دیکھنے کے بعد سے آج تک، ایک لمحے کے لئے بھی بھول جانا میرے اختیار سے باہر رہا ہے۔ تم میری ایک اچانک ہی قبول ہو جانے والی دعا ہو سعدیہ!...... قدرت کا بہت بڑا عطیہ۔ اور میری بے نوا زندگی کا سب سے انمول اور بیش بہا خزانہ ہو...... خدا میری عمر بھی تم کو لگا دے۔ تم کبھی اپنی زندگی میں معمولی ترین دُکھ کا لمحہ بھی نہ دیکھو۔"

وہ باتیں کرتا ہوا آہستہ آہستہ سہارا دے کر اسے کمرے سے باہر لے آیا۔ یہاں کھلی ہوئی کشادہ چھت ان دونوں کے استقبال میں بانہیں پھیلائے جیسے انہی کی منتظر تھی۔ عجب حسین اتفاق تھا۔ آج چاند اور انگریزی، دونوں تاریخیں ایک ہی تھیں۔ اگست کی بھی چودہ اور چاند کی بھی چودہ تاریخ۔ بادل برس برس کر جگہ جگہ سے چھٹ گئے تھے۔ ہوائیں تھم تھم کر چل رہی تھیں۔ ساری چھت دودھیا سے غبار کی لپیٹ میں جکڑی ہوئی تھی۔ آج چاند نے ان دونوں کے ساتھ سفر کیا تھا اور فاخر کے دلآویز، خالص اور دلکش جذبوں کا ترجمان بنا رہا تھا۔ اس کا والہانہ پن سعدیہ کی روح کی گہرائیوں تک اتر کر ایک

سرشاری نشے کی کیفیت میں بدل چکا تھا۔

رات کچ کچ پاؤں دھرتی، کافوری اُجالوں سے گلے ملتی روپہلے چہرے والی صبح کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ ہواؤں کی پالکی پر سوار شبنم کے قطرے آسمانوں سے زمین کی طرف سفر کر کے بیلے بیلے جھونکوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ یہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، چلتے چلتے چھت کے آخری گوشے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک محراب کے نیچے خوبصورت سی تنگ بینچ نصب تھی۔ فاخر نے آہستگی سے پھولوں سے گندھی خوشبو سے اٹی اپنی دلہن کو اس پر بٹھا دیا۔ حسین و جمیل یادگار لمحات بارش کی طرح اُن پر برسنے لگے۔ فاخر نے بے ساختہ اس کے نرم و ملائم، نازک اور حنا آلود ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں بھر لیے۔ چاروں طرف ان گنت چاندی کے پھول کھل اُٹھے۔ نرم جذبوں کی پُر کیف پھوار برسنے لگی۔

سعدیہ کی دونوں ہتھیلیوں پر چپکے ہوئے مہندی کے پھول کھلکھلانے لگے۔ فاخر پورے کا پورا مچل اُٹھا۔ بے اختیار ہو گیا۔ اس کی بھاری سی دلگداز آواز کا سحر سعدیہ کے گرد جال بُننے لگا۔

میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا
ایسا لگتا ہے جو یہ ہاتھ دعا کو اٹھیں
خود فرشتے لیے آتے ہوں زمیں کی جانب
سونپ ... ہاتھوں کی ہتھیلی کو حنا
جو بھی ... ہاتھ دیئے جاتے ہوں
ان کی ... میرا سارا وجود
انہی ہاتھوں میں ... خواب چھپے ہیں مولا
[illegible]
انہی پوروں نے مرے درد چنے ہیں مولا
ان کی رگ رگ میں محبت ہی محبت رکھنا
میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا
انہی ہاتھوں کی لکیروں میں مقدر ہے مرا
یہ جو کونے میں ستارہ ہے، مقدر ہے مرا
خواب سے نرم خیالوں کی طرح نازک ہیں
ان کے ہر لمس میں میرے لیے چاہت رکھنا
میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا
میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا

⌘●⌘

ڈیوڑھی پار کر کے تیزی سے آتی ہوئی کرائے دارنی نے کھانے کی ٹرے دھپ سے تخت پر رکھ دی اور پھر ماتھے پر ہاتھ مار کر زور سے بولی۔

"اوئی میری تو عقل جاتی رہی۔ خیال ہی نہ رہا۔ اب بھلا فرحت میاں کاہے کو یہ کھانا مسجد پہنچا کر آئیں گے۔ وہ تو اپنی دلہن کے حضور ہوں گے۔"

اپنی بات پر وہ خود ہی زور سے ہنسی۔ تخت پر گاؤ تکیے سے ٹکی بی اماں بھی مسکرانے لگیں۔ بلا سبب

پاندان میں جھانک کر گویا ہوئیں۔

"بس، بیگم اول فول بکے۔ اے اللہ رکھے، جائے گا کیوں نہیں۔"

فرحت ہاتھ سے بال سنوارتا ہوا بوکھلا کر کمرے سے نکل آیا اور ان سے بولا۔

"اجی میں بھلا اگست کے مہینے کو بھول سکتا ہوں؟ خوب یاد ہے کہ آندھی آئے، طوفان آئے مگر آپ پورے ماہ نمازیوں کی تواضع ضرور کرتی رہیں گی لیکن......." اس نے شرارت سے ذرا تھم کر جملہ مکمل کیا۔ "آج تو چودہ اگست ہے۔ اور چودہ اگست ہندوستان کی خوشی کا دن ہے۔"

"اے بھاڑ میں جائے۔" وہ تنتنے بھنا کر بولی۔ "تم ہمارے سامنے اس گوڑ مارے (ہندوستان) کا نام مت لیا کرو۔ کمبخت کا ذکر سن کر جی جلتا ہے جہاں ہمارے سب سگے رشتے کٹ مرے۔"

فرحت کی شرارت کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ کھانا اُٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ باتوں کی آواز سے ادھر اُدھر اوندھی سیدھی پڑی مہمان بی بیوں اور لڑکیوں میں ہلچل کے آثار دکھائی دینے لگے۔

اتنے دنوں سے باہر بجنے والی ڈھولک ایک طرف لڑھکی پڑی تھی۔ کل رات دلہن بیاہ کر آ چکی تھی اور لاکھ صفائی ستھرائی کے باوجود ہر کمرے، ہر برآمدے میں ادھر اُدھر بکھرے دوپٹوں، مہندی کی پراتوں، میلے ہوتے پھولوں، اُبٹن کے علاوہ کسی بچے کی نکر، بڑے کی بنیان اور غیر ضروری چیزوں کی بھی افراط تھی۔ کسی گوشے میں بچوں کے ... پڑے تھے۔ شادی کی بے پناہ بھاگ دوڑ میں تھک تھکا کر سب کو اب تک نیند آئے ... مہمان دور ... سے بھی آئے ہوئے تھے جو اب خیر سے ولیمے کی دعوت وغیرہ سے نمٹ کر ... تھے۔ آدھے درجن بچوں کے جلوس میں سوئی معطر نے بمشکل آنکھ کھول کر ...

"کیا ہو گیا؟...... کیا کہہ رہے ہیں فرحت ..."

کرائے دارنی ... دبا کر بولی۔

"اے فرحت میاں اب ہم تم سے کیا کہیں گے۔ کہنے سننے کو اب مل گئیں ان کو ان کی دلہن۔ تم اپنی کہو۔ کہیں بھائیوں کی شادی میں یوں گھوڑے بیچ کر سویا جاتا ہے۔"

معطر شرمندہ ہو کر ... بکھرے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ "آپ دیکھ رہی ہیں ان بچوں کے جھمیلے نے کیسا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان کے باوا ساتھ میں آتے تو یہ ایسے بے تحے بیل کی طرح تو نہ مچلتے۔ لے کے سر میں درد کر دیا۔ اب تک ریل گاڑی کے چکر بھی دماغ سے نہیں اُترے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" کرائے دارنی نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ "اتنی دور کا سفر آسان بھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی اوپر تلے کے لڑتے بھڑتے بچوں کے ہمراہ۔"

معطر نے رونی صورت بنا کر کہا۔ "فرحت کی شادی ہوئی بھی تو مارا مار ہے۔ اللہ جانتا ہے، معلوم نہیں کیسے گرتے پڑتے آنا ہوا ہے۔ ایک ہی میرا بھیا۔ نہ کوئی چاؤ چونچلے ہوئے نہ ارمان نکلے۔ اچھی سی تیاری کا تو کیا موقع تھا، اطلاع ملتے ہی ہاتھ پاؤں پھول گئے میرے۔ ابھی تین دن پہلے تو خالو میاں کا چالیسواں ہوا ہے۔ انھی نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ ہاں، یہ ہے کہ مجھے روکا بھی نہیں۔"

"خیر یہ تو انصاف کی بات ہے کہ زیادتی ہماری طرف سے ہی ہوئی ہے۔" اماں بی نے دیانت داری سے کہا۔ "تمہارے سسرالیوں کی جتنی تعریف کی جائے، وہ کم ہے۔ انتہائی شریف اور قدر دان ہے ہمارا سمدھیانہ۔ مولا سب کو ایسے سمجھ دار رشتے عطا فرمائے۔ حقیقت میں انھوں نے میری بہت

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

لاج رکھی۔"

معطر کو اپنے سسرال کی تعریف سے دلی خوشی ہوئی مگر ٹھنک کر بولی۔ "ہاں تو اماں! آپ نے اتنی جلدی کیوں مچائی؟ پہلے سے کوئی خبر تھی نہ خبر۔ ابھی مہینہ پیچھے آپ خالو میاں کے انتقال پر گئی تھیں۔ تب تو تذکرہ تک نہ کیا تھا۔"

"اے چپ رہ بدعقل لڑکی!" اماں بی نے سہما ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے بولنے سے روکا۔ "تم تو ہو پوری بھاڑ کا چنا۔ بات کو سمجھتی ہو نہ حالات کو۔"

معطر نے مارے جوش اور جستجو کے اٹھ کر ان کے قریب آنا چاہا مگر پہلو سے چپٹے منے نے قمیص پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ کرائے واری ہنسنے لگی۔

"دیکھا آپ نے؟" وہ کھسیا کر بولی۔ "ایسی گت بناتی ہے یہ اولاد میری۔" پھر منے کو گود میں بھرے وہیں بے بسی سے بیٹھ گئی۔

اماں بی نے بند دروازے کی طرف دیکھ کر دھیرے سے کہا۔ "ابھی موقع نہیں ہے۔ تمہیں پھر بھی تفصیل سے بتا دیں گے سب کچھ۔ خاطر جمع رکھو۔"

"آپ خاطر جمع نہ رکھیں گے تو اور کیا کریں گے۔" وہ منہ پھلا کر بولی۔ "ہمیں تو کوئی جہیز وہیز بھی نظر نہیں آیا۔ خالی خولی دلہن ہی دلہن ہے۔"

"معطر!" اماں بی کو غصہ آ گیا۔ آواز دبا کر بولیں۔ "خبردار جو اس معاملے میں کسی زبان سے کوئی دوسری بات نکالی تو...... آج کے بعد ہم بھی [illegible]۔"

مارے جلال کے ان کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے تھے۔ معطر ڈر گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مصالحانہ رویہ اختیار کر لیا اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"یہ آپ نے اچھا [illegible] اب [illegible] شریک ہو سکیں گے دعوت میں۔"

جواب میں اماں بی تو خاموش رہیں مگر کرائے واری نے چہک کر کہا۔ "ہو یہ اب تم ہی سوچو کتنی سہولت اور خوبی کی بات ہے......" اس کی بات پوری بھی نہ ہو سکی اور آن کی آن میں اک طوفان بدتمیزی مچ گیا۔

معاً ڈیوڑھی میں بے شمار گھنگھرو بجنے لگے۔ ساتھ دھمادھم ڈھول پر تھاپ پڑنے لگی۔ سب نے گھبرا کر دیکھا۔

سامنے سے ہیجڑوں کی ایک گاتی بجاتی ٹولی تالیاں بجاتی چلی آ رہی تھی۔ سب سے آگے والے ہیجڑے کی پاٹ دار آواز ہر طرف گونج گئی۔

"اے مبارک ہو بڑی ماں!...... بیٹے کا سہرا مبارک ہو۔ نیک بخت، نیک خو بہو مبارک ہو۔ آج ہم بدبختوں کے بھی بھاگ کھول دے ماں!...... او ری ماں!"

تھوڑی دیر میں ہر طرف دھماچوکڑی مچ گئی۔ سوئی لڑکی بچیاں ادھر ادھر بکھرے دوپٹے تلاش کرنے لگیں۔ ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ ہیجڑوں نے نہایت منظم انداز میں اماں بی کی چوکی کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ وہ بے چاری پہلے تو اٹھ کر ہی کھڑی ہو گئی تھیں بوکھلاہٹ میں۔ مگر پھر وقت کی نزاکت کے خیال سے دوبارہ اپنی جگہ بیٹھ گئیں۔ جاتی کہیں، دروازہ کھلا رہ گیا۔ اب یہ کسی کے نکالے نہ نکلیں گے۔ اسی ہیجڑے نے کان پر ہاتھ رکھ کر زوردار ہانک لگائی۔

"دھوم شادی کی دھواں دھار مبارک ہووے
اماں پیاری کو یہ دلدار مبارک ہووے
طوطیاں گائیں چہک کر بھری محفل میں آج
سہرا پھولوں کا زری دار مبارک ہووے"

ان سب نے مل کر یکلخت پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔ دھمادھپ ڈھولک بجنے لگی۔ گھنگھرو چھنکنے لگے۔ پاٹ دار آوازوں کے عقب میں تالیاں چٹاچٹ بج رہی تھیں۔ ایسا شور کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ چاروں طرف سے گھر کا ہر فرد آ جمع ہوا تھا۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ حتیٰ کہ دلہن بھی کمرے کی کھڑکی میں چھپی کھڑی تھی۔

بھڑک دار چمکیلے کپڑے پہنے، منوں سرخی پاؤڈر تھوپے سب میں "حسین" ہیجڑے نے سب کے بیچ کھڑے ہو کر ٹھمکے پہ ٹھمکا لگانا شروع کر دیا۔

اچانک انہوں نے اپنا سازوں کا سُر تال بدلا اور ایک عجیب ہی وضع کا گانا شروع کر دیا۔

"بنا آیا ہے بنی، پھولوں کا گہنا لے کر
بنا پاؤں [illegible] کے ہماری بجری"

مگر لڑکیوں بالیوں نے ایک نہ چلنے دی۔

"اوہو...... اوہو...... کیا [illegible] کہیں سے شوخ آواز ابھری۔ "آج ہم نندیں ہیں۔ نندوں میں نیگ بٹے گا یہ۔"

ناچار انہوں نے سُر بدلا۔ تان اٹھائی۔

"[illegible] تمہاری [illegible] گی"

اب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ساز اور سُر تال بدلا جانے لگا۔ کبھی...... "گھونگھٹ نکالوں کہ گھونگھٹ اٹھا لوں، سیاں جی کا کہا میں مانوں کہ نا مانوں"...... کبھی "او گوری تیکھی راہوں پہ پائل میری چھنکے" سب کے سب کمرے میں آ کر تالیاں بجانے لگے اور زوردار ٹھمکا لگ رہا تھا۔

آ گئے موسم رنگیلے سہانے، جیا نہیں مانے
تو چھٹی لے کے آ جا بالما...... ہو

یہ ہو......" اتنی تشویش ناک ہوئی کہ کھانے کی خالی ٹرے واپس لے کر آنے والا فرحت کو وقت کما کر دوبارہ گھر سے بھاگ لیا۔

بہت دیر تک شور وغل مچانے کے بعد ہیجڑوں نے ویل دو ویل دو کی راگنی شروع کر دی۔

"ڈھائی سو...... ڈھائی سو سے کم ایک کوڑی نہ لوں گی اماں ری۔ ڈھائی سو...... پورے پکے ڈھائی سو ڈال دے ہماری خالی گود میں۔"

بالآخر بہ مشکل تمام کسی نہ کسی صورت انہیں سو روپے دے کر ٹالا گیا تب کہیں خدا خدا کر کے وہ اپنے ڈھول تاشے سمیٹ کر ٹھمکتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

اب سارے گھر میں رونق ہی رونق جاگ پڑی تھی۔

کوئی نہانے چل دیا تھا، کوئی کپڑے بدل رہا تھا۔ کہیں بچے ضد کر رہے تھے تو کہیں بڑے بگڑے جا رہے تھے۔ غرضیکہ صحیح معنوں میں شادی والا گھر لگ رہا تھا۔ ایک مصروفیت اور گہما گہمی کا سا عالم تھا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کھانے سے فراغت پا کر سب کسی نہ کسی طرف لگ گئے۔

فرحت نے گاہے گاہے کئی چکر اپنے کمرے کے لگائے مگر ہر بار نازیہ کو لڑکیوں میں گھرا ہوا پایا۔ وہ نظر بھر کر اسے دیکھ بھی نہ پا رہا تھا۔

کل رات سے اب تک اسے یوں لگ رہا تھا جیسے خوابوں کے ہنڈولوں میں اُڑ رہا ہو یا روپہلی، سرمئی ساعتوں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا ہو۔ حالانکہ یہ حقیقت تھی کہ نازیہ کو دیکھنا تو درکنار وہ اس کے نام سے بھی آشنا نہیں تھا۔ وہ تو بس فاخر کا ہی مذاق اُڑاتا آیا تھا۔ اپنی اچانک ہو جانے والی شادی کا اسے دور تک گمان نہ گزرا تھا اور اب ...... جب کہ فاخر کے ساتھ ساتھ وہ بھی ان تمام مراحل سے گزرتا چلا آیا تھا تو اسے یوں معلوم ہو رہا تھا گویا اس کا اور نازیہ کا جنم جنم کا ساتھ رہا ہو۔ وہ اس کو اتنی مانوس اور آشنا آشنا سی لگی تھی، جہاں کسی اجنبیت اور غیریت کا سوال نہ تھا۔

سچ کہا ہے بڑے بوڑھوں نے کہ خدائے بزرگ و برتر نے نکاح کے دو بولوں میں وہ مقدس اور پاکیزہ ترین رشتہ پیوست کر دیا ہے جس کے واقع ہوتے ہی دو اجنبی دل لازوال اور لافانی بندھن سے بندھ جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ سیاہ آسمان پر تاروں کی برات اتر آئی۔ کل بھی جانے والی بارش کے بعد پُروا ہوا کے جھونکے اکا دکا اودے بادلوں کو اُڑائے لئے جا رہے تھے۔ ہر طرف ایک پُرنوری خاموشی چھاتی چلی گئی اور نیند کے ساگر میں تمام عالم ڈوبتا چلا گیا۔ [illegible] رات ڈھل رہی تھی۔

فرحت اور نازیہ ...... دونوں بہت دیر سے کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے بیٹھے محو گفتگو تھے۔ پچھلے برآمدے میں کھلنے والی کھڑکی سے آگے دور تک [illegible] صحن خالی پڑا تھا۔

باتیں کرتے کرتے دونوں خاموش ہو گئے۔ لیکن اس خاموشی اور چپ کا بھی اپنا ہی ایک حسن تھا۔ ایسا طلسمی اور سحر انگیز [illegible] پُراسرار [illegible] گفتگو کا بھی [illegible] ان کی بے چینیوں میں [illegible] کا عنصر غالب تھا۔ مانوس سی فضاؤں میں شناسا سی مہک بکھرے رہی تھی۔

Famous Urdu Novels

آنکھوں [illegible]

Free Pdf Library

آنکھوں میں میرے کھلی ہوئی رات
خوابوں کی کل ہتھیلیوں پہ
مہندی کی طرح رچی ہوئی رات

انہیں اپنی نرم و گرم آغوش میں سمیٹے یادگار رات کچ کچ قدموں سے سفر طے کرتی رہی اور وہ اپنی اپنی سوچوں کے گرداب میں ڈوبتے اُبھرتے رہے۔

اچانک فرحت کی سوچوں کو زبان مل گئی۔ وہ دھیرے سے بولا۔ "جب ہم دونوں اتنے مگن اور مطمئن ہیں، جنہوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں تھا تو بھلا فاخر اور سعدیہ کی خوشیوں کا کہاں ٹھکانہ ہوگا؟"

"کیا مطلب؟" نازیہ نے اُلجھ کر پوچھا۔ "جیسے ہم مگن ہیں، ایسے ہی وہ بھی ہوں گے۔"

"جی نہیں ...... بلکہ کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہونا چاہئے۔"

"عجیب بات کی آپ نے۔ میری سمجھ میں تو آئی نہیں۔"

فرحت نے بغور اس کی حیران صورت دیکھی اور پوچھا۔ "کیا تمہیں واقعی کچھ نہیں معلوم؟"

"جی؟ ...... میں آپ کا مطلب بالکل نہیں سمجھی۔" اب وہ تھوڑی سی گھبرا بھی گئی تھی۔ پریشان ہو

کر پوچھا۔ "بتایئے نا ...... کیا بات ہے؟ ...... مجھے تو ہول ہونے لگا ہے۔"

"خیر ...... ہولنے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔" فرحت نے اسے تسلی دے کر کہا۔ "تعجب تو مجھے تمہاری بے خبری پر ہے۔ دونوں سگی بہنیں ہو مگر ایک دوسرے کی معلومات نہیں۔ کمال کی بات ہے بھئی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ سعدیہ نے تمہیں اپنا ہم راز بنانا پسند نہیں کیا۔ مان گئے بھئی سعدیہ کو۔ بہت گہری طبیعت پائی ہے اس نے بھی۔"

اتنا کہہ کر فرحت نے لمحہ بھر غور کیا مگر اب کیا تدارک ہو سکتا تھا۔ بات منہ سے نکل چکی تھی۔ اس کی نئی نویلی دلہن بے تابی کے ساتھ اس کی طرف وضاحت طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ وضاحت کے بغیر چارہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ سنبھل سنبھل کر اسے داستانِ فاخر و سعدیہ سنا رہا تھا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے ہمہ تن گوش تھی۔

※●※

صبح کے کوئی دس بجے ہوں گے۔ زمانی بیگم گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں خاموش بیٹھی تھیں۔ خلافِ معمول پاندان بند تھا۔ منہ میں پان بھی نہیں تھا۔ چہرے بشرے سے تردد کے آثار جھلک رہے تھے۔

دلاری نے قریب آ کر ادب سے دریافت کیا۔

"اچھوانی تیار ہو گئی ہے بیگم صاحبہ ...... [illegible] آؤں؟"

"آں ...... ہاں ......" انہوں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر پوچھا۔ "لڈو نہیں آئے؟"

"جی ہاں ...... [illegible] لے گئے ہیں۔"

"دلہن کے پاس [illegible]"

"بیگی جان اور تانیا بی بی ہیں ان کے کمرے میں۔"

"ٹھیک ہے۔" زمانی بیگم نے مطمئن ہو کر ہدایت کی۔ "ان سے کہنا خوب اچھی طرح ناشتہ کروا دیں دلہن کو۔ اور سوا شاہ جاگ جائیں تو یہاں ہمارے پاس بھیج دینا۔"

دلاری کے جانے کے بعد انہوں نے پاندان کھولا اور پان لگانے لگیں۔ اتنے میں تانیا مسکراتی ہوئی آئی اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"ہائے اماں جان! ...... ہمارا نیگ لائیے۔ آج ہم دوہرے پھوپھی بن گئے۔ بس اب زوردار مٹھائی ہونی چاہئے۔ جلدی کیجئے۔"

"ارے باؤلی ہو گئی ہے کیا لڑکی؟" زمانی بیگم نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "کہاں کا نیگ، کدھر کی مٹھائی؟ ...... کہیں لڑکی ہونے پر بھی مٹھائیاں بٹتی ہیں؟"

"ہائے اماں جان! یہ آپ کو کیا ہو گیا؟" تانیا تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ "لگتا ہے آپ کو پسند نہیں آئی ہماری بھتیجی۔ اللہ! کیسی خوبصورت، نرم و نازک گڑیا سی بنیا ہے۔ دیکھو تو دیکھتے چلے جاؤ۔ نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"ارے جاؤ۔" زمانی بیگم کسی دوسری ہی دنیا میں تھیں۔ بیٹی کو پھٹکار دیا۔ "تم نے ابھی زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے۔" پھر ذرا تھم کر اسے تنبیہ کی۔ "تمہارے اپنے بچے نہیں ہیں اس لئے بھی تم اشتیاق اور خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی ہو۔ ورنہ یہ سمجھ لو کہ جوں جوں تمہارا تجربہ اور مشاہدہ بڑھتا جائے گا،

یہ حقیقت تم پر روزِ روشن کی طرح واضح ہوتی چلی جائے گی کہ لڑکی کی پیدائش ہرگز کسی فخر اور اطمینان کا باعث نہیں ہوتی۔ بلکہ دور اندیشوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہوتی ہے۔ لڑکی کی پیدائش لاکھوں طرح کے اندیشوں اور تفکرات کی جڑ ہے۔ اس لئے تمہیں نیگ کس بات کا دیں؟"

ان کی تقریر سن کر تانیا کا دمکتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا۔ منہ بھلا کر بولی۔ "آپ نے تو سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ مت دیں نیگ۔ ہم پھوپھی سرور جہاں سے کہہ کر بھائی صاحب سے خود مانگ لیں گے۔ کیسے نہ دیں گے وہ۔"

"تو...... اور سن لو۔" زمانی بیگم ماتھے پر ہاتھ مار کر بڑبڑائیں۔ "اب یہ دیوانی باجی کو ہمارے پیچھے لگائیں گی۔"

"اے دلہن! خدا کے عذاب سے ڈرو۔" سرور جہاں نے اچانک کہیں سے نمودار ہو کر انہیں للکارا۔ "تمہاری نظر میں اب ہم دیوانے بھی ہو گئے۔ لو بھی! زبان ہی کندھے پہ ڈال لی۔"

زمانی بیگم نے گھبراہٹ کے انداز میں وضاحت کی۔ "اوئی باجی! بھلا ہم یہ گستاخی کر سکتے ہیں؟ دیوانی تو ہم نے تانیا کو کہا جو اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے ہمارا دماغ چاٹے لے رہی ہے۔"

"ہاں، تم تو گویا بہت ہی علامہ مشرقی ہو۔ رہنے دو تمہاری بھی لن ترانیاں۔"

سرور جہاں لنگڑاتی ہوئی آ کر وہیں بیٹھ گئیں اور دوبارہ گویا ہوئیں۔ "ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم نے اس لڑکی کے لئے بھی کچھ سوچا؟ کوئی اقدامات کئے؟ یا یہ بھی سونی گود لئے کڑھتے لگاتی پھرے گی؟"

"باجی! آپ ہی بتایئے، میں کیا کروں؟" زمانی بیگم نے فکرمندی سے جواب دیا۔ "ان کی سسرال میں تو کسی کو کسی بھی طرح کی فکر ہے نہ فاقہ۔ سب اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔ اب یہ تو ان کی ساس صاحبہ کو بھی سوچنا چاہیے۔ بہو کی گود کیوں خالی ہے۔ پوتی پوتوں سے اللہ رکھے ان کا گھر آنگن آباد ہو گا یا میرا؟ شاکر کی اور ان کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ شگفتہ کب سے دو بچوں کی ماں ہو گئی......"

تانیا بجھ سی گئی۔ اسے چاروں طرف سے اداسیوں نے دھاوا بول دیا۔ ایک بے چینی اور پژمردگی سی تھی جس نے احاطہ کر لیا تھا ان کی گفتگو سن کر۔

سرور جہاں نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور زمانی بیگم کی طرف سرک کر رازداری سے کہنے لگیں۔ "اے تمہاری عقل گھاس کھا گئی ہے؟...... سسرال فکر نہیں کرتے تو بیٹی تو ہماری ہے۔ ہم پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہ بیٹھیں۔ جو بن پڑے وہ ضرور کریں۔"

زمانی بیگم نے بے چارگی سے دریافت کیا۔ "آپ کچھ کھل کر بتائیں تو میں سمجھ سکوں۔ عقل تو واقعی بیکار ہو رہی ہے میری۔"

"ہاں...... اس میں تو خیر شبہ بھی نہیں۔" سرور جہاں نے برجستہ کہا۔ پھر لمحہ بھر تھم کر اضافہ کیا۔ "چلو مت کرو اپنی عقل استعمال مگر ہمارے کہے پر عمل تو کرو۔ ہم نے اس سلسلے میں پھولن سے معلومات لی ہیں۔ وہ بتا رہی تھیں یہاں سے تین چار کوس پر ایک چھوٹی سی بستی ہے مہرولی۔ وہاں ایک بہت بڑا مزار ہے۔ بے اولادوں کا تو تانتا بندھا رہتا ہے وہاں ہر وقت۔ اور منت ماننے والے جھولیاں بھر بھر مرادیں پاتے ہیں۔"

زمانی بیگم نے اسی وقت پھولن بوا کو بلوایا۔ اب ایک نیا موضوع چھڑ گیا۔ پھولن بوا قسمیں کھا کھا

کر سب کو یقین دلا رہی تھیں۔

"بیگم صاحبہ! قسم مولا پاک کی۔ ان گناہگار آنکھوں سے بڑے بڑے کام سنبھلتے دیکھے ہیں لوگوں کے۔ لوگ روتے ہوئے جاتے ہیں اور ہنستے ہوئے لوٹتے ہیں۔ پتہ نہیں کتنی ماؤں کی گودیں زندہ سلامت بچوں سے آباد ہو گئیں۔ میں تو بہت دنوں سے اس فکر میں تھی کہ کسی طرح آپ کے دل میں یہ خیال ڈالوں۔ مگر ہمت نہ ہوتی تھی۔ آپ میرے کہنے سے ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔"

"ہاں بوا! تم تسلی رکھو۔" سرور جہاں نے ٹوک دیا۔ "ذرا تفصیل سے یہ تو بتاؤ کہ وہاں کا طریقہ کار کیا ہے؟"

"اے میری اچھی بیگم صاحب! طریقہ کیا ہوتا۔ بالکل آسان سی بات ہے۔" پھولن بوا خوش ہو کر تفصیل بتانے بیٹھ گئی نہایت عقیدت کے ساتھ۔

"چھتناری ہری بھری نیموں کی چھاؤں تلے بہت بڑا سا کچا احاطہ کھنچا ہوا ہے۔ اندر گھسنے کے لئے اونچا، بلند و بالا پھاٹک ہے جو چاروں پہر کھلا رہتا ہے۔ اندر جہاں بابا بڑی سرکار کا مزار شریف ہے، جالیوں والا لمبا چوڑا کمرہ ہے۔ قبر شریف کے سرہانے ایک بڑے سے طاق میں سات جمعرات چراغ جلایا جاتا ہے۔ تیل اس باپ کی کمائی کا ہونا چاہیے جو بچے کا آرزومند ہو۔ بس میری بیگم صاحب! ہم نے تو کبھی کسی سوالی کو وہاں سے خالی ہاتھ جاتے نہیں دیکھا۔ سات جمعرات کے اندر اندر قسم مولا کی، ہر ایک کی امید بندھتے دیکھی۔ ارے اس احاطے کی تو نیموں کی نکولی تک ایسی میٹھی اور رسیلی ہے کہ کیا بتاؤں۔"

تانیا تو جیسے سانس روکے بوا پھولن کے انکشافات سن رہی تھی۔ مارے عقیدت اور احترام کے اس کی آنکھیں گیلی ہو رہی تھیں اور دل کی دنیا میں امیدوں اور ارمانوں کے چراغ لو دینے لگے تھے۔

یہاں سب اپنے اپنے دھیان میں خاموش بیٹھے بوا پھولن کی باتیں سن رہے تھے کہ اچانک دلاری مینا کو پکارتے ہوئے چلی آئیں اور بری طرح روتے ہوئے چیخ چیخ کر کہنے لگی۔

"بڑی بیگم صاحب!...... ہم سب لٹ گئے...... میرے منہ میں خاک...... ہمارے شاکر میاں...... ارے ہمارے شاکر میاں......"

"الٰہی خیر!" زمانی بیگم کلیجہ تھام کر کھڑی ہو گئیں۔

❖❖○❖❖

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

باجی سرور جہاں اُٹھتے اُٹھتے اپنے ہی زور سے دھڑام سے گاؤ تکیے پر اوندھی گریں۔ بے اختیار منہ سے دلدوز سی چیخ نکل گئی۔ مگر کسی نے توجہ نہ دی۔

ولاری کی بات کا مفہوم واضح ہوتے ہی جو جہاں بیٹھا تھا اس نے وہیں سے ہائے واویلا مچا دی تھی...... کیا مالکن اور کیا ماما، سب پر ایک جیسا ردعمل دیکھنے میں آ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں کہرام مچ گیا۔

"اری کم بختو! میری جوتیاں تو لاؤ۔" [illegible] بوکھلاہٹ میں ننگے پیر اپنے کمرے میں دوڑتی چلی گئیں۔ جب یاد آیا کہ [illegible] ان کی رنگت فق اور سانس سینے میں نہ سما رہا تھا۔ عقل جیسے خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ [illegible] ایک کونے میں کھڑی ہوئی "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو......" پڑھتی جا رہی تھیں اور چاروں طرف پھونکیں مارتی جاتی تھیں۔ تانیہ ایک ایک سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

اسی دوران کسی نے یہ خبر زچہ خانے میں بھی پہنچا دی، [illegible] بڑے بیٹے کے بعد رات قدرت نے شگفتہ کو ایک پیاری سی بچی سے نوازا تھا۔ ایک تو ویسے ہی اس گھر کے دقیانوسی رسم و رواج اور پرانے طور طریقے، اوپر سے ایسی جان نکال لینے والی اطلاع! انہوں نے تو پلنگ پر لیٹے لیٹے [illegible] رہی تھی، لات مار کے اسے دور ہٹایا اور اسی کے منع کرتے کرتے بند کمرے سے نکل بھاگیں۔ باہر بھی افراتفری کا عالم تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ سب رونے پیٹنے اور واویلا کرنے میں مصروف تھے۔ کوئی دوسرا وقت ہوتا تو شگفتہ کے یوں زچہ خانے سے کھلے سر نکل آنے پر ان کی ساس نصیحت کر ڈالتیں۔ ہزار صلواتیں تو سرور جہاں ہی سنا دیتیں کہ سر میں ہوا لگ جائے گی...... اوپر کا اثر ہو جائے گا...... بچی بیمار پڑ جائے گی۔ مگر آج ان لمحوں میں سبھی بدحواس اور پریشان تھے اور وہ سیدھی ساس کے پاس جا پہنچیں۔

سرور جہاں بے چاری خود ہی گریں اور خود ہی اٹھ بھی بیٹھی تھیں۔ گھٹنا سہلاتے ہوئے انہوں نے ولاری سے ڈپٹ کر دریافت کیا۔

"بدبخت! اگل کر بتا، تجھے یہ بدخبری کس نے بتائی؟...... کس سے سن کر آئی تو؟"

ولاری نے پلو سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بتایا۔

"بیگم صاحب! باہر کے چوکیدار نے گلو کو بتایا تھا۔ اسی سے سن کر میں نے یہاں سب کو بتایا۔ گلو فوراً ہی باہر دوڑ گیا تھا۔ ابھی تک تو لوٹا نہیں ہے۔"

ولاری کی بات پوری ہوئی تھی کہ ایک ملازمہ بھاگتی ہوئی آئی اور زور سے بولی۔

"ہائے بیگم جی!...... غضب ہو گیا۔ گاؤں میں بلوہ ہو گیا۔ شاکر میاں وہیں تھے۔ چلی نامراد گولی

لگی...... کوئی انہی کو لگی ہے......"

لفظ گولی سنتے ہی آہ و فغاں کا ایک نہ رکنے والا طوفان بپا ہو گیا۔ شگفتہ نے اپنے آپ کو پیٹ پیٹ کر بے حال کر لیا۔ سر پر بندھی ہوئی سرخ رنگ کی کامدار پٹی نوچ کر پھینک دی۔ وہ باقاعدہ بین کر رہی تھیں۔

"ہائے اللہ!...... یہ سب سنتے ہوئے مجھے موت کیوں نہ آ گئی...... اب میں کس منہ سے جیوں؟...... یہ کیا ہو گیا مولا؟...... اب کیا ہو گا؟"

اب تو باجی سرور جہاں بھی دوپٹے میں منہ چھپائے ہچکوں پہکوں رو رہی تھیں۔ ان کا بھاری بھرکم وجود ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔

زمانی بیگم سکتے کے عالم میں ایک ایک کی روتی ہوئی صورت تک رہی تھیں۔ کچھ دیر اپنے کمرے میں کھڑے رہنے کے بعد وہ چپ چاپ باہر آ گئی تھیں اور اب گاؤ تکیے کے سہارے خاموش بیٹھی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس اچانک خبر نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔

باہر سے اس اطلاع کی تصدیق کرکے آنے والا گلو تھا۔ اب اس ناگہانی واقعے کی سچائی میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ گھر کا ذرہ ذرہ نوحہ کناں اور دل گرفتہ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

"ہائے پھوپھی جان! میرے بھائی صاحب...... ہائے میرے بھائی صاحب۔" تانیہ، سرور جہاں کے کندھے پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ کوئی کسی کو چپ کروا رہا تھا نہ تسلی دلاسا دے رہا تھا۔ آنسوؤں اور آہوں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔

گیارہ بجے سے دن کا ڈیڑھ بج گیا۔ [illegible] کوئی مفصل معلومات نہ مل پا رہی تھیں۔ جتنی بات گلو سے سننے میں آئی [illegible] کی راہ تکتے تکتے سب کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

آج تو صبح سے مانگ تک کسی کے منہ میں ایک کھیل تک اڑ کر نہ پہنچی تھی۔ چولہے اوندھے پڑے تھے۔ باورچی خانہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کسی کو کھانے کا ہوش [illegible]
شگفتہ کی نومولود بچی پتہ نہیں کب سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روئے جا رہی تھی۔ کسی نے ماں کی خالی گود میں لا ڈالا۔

"دلہن بیگم! اسے دودھ پلایئے۔ دیکھئے تو کس قدر بلک بلک کر رو رہی ہے۔"

سرور جہاں نے دوپٹہ چہرے سے ہٹا کر قہر آلود نظروں سے گھورا۔

"پھینک دو اٹھا کر اس منحوس قدم کو۔" ان کی زہر میں ڈوبی ہوئی آواز ہر طرف گونج گئی۔ "مت لگاؤ اسے چھاتی سے...... یہ باپ کی دشمن ہے۔ بچھل پیری۔" سرور جہاں کی بات سب نے کھلے کانوں سے سنی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا مگر حیرت انگیز طور پر کسی نے اعتراض نہ کیا، نہ برا مانا۔ نہ زمانی بیگم نے اور نہ شگفتہ بیگم نے۔ بلکہ شاید دل ہی دل میں ان کی "سچ بیانی" اور "حقیقت گوئی" کا اعتراف کر لیا تھا۔

دراصل ان کا ماحول ایسی جہالتوں سے بھرا پڑا تھا۔

خدا خدا کر کے شام پانچ بجے کے بعد ایک تیز رفتار جیپ بڑے پھاٹک کے باہر آ کر رکی اور ابا میاں کا گن مین حشمت خان چھلاوے کی مانند لپک کر نکلا۔ اندر سے گلو کو بلوایا اور وہیں رک کر اسے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

واقعے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ کچھ ضروری ہدایات دیں اور بہت عجلت کے عالم میں سوار ہو کر دوبارہ روانہ ہو گیا۔ آج حشمت خان کی آنکھیں خون اگلتی اور چہرہ معمول سے زیادہ تپا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے جاتے ہی گلو نے اندر دوڑ لگا دی اور دلاری کو بلوا کر تمام تفصیلات اس کو منتقل کر دیں۔ گویا اطمینان اور سکون کی روح پھونک ڈالی۔

گھر والے دل ہی دل میں نہ معلوم کیسے برے برے تصورات لیے ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ شاکر کے زندہ و سلامت ہونے کی خبر سن کر گویا سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ بلا سے کوئی پنڈلی کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ معمولی زخمی ہوئے تھے۔ ہسپتال میں مجبوراً داخل ہونا پڑا تھا۔ ابا میاں ہمراہ تھے۔ یہ بھی ایک قابل اطمینان امر تھا۔ باقی سب خیریت تھی۔

گھر کی خواتین کے لیے خیر سلا کی اتنی ہی اطلاع بہت تھی۔ اب گاؤں میں کیوں بلوہ ہو گیا؟ گولی کاہے کو چل گئی؟ زمینداری کے جھمیلے تھے۔ ابا میاں جانیں اور ان کے حواری۔ خواتین کو کچھ مطلب نہ تھا!

یہاں تو پورے گھر میں سکون و قرار کی لہر دوڑ گئی۔ فکر و تردد کے بادل چھٹ گئے۔ افسردہ چہرے کھل اٹھے۔ دلوں کی بے تابی جاتی رہی۔ ... رات صف ... ایک دم ہی ہر طرف چہل پہل اور رونق کا سماں چھانے لگا۔

باجی سرور جہاں جو بہت دیر سے شگفتہ کی کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اپنی نگاہوں کی زد میں لیے بیٹھی تھیں، وہ رہ رہ کر کنک کی دمک جانے والی ... لشکارے جا رہی تھی۔ شاکر کی شان کی سلامتی کا سنتے ہی ان کے تیور بدل گئے۔ ... کدورت ... نکل جاتا رہا۔ آنکھوں کا زاویہ خود بخود تبدیل ہو گیا۔

"اے ہے شاکر کی دلہن!" وہ فوراً ہوش و حواس کی دنیا میں آ گئیں۔ "یہ تم نے سر پر سے کار چوبی پٹی کیوں اتار پھینکی؟ اے ایسا کیسا فیشن؟...... ابھی رات کو تو ہم نے بندھوائی ہے۔ کہیں یوں بے پھرنے سے زچہ، زچہ خانے سے باہر نکل بھاگتی ہے؟ ... میں خاک اگر ہوا کا اثر ہو جائے تو؟"

اچانک انہوں نے قریب کھڑی ملازمہ کو پھٹکارنا شروع کر دیا۔

"اے خدا کی مار ہو تجھ پر۔ بدبخت کہیں کی اور ات کی پیدا بھی بی جان کو باہر نکال لائی۔ غضب خدا کا، کیسی دیدہ ہٹکی کام چور ہیں یہ کام والیاں۔ چل اٹھ زچہ بچے دونوں کو سنبھال کر اندر لے کر جا۔" ان کی کراری آواز کو سنتے ہی ہر کوئی چاق و چوبند ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہی نو زائیدہ بچی جو ان کی زبان سے "سبز قدم" اور "منحوس پیری" قرار پائی تھی، باپ کے زندہ سلامت ہونے کی خبر سن کر سرخرو ہو چکی تھی۔

چچی جان تسبیح جیب میں رکھتے ہوئے ان کے قریب آ بیٹھیں اور نہایت ہی عقیدت سے جھوم کر گویا ہوئیں۔ "دیکھا سرور! تم نے ہمارے وظیفے کی برکت۔ کیسی بڑی بلا ٹلی ہے آج۔"

"اس میں تو خیر کوئی شک نہیں۔" باجی نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

"ہم بھی ابھی ابھی پھولن کو بستی میر ولی کے بزرگ بابا کے مزار شریف بھیجتے ہیں۔ وہ ہمارے کنبے کی خیر و عافیت کے لیے منت مان کر آئے گی۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" چچی جان نے مشورتاً جواب دیا۔ "ساتھ میں ثانیہ بٹیا کی چوٹی کے چند بال بھی بھجوا دو۔ لگے ہاتھوں دونوں کام کر آئے گی۔ پھولن! ہم تو گناہ گار بندے ہیں۔ اس نیلی چھتری والے

نے بڑے فقیروں کو بڑے بڑے مرتبے عطا فرمائے ہیں۔ مخلوق کی داد رسی کے لیے۔"

ثانیہ فخریہ انداز میں بولی۔ "دادی اماں! میں نے دس دیبیوں کی چار جہانیاں مانی ہیں اور ان چند گھنٹوں میں بی بی سیدہ کی تو معلوم نہیں کتنی کہانیوں کی منت مان لی۔"

اب یہاں نیا موضوع چھڑ گیا تھا۔

ہسپتال سے شاکر کے صحت مند اور سلامت لوٹ آنے کے لیے تو کہانیاں تک بڑھ چڑھ کر مرادیں مانگ رہی تھیں۔ چچی جان نے ثانیہ کی خوب حوصلہ افزائی کی اور پیٹھ تھپک کر بولیں۔

"شاباش بٹیا! یہ تم نے بہت عقلمندی کا کام کیا۔ اب ذرا دیر اپنی بھاوج کے پاس چلی جاؤ اور ان سے کہو کہ فوراً مسجد میں گلگلے چڑھانے اور اللہ میاں کا طاق بھرنے کی منت مان لیں۔ اور ہاں! آس بی بی کا کونڈا بھی ضروری ہے۔ جب ساتھ خیریت کے ان کے میاں گھر آ پہنچیں تو پھر یہ ساری منتیں ایک ایک کر کے پوری کرے۔"

ثانیہ جلدی سے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ زمانی بیگم دیر سے خاموش بیٹھی یہ سب دیکھ اور سن رہی تھیں۔ شاکر کی خیر و عافیت معلوم ہو جانے کے بعد سے ان کا جمود خود بخود ٹوٹتا چلا گیا تھا۔ حواس پر بھی برف پگھلنے لگی تھی۔ اب ان کا اضطراب بڑی حد تک بحال ہو گیا ... دلاری کو بلا کر کہنے لگیں۔

"جاؤ دلاری! انگو سے باہر کہلوا دو کہ فوراً دو بکرے ذبح کر کے غریبوں میں سب گوشت تقسیم کروا دیا جائے...... مالک نے بڑی خیر کر دی۔ ہم پر ... قیامت گزر گئی آج۔" پھر پاندان اپنے قریب کھسکاتے ہوئے چچی جان سے بولیں۔ "بچی اماں! ہم نے مولا مشکل کشا کا روزہ مانا ہے اور ساتھ ہی منت مانی ہے کہ "اے بڑے پیر! شاکر کو جان کی سلامتی اور تندرستی کے ساتھ اپنے گھر پہنچا دے۔ میں دو شکستہ مسجدوں کو جو کتنی ہی ٹوٹی حالت میں ہوں، ... کی اور گائے بھی ذبح کروا کے گوشت تقسیم کرواؤں گی۔"

"بالکل ٹھیک منت مانی تم نے۔ اللہ مراد پوری کرے۔" چچی جان سے بھی پہلے سرور جہاں نے گردن ہلاتے ہوئے تائید کر دی۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

***

اگست کا پورا مہینہ گزر چکا تھا۔ برسات کی بھیگی بھیگی شامیں اور سہانی رت بیت گئی۔ ولیمے کی دعوت کے بعد فرحت کے ہاں باقی ماندہ مہمان بھی رخصت ہو چکے تھے۔ فقط اس کی ہمشیرہ اور اس کے بچے رہ گئے تھے۔

آج کل فضا میں سردی تھی نہ گرمی۔ معتدل سے جی کو بھلے لگنے والے دن لگ رہے تھے۔ شام کا سہانا وقت تھا اور گہرا نیلا آسمان کسی آئینے کی طرح لگ رہا تھا۔ برآمدے کی محرابوں پر چھوٹے چھوٹے سفید پھولوں والی بیلوں میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ہواؤں کے ہلکے ہلکے جھونکے پھولوں سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ لال لال لکھوری اینٹوں والے کشادہ آنگن میں پلنگ بچھا تھا جس پر اماں بی کے ساتھ ان کی سمدھن بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ قریب ہی حمید سر جھکائے بیٹھا تھا۔ دونوں ماں بیٹا نازیہ کو لینے دوپہر سے آئے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر میں جو نازیہ تیار ہو کر باہر نکلی تو خوب شگفتہ اور نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ گہرے نارنجی رنگ کے ریشمی جوڑے اور چمکتے ہوئے بالوں کی لمبی سی چوٹی باندھے وہ بالکل ہی بدلی ہوئی رعنائی اور دلکشی کا مجسمہ لگ رہی تھی۔ ماں مبہوت ہو کر یک ٹک اس کا چہرہ تکتی رہ گئیں۔ اس کے گلابی ہونٹ تازہ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

پھول کی پنکھڑیاں معلوم ہو رہے تھے۔ بی اماں نے کھڑے ہو کر گلے لگایا اور محبت و پیار سے رخصت کیا۔ کرائے داری اور بچی کے ساتھ ڈیوڑھی تک چھوڑنے کے لئے آئیں۔ فرحت دوپہر کے بعد کہیں گیا تھا۔ نازیہ نے فرماں بردار بیویوں کی طرح اس سے بھی میکے جانے کی اجازت لے لی تھی۔

اماں بی پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"دلہن کے گھر جاتے ہی گھر آنگن خالی خالی معلوم ہونے لگتا ہے۔"

کرائے داری نے ہنس کر جواب دیا۔ "ابھی تو خیر سے رونق ہے۔ معطر چلی گئی تو بالکل ہی جی نہ لگتا۔ بچوں کے اتنے شور شرابے میں آنے کا اندازہ نہیں ہو پا رہا۔"

"اماں! آپ نے اب تک اپنی بہو رانی کو خطاب کیوں نہیں دیا؟" معطر نے ان کے قریب بیٹھ کر یاد دلایا۔ "شادی کے بعد سے کئی مرتبہ ان کا میکے آنا جانا ہو چکا ہے۔ ہمیں تو ہماری ساس اماں نے فوراً ہی "معطر دلہن" کا خطاب دے ڈالا تھا۔"

"اچھا...... تو "معطر" کا خطاب تمہیں سسرال سے ملا تھا۔" کرائے داری نے اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

"ہماری اماں نے ہمارا نام "عالیہ" رکھا تھا۔ اس لئے تو یہاں سب زیادہ تر عالیہ کہتے ہیں۔ سسرال میں معطر کہتے ہیں۔"

کرائے داری شرارت سے ہنسی۔ "ہم سمجھے آپ کو پورے نام "عالیہ معطر" کی وجہ سے شاعرہ سمجھا کرتے تھے۔ اور یہی بات ہے ... آپ معلوم ہوا کہ......"

"کھودا پہاڑ نکلی چوہیا۔" اچانک فرحت نے اندر داخل ہو کر بات اچک لی۔

"فرحت کے بچے!" معطر ... "تم نے چوہیا کسے ...؟" ...... چوہیا ہوگی تمہاری دلہن۔"

فرحت نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ نے میری بات ہی کاٹ دی۔ ورنہ شکوہ رہتا اور نہ برا مانتیں۔"

"اچھا پھر پوری کرو بات اپنی۔" معطر نے اشتیاق بھرے انداز میں فرمائش کی۔

"میرا مطلب تھا کہ...... کھودا پہاڑ نکلی چوہیا۔ وہ بھی معطر معطر۔"

کرائے داری تو ہنس رہی تھی۔ اماں بی بھی ہنس پڑیں۔

"دیکھا اماں! آپ نے اس پاجی کو؟" معطر روہانسی ہو کر منمنائی۔

"اے...... اے خبردار۔" وہ بوکھلا کر بولا۔

"ایسا غضب مت کر ڈالئے گا۔ لوگ مجھے بھی "مسٹر چوہا" کہہ کر پکارنے لگیں گے۔"

"تم دونوں کے لئے یہی خطاب مناسب رہے گا۔" معطر نے ہنس کر چڑایا۔ "چوہیا...... اور چوہا...... کیوں اماں! ٹھیک ہے نا؟"

اماں بی نے چھالیہ کترتے ہوئے جواب دیا۔ "خطاب دینے کو تو ہم دے ڈالیں مگر یہ فرحت کسی صورت مانتے ہی نہیں ہیں۔"

"کیوں، کیوں...... پھر کیا بات ہوئی بھلا؟" معطر نے شور مچایا۔ "اس فرحت کے بچے کو کیا اعتراض ہے آخر؟ اماں! میں دیکھتی ہوں یہ آج کل کے پڑھے لکھے ہر بات میں روک ٹوک کرنے لگے ہیں۔"

"کیا کریں...... مجبوری ہے۔" فرحت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "بے پڑھے لکھوں کو پڑھانا پڑتا ہے۔"

معطر نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جما کر کہا۔ "بہت باتیں شطارانی آ گئی ہیں۔ مگر صاف کہے دیتی ہوں، ہم تمہاری باتوں میں آنے والے نہیں۔ بیٹھ کر اپنی "چوہیا دلہن" کو ایم اے، ایم ایس سی پڑھایا کرو۔ ہم یونہی بھلے ہیں۔"

فرحت نے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ "لیکن...... براہ کرم آپ یہ "خطاب وطاب" کی تُک مت لگائیے۔ مجھے سخت کوفت ہوتی ہے ایسی بے تکی باتوں سے۔"

"اے لو!" وہ دیدے پھاڑ کر بولی۔ "بے تکے تو تم خود ہو۔ اور پھر بھلا عورتوں کی باتوں میں تمہیں دخل انداز ہونے کا کام کیا؟"

"واہ، واہ...... یہ خوب رہی۔" فرحت نے شرارت سے جواب دیا۔ "نکاح کے دو بول ہوتے ہی والدین کا برسوں پرانا نام بدل دیا جائے۔ یہ کہاں کی تک بندی ہے بھلا؟ عجیب رسم و رواج ہیں آپ کے بھی۔"

اماں بی جو خاموشی سے دونوں بہن بھائی کی نوک جھوک سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، بولیں۔ "خیر، اس میں حرج کسی کا نہیں ہے۔ نہ ہی والدین کے رکھے ہوئے نام پر کسی طرح کی دخل اندازی مقصود ہوتی ہے اس رسم میں۔ بس ذرا یہ خوش کن تبدیلی ہو جاتی ہے کہ اپنے گھرانے میں ہی شامل ہونے والی دلہن کو......"

معطر نے تالیاں بجا بجا کر بھائی کو ... اماں بی کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ کرائے داری بھی ہنس رہی تھی۔ فرحت نے ... براہ راست مخاطب کیا اور زور دے کر بولا۔

"یہی اماں ... پرانی باتیں ہیں۔ بس آپ تو اس کا وہی نام رہنے دیجئے۔"

"کیا بھلا؟" معطر نے شوخی سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"نازیہ......" فرحت نے ... جواب دیا۔ معطر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھی۔ اس وقت اسے اپنے روتے دھوتے بچوں کی بھی خبر نہ تھی۔ فرحت کو اچانک ہی سوجھ گئی۔ "وہ مارا۔" وہ اچھل کر چلایا۔ "نبیے۔ نبیے...... زبردست قافیہ بندی نبیے۔" وہ خوشی سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ "اماں جان! آپ کو کوئی خطاب وطاب دینے کی زحمت نہیں کرنی چاہئے۔ ذرا غور فرمائیے نند بھاوج کے ناموں پر۔ عالیہ، نازیہ۔ ہم قافیہ نام۔"

معطر کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ وہ بھائی کی بات پر غور کرنے لگی۔ کرائے داری نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں...... سچ تو ہے۔ کیسا جوڑ سے جوڑ مل گیا۔ عالیہ، نازیہ۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ فرحت میاں کی بات بھی رہ جائے گی۔"

فرحت نے معطر کے منے کو گود میں لے زور زور سے گھما ڈالا اور بولا۔ "آخر کو جیت ہماری ہوئی نا۔ دیکھی منے میاں! اپنی اماں کی شکست...... عبرت ناک شکست۔"

معطر نے لمحہ بھر غور کیا، پھر بناوٹی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "بات اگر ہے ہم قافیہ ناموں کی تو ایک نام اس سے بھی زیادہ آفت ہے۔ جگر کو تھام کر سنو تو ہم بھی ایسی شاعری سنا دیں۔"

فرحت نے شاہانہ انداز سے جواب دیا۔ "چلئے سنا ڈالئے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گی کہ کس تی سے

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

پالا پڑا تھا۔"

معطر اماں کی کمر سے جڑ کر بیٹھ گئی اور آنکھیں مٹکا کر بولی۔ "تو معطر، بھاوج چلتر۔ اب فرمایئے، کیسی رہی؟"

اماں بی کے ساتھ کرائے داری بھی قہقہے لگانے لگی۔ فرحت نے بھنا کر معطر کے منے کو سر سے اوپر اٹھالیا اور دھمکایا۔ "اب خیر نہیں آپ کے راج دلارے کی۔"

"ارے...... رے...... رے......" وہ چلانے لگی۔ "خدا کے واسطے فرحت! اسے چھوڑ دے۔ دیکھا پرسوں سے بہت روئے جا رہا ہے۔ اس کا جی اچھا نہیں۔"

"جی تو ان کا ابھی اچھا ہوا جاتا ہے۔"

"دیکھ میرا اچھا بچہ ہے نا۔ چھوڑ دے اسے۔" وہ خوشامد پر اتر آئی۔

"اچھا، جلدی سے کہئے۔ معطر چلتر غلط، عالیہ نازیہ ٹھیک۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے...... سب ٹھیک ہے۔" اس نے فوراً اعتراف کرلیا۔

"اور...... وہ چوہیا والی بات؟"

"نہیں جی۔ وہ 'چوہیا' کیوں ہونے لگیں؟" معطر نے میٹھے لہجے میں کہا۔ "چوہیا ہوں گے ان کے دشمن۔ وہ تو دلہن رانی ہیں۔ مہارانی ہیں۔ دل کا چین ہیں۔ آنکھوں کا سرور ہیں۔"

اسی وقت کسی نے باہر سے فرحت کو آواز دی۔ وہ منا اس کی گود میں ڈال کر ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ معطر نے اسے خود سے چمٹاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے اماں! اس کا دل کیسے زور زور سے دھک دھک کر رہا ہے۔ اس فرحت کی اتراہٹ تو نگوڑوں کی سی ہے۔ بچہ ہر وقت روتا رہتا ہے۔"

اماں بی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ارے بی! تم نے بھی تو آج فرحت کو بہت ستایا ہے۔ اس نے کسر پوری کرلی۔"

"آج ہی تو ذرا سا موقع ملا تھا ان کی دلہن کے میکے جانے کی وجہ سے۔ ورنہ اب یہ حضرت کہاں ہتھے چڑھتے ہیں۔" وہ روتے ہوئے بچے کو پچکار پچکار کر اس کا چہرہ صاف کرنے لگی۔ کرائے داری آئے یہ غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرا تو خیال ہے معطر! لڑکے کے کان میں کچھ تکلیف ہے۔ دیکھو یہ اپنا ہاتھ بار بار کان تک لے جا رہا ہے۔" یہ کہتے کہتے اس نے اپنا ہاتھ دو تین دفعہ نرمی سے بچے کے کان پر پھیرا، اچانک ہی اس کا رونا بلکنا بند ہوگیا۔

"دیکھا، آرام ملا اس کو۔" اس نے نہایت تجربہ کارانہ انداز میں وثوق سے کہا۔ پھر بولی۔ "گیندے کے پتوں کا پانی نیم گرم، دو دو بوند کان میں ڈالنا شروع کردو۔ ابھی دے کر جاتی ہوں تمہیں۔ میرے ہاں گیندے کے پھول لگے ہیں۔" وہ اٹھ کر تیز قدموں سے اپنے گھر چلی گئی۔

⁂

ڈرائنگ روم میں نصب گھڑیال نے دو بجے کا گجر بجایا۔ نازش اور سعدیہ چونک کر ایک دوسرے کی صورت تکنے لگیں۔

"اللہ، یہ فاخر بھائی اب تک نہیں آئے۔" نازش نے فکرمندی سے کہا۔ سعدیہ تو دہشت زدہ سی نظر آنے لگی۔ اور کچھ نہ سوجھا تو اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

نازش نے ہمدردی کی نظر سے اسے دیکھا، پھر سنبھل کر تسلی دینے کو بولی۔ "اب ایسی بھی کوئی غیر

معمولی بات نہیں ہے۔ ابھی شام کو تو تم نے ان کا فون اٹینڈ کیا ہے۔ میرا خیال ہے خاصے زوردار ڈائیلاگ چل رہے تھے۔"

"تمہیں کیسے معلوم؟" سعدیہ حیران ہوئی۔

"تمہاری شرمیلی شرمیلی مسکراہٹ بتا رہی تھی۔" نازش نے ڈھٹائی سے بتایا۔ پریشانی کے باوجود سعدیہ ہنس پڑی۔ "ہو بڑی خبیث۔"

"لیکن وہ تو مذکر ہوتا ہے۔"

"کون مذکر؟" سعدیہ ایک بار پھر حیران ہوئی۔

"خبیث...... میرا مطلب ہے کہ خبیث تو مذکر ہوتا ہے۔ جب کہ میں مونث ہوں۔"

"چلو خبیثہ سہی۔" سعدیہ نے اسی کے لہجے میں جواب دیا۔ "فاخر کی تو خیر، مجھے ان کے بھائی صاحب کی فکر ہو رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔" فاخر نے ان کے متعلق کچھ تفصیل سے بتایا بھی نہیں تھا۔

"اللہ غفور الرحیم ہے۔ اس سے بھلے کی امید اور دعا رکھنی چاہئے۔" نازش نے معقولیت سے جواب دیا۔ "مولا نے چاہا تو بھائی صاحب کی طبیعت بھی بہتر ہوگی۔ دو دن تو ہوگئے۔ اور آج فاخر بھائی بھی آجائیں گے۔"

اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ رات کے سناٹے میں سڑک پر کسی رکشے کے پھٹپھٹانے کی آواز دور تک گونج گئی۔ یہ دونوں اس وقت بالائی منزل کے اسی کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں جو نازش کی بھابی نے سعدیہ اور فاخر کے لئے مخصوص کردیا تھا۔ یہ دونوں جھپٹ کر کھڑکی میں آگئیں۔ واقعی فاخر ہی تھا۔ پھاٹک کھلنے کے بعد وہ اسی طرف آرہا تھا۔ نازش شرارت کرکے سعدیہ کا مرجھایا مکھڑا دیکھنے لگی۔ دھیرے سے بولی۔

"کون پہ بھی [illegible] آج تو خیر ہے۔"

"جی، جی...... کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" نازش نے شرارت سے گردن ہلائی۔ "کچے دھاگے سے بندھے آئے ہیں سرکار تو۔"

سعدیہ کھسیا گئی۔

اسی وقت زینے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ چند لمحوں میں فاخر سامنے کھڑا تھا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام!" دونوں نے باجماعت جواب دیا۔ کپڑے اس کے گچلے ہو رہے تھے۔ چہرے سے کمزور اور نڈھال لگ رہا تھا۔ سعدیہ دھک سے رہ گئی۔ نازش نے بڑھ کر ہمدردی سے پوچھا۔

"بھائی صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟...... آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں۔"

فاخر نے ایک نظر حواس باختہ بیوی پر ڈالی اور قدرے مسکرا کر جواب دیا۔ "اب تو اللہ تعالیٰ نے کرم کردیا۔ پرسوں حالت بہت تشویشناک حد تک گر گئی تھی۔ بلکہ نا امیدی سی چھا گئی تھی۔"

"آج ہوش میں ہیں؟" نازش نے پوچھا۔

"ہاں...... کچھ دیر باتیں بھی کیں۔ اب مسکن دواؤں کے زیر اثر ہیں۔ ڈاکٹرز نے اطمینان ظاہر کیا ہے۔ اسی لئے تو میں آ بھی گیا۔" پھر اس نے دم بخود کھڑی سعدیہ کی ناک پکڑ کر ہلا دی اور مسکرا کر بولا۔ "اب کھانا تو کھلا دو۔ یا آج بھی بھوکا مروں۔"

وہ چونک کر جیسے ہوش و حواس کی دنیا میں آگئی اور جلدی سے بولی۔ "آپ غسل کرلیں۔ میں

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ابھی لاتی کھانا۔"

نازش بھی اس کے پیچھے چل دی اور جاتے جاتے گردن موڑ کر بولی۔

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ محترمہ بیگم صاحبہ گزشتہ دو دن سے آپ کی فرقت میں جوگ لئے ہوئے ہیں۔ ایک نوالہ بھی حرام کر رکھا ہے جانِ ناتواں پر۔"

کچن میں پہنچ کر سعدیہ نے اسے پھٹکارا۔ "کیسی جھوٹوں کی بادشاہ ہو تم نازش! میں اور بھلا بھوکی رہ جاؤں؟ اوّل تو خود ہی بھوک کی کچی ہوں، اوپر سے بھابی جان اپنی نگرانی میں کھلاتی ہیں بھر بھر پلیٹ۔"

"جی ہاں، ہم بھی آنکھیں رکھتے ہیں، بچی نہیں۔" نازش نے اطمینان سے اس کی بات رد کر ڈالی اور کباب تلنے لگی۔ دونوں نے مل کر جھٹ پٹ کھانا گرم کیا اور جب سعدیہ کھانے کی ٹرے لے کر اوپر چلی تو نازش اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے شرارت سے بولی۔ "جاؤ جی۔ تم تو اپنے میاں کے ساتھ مل کر سحری کھاؤ۔ ہم تو خواب سے اپنی نیند پوری کریں گے۔"

سعدیہ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

فاخر گیلے بال تولیے سے خشک کر رہا تھا۔ اسے بغور دیکھ کر پوچھنے لگا۔

"کس بات پر ہنسی آ رہی ہے؟"

"وہی ہے، نازش کی بچی۔" سعدیہ نے کھانا رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اس وقت کے کھانے کو سحری کہہ رہی تھی۔"

"سچ کہا اس نے۔" فاخر نے وال کلاک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "رات کے تین بجے عشائیہ تو نہیں کہہ سکتے۔ ہاں، سحری ہو سکتی ہے۔"

سعدیہ نے پہلا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔ "چلیے آج نہیں تو انشاء اللہ اگلے چند دنوں میں سحری ہی کھایا کریں گے۔"

"وہ کیسے بھئی؟" فاخر نے لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔

"لیجئے، آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم" وہ بولی۔ "اسی مہینے کے آخری ہفتے میں رمضان المبارک کا عشرہ اوّل شروع ہو جائے گا۔ آپ ہیں کس خواب و خیال میں؟"

"اوہ اچھا۔" وہ واقعی حیران رہ گیا۔ "تمہاری ہمراہی میں یہ ایک ماہ تو پوری گزری ہوئی زندگی سے زیادہ تیز رفتاری دکھا گیا۔ واہ واہ...... کیسی باکمال خاتون ہیں آپ!"

"لیکن جناب سے کم۔" سعدیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ کھانے کے بعد وہ کچن سے واپس آئی تو فاخر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا بیڈ پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

"کیا سوچے جا رہے ہیں آپ؟...... مجھے بھی تو بتائیے۔ نہ ہسپتال کا کچھ حال سنایا، نہ بھائی صاحب کے متعلق تفصیل سے بتایا۔"

"ہاں...... آں...... سب خیریت ہے۔ بتایا تو تھا آتے ہی۔" اس نے کھسک کر جگہ دی۔

"لفظ، تفصیل پر غور فرمائیے۔" سعدیہ نے اصرار کیا۔

کچھ بات سوچ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے سہولت سے اپنے قریب کیا اور بہت پیار سے بولا۔

"بات یہ ہے ڈیئر! کہ بھائی صاحب کی طبیعت کچھ ایسی ویسی خراب نہیں تھی۔ بلکہ ان کی ران میں گولی پیوست ہو گئی تھی۔"

"اُف میرے خدا......" سعدیہ دنگ رہ گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"سو فیصد حقیقت ہے۔" فاخر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"لیکن...... یہ واردات کی کس نے؟ اور کیوں؟" وہ بدستور دم بخود تھی۔

"واردات۔" وہ ہنس پڑا۔ "اچھی خبر لگائی تم نے۔"

"کمال ہے...... آپ ہنس رہے ہیں۔" اس نے حیرانی سے کہا۔ "ایک گوشت پوست کے انسان کو گولی لگ جانا بھلا معمولی بات ہے؟"

"مگر اللہ کا کرم ہے کہ یہ واقعہ واردات والے طریقے سے وقوع پذیر نہیں ہوا۔ اس میں کوئی تردد والی بات نہیں ہے سوائے اس کے کہ بھائی صاحب نے بہت تکلیف اور اذیت اٹھائی۔ بات کچھ یوں ہے میری پیاری شریکِ حیات! کہ ابا میاں کی ساری زمینداری بھائی صاحب ہی سنبھالتے ہیں۔ مجھے ان بکھیڑوں میں پڑنے کی کبھی ضرورت محسوس ہوئی نہ شوق ہے۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے میری ہمیشہ بچت رہی ہے۔ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہاں زمینوں پر اکثر مزارعوں کے درمیان کسی نہ کسی صورت میں لڑائی جھگڑا بھی ہوتا رہتا ہے۔ ایک دو مرتبہ مجھے بھی ایسے تنازعات نمٹانے کا تجربہ ہو چکا ہے مگر بھائی صاحب کی غیر موجودگی کے سبب۔ ورنہ تو ایسے سارے کے سارے چھوٹے بڑے معاملات وہی سنبھالتے، سلجھاتے ہیں۔ اب تو خاصے عرصے سے ابا میاں بھی زمینوں پر کم جاتے ہیں۔

اب آگے سن لو اس ہی جنجال [illegible] تمہاری واردات کی روداد...... زمینوں پر کام کرنے والوں میں سے چار پانچ ایسے مزارعوں کے [illegible] ہیں جن کی آپس میں پرانی عداوتیں ہیں۔ جو لاکھ صلح کروا دیے جائیں پھر بھی ان کے دلوں سے نکل نہیں پاتیں۔ یہ دشمنیاں اندر ہی اندر لاوے کی طرح پکتی رہتی ہیں اور جوں ہی موقع ملتا ہے، ابل پڑتی ہیں۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ بدقسمتی سے بھائی صاحب معاملے کو فوری طور پر سلجھانے [illegible] اور [illegible] بات بڑھ گئی۔ اتنی بڑھی کہ نوبت آزادانہ گولیاں چلنے تک پہنچ گئی...... کوئی بھائی صاحب کی ران کے اندر موجود تھی۔ ظاہر ہے [illegible] بہت ہی تشویش ناک اور پریشان کن ہو سکتا ہے۔ وہ تو ابا میاں ہی تھے جو ایسے پرتشدد معاملے سے بخیر و خوبی نکل گئے ورنہ صورت حال [illegible] دوسری پریشانی بھائی صاحب کی جان کی طرف سے تھی۔ خون کا اخراج مسلسل جاری تھا۔ تاہم قدرت نے بڑی مہربانی کی۔ بھائی صاحب ہمارے ہیں بھی پورے باڈی بلڈر ماشاء اللہ۔ کسی نہ کسی طرح کامیاب آپریشن کے مرحلے کو پار کر ہی گئے۔"

اس کے خاموش ہوتے ہی سعدیہ جو انہماک سے سن رہی تھی، بولی۔ "اور وہ جو آپ کہہ رہے تھے کہ پرسوں حالت تشویش ناک......"

فاخر نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ "یہ پرسوں والی بات ہی تو مختصر کر کے تمہیں بتائی ہے کہ ابا میاں تو بیرونی معاملات کی درستگی اور بھاگ دوڑ میں مصروف رہے۔ جب کہ بھائی صاحب پہ چاروں کی جان پر سے گزر گئی۔ اگر منہاج الدین صاحب اور فرحت بروقت تسلی تشفی کے لئے نہ پہنچ جاتے تو شاید میرے اعصاب بھی جواب دے جاتے۔ آپریشن تھیٹر کے باہر گھومتے وحشت سے دل و دماغ بیکار ہو رہے تھے۔"

"اچھا...... ان لوگوں کو اطلاع مل گئی اس واقعے کی۔" سعدیہ نے چونک کر پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" فاخر نے جواب دیا۔ "ابا میاں تنہا کیا کیا کرتے؟ منہاج الدین صاحب برابر ان کے ساتھ ساتھ ہیں۔ پولیس تو ایسے کیسوں کی تلاش میں رہتی ہے۔"

"پولیس؟" سعدیہ نے سہم کر اس کی طرف دیکھا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فاخر نے ہنس کر اس کے بال بکھیر دیے۔ "پولیس نہیں تو قاضی صاحب۔ تم بھی احمقوں کی سردار ہی ہو۔ چلو اب شریک جرم بننا چھوڑو اور سیدھی طرح شریک حیات بن جاؤ۔ بہت باتیں ہو چکیں۔ میری تو نیند سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔"

اور واقعی وہ جلدی ہی نیند کی وادیوں میں اترتا چلا گیا۔ لیکن سعدیہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں۔ دل و دماغ ڈھیروں خیالات اور نئی پرانی سوچوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ ایک خیال آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔

بہت دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد وہ کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ رات کے اس سمے کشادہ اور سرمئی سڑکیں سنسان اور اونگھتی سی لگ رہی تھیں جن کے کنارے بنگلوں کے پھاٹک بند اور خاموش تھے۔ درختوں، پودوں کی شاخوں میں صبح دم چلنے والی نسیم سحر کے خنک جھونکے سرسراہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ خوبصورت گھروں کے پرسکون لان دیکھتے دیکھتے اس کے دل میں ایک فخر اور سرشاری کی لہر اٹھی اور وہ جھک جھک کر اپنی رہائش گاہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی جو ابا میاں نے فاخر کو شادی سے پہلے ہی خرید کر دے دی تھی۔ گو کہ اس کا گیٹ برابر میں بند ہونے کی وجہ سے وہ اپنا گھر پوری طرح دیکھنے سے قاصر رہی تاہم اندرونی مسرتوں کا احساس اسے تر و تازہ کر گیا اور تھوڑی دیر پہلے تک کی بے چینی رفع ہوتی چلی گئی۔ روح میں گہری طمانیت کا احساس جاگ پڑا۔

اچانک سوئی سوئی فضاؤں میں اذان فجر کی پرنور آواز ابھری۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا پھر وہ اذان کے ساتھ ساتھ حسب عادت اپنے رب سے دعا مانگتی رہی۔ دعا کے بعد نماز اور تلاوت کلام پاک کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

❊❊❊

آج اتوار کا دن تھا۔ اس لیے سعید احمد گھر پر ہی نظر آ رہے تھے اور برآمدے سے باہر آرام کرسی پر نیم دراز اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ قریب ہی چارپائی پر بیٹھی ان کی بیوی چھری سنبھالے پالک کی گڈی سے نبرد آزما تھیں۔ نازیہ مونگ کی دال بین رہی تھی۔ اس وقت سرسرانے والے ہوا کے جھونکے خوشگوار محسوس ہو رہے تھے۔

اچانک ہی باہر کا دروازہ کھلا اور منجھلی دادی لاٹھی ٹیکتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔ حقیقت میں وہ بہ مشکل ہی قدم اٹھا رہی تھیں۔ زور لگا لگا کر چلتے ہوئے ان کے منہ سے بے اختیار کراہ نکلی جا رہی تھی۔

سعید احمد نے اخبار چھوڑ کر ان کا ہاتھ تھام لیا اور پوچھا۔

"یہ آج ...... لکڑی کے سہارے کیسے چلی آ رہی ہیں؟ ...... خیریت تو ہے؟"

"وہ، اللہ ماری خیریت ہی تو نہیں ہے۔" انھوں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا اور قریب پہنچ کر خود کو چارپائی کے سپرد کیا اور لکڑی کو پٹخ دیا۔

"کیا ہو گیا اماں؟" سعید احمد کی بیوی نے بھی انھیں نیچے سے اوپر تک تشویش سے دیکھا۔

اتنے میں نازیہ نے ادب سے کھڑے ہو کر دادی کو آداب کیا۔ اپنی تکلیف بھول کر انھوں نے بڑی شفقت سے لپٹا کر پیار کیا اور کہنے لگیں۔

"یہی تو کل سنا تھا کہ لڑکی سسرال سے آنے کو ہے۔ جی تڑپ رہا تھا اسے دیکھنے کو۔ لیکن اس کمر کے مہرے کا درد بھی زوروں پر ہے آج کل۔ بس پھٹکار ہو بہو پر، جس سے کہہ بیٹھی کہ رات کو میری کمر کی

مالش کر دے ذرا سی۔"

"اس نے منع کر دیا کیا؟" سعید احمد کی بیوی نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ارے، منع کیسے کر دیتی؟ ...... اتنی جرأت ہے اس میں؟" دادی نے اکڑ کر جواب دیا۔

"تو پھر کیا ہو گیا کمر میں؟"

"ہونا کیا تھا" انھوں نے منہ بسور کر بتایا۔ "پہلے تو اس نے کاکڑے کے تیل سے خوب مالش کی، پھر اوپر سے آک کے پتے اور ٹیسو کے پھول نیم گرم کر کے باندھ ڈالے۔"

"اچھا، پھر ......؟"

"پھر کیا، تمہارا سر۔" وہ تنک کر بولیں۔ "رات بھر تو میں کروٹ لیے سوتی رہی۔ اب جو صبح آنکھ کھلی تو ...... کمر غائب!"

"کمر غائب؟" سب کے منہ سے بیک وقت کلمۂ حیرت نکلا۔

سعید آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دادی کی "زندہ سلامت" کمر کو گھورنے لگا۔ وہ پھر شروع ہو گئیں۔

"چیخ چیخ کر میں نے گھر سر پر اٹھا لیا۔ کوئی ناشتہ کرتے سے بھاگا، کوئی غسل خانے سے نکل آیا، کسی نے جھاڑو ادھوری چھوڑ دی۔ بہو بھی جلتا چولہا چھوڑ کر دوڑی۔ سب نے اپنے اپنے جتن کر لیے مگر یہ کمر اللہ ماری سیدھی ہو کر نہ دی۔ جتنا سب نے زور لگایا، اتنی ہی کمان کی طرح اکڑی جا رہی تھی۔ اور میری پوتی میکے آئی ہوئی ہے، جا کر خیر صلاح پوچھوں۔ آخر میں نے سب کو قریب سے ہٹا دیا۔ خود آہستہ آہستہ کروٹیں بدل بدل کر اٹھتی بیٹھتی رہی تب جا کر کہیں تین گھنٹے کے بعد اٹھ بیٹھنے کے لائق ہوئی۔"

سعید احمد نے بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ آپ کو کاکڑے کا تیل، ٹیسو کے پھول اور آک کے پتے باندھنے کو کس نے بتایا تھا؟"

"تو بھیا، بتاتا کون؟" انھوں نے بڑے فخر سے انکشاف کیا۔ "میرا خود کا نسخہ ہے۔ کس خوشامدوں سے تو میں نے ہمسائی کے لڑکے کو بھیج کر قبرستان سے آک کے پتے تڑوائے تھے۔"

نازیہ قہقہہ دباتے ہوئے باورچی خانے میں گھس گئی۔

"اسی کو کہتے ہیں نیم حکیم۔" سعید احمد نے منہ ہی منہ میں کہا، پھر زور سے اپنی منجھلی لڑکی سے بولے۔ "سعیدہ، دادی کی کمر دبا دو آ کر۔"

"جی اچھا۔" وہ فوراً حکم کی تعمیل کے لیے آ موجود ہوئی۔ سعید احمد کی بیوی سے رہا نہ گیا۔ وہ دبی زبان میں بولیں۔

"اماں! جب نسخہ آپ کا تھا اور تجویز بھی آپ کی، تو پھر بہو بے چاری پر کاہے کو پھٹکار ڈال رہی ہیں؟ ...... اس کا کیا قصور؟"

"ارے واہ!" وہ غصے سے اکڑ گئیں۔ "یہ 'بے چاری' اور 'قصور' کی خوب رہی۔ بھلا وہ بے قصور کیسے ہو گئی؟ ...... اس کا بھی فرض ہے نفع نقصان پر غور کرتی۔ اگر میری کمر بالکل ہی رہ جاتی تو؟"

ان کی تقریر ابھی جاری رہتی مگر اسی وقت ہیڈ مدرس منہاج الدین صاحب کی بیوی ملنے آ گئیں۔ سعید احمد اٹھ کر اندر چلے گئے۔

"آؤ ثمینہ! آؤ۔" دادی نے بڑے تپاک سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ نازیہ نے بھی آ کر سلام کیا اور

Famous Urdu Novels

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

دعائیں لیں۔

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔ "لڑکیوں کے چلے جانے سے بھی گھر خالی خالی لگنے لگتا ہے۔ بہت یاد آتی ہوگی آپ کو؟"

سعید احمد کی بیوی تو مسکرا کر چپ رہیں مگر دادی نے جھٹ جواب دیا۔ "بیٹیاں تو نیوں، شاہوں، کسی کی بھی بیٹھی نہیں رہتیں۔ دنیا کا دستور یہی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کے جانے کا دکھ بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی۔ بس دعا یہ ہونی چاہئے کہ مولا نصیب اچھے کرے۔ سسرال اچھی اور قدر دان ہو۔ یہ نہیں کہ لے جائیں خوشی خوشی، بعد میں جوتیوں میں دال بٹے۔"

"اللہ رحم کرے۔" ثمینہ نے جلدی سے کہا، پھر موضوع بدلا۔ "سعدیہ نہیں آئی؟"

"آئی تھی وہ بھی۔" سعید احمد کی بیوی نے جواب دیا۔ "چار دن رہ کر گئی ہے۔ ماشاء اللہ وہ بھی اپنے گھر میں راضی خوشی ہے آپ سب کی دعاؤں سے۔"

"بس جی، والدین کو بھی چاہئے۔" ثمینہ مطمئن ہو کر بولیں۔

تبھی باورچی خانے سے نازیہ نے حمیدہ کو پکارا اور اس کے ہاتھ چائے بھجوائی۔

"جیتی رہو۔" ثمینہ نے حمیدہ کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پیالی لے لی اور پوچھا۔ "آپا اور بجیا کی شادیوں کے بعد ہماری بچی تو بہت ذمے دار بن گئی ہے۔ ہے نا؟ سارا سارا دن لگے رہنا پڑتا ہوگا۔"

"نہیں تو خالہ جان!" حمیدہ شرمیلی سی ہنسی ہنس پڑی اور اندر چلی گئی۔

دادی صغریٰ بولیں۔ "اس گھر کا بچہ بچہ ذمے دار اور سمجھ دار ہے۔ خدا کا لاکھوں بار شکر ہے کہ یہاں کی ساری لڑکیاں سگھڑ اور سلیقے والی ہیں۔ پڑھائی [illegible] بہو نے اپنے بچوں پر محنت اور توجہ کی ہے۔ سارے ہی بچوں کی اٹھان ایسی عمدہ رکھی ہے کہ کبھی کہیں ٹھوکر نہیں کھائیں گے ہرگز نہیں۔"

"ارے اماں! یہ سب آپ کیا لے کے رو رہی ہیں؟" ثمینہ نے چائے کی چسکی لے کر ہنستے ہوئے کہا۔ "شاید آپ سے بھی کچھ زیادہ ہی واقف حال ہوں میں یہاں کی۔ آپ کے ساتھ ساتھ میرے لئے بھی یہ گھرانہ کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے۔ رتی رتی جانتی ہوں سب۔" اتنا کہہ کر ثمینہ نے سعید احمد کی بیوی کی طرف دیکھ کر اضافہ کیا۔ "بہن! زندگی کے کسی بھی حصے میں مجھے بھولنا مت...... ایک نہ ایک دن میں جھولی پھیلا کر آؤں گی ضرور۔ میرا سوال رد نہ کیجئے گی۔ اتنا یاد رکھنا، حمیدہ میری بیٹی ہے۔"

سعید احمد کی بیوی کا منہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ انہوں نے پلک کاٹ کر نازیہ کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔

"اللہ وارث ہے۔"

صغریٰ دادی جھوم کر بولیں۔ "اے بی بی! جم جم آؤ...... تمہیں اللہ توفیق دے۔ بیٹی والا بھلا بھی آتے ہوئے بر کو روکے گا؟...... اللہ تم لوگوں کی اولادوں کو نصیب ور کرے۔ چند مہینے پہلے میری کم عقلی اور بے وقوفی سے تم نے بھی دیکھا ہوگا، اس گھر میں کیسا بھونچال آیا ہوا تھا۔ اے ایسی ہمراہ رشتے داریاں تو خدا دشمن کی بھی نہ کرائے۔ اتنے چار سو میں لوگ کہ کیا بتاؤں۔ وہ تو کہو کوئی لیا دیا کام آ گیا ورنہ میرا سعید احمد تو میرے منہ میں خاک، لگتا نہ تھا کہ بچ بھی جائے گا۔ اللہ کا لاکھوں بار شکر ہے کہ ان جھاڑو پھیروں سے بھی جان چھوٹی اور خیر سے سعدیہ، نازیہ دونوں اپنے گھر بار کی ہو گئیں۔ اب

بھی تو وہی سعید احمد ہے کہ ماشاء اللہ چاق و چوبند، تندرست اور ہر کام میں آگے آگے۔"

اندر کمرے میں کھڑے سعید احمد مسکرائے جا رہے تھے۔

✾●✾

بہاولپور سے ابا میاں کے بڑے بھائی دلاور حسین آئے ہوئے تھے۔ اپنے بھتیجے اور داماد شاکر حسین کی عیادت کے لئے وہ آئے تو دو دن کو تھے مگر سب نے اصرار کر کے روک لیا۔ بہاولپور سے آئے تو وہ تنہا ہی تھے اپنے ایک ملازم کے ہمراہ مگر گھر کی رونق میں خوب اضافہ ہو گیا تھا۔ بڑے ہونے کے باوجود وہ ابا میاں کی طرح کم سخن، تنہائی پسند اور بارعب نہیں تھے بلکہ نہایت ہنس مکھ اور لطیفہ گو قسم کے انسان تھے۔ شاکر کے پاس ایک دن ہسپتال میں رہنے کے بعد گھر آ گئے اور ہر وقت چچی جان، سرور جہاں اور زمانی بیگم کے درمیان گھرے بیٹھے نت نئی چٹکلے بازی کرتے رہتے۔ ان کا نواسا شہکار اور ننھی منی سی نواسی ان کی نگاہوں کا مرکز تھی۔

شاکر حسین کو احتیاطاً ہسپتال میں روک لیا گیا تھا۔ یوں تو وہ تیزی سے روبہ صحت تھے۔ یہاں کسی کو ان کی ٹانگ کے آپریشن کا نہیں بتایا گیا تھا۔ سب کو اتنا ہی معلوم تھا کہ گولی پنڈلی سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی ہے اس لئے معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ اس وقت سب لوگ ناشتے سے فراغت پا چکے تھے۔ زمانی بیگم کمرے سے اٹھ کر برآمدے میں آ گئیں۔ یہاں تختوں کا چوکا بچھا تھا جس پر سفید چاندنی کا فرش اور فرش کے درمیان میں گہرے عنابی رنگ کا مخملی قالین تھا جس پر سفید گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ قریب میں ایک نواڑی پلنگ بچھا تھا جس پر سفید براق چادر سلیقے سے بچھی تھی۔

زمانی بیگم نے پلنگ پر بیٹھ کر قریب ہی رکھا ہوا اپنا مراد آبادی پاندان کھولا۔ دلاور حسین بھی ٹہلتے ہوئے تخت پر آ بیٹھے اور بھاوج سے پان کی گلوری لے کر منہ میں رکھ لی۔ زمانی بیگم نے ملازمہ کو بلا کر دوپہر کے کھانے سے متعلق ہدایات جاری کیں۔

تھوڑی دیر میں ایک ایک کر کے سب وہیں جمع ہو گئے۔ "ارے بھئی، ہم کیا گڑ کا گلگلا ہیں کہ جسے دیکھو ادھر ہی چلا آ رہا ہے۔" دلاور حسین نے زوردار قہقہہ لگا کر تبصرہ کیا۔

"اس میں شک کیا ہے۔" سرور باجی نے مسکرا کر تائید کی۔ "جو بھی ہمارا اچھے چچے ہے، اصول ہوتا ہے۔ تم تو یوں بھی عید کے چاند ہو۔"

"چلو بھئی، چھٹی ہوئی۔" انہوں نے ایک اور قہقہہ چھوڑا۔ "سرور نے چاند ہی بنا دیا۔"

"ہاں تو سگے چچا تایا کی اولاد ہو تم لوگ۔" چچی جان نے فوراً تاریخ جغرافیہ بتانا شروع کر دیا۔ "سرور تو یوں بھی تم دونوں بھائیوں کو سورج چاند کی جوڑی کہا کرتی تھی۔ تم، سرور اور یہ زمانی ایک ہی سال کی پیدائش ہو۔ اللہ رکھے یاور حسین تو تم تینوں سے دو ڈھائی سال چھوٹے ہیں مگر شادی بیاہ میں اپنوں میں کوئی چھوٹائی بڑائی تھوڑا ہی دیکھی جاتی ہے۔"

زمانی بیگم کھسیا سی گئیں لیکن خاموش رہیں۔ دلاور حسین نے سرور جہاں کو مخاطب کر کے کہا۔

"چلو سرور! تم تو ہمارے ساتھ چلو۔ تمہاری بھاوج یاد بھی بہت کر رہی تھیں۔ آ جاتیں تو وہ میرے ساتھ ہی مگر ان کے بھتیجے کی نسبت ٹھہر رہی تھی آج کے دن۔"

"ارے بھیا! تمہارے بہاولپور میں ہمارا جی نہیں لگتا۔" انہوں نے بے چارگی سے جواب دیا۔ "اور پھر وہاں کی آب و ہوا بالکل بھی موافق نہیں ہمارے گھٹنوں کے لئے۔"

چچی جان نے ہنس کر کہا۔ "بھلا یہ زمانی کی جان چھوڑ کر کہیں جا سکتی ہیں؟ آخر کو بچپن کا ساتھ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ہے۔ ہمیشہ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہی ہیں۔ بلا سے لڑتی جھگڑتی رہیں مگر رہیں گی ان کے دم کے ساتھ ہی۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی جو قدرت نے ان کو بیوہ کیا تو انہوں نے یاور حسین کا ہی پلّہ پکڑا۔ اپنے اماں باوا کے پاس بھی نہ رہیں۔ وہ دن رات دوسرے نکاح کے لئے بضد جو رہتے تھے۔ لیکن یہ بدظن ہو چکی تھیں۔

''ارے ہم کہتے ہیں یہ آج آپ کو ہو کیا گیا ہے؟'' سرور جہاں چڑ کر بولیں۔ ''بلاوجہ بیٹھی ہوئی گڑے مردے اکھاڑ رہی ہیں۔''

''آج چچی جان کو عہد ماضی کے مرغزاروں کی سیر کرنے دو۔ اس میں کیا برائی ہے۔'' زمانی بیگم بولیں۔

''برائی تو باجی کو اس وقت تک دکھائی نہیں دے گی جب تک......''

سرور جہاں نے ان کی بات کاٹ دی اور چچی جان سے بولیں۔ ''آپ بتاتی ہیں، ہم اور زمانی ہم عمر ہیں۔ تو پھر بھلا ہمیں 'باجی' کیوں کہتی ہیں؟''

دلاور حسین ہنسنے لگے۔ چچی جان نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

''اے تم ہمیں چپ [illegible] سرور اپنے [illegible] بھول گئیں کیا؟ چھ ماہ کی بڑائی کی وجہ سے انہیں بڑے بوڑھوں نے پہلا سبق [illegible] 'باجی' کہا جائے۔''

چچی جان کے انداز پر سرور جہاں [illegible] دلاور حسین نے زمانی بیگم کو یقین دہانی کرائی۔ ''ہاں بھئی... وہ 'برائی، برائی' کیا [illegible] بات بیچ میں رہ گئی۔''

زمانی بیگم نے سرور جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] کہا۔

''اس وقت تو میں فاخر کا ذکر کر رہی تھی۔ باجی کو اس وقت خوب برا محسوس ہوتا ہے جب کوئی فاخر کے حق میں ایسی ویسی بات کہہ دے۔ چاہے وہ سو فیصد سچ کیوں نہ ہو۔ مجال نہیں ہماری کہ ان کے لاڈلے چہیتے کو کچھ کہہ جائیں۔''

دلاور حسین کے چہرے پر [illegible] سرور باجی سنبھل کر بیٹھ گئیں اور ترکی بہ ترکی بولیں۔

''اے، تم اسے کہو گی کیا؟ اس نے تمہارا بگاڑا کیا ہے؟ اسے اپنی پڑھائی لکھائی سے فرصت نہیں۔ مہینوں تو ہم اپنے بچے کی صورت کو ترس جاتے ہیں۔ اوپر سے یہ ہمارا کلیجہ جلاتی رہتی ہیں۔'' آخر میں وہ واقعی روہانسی ہو گئی تھیں۔

دلاور حسین نے مصالحانہ انداز سے پوچھا۔ ''فاخر سے تمہیں کیا شکایت ہے؟ پہلے تم بتاؤ زمانی!''

انہوں نے فوراً جواب دیا۔ ''شکایت کا ہے کی بھائی صاحب! اب یہ حقیقت تو آپ کے سامنے ہی ہے کہ اللہ بری گھڑی سے بچائے، یہاں قیامت گزر گئی ہے۔ ایک پل میں نہ معلوم کیا ہو جاتا مگر فاخر کو کوئی خبر ہے نہ فکر۔ ایسے لاابالی پن سے ہمارا جی جلے یا نہ؟ بس ایسا ہی ہماری باجی کو بھاتا نہیں۔''

دلاور حسین نے اندر ہی اندر مطمئن ہو کر جواب دیا۔ ''لیکن یہاں تو تمہارا خدشہ بے بنیاد ہے۔ کیونکہ ہم نے تو اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے خود ملاحظہ کیا ہے کہ فاخر میں کوئی لاابالی پن ہے نہ بے فکری۔ بھائی کے پاس سے ایک پل بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔ بقول شگفتہ 'پٹی' سے لگا بیٹھا ہے۔''

سب حیران ہو کر ان کی صورت تکنے لگے۔ سرور باجی خوشی سے اچھل پڑیں۔ ''سن لیا تم نے زمانی بیگم!......اب کہو کیا کہتی ہو؟''

زمانی بیگم کیا کہتیں؟ خوشی انہیں بھی ہوئی لیکن ساتھ ہی حیرت بھی۔ سرور باجی نے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ ''بس بھیا! یہ یونہی اس سے بدظن رہتی ہیں۔ ہزار دفعہ سمجھاتی ہوں کہ حوصلے سے کام لو۔ پڑھنے پڑھانے والا بچہ ہے۔ وہ اجڈ گنوار تو ہے نہیں کہ ہر وقت میا کے گھٹنے سے لگا بیٹھا رہے۔ اس کے باپ کی مثال سامنے ہے۔ مگر ان کی عقل شریف میں اتنی سی بات نہیں آتی۔ کیا بتاؤں بھیا! میرا بچہ مجھ سے کس قدر انسیت رکھتا ہے۔ اس سال تو برسات بھر بیمار رہا۔ ان کی جلی کٹی کی وجہ سے زیادہ تر مردانے میں ہی رہتا رہا۔ اندر جب آتا، میری گود میں سر رکھے پڑا رہتا۔ ارے بہت قابل ہے میرا لعل۔ ایسی ایسی شاعری سنایا کرتا تھا کہ انسان کی روح تک پھڑک اٹھے۔ بس یہ جل جل کر کوئلہ ہوتی رہتی ہیں۔''

ان کے آخری جملے پر سب کے ساتھ ساتھ زمانی بیگم بھی ہنسنے لگیں۔ دلاور حسین بظاہر ہنس بول رہے تھے مگر دل ہی دل میں بہت کچھ سوچ بھی رہے تھے۔ انہوں نے سب کو مطمئن کرنے کے لئے دوبارہ کہا۔

''بھئی ہم نے تو وہاں ہسپتال میں جو دیکھا، وہ بتا دیا۔ اپنے بھائی کے لئے بہت فکرمند اور پریشان تھا وہ۔ اب اسے بھی یونیورسٹی کے ہاسٹل میں کہیں خبر گئی ہوگی تبھی بھاگا آیا تھا۔ خود بھی بتا رہا تھا کہ مصروفیت بے پناہ ہے اس لئے [illegible] بہت دنوں سے گھر جانا نہیں ہو سکا ہے۔''

''ہم تو کہتے ہیں بس اب تم [illegible] کی تیاری کرو۔'' چچی جان نے پان لگاتے ہوئے صلاح دی۔ ''اللہ رکھے بہت پڑھ لیا فاخر [illegible] ملازمت کیا کرنی انہیں۔ باپ دادا کا بنا ہوا سب کچھ انہی دونوں کا ہے۔ اپنی قابلیت اور [illegible] پڑھ رہے ہیں، بس بہت ہے اتنا۔''

دلاور حسین بھی خود وہ کہے [illegible] ان کا ہنستا مسکراتا چہرہ و تاریک ہو گیا تھا اپنی خوش فعلیوں میں کوئی محسوس نہ [illegible] ہی بھلا

''ہاں، اب کی آپ نے خدا لگتی۔'' زمانی بیگم کھل کر مسکرائیں۔ سرور باجی بھی خوش ہو گئیں اور جلدی سے تائید میں کہنے لگیں۔

''آپ نے ہمارے منہ کی بات چھین لی چچی! ہمارا بھی منشا یہی ہے۔ اس وقت اللہ رکھے دونوں فرق آنے سامنے ہیں۔ دونوں سے کہے دیتے ہیں کہ بس اب اس نیک کام میں تاخیر نہ کریں۔'' پھر دلاور حسین کو مخاطب کیا۔ ''بھیا! اب شگفتہ اور فاخر کی شادی ہو جانی چاہئے۔ دیر کا ہے کی ہے۔ خیر سے تیاری تو دونوں طرف سے مکمل ہے۔ چلے چلتے ہیں ہم بھی آپ کے ہمراہ بہاولپور۔ بھائی جان سے بھی کہے دیتے ہیں جا کر۔''

چچی جان ہنس پڑیں۔ ''لو بھیا! سرور نے تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا شروع کر دی۔''

''شروعات تو آپ کی طرف سے ہوئی۔'' انہوں نے جواب دے کر اپنا روئے سخن دوبارہ دلاور حسین کی طرف کر لیا اور بے صبری سے دریافت کرنے لگیں۔ ''آپ کس سوچ میں پڑ گئے؟ حالانکہ خدا گواہ ہماری جان ڈگی ہے۔ گھٹنوں میں دم نہیں مگر اس کار خیر کے لئے ہم تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ آج سے چند دن پیچھے رمضان المبارک کا چاند نظر آنے کو ہے۔ تم کیا جانو، ہم تو ان دنوں کتنے مصروف ہوتے ہیں۔ یہ لونڈیاں باندیاں تو بس تیجی تیجی کرنے کی ہیں۔ کام کاج ڈھنگ سے اس وقت تک نہیں کرتیں جب تک ان کا پیچھا نہ کرے جاؤ۔ سال بھر کی بڑیاں، سویاں تڑوا کر رکھواتے ہیں، پھر چاول بلکہ سارے ہی اجناس، دالیں، مسالے سب چھان پھٹک کروا کر بھرواتے ہیں۔ بھیا!

اللہ رکھے یہ اتنے بڑے گھر کی سنبھال یونہی تھوڑی ہو جاتی۔ ہر دفعہ سال بھر کے انتظامات ہم روزوں سے پہلے ہی کر لیتے ہیں۔ زمانی بیگم کو ان کاموں سے کچھ مطلب نہیں۔ ہم نے یاور حسین سے کہہ رکھا ہے کہ رمضان کا چاند ہوتے ہی ہر نوکر چاکر کو کپڑے لتے اور اناج غلہ جو دینا ہے دے کر فارغ ہو جایا کرو۔ اور یہی ہمارا دستور ہے۔ سال بھر کے جوڑے ہم سب کے بھی رمضان المبارک میں ہی بن جاتے ہیں۔ بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں کہ روزوں کا یہ سب کیا، حساب کتاب میں نہیں ہوتا۔ تو یہ ہیں ہماری ان دنوں کی مصروفیات۔ لیکن ہم اپنے اتنی محنت کرنے والے بچے کی خاطر اپنی ساری ذمے داریوں کو پس پشت ڈال کر تمہارے ساتھ چلے چلیں گے۔"

سرور باجی اپنی طویل تقریر کر چکیں تو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے دلاور حسین نے ہنکارا بھرا اور بہت سنجیدگی سے، آہستگی سے گویا ہوئے۔

"یہی تو بات ہے ساری کہ بیٹا تو آخر اپنا ہی ہے۔ جو کچھ کریں گے، اس کی محبت میں کریں گے۔ وہ خود بھی محبتوں سے گندھا اور اپنائیت کی شیرینی میں رچا ایسا انمول ہیرا ہے کہ کیا تعریف کروں۔ مجھے دیکھتے ہی ایسا دوڑ کر آ چمٹتا ہے کہ دل آئینہ ہو گیا میرا۔ دل سے دعائیں نکلتی ہیں ایسے خوش بخت لخت جگر کے لیے۔"

بیٹے کی تعریف سن کر زمانی بیگم مسکرانے لگیں۔ چچی جان نے بات آگے بڑھائی۔

"جو کچھ سرور جہاں نے بتایا تو ٹھیک ہی کہا ہے۔ بات تمہاری بھی سولہ آنے درست ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ خیر سے یاور حسین خیر سلا [illegible] ہے۔ تم کسی سے لکھوا کر فاخر کو بھی بلوا لو ساتھ ہی۔ سب باتیں ایک جگہ بیٹھ کر طے ہو جائیں گی۔ سب مل کر اس کے کان اینٹھیں گے۔"

"کیا مطلب؟" دلاور حسین نے چونک کر پوچھا۔

سرور باجی نے جلدی سے دخل در معقولات ضروری سمجھا اور بولیں۔ "بات کچھ انہونی نہیں ہے بھیا! فقط اتنی سی ہے کہ آج کل کے عام لڑکوں کی طرح فاخر بھی شادی بیاہ کے تذکرے پر اکثر بدک جاتا ہے۔ بس یہی اصرار کرنے لگتا ہے کہ ابھی مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔ تم جانو ابھی ایسا بوڑھا تو نہیں ہو گیا کہ اس کی بات کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا جائے۔ بس اسی بات پر یہ ہماری زمانی بیگم اس کی طرف سے جی برا کر کے بیٹھ جاتی ہیں۔ مجال ہے اس کی کہ اپنے بڑوں کے سامنے بول جائے؟"

دلاور حسین نے ان کی بات پہ غور سن کر پہلو بدلا مگر بولے کچھ نہیں۔ چچی جان خود بخود حساب کتاب میں مصروف ہو گئیں۔

"بات کی پیش رفت یہیں سے کر کے جاؤ۔ ساتھ خیریت کے رمضان شریف گزر جائیں پھر عید کے چاند ہم لوگ آ جائیں گے دن تاریخ ٹھہرانے۔ اول تو اتنی دور بھی نکاح کی تاریخ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم اگر تمہاری دلہن وغیرہ تاخیر ضروری خیال کریں تو بقر عید کا چاند رکھ لینا۔ کیوں زمانی؟" انہوں نے پاندان سے تیور آزما زمانی بیگم کی تائید چاہی۔

"جو سب کی رائے، وہی میری رائے۔" انہوں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

اسی وقت تانیا ہنستی کھلکھلاتی آ گئی اور چھگانہ چادر میں لپٹی نواسی کو ان کے قریب لٹا کر بولی۔

"لیجیے بڑے ابا! ہمارے نئے کھلونے سے کھیلیے۔"

"ارے واہ...... ہماری ضیا آ گئی۔" وہ خوش ہو کر بولے۔

"یہ ضیا چیا نہیں چلے گا بھیا!" سرور باجی دلاور سے بولیں۔ "ہم نے ان کا نام اپنے نام سے ملا کر "منور جہاں" رکھ دیا ہے۔"

"اے خبردار!" دلاور حسین نے ٹھٹھا اڑایا۔ "جیسا خود کا مردانہ نام ایسا ہماری نواسی کا بھی رکھ رہی ہیں۔ ہماری طرف سے قطعی نامنظور۔ اصل نام ہم رکھے دے رہے ہیں، کشور جہاں۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں۔"

سب ہنسی ٹھٹھول میں مشغول تھے کہ شاکر کے بڑے بیٹے شہکار نے ننھی کشور کا کان مروڑ دیا۔ وہ بلبلا کر رونے لگی۔

"میاں صاحبزادے! ہمارے سامنے یہ بدمعاشی نہیں چلے گی۔" نانا نے اسے بازو سے پکڑ کر دھمکایا۔

"کیوں نہیں چلے گی؟" چار سالہ شہکار اکڑ گیا۔ "یہ ہمالی (ہماری) امی کے پاچھ (پاس) کیوں شوتی ہے؟"

"اچھا...... تو وہ صرف تمہاری امی ہیں کیا؟" نانا نے سوال کیا۔

"ہاں...... ہاں...... بچھ (بس) ممی (میری) امی ہیں۔" شہکار نے بلند ہو کر دوبدو جواب دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی کو ایک چپت رسید کر کے بھاگ گیا۔ اور نانا دلاور حسین "ہائیں ہائیں" کرتے رہ گئے۔

❊●❊

رات کا کھانا اپنے خسر سعید احمد کے ساتھ کھا چکنے کے بعد فرحت، حمید کو لے کر چہل قدمی کے لیے باہر نکل گیا تھا۔ واپس آیا تو نازیہ اس کا بستر لگا چکی تھی۔ میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھنے کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے ایک نظر شوہر پر ڈالی اور باہر جانے کے لیے پلٹی۔ فرحت نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بیٹھو نا...... کہاں چلیں؟"

"رات کے گیارہ بجنے کو ہیں۔ سوؤں نہ کیا جا کے؟"

"یہیں سو جاؤ نا۔"

"پاگل ہو گئے ہیں کیا؟" نازیہ نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔

"کیوں؟...... اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے؟ شام سے ہی فاخر بہت یاد آ رہا ہے۔ اس کی باتیں کریں گے۔ تمہیں کھانے کا ارادہ تو نہیں ہے میرا جو ڈر رہی ہو۔"

نازیہ نے اس کی بتائی بات نظر انداز کر دی اور پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیوں...... فاخر بھائی کو کیا ہو گیا؟ ان کی باتیں کون سی ہیں؟ خیریت تو ہے نا وہاں؟"

"اللہ میری توبہ......!" فرحت نے عورتوں کی طرح سر پر ہاتھ مارا۔ "واقعی پریشان ہونے اور پریشان کر دینے میں لیڈیز فرسٹ ہیں۔ یہ صنف نازک۔ ارے بھئی میں نے کیا کہہ دیا آپ کے دلہا بھائی کو؟"

"تو...... آپ اپنا انداز دیکھیے ذرا۔" وہ روٹھ کر بولی۔

فرحت تھوڑی دیر مزید اسے ستاتا رہا، پھر سنجیدہ ہو کر کہنے لگا۔

"نازیہ! تم تو بالکل ہی بدھو ہو۔ پتہ ہے کیا! آج شادی کے بعد شاید پہلی مرتبہ میں اس گھر ے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY
Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

میں سو رہا ہوں۔ میں نے اور فاخر نے اتنا یادگار وقت گزارا ہے اس تاریخی کمرے میں کہ بس کیا بتاؤں اور کیا چھپاؤں۔ جب میں شام کو بابا جان کے ساتھ یہاں کھانا کھا رہا تھا تو ایمان سے رو رو کر فاخر یاد آ رہا تھا۔ وہ اس کی اُس زمانے والی بے قراریاں، بے تابیاں بلکہ آہ وزاریاں...... سعدیہ کے لئے۔"

نازیہ نے گھبراہٹ کے عالم میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے آواز دبا کر کہنے لگی۔

"خدا کے لئے ان کا نام بھی مت لیجئے۔ اس موضوع کو یہاں بیٹھ کر مت چھیڑیے۔ میری امی کا نام بدنام ہوگا۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اگر ایسا ہی آپ کا جی چاہ رہا ہے تو کل گھر چل کر کر لیجئے گا یہ باتیں۔"

"ہوں...... ہو واقعی بہت دور اندیش۔" فرحت ہنس پڑا۔ "آخر ہو نا برخوردار حمید کی بجیا۔"

عین اسی وقت حمید بوتل کے جن کی طرح نمودار ہوا اور اعلان کر کے چلتا بنا۔

"بجیا!...... بجیا! دادی نے کہلایا ہے کہ صبح میرے آنے سے پہلے مت چلی جانا۔"

فرحت کی ہنسی میں مزید شدت آ گئی۔

"یا اللہ اب کیا ہو گیا؟...... اتنا کیوں ہنسے جا رہے ہیں؟" نازیہ کھسیا رہی تھی۔

فرحت خوب ہنس چکا تو سنجیدہ ہو کر بولا۔ "تمہاری دادی کہیں یہ شرط نہ لگا ڈالیں کہ "آج اپنی دلہن کو پیٹھ پر لاد کر لے جاؤ۔" اب تو تم ماشاء اللہ......"

فرحت کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ اپنا آپ چھڑا کر بے آواز ہنسی ہنستے ہوئے درمیان والا دروازہ کھول کر گھر کے آنگن میں بھاگ گئی۔ اس کے چلے جانے کے بعد وہ کافی دیر لیٹا چپکے چپکے ہنستا رہا۔

آج وہ دوپہر میں آ جاتا نازیہ کو لینے مگر شاکر بھائی کو دیکھنے ہسپتال چلا گیا تھا۔ اب ان کی کیفیت پہلے سے بہتر تھی۔ فاخر سے بھی وہیں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مستقل اپنے بھائی صاحب کی خدمت اور تیمارداری میں دل و جان سے ڈٹا ہوا تھا۔ ساری دوپہر دونوں دوستوں میں گھٹ گھٹ کر باتیں ہوتی رہی تھیں۔

شام کے قریب وہ سسرال آیا تو سعید احمد نے اصرار کر کے روک لیا۔ اس کے رات بھر رک جانے سے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ بھی چھوٹے سالے سالیوں سے گھل مل کر ہلکا پھلکا مذاق کرتا رہا تھا۔ ساس بھی بہت خوش اور مگن تھیں۔

یہاں سے فرحت کے گھر تک کسی کو کانوں کان بھی شاکر والے واقعے کا علم نہ تھا۔ منہاج الدین صاحب نے فرحت کو کھلے الفاظ میں سمجھا دیا تھا۔ خود اپنے گھر میں بھی انہوں نے ذکر نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے اس احتیاط میں مصلحت پوشیدہ تھی۔

تھوڑی دیر لیٹے رہنے کے بعد فرحت نے اٹھ کر جگ سے ایک گلاس پانی انڈیل کر پیا، پھر ٹہلتا ہوا کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ حالانکہ اس کمرے سے گھر میں جانے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اندر چلے جانے پر پابندی نہیں تھی مگر اس کے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ اخلاقاً بھی اسے ہرگز پسند نہ تھا کہ بیوی کا اس حد تک تعاقب کرے کہ بات اخلاقی گراوٹ تک جا پہنچے۔

دور کہیں مکیش کے گانوں کا کیسٹ لگا ہوا تھا۔ ہوا کے دوش پر اس کے ایک مشہور گانے کے بول مسلسل سنائی دے رہے تھے۔

"او دُنیا کے رکھوالے
سن درد بھرے میرے نالے"

فرحت کو ایک بار پھر فاخر کی یاد ستانے لگی۔ ساتھ ہی ناصر کاظمی کی شاعری بھی یاد آتی چلی گئی جو اس کمرے میں رہائش کے آخری دنوں میں فاخر کی نوک زبان پر رہتی تھی۔

"او پچھلی رُت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں
تیری گلی میں سارا دن
دُکھ کے کنکر چنتا ہوں
تُو جیون کی ہری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں"

فرحت کے ہونٹوں پر ہلکی سی لکیر نمودار ہو گئی۔ اس نے دل میں سوچا۔

"کتنا دلگداز اور روح تک چھید ڈالنے والا کلام، لیکن کیسا باغ و بہار، خوش رنگ، شہد آفریں اور دلکش و حسین انجام! بلکہ فاخر کے ساتھ ساتھ تمہارے صدقے میں ہی خود میرے بھی سہرے کے پھول کھل اُٹھے۔ واہ میرے مولا! تو واقعی بے نیاز اور بے پرواہ ہے...... دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دے ڈالتا ہے۔ جس کی گلی میں دکھ کے کنکر چنتے چنتے فاخر پھولوں اور بہاروں میں تنہا گیا تھا۔"

فرحت کا ایک دم ہی فاخر کو رو رو کر یاد کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اس کرائے کے کمرے کی ایک ایک اینٹ آج اس کے بتائے ہوئے دن یاد دلا رہی تھی۔ ان دنوں کے بعد کئی کرائے دار اس کمرے کی طلب میں آئے تھے مگر سعید احمد نے کرائے پر دینا مناسب خیال نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب وہ ایک چھوڑ، دو دو دامادوں والا گھر بن چکا تھا۔ اس لئے آنے جانے والوں کے لئے باہر کا یہ کمرہ بہت کام آنے والا تھا۔ فاخر اور فرحت اپنے پلنگ، میز کرسی بلکہ پنکھا چھوڑ گئے تھے جو کئی بار یاد دہانی کے باوجود لے کر نہ گئے تھے بلکہ صاف منع کر دیا تھا۔ اب یہ سامان نہایت سلیقے اور نفاست کے ساتھ اس مہمان خانے کی زینت مستقل طور سے بن گیا تھا۔

اس زمانے میں کون یقین کر سکتا تھا کہ کرائے پر رہنے والے یہی دونوں لڑکے سعید احمد کے داماد بن جائیں گے۔ اور یوں بے سان و گمان کام ہوتے چلے جائیں گے۔ فرحت قدرت کی فیاضی پر عش عش کر رہا تھا۔

فرحت کی اس رات اور تنہائی کے ان گھنٹوں میں وہ بہت آزادی، یکسوئی اور دیانت داری سے سارے حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے لگا۔ جتنا جتنا وہ غور کرتا گیا، اس کی توجہ اس حقیقت پر مرکوز ہوتی چلی گئی کہ یہ تمام تر کمال فاخر کے جذبۂ صادق اور قسمت کی یاوری کا تھا۔ ورنہ عشق تو بہت لوگ کیا کرتے ہیں مگر منزل کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کتنی ہی ساعتوں میں فاخر نے فرحت کو بھی "بجیا" کہہ کہہ کر چھیڑا تھا اور مذاق ہی مذاق میں رومال پھیلا پھیلا کر دعا مانگی تھی کہ آج بجیا یعنی اس کی نازیہ دمساز و غمگسار بن چکی تھی۔

رات خاصی بھیگ چکی تھی اور وہ پلنگ پر سو جانے کے خیال سے لیٹا ہی تھا کہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔ رات کے گہرے سناٹے میں باہر سے کسی اعلان کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ خاموشی ہونے کی وجہ سے جلد ہی صورت حال واضح ہو گئی۔ اعلان غالباً مسجد سے کیا جا رہا تھا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

لاؤڈ اسپیکر پر مولوی صاحب با آواز بلند کہہ رہے تھے۔

"حضرات! ایک ضروری اعلان سنیے۔ رویت ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق رمضان المبارک کا چاند نظر آ چکا ہے۔ لہٰذا آج رات سحری ہے اور صبح پہلا روزہ ہوگا۔"

دیکھتے ہی دیکھتے رات کا سناٹا مجروح ہونے لگا۔ سوئی ہوئی آوازیں جاگ پڑیں۔ ہر گھر، آنگن سے باتوں اور پکاروں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔

"تو بھئی! یہ دن بھی لکھا تھا سسرال میں!"...... فرحت کھوپڑی پر ہاتھ پھیرتا دھیرے سے بڑبڑایا اور منتظر نگاہوں سے گھر اور بیٹھک کو ملانے والے دروازے کی سمت دیکھنے لگا۔

⌘●⌘

اگر اس مکر و فریب سے اٹی ہوئی منافقت سے سجی ہوئی اور سازشوں کی گود میں پلی ہوئی سیاہ کار اور گناہ گار دنیا میں کہیں روپہلی فطرت اور جگمگاتے چہروں والے فرشتوں کا وجود ممکن ہے تو وہ سعدیہ اور فاخر کی نظر میں ڈاکٹر منان اور ان کی بیگم کا دوسرا روپ ہو سکتے تھے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔

بھلا کسی عام انسان کا کام ہو سکتا تھا کہ کسی راہ چلتے مصیبت زدہ کو ایسا گلے سے لگایا کہ بس اپنا ہی بنا لیا۔ اپنے گھر میں بسا لیا اور اس پر خلوص اور سچ کی شیرینیوں میں ڈوبی ہوئی لافانی خوشبوؤں سے گندھی ہوئی شفقت اور محبت کی بوچھاریں کیں کہ اس کا پور پور بھیگ گیا۔ اور ظاہر ہے محبت کا جواب بھی عام حالات میں محبت ہی ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اس راہ چلتے مصیبت زدہ کو تو ان کے آگے سجدہ ریز ہونا ہی تھا تو بس یہی ہوا۔ مکمل یہاں بھی ہوا۔

یہ دونوں، ان دونوں کے پُر خلوص اور بے لوث پیار کی حدت سے ہمیشہ کے لئے پگھل کر جیسے انہی کے سانچے میں ڈھل گئے۔

پھر ان چاروں کے درمیان میں زنجیر کا کردار نازش، ریحان اور سلطان کی اپنائیت اور معصومیت اور جلد مکمل مل جانے والی فطرت نے ادا کیا۔ بظاہر دیکھنے والی نگاہ شناخت نہ کر سکتی تھی کہ ان سب کا رابطہ کتنا مختصر ہے ورنہ ایسا لگتا تھا جیسے اٹوٹ بندھن میں جڑے ہوئے تھے وہ سب۔ اور محبتوں، چاہتوں سے لبریز اس تعلق میں ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

⌘●⌘

گو کہ ابا میاں کی مہربانیوں سے فاخر اور سعدیہ کو گھر اور سامان گھر کی سردست کوئی حاجت تھی نہ ضرورت کیونکہ ہر چیز موجود تھی۔ مگر یہاں سے کسی نے انہیں ٹس سے مس نہ ہونے دیا۔ ڈاکٹر منان اور ان کی بیگم نے بصد اصرار اپنے ہاں روک لیا تھا اور بھابی نے تو صاف الفاظ میں فاخر کو سنا ڈالا تھا۔

"ابھی تو تمہاری دلہن کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اُتری اور چلے ہو اسے اپنی گھر داری میں پھنسانے۔ بس خبردار! کوئی ضرورت نہیں ان تکلفات کی۔ ساری زندگی پڑی ہے ان بکھیڑوں کے لئے۔ وہاں اکیلے رہے گی تو دن بھر میں گھبرا جائے گی۔ نہ ہم ہی ہر وقت دوڑ دوڑ کر پہنچ سکتے ہیں۔ خیر سے جب ہنی مون منا کر آ جاؤ تو اپنا بنگلہ بسا لینا۔ ابھی صبر و تحمل سے یہیں رہو۔ یوں بھی وہ دلہن بن کر یہیں اُتری ہے۔ اب ہماری مرضی۔"

اس پیار بھری ڈانٹ نے فاخر تو فاخر، سعدیہ کو بھی اسیر کر لیا تھا۔ نازش اور وہ تو چند دنوں میں ہی یک جان دو قالب بن گئی تھیں۔ اتفاق سے شاکر بھائی صاحب کی وجہ سے فاخر کو مسلسل ہسپتال میں رہنا پڑا۔ ایسی صورت میں اگر سعدیہ اپنے گھر میں ہوتی تو یقیناً بور ہو کر رہ جاتی اور فاخر کو الگ فکر مند

رہنا پڑتا۔ اس لئے ان دونوں کو ڈاکٹر منان کی فیملی سے بے حد ڈھارس ملی اور اطمینان مل گیا۔

رخصتی کے وقت جو سعدیہ بے ہوش ہوئی اور پھر ڈاکٹر منان کی کوششوں سے ہوش میں آئی تو اگلے دن سے اس کی حالت بہتر ہوتی چلی گئی۔ حالانکہ فاخر بہت ڈر گیا تھا۔ تاہم جب اس نے وقتِ رخصت کانوں میں اتفاقیہ پڑ جانے والی سرگوشیوں کا حوالہ دیا تو اصل حقیقت فاخر کی سمجھ میں با آسانی آ گئی تھی۔

ڈاکٹر منان نے اس کے چند ٹیسٹ تجویز کر ڈالے تھے مگر سعدیہ نے ہنس کر ٹال دیا تھا۔ وہ بحیثیت ملنے والوں میں سے تو ہرگز نہیں تھے مگر فاخر نے تنہائی میں ان کو بھی اصل حقیقت کا احوال سنا دیا۔ بات ان کے دل کو بھی لگی۔ یوں سعدیہ ماشاءاللہ بالکل چاق و چوبند اور ہوشیار لگ رہی تھی۔ اس لئے بات آئی گئی ہو گئی۔

بعد میں ڈاکٹر منان نے بہت فرصت سے بیٹھ کر اور بیوی سے مشاورت کرتے ہوئے ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا اور فاخر کو اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا تھا کہ نہایت حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے رفتہ رفتہ سعدیہ کو درست حالات سے آگاہ کرنا شروع کر دے۔ کیونکہ جو سچ میں توانائی ہے وہ جھوٹ میں بھی نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہ کبھی اسے یہ راز معلوم ہونا ہی تھا کہ یہ گھر اس کی حقیقی سسرال نہیں ہے۔ اس صورت حال میں وہ زیادہ ٹینشن لے سکتی تھی۔ جب تک وقت گزر جائے گا تو زیادہ گہرا دھچکا لگنے کا امکان تھا۔ یہ تمام احتیاط سعدیہ کے پہلے دن کی بے ہوشی کے سبب تھی۔ یہی اس نو بیاہتا جوڑے کی خوش نصیبی تھی کہ ان کا ساتھ ایک قابل قدر ڈاکٹر سے پڑا تھا۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کے زیر ہدایت رہتے ہوئے فاخر نے بہت ذہانت اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں سعدیہ پر آگاہی کے در وا کرنے شروع کر دیئے بلکہ موقع پا کر دھیرے دھیرے اس راز پر سے بھی پردہ اٹھا دیا کہ اصل میں وہ اسے ڈائریکٹ ہی اپنے آبائی گھر میں بیاہ کر کیوں نہیں لے جا سکا اور سوائے ابا میاں کے کوئی دوسرا اسید احمد سے رشتہ مانگنے سے رخصتی تک کیوں نہیں ان کے گھر آیا؟ اور ابا میاں نے یہ فیصلہ خود کر کیوں دے دیا؟

گو یہ سارے مراحل بہت دشوار نظر آ رہے تھے۔ تاہم جب اس چوٹی کو سر کرنے کے لئے عمل کیا گیا تو حیرت انگیز طور پر نتیجہ خوش آئند نکلا چلا گیا اور فکر مند ذہنوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

یہ دراصل فاخر کے جذبہ صادق اور سعدیہ کی سلجھی ہوئی فطرت اور نیک اطوار کی بناء پر زیادہ آسانی سے ممکن ہو سکا۔ تمام معاملات سعدیہ کے ذہن میں فٹ کر دینے کے بعد باقی سب کچھ فاخر نے بیوی پر چھوڑ دیا تھا کہ ان میں سے کون سے پوشیدہ رکھے؟ اس فیصلے میں آزادی کے حق کا احساس ہوتے ہی سعدیہ پُرسکون ہو چکی تھی اور اس نے فاخر سے بھی زیادہ حسنِ تدبیر اور مناسب اقدامات کے ساتھ یہاں سے اپنے میکے تک کی کمان سنبھال لی تھی۔

یونیورسٹی کے دور سے شناسائی ہونے کی وجہ سے نازش اور سعدیہ کے درمیان بہت گہری دوستی کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ تعلق ہر روز پائیدار ہوتا چلا گیا۔ فارغ اوقات میں یہ گھنٹوں باتوں میں مصروف رہتیں۔

سعدیہ کے آ جانے سے بھائی کو نازش کی طرف سے بھی یک گونہ سکون کا احساس ہوا تھا اور وہ اس خیال سے خوش اور مطمئن رہنے لگی تھیں کہ ان کی بے ضرری نند کو گھر بیٹھے ایک عدد کمپنی میسر آ گئی تھی۔ اس طرح ان لوگوں کو ایک دوسرے سے دوراہٹ بھی مل گئی تھی۔ زمانۂ تعلیم کی شناسائی نے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔

دن پر لگا کر اڑے اور تیسرا روزہ آ گیا مگر فاخر کی ہسپتال والی مصروفیات میں کمی نہ آئی۔ سعدیہ کی تنہائی کے خیال سے نازش اوپر اسی کے کمرے میں سو رہتی۔ یہاں اس علاقے میں سعدیہ اذان کی آواز تو برابر سنتی رہتی تھی مگر جب سے رمضان المبارک کا آغاز ہوا تھا اس نے اپنے میکے کی طرح سحری اور افطار کے اوقات میں مسجدوں سے کلام پاک کی تلاوت اور نعتوں کی خوش الحان آوازیں نہیں سنی تھیں تاہم سحری کے وقت اس کی آنکھ خود بخود وقتِ مقررہ پر کھل رہی تھی۔

حیرت انگیز طور پر اس کے میکے کی طرح یہاں بھی سب روزے پابندی سے رکھتے تھے۔ سحری میں جاگنے کے لئے بھابی اپنے کمرے میں الارم کا سسٹم رکھا کرتی تھیں مگر ان روزوں میں انہیں اس جھنجٹ سے آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں مل کر سحری کا اتنا عمدہ انتظام کرلیتیں کہ بھابی انہیں دل کی گہرائیوں سے دعائیں دینے لگتیں۔ اسی طرح افطاری کا اہتمام سعدیہ تین بجے سے شروع کرتی تو نہایت خوش اسلوبی سے مغرب سے پہلے پہلے ایک بے حد مزیدار اور خوش ذائقہ افطار پارٹی تیار کرلیتی۔ نازش اور چاچی بوا ہر کام میں پیش پیش رہتیں۔

آج کل گھر میں چھوٹے بڑے سبھی کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ چاچی بوا ایک خوش خوش پھرتے۔ سب سے زیادہ مزے سلطان اور ریحان کے آ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی پانچوں گھی میں اور فرخ کا سر کڑاہی میں تھا۔ وہ جو پہلے روزے کے افطار پر محض اتفاق سے آ پہنچا تھا تو اب روزہ ہوتا نہ ہوتا اس نے اپنی موجودگی افطار کے وقت لازم کر لی تھی۔ ڈاکٹر منان کے ساتھ ساتھ فاخر نے فرخ سے بھی سعدیہ کا پردہ نہیں کروایا تھا اس لئے وہ اسے بھابی کہنے لگا تھا اور نازش کی طرح اس سے بھی ہلکا پھلکا مذاق کر لیتا تھا۔

اس شام بھی وہ موجود تھا۔ سعدیہ اور نازش کی سرگرمیاں و افطاری کی تیاریاں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اخبار پڑھتے ہوئے بولے۔

"بیگم صاحبہ! آپ کے دونوں بچوں میں ہی جھگڑا ہوگا، یہ سکون اس چین کو بے چینی میں آ کر تبدیل کرے گا فاخر۔ پھر ہم آپ کے ہاتھوں کے طوطے اڑتے دیکھیں گے۔"

بھابی ہنسنے لگیں۔

"بس ہو گئیں نا، لاجواب۔" فرخ نے مذاق اڑایا۔

"لاجواب تو نہیں ہوئی بلکہ ایک سوال کرنا چاہتی ہوں دونوں سے۔" بھابی نے سوالیہ انداز سے دونوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ضرور، ضرور۔" دونوں نے لپک کر اجازت دی۔ بھابی نے سادگی سے پوچھا۔ "افطاری کے زیادہ لوازمات تو چیز چیز آپ دونوں ہی ٹوٹ کر چکھتے ہیں۔ پھر اب بتائیں کہ زیادہ محنت اور وقت کس کے کھاتے میں جا رہا ہے؟ تو ظاہر ہے فاخر کو جواب دہ بھی آپ ہی ہوئے۔"

"اللہ رے ذہین...... بلکہ فطین خاتون!" ڈاکٹر صاحب کا منہ کھلا رہ گیا۔

آلو کے چپس تلتے تلتے سعدیہ بھی مسکرا دی۔ وہ روزانہ سب کی نوک جھونک کے درمیان اپنے کام میں مشغول رہتی۔ ذہن کہیں سے کہیں اڑان بھرتا رہتا۔ میکے میں گزرے ماہ و سال روح میں نہ معلوم سی کسک بن کر سرسراتے۔ محدود سے وسائل اور مخصوص حالات میں دونوں بہنیں مل جل کر اپنے تھوڑے میں صبر شکر کے ساتھ افطار و سحر کا انتظام کیا کرتی تھیں۔ کیا وقت تھا وہ بھی۔ یہاں

بھرے بھرائے کچن، کھلے کھلے اخراجات۔ وہ بڑے چاؤ اور شوق سے ہر طرح کی چیزیں تیار کرتی رہتی۔ میکے سے ہر ہنر اور سلیقہ سیکھا ہونے کی وجہ سے اسے ذرا بھی دقت نہ ہوتی۔ حالانکہ یہاں ڈاکٹر صاحب کے ہاں ریڈی میڈ افطاری کثرت سے چلتی تھی مگر سعدیہ نے اپنے گھریلو طور طریقوں کو خیرباد کہنا پسند نہ کیا تھا۔ ہاتھ میں مزہ اور ذائقہ تھا۔ سب چٹخارے لے لے کر انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ گھر کی بنی چیز کا لطف ہی دوسرا ہوتا ہے۔ بس فاخر کی غیر موجودگی سے اس کا دل بھرا سا رہتا مگر مجبوری تھی۔ افطار سے آدھا گھنٹہ قبل اچانک اسی بے ایمان کا فون آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ذرا سی دیر قہقہوں کا تبادلہ کرنے کے بعد ریسیور سعدیہ کو بلا کر تھما دیا۔

وہ واپس کچن میں آئی تو اس کا تمتمایا سا چہرہ دیکھ کر نازش نے استفسار کیا۔ "کیوں...... خیریت تو ہے؟...... ریسیور میں سے جھانک کر ڈانٹ پلا دی کیا؟"

"وہ نہیں آ رہے۔ کہہ رہے تھے، بھائی صاحب کی چھٹی میں ہفتہ بھر لگ جائے گا۔" سعدیہ نے اداس ہو کر جواب دیا۔ نازش نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"اسے کہتے ہیں کھیت کی، سو کھلیان کی۔"

"کیوں ہنس رہی ہو؟" بھابی نے قریب آ کر پوچھا۔

نازش مزے لے لے کر یہ لطیفہ سنانے لگی۔ چاچی بوا بھی زیر لب مسکرا رہی تھیں۔ سعدیہ کی رنگت خجالت سے تپ رہی تھی مگر دھیان فاخر کی طرف ہی تھا۔ ویسے تو اس کی مسلسل غیر حاضری سب کو کھل رہی تھی اور سعدیہ سے ہمدردی تھی۔

افطار میں کچھ چند لمحے باقی تھے کہ ایک زوردار "السلام علیکم" کے ساتھ وہ شرارت سے مسکراتا ہوا آ گیا۔ چھوٹے بڑے سب شور مچانے لگے۔ حیرت و مسرت سے سعدیہ آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔

اب اس کی سمجھ میں فاخر کی شرارت آئی۔

باتیں کر دینے کے بعد اچانک اس کے آ جانے سے سبھی اچھل پڑے تھے۔ سعدیہ کو سب سے زیادہ مبارکبادیں دینے والا فرخ تھا۔ بروقت تمام روزے کا واسطہ دے دے کر بھابی نے سب کو خاموش کرایا اب جا کر کہیں ماحول پرسکون ہوا۔ فاخر آج پہلی مرتبہ اپنی دلہن کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی افطاری کا اہتمام دیکھ رہا تھا۔ اذان مغرب کے ساتھ جب سب نے دعا مانگ کر روزہ کھول لیا تو ایک نئے ہنگامے کا آغاز ہو چکا تھا۔

"بھئی اب مجھے کہیں نہیں جانا۔" فاخر نے مسکراتے ہوئے کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ "خدا کے فضل و کرم سے اور آپ سب صاحبان کی دعاؤں کے طفیل بھائی صاحب کو ان کے ڈاکٹرز نے کلیئر قرار دے دیا ہے۔ وہ ڈسچارج ہو کر ماشاء اللہ آج گھر جا چکے ہیں۔ اب ہم اور آپ ساری افطاریاں، سحریاں مل کر کیا کریں گے۔"

آخری جملہ اس نے سعدیہ کی جھکی جھکی نگاہوں کی طرف دیکھ کر ادا کیا تھا۔

"ہپ ہپ ہرے۔" فرخ، سلطان، فرحان نے اچھل کود مچا دی۔ "اب تو اور بھی زیادہ وشز ملا کریں گی۔" سب شرارت سے سعدیہ کو چھیڑ رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اور بھابی کی ہنسی ان کو شہہ دے رہی تھی۔

نماز عشاء اور تراویح کے بعد رات کو جب یہ لوگ آرام کرنے کی غرض سے لیٹے تو سعدیہ نے دریافت کیا۔ "آپ کے بڑے ابا چلے گئے بہاولپور؟"

Famous Urdu Novels
Free Pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"ابھی تو نہیں گئے۔" فاخر نے جواب دیا۔ پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "اس روز کیسا تڑپ تڑپ کر روئے ہیں مجھے گلے لگا کر۔ بس کیا بتاؤں؟" سعدیہ متاثر ہو کر بولی۔ "آخر کو سگا خون ہیں آپ ان کا۔ مگر روئے کیوں وہ؟"

فاخر نے نظر بھر کر سعدیہ کو دیکھا، پھر قدرے تردد کے لہجے میں بولا۔ "میں نے ان کی برسوں پرانی آرزو کا خون کر ڈالا۔ تب بھی نہ روتے؟"

"کیوں...... آ...... آپ......" وہ ہکلا کر چپ ہو گئی۔ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ فاخر بھی اٹھ بیٹھا اور رنجیدہ سی آواز میں آہستہ آہستہ بتانے لگا۔

"ہر عمل کا کوئی نہ کوئی ردعمل ہوتا ہے ضرور۔ جب سے میں نے بڑے ابا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں، دل و دماغ پر بہت بوجھ ہے۔ گو کہ میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا۔ میرا ضمیر صاف ہے اس لئے کسی کا گناہ گار بھی نہیں ہوں، نہ ہی مجرم۔ بس تمہیں اپنا بیک گراؤنڈ کیا بتاؤں ڈیئر! مجھے اپنے کنبے میں دو افراد سے بہت زیادہ پیار ملا اور وہی دونوں مجھے جان سے زیادہ عزیز بھی ہیں۔ ایک میرے بڑے ابا اور دوسری سرور پھپھو۔ زندگی بخیر، کبھی نہ کبھی تمہیں ان دونوں سے ضرور ملواؤں گا۔ میرے اپنے ابا میاں اور اماں سے بڑھ کر انہوں نے میرے لاڈ اٹھائے ہیں۔ جو میری بھابی ہیں، شاکر بھائی صاحب کی بیوی، ان کے والد ہیں وہ میرے بڑے ابا۔ ان کی فقط دو بیٹیاں ہیں۔ بچپن سے ہی ہم دونوں بھائی انہی دونوں بہنوں سے منسوب رہے۔"

سعدیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی ہی رو میں کہے چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی چونکا۔

"ارے...... تم کیوں چپ ہو گئیں بھئی؟" وہ اسے کریدنے لگا۔ "ہم تو اپنی شریک حیات کی معلومات میں اضافہ کر رہے ہیں اور یہ ہیں کہ...... بیوقوف لڑکی! کوئی دوسرا سوال باقی ہو تو کر لو، ورنہ ہم سوتے ہیں۔ پھر شکوہ نہ کرنا۔"

"آپ کو تو بہت افسوس ہوا ہوگا بڑے ابا کا داماد نہ بننے کا؟" سعدیہ نے اپنی دانست میں بڑا چبھتا ہوا سوال داغا۔

"اس راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔" فاخر نے برجستہ جواب دیا۔ اب اسے سعدیہ کی "چپ" کا راز سمجھ میں آیا۔ مگر وہ فاخر ہی کیا جو ستانے کا موقع ہاتھ سے جانے دیتا۔ کافی دیر بعد سعدیہ نے زچ ہو کر دریافت کیا۔

"خیر، بھائی صاحب تو گئے۔ آپ تو نہیں جا رہے کیا ان کے پیچھے؟"

"نہیں بھئی۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔ لیکن کیوں؟"

"وہ یوں کہ میں دو دن کے لئے امی کے پاس جانا چاہ رہی ہوں۔"

"ہاں، چلی جانا۔ کوئی حرج نہیں ہے۔" اس نے فراخ دلی سے اجازت دے دی پھر ہولے ہولے سُروں میں گنگنانے لگا۔

"ارے ارے......" وہ گھبرا کر روکنے لگی۔ "رمضان شریف ہیں۔ کوئی خیال کیجئے۔"

مگر کمرے کی محدود فضا اس کی بھاری آواز کے سحر سے مہکنے لگی۔

اس کے سائے میں میرے خواب دہک اٹھتے ہیں
میرے چہرے پہ چمکتا ہوا آنچل کر دو

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

مجھ پہ چھا جاؤ کسی آگ کی صورت جاناں
اور میری ذات کو سوکھا ہوا جنگل کر دو
اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو

❋●❋

اسی دن سحری کی تیاری کے لئے وہ کچن میں پہنچی تو حیرت زدہ رہ گئی۔ بھابی زور و شور سے انڈے پراٹھے تلنے میں مصروف تھیں۔

"بھابی جان!" سعدیہ ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

"کیوں...... کیا ہوا؟" انہوں نے پاس آ کر اس کی پیشانی چوم لی۔ پیار بھرے تبسم سے بولیں۔ "رات ہی تو تمہارے میاں جی آئے ہیں۔ میں نے سوچا آج تمہاری چھٹی کر دیں۔"

"سعدیہ...... سعدیہ!" برآمدے سے نازش نے آواز لگائی۔ "دوڑ کر فاخر بھائی کو بلا لو۔ ان کا فون ہے۔"

فاخر فوراً ہی آ گیا۔ کوئی غیر معمولی فون تھا جسے ریسیور کر کے وہ سیدھا کچن میں آیا اور سعدیہ کو مخاطب کر کے بولا۔

"ابا میاں تھے۔ مجھے فوراً گھر طلب کیا گیا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ جانا تو پڑے گا۔"

پھر بھابی کو دیکھ کر شرارت سے بولا۔ "رات آپ کے ہاں پہلا روزہ افطار کیا تھا۔ اب پہلی سحری بھی کھلا دیں۔ آگے اللہ حافظ!"

اس کی اس بات پر سعدیہ کا دل دھک سے ہو گیا۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فاخر کا جملہ سعدیہ کی آنکھ سے آنسو بن کر ٹپک پڑا۔ وہ جلدی سے منہ پھیر کر کچن سے نکل گئی۔

بھابی سے بات کر کے فاخر کمرے میں آیا تو وہ بیڈ کے کونے پر بیٹھی اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو گھورے جارہی تھی۔ رنگت پھیکی سی پڑ گئی تھی۔

"کیوں...... کیا ہوگیا؟" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"نہیں...... کچھ تو ہے۔" فاخر نے اصرار کیا۔

"اچھا، بھلا کیا ہوگا؟" سعدیہ نے اس سے الٹا سوال کر دیا۔

"میرا جانا فیل کر رہی ہو؟"

"کیوں؟...... میں اتنی پاگل ہوں کیا؟...... ظاہر ہے انسان اپنے سگے رشتوں کو تو چھوڑنے سے رہا۔ بس یہ خیال آ رہا ہے کہ ابھی رات تو آپ......"

فاخر نے اس کی بات کاٹ کر لگاتے ہوئے جواب دیا۔ "اعلان کر رہی تھیں کہ اب ہم اور آپ ساری افطاریاں، سحریاں مل کر کیا کریں گے۔ یہی یاد دلا رہی ہیں نا؟"

اس دفعہ سعدیہ نے جواب نہیں دیا۔ بس اس کی ہنستی ہوئی صورت دیکھ کر رہ گئی۔ فاخر نے پیار بھرے انداز سے اسے قریب کر لیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دل اس کا بھی اندر سے تڑپ اٹھا تھا ابا میاں کے اچانک بلاوے پر۔ ایک پل کے لئے بھی جی نہ چاہ رہا تھا کہ اسے چھوڑ کر جائے۔ وہ سعدیہ جس نے اس کی جدائی میں لمحہ لمحہ روحانی اذیتیں سی تھیں۔ بھائی صاحب کے ہسپتال میں رہنے کے دوران وہ ایک پہر کے لئے بھی گھر نہ آپاتا تھا۔ مگر سعدیہ بھی معمولی ترین حرف شکایت بھی زبان پر نہ لاتی تھی۔ بھائی صاحب کو ڈسچارج کروا کے وہ بہت خوش خوش رات کو گھر آیا تھا۔ اس وقت تو اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ابا میاں فوراً گھر پہنچنے کی اتنی کڑی شرط لگا دیں گے۔ سعدیہ کی ستی ہوئی صورت اور اشک آلود آنکھیں اس کے سینے میں پھانس کی طرح گڑ رہی تھیں مگر وہ مجبور تھا۔ بے حد مجبور اور لاچار۔

چند لمحے خاموشی سے بیت گئے۔ اس کا پیار بھرا لمس پاتے ہی سعدیہ کے آنسو تواتر سے بہہ نکلے۔ فاخر کا گریبان بھیگتا چلا گیا مگر اس نے اسے روکا نہ ٹوکا۔ وہ اپنی کمزوری بھی اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ اس طرح وہ مزید چھلکتی چلی جاتی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے آنسوؤں کی برسات خود بخود تھم گئی۔ فاخر نے بے حد نرمی سے اسے علیحدہ کیا، پھر اٹھ کر پانی پلایا اور آہستہ سے کہنے لگا۔

"تم نے تو بچوں کو بھی مات دے دی سعدیہ! میری شریک زندگی کو ایسا کم حوصلہ تو نہیں ہونا چاہئے۔ مانا کہ تمہاری باری مس ہو گئی...... مگر اب کیا کریں؟"

"باری مس ہو گئی؟" سعدیہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"ہاں، ہاں! آج تمہیں میکے جانا تھا نا۔" وہ بڑی سنجیدگی سے سمجھا کر بولا۔ "اب یہ مجبوری ہے کہ تمہارے بجائے مجھے اپنے "میکے" جانا پڑ رہا ہے۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"اے اللہ! تیرا شکر ہے۔" وہ اوپر دیکھ کر بڑبڑایا۔

اسی وقت نازش، چاندنی بوا سے کھانے کی ٹرے اٹھوائے ہوئے آپہنچی اور قریب پہنچ کر شرارت سے بولی۔

"سحری کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ اگر شعر و شاعری سے فرصت مل گئی ہو تو تناول فرمائیے۔"

"ارے تم نے اتنی تکلیف کی۔" دونوں شرمندہ ہو گئے۔

"مجھے تو نہیں۔ چاندنی بوا کو بے شک ہوئی۔" وہ جھٹ سے تجویز دے کر بولی۔ "اور اس کا ازالہ یوں ہو سکتا ہے کہ چاندنی بوا کے "چاند بابا" آجائیں تو آپ دونوں ان کی بیوی آؤ بھگت کیا کیجئے گا۔"

"چل ہٹ۔" چاندنی بوا نے شرما کر اسے چپت لگائی پھر میز پر کھانا لگانے لگیں۔ نازش قہقہے لگاتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

فاخر سحری اور نماز فجر کے بعد گاؤں کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔ اس دفعہ اس کے چلے جانے سے سعدیہ ایک دم ہی جیسے اندر باہر سے خالی ہو گئی۔ شدید احساس تنہائی اور کسی انجانے خدشے نے اسے سہما ڈالا تھا۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد وہ بہت دیر تک بلا مقصد کمرے میں ٹہلتی رہی۔ تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ اسے فاخر کے چلے جانے میں کچھ پوشیدہ باتیں نظر آرہی تھیں جن کا اندازہ وہ بہر حال نہیں لگا سکتی تھی۔ پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کا دماغ ایک دفعہ پھر کہیں سے کہیں اڑان بھرنے لگا۔

معلوم نہیں کیوں بلوایا ہے فاخر کو۔ اللہ خیر کرے۔ پتہ نہیں، کیوں طبیعت اتنی گھبرا رہی ہے۔ شاید میں نے غلطی کی۔ مجھے فاخر کے ساتھ ہی ان کے ہاں چلے جانا چاہئے تھا۔ کچھ دل بہلتا۔ ممکن ہے وہاں کے ماحول میں اتنی گھبراہٹ نہ ہوتی۔ ہائے اب کیا کروں۔ نیند بھی نہیں آرہی۔ کرنے کو کوئی کام بھی تو نہیں۔ لیکن...... یہ مجھے ہو کیا رہا ہے؟...... ایسی شدید بے کلی تو کبھی نہیں ہوئی!

وہ کروٹیں بدل بدل کر سوچتی رہی...... سوچتی رہی۔ بیڈ پر گویا ایک بیک کانٹوں کا بستر اگ آیا تھا۔ کمرے کی فضاؤں میں رات کی رات مہمانوں کی طرح آکر ٹھہرنے اور چلے جانے والے شخص کی خوشبو مہک رہی تھی۔ اس کی باتوں کا سحر گھلا ہوا تھا۔ لہجے کا جادو بول رہا تھا۔ اس کے دھیمے سُروں میں گنگناتے ہوئے گیتوں کی مدھر تانیں رس برسا رہی تھیں۔ یقیناً اسی کی یاد رہ رہ کر دل میں چٹکیاں بھر رہی تھی۔

وہ خود ہی اپنے موجودہ احساسات کا تجزیہ اور پھر محاسبہ کرنے لگی۔ اس ذہنی ورزش نے واقعی اسے پُرسکون ہونے میں بہت مدد دی۔ جیسے ہی اعصاب ڈھیلے پڑے، وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اب خوابوں کی نقرئی پگڈنڈیاں تھیں اور فاخر۔ جس کا ہاتھ تھامے وہ دلی خوشیوں اور سچی مسرتوں کے ہنڈولوں میں جھولتی اس کے پیار کی پائل چھنکاتی کہیں سے کہیں جا نکلی۔ جہاں ابا میاں کے بلاوے تھے، نہ کسی دوسرے کی فکر اور نہ ہی اندیشۂ فردا۔ زمین آسمان لحن کے رسیلے گیت گا رہے تھے اور وہ اپنے آپ کو خوش قسمت ترین ہستی سمجھ رہی تھی جس کا چاہنے والا اس کے پاس تھا۔ کبھی نہ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بچھڑنے کے لئے۔

***

ابا میاں، شاکر کو لے کر ہسپتال سے حویلی کیا پہنچے تھے، گویا خوشیوں بھرا سندیسہ اتر آیا تھا آسمانوں سے۔ ایک رنگ بھری مستی اور طمانیت سے بھرپور لہر تھی جس نے ہر چھوٹے بڑے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ حالانکہ ابا میاں کی جیپ بلا پیشگی اطلاع کے پہنچی تھی، تاہم سرور باجی اور چچی جان نے ماماؤں کو دوڑا دوڑا کر اپنی من مانی کر لی تھی۔ شاکر پر سے تیل ماش بھی وارے گئے اور ان کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے سیاہ مرغا بھی دہلیز پر ذبح کروا دیا گیا تھا۔ اور جب وہ تسلی سے زمانی بیگم کے پاس بیٹھ چکے تو سب نے حسب استطاعت وار پھیر کے پیسے بھی ان پر سے اتارے۔ ابا میاں تو تیوری پر بل ڈالے اندر چلے گئے مگر دلاور حسین صاحب تخت پہ شغل لگا کر عورتوں کی کارگزاریاں ملاحظہ کر رہے تھے۔ یہ تمام سرگرمیاں تمام ہوئیں تو شاکر کے حالات سننے پوچھنے میں روزہ افطار ہو گیا۔

رات میں جب سب اپنی اپنی طرف سونے کے لئے جا چکے تو ابا میاں اور دلاور صاحب دانستہ مردانے میں آ گئے۔ بے شمار باتیں تھیں کرنے کو جو دونوں بھائیوں کے دلوں میں چھپ رہی تھیں مگر موقع نہ ملنے کی وجہ سے کہی نہ جا سکی تھیں۔ چائے کی جاب اڑا لی پیالیاں وصول کرنے کے بعد ابا میاں نے ملازم کو چلے جانے کا اشارہ کیا۔ جب ان دونوں کے درمیان فقط حقہ رہ گیا تو انہوں نے سکون کا گہرا سانس لیا اور ہلکے پھلکے ہو کر بڑبڑائے۔

"اتنے دنوں میں ہم گھن چکر بن کر رہ گئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے تمام معاملات بہ خوبی نمٹ گئے۔ آج آزادی کا احساس ہو رہا ہے۔"

"بہت خوب!" دلاور حسین دھیمے سروں میں ہنس دیے۔ "گویا آج تمہیں آزادی کا احساس ہو رہا ہے نا۔"

"دراں چہ شک؟" ابا میاں نے چائے کی چسکی لگا کر شرارت سے جواب دیا۔ دلاور حسین نے ان کے آسودہ چہرے کو گہری نظر سے دیکھا پھر جلدی جلدی حقے کے کش لگانے لگے۔ چند لمحے گہری خاموشی چھائی رہی۔ بس حقے کی "گڑگڑ" گونج رہی تھی۔ اندر سے ان کا دل ہرگز نہیں چاہ رہا تھا کہ چھوٹے بھائی کے صبر و قرار کو کسی آزمائش سے دوچار کریں مگر اس وقت مجبوری تھی۔ وہ خود بھی زیادہ دن یہاں رک نہ سکتے تھے۔ دوسرے گھر کی خواتین نے مل جل کر ان کا ناک میں دم کر ڈالا تھا۔ اس دن سے آج تک وہ معلوم نہیں کس کس حیلے بہانے وقت کاٹ رہے تھے، ٹال رہے تھے۔ مگر اس مسئلے پر پورا گھر متحد ہو چکا تھا۔ خود ان کی بیٹی شگفتہ کی فرمائش بھی یہی تھی کہ اب شگوفہ کو بیاہ کر اس گھر میں آ جانا چاہئے۔ چاہت اور ارمانوں کے وہ بے شمار خواب سجائے بیٹھی تھی۔

ابا میاں اور شاکر کے ساتھ فاخر کو نہ دیکھ کر زمانی بیگم کو سخت گراں گزرا تھا۔ انہوں نے شام سے اب تک کئی مرتبہ شکوہ کیا تھا جسے دلاور حسین نے حکمت عملی سے ہنس کر ٹالا تھا مگر اندر سے خوب جانتے تھے کہ فاخر کی شادی کے لئے کیا جانے والا اتحاد اب ٹالے نہ ٹلے گا۔ سرور باجی نے تو صاف مطالبہ کر دیا تھا کہ فوراً سے پیشتر فاخر کو حاضر کر کے شادی کی رضامندی لی جائے تاکہ زمانی بیگم کا ملال کم ہو۔

دلاور حسین سر سے پاؤں تک سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بالآخر انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پرشفقت لہجے میں گویا ہوئے۔

"اچھا برا ہر وقت انسان پر ہی آیا کرتا ہے۔ جیتی جاگتی زندگی میں سب کچھ ممکن ہوتا ہے۔ بس دعا یہ ہونی چاہئے کہ ہر طرح کی پریشانی آئے مگر ٹل جانے والی ہو۔ خیر و عافیت برقرار رہے۔ اللہ رب العزت کا احسان ہے کہ اس نے شاکر میاں کی جان بخشی اور تمہاری کوششیں بار آور ہوئیں۔ اب آگے کی فکر کرو۔ تمہارے گھر سے فاخر میاں کا مسئلہ نہایت شدت کے ساتھ اٹھایا جا رہا ہے۔ ہماری تو سوچ سوچ کر دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں کہ اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟"

ابا میاں نے چونک کر انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا اور انہوں نے مکمل وضاحت کر دی۔

"ارے بھائی! وہ سرور اور چچی جان بہاولپور جانے کو تیار بیٹھی ہیں شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے۔ ہماری بڑی درگت بن رہی ہے۔ کیونکہ شامت اعمال ہم لڑکی کے والد بزرگوار ہیں۔ نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن۔ اوپر اوپر سے ہاں کر کر کے سب کو دلاسے دے رہے ہیں، اندر سے لرزہ براندام ہیں۔ تمہارے انتظار میں نگاہیں دروازے کی طرف گاڑے بیٹھے تھے کہ تم آؤ تو یہ بلا ٹلے۔"

ابا میاں نے دیر سے رکی ہوئی سانس بحال کی اور بگڑ کر بولے۔ "ہم خوب جانتے ہیں در پردہ یہ کارروائی کس کی ہے؟"

"کیا مطلب؟" دلاور حسین نے تعجب سے دریافت کیا۔

انہوں نے اسی لہجے میں تیوریوں پر بل ڈال کر جواب دیا۔ "یہ جو آپ بتا رہے ہیں کہ سرور باجی اور چچی جان تاریخ کے لئے آپ سے اصرار کر رہی ہیں تو ان کو کس نے آپ کے پیچھے لگایا ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ شروع سے ہی جو ہم نے فاخر کو اس کی ننھیال کی وجہ سے "ان" سے دور رکھا ہے اور حصول علم کی غرض سے وہ ہاسٹلوں میں رہا ہے، اس کے لئے وہ خار رکھتی ہیں۔ "وہ" بچے سے، بلکہ سراسر مورد الزام ٹھہراتی ہیں ہمیں، ہم نے ان کے صاحبزادے کو ان سے دور دور رکھا۔ ان کی ممتا کے گلے پر چھری رکھ دی۔ اب وہ شادی کے سوال کو ٹال رہا ہے تو اس کے بھی مجرم ہم ہیں۔ "وہ" برملا فرماتی ہیں کہ صاحبزادے کو آزاد خیال اور بے حجاب کرنے میں ہم ہی ملوث ہیں لہٰذا اب اتفاق سے آپ آ گئے ہیں تو وہ سرور باجی اور چچی جان کو آپ کے پیچھے لگا کر اپنے تئیں نیا تماشا لگا رہی ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ فاخر حسب عادت آپ کے سامنے بھی ٹال مٹول سے کام لے گا اور "ان" کو ہمیں مطعون کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

دلاور حسین ہنس پڑے۔ "کمال ہے کیا عورتوں کی طرح "وہ وہ" اور "ان، ان" لگا رکھی ہے؟ حد کر دی تم نے۔ یعنی یہ زمانی بیگم کے لئے گوہر افشانی ہو رہی ہے۔ ہم کو معلوم نہیں کون درمیان میں تیسرا آ گیا۔ لاحول ولا قوۃ!"

"کمال کرتے ہیں بھیا! آپ بھی۔" ابا میاں مزید چڑ گئے، بگڑ گئے۔ "آپ نے زندگی میں کبھی "ان" کو ہم سے مطمئن پایا؟"

انہوں نے برجستہ جواب دیا۔ "تم نے کبھی ان کو مطمئن کیا؟"

ایک لمحے کے لئے ابا میاں چپ ہو گئے مگر فوراً ہی بگڑ کر جواب دیا۔ "یہ کیا فرمایا آپ نے؟ سراسر زیادتی پر وہ خود ہیں۔ ہم نے آج تک کبھی ان کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ تمام تر سیاہ و سپید کی مالک ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں گھر میں کیسے کیسے نامعقول اور واہیات رسم و رواج رائج ہیں۔ ان کے ہاں ہر اصول خلاف شرع ہے لیکن ہم خاموش رہتے ہیں۔ ہم نے "ان" کو اپنا نام دیا۔ وہ ہماری اولاد کی ماں ہیں۔ اب بھی غیر مطمئن ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"چلو چھوڑو اس تذکرے کو۔" دلاور حسین نے بات ٹالی۔ "تم کسی طرح فاخر کو ترو دو کر کے ہی نہ جاؤ۔ عورتوں کے قاعدے قانون وہ جانیں...... اس وقت تو غور و فکر اس مسئلے پر کرو کہ اب کیا کرنا چاہئے۔"

ابا میاں نے بے پروائی سے کہا۔ "آپ اس سلسلے میں فکرمند نہ ہوں۔ ہم چچی جان اور سرور باجی کو با آسانی سمجھا لیں گے۔ وہ یقیناً خاموشی اختیار کر لیں گی۔ ہم نے آپ کو بتایا ہے نا، اس سازش کی تمام جڑ "وہ" ہیں۔"

"نادانی کی باتیں مت کرو یاور!" دلاور حسین نے قدرے لہجہ بدل کر کہا۔ "تمہارے سازش کہہ دینے سے سازش ہو نہیں گی۔ بات کو سمجھنے بلکہ سلجھانے کی کوشش کرو۔ اگر وقتی طور سے تم گھر والوں کا مطالبہ دبا بھی دو تو ہم نے یہاں رہ کر اندازہ کیا ہے کہ یہ مسئلہ اب زیادہ عرصہ تک مسئلہ نہیں رہنے دیا جا سکتا۔ اور یہ مثل تو مشہور ہے کہ عورت جس کام کے پیچھے لگ جائے، وہ کر کے چھوڑتی ہے۔"

اپنی بات مکمل کر کے وہ حسب عادت ہنسے مگر چھوٹے بھائی کو ان کی ہنسی بہادلی سی معلوم ہوئی۔ انہوں نے اپنی الجھنوں سے نکل کر بہ نظر غور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا تو دھک سے رہ گئے۔ دفعتاً سینے کے مقام پر دھڑکتے دل میں ایک ساتھ سینکڑوں تیر پیوست ہو گئے۔ احساس جرم سے وہ پانی پانی ہو گئے۔

"اُف! ہم کس قدر خود غرض ہو گئے ہیں!" انہوں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ دلاور حسین صاحب صرف ان کے بھائی ہی نہ تھے بلکہ ایک بیٹی کے باپ بھی تھے۔ وہ بیٹی جو خود ان کے بیٹے کے نام سے منسوب رہی تھی ہمیشہ۔ پشیمانی کا دھواں ان کے اپنے وجود کو داغ دار کرنے لگا۔ وہ ایک مضطرب اور بے قرار روح کی طرح لہرا کر اٹھے اور بھائی کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئے۔ آنکھیں خون رنگ ہو گئیں۔

"بھیا! ہمیں معاف کر دیجئے...... حالانکہ ہماری خود غرضی ہرگز قابل معافی نہیں ہے۔ مگر ہم مجبور ہو گئے۔ بہت بے بس۔ اپنی اولاد کے ہاتھوں۔ کاش اپنا دل چیر کر آپ کو دکھا سکتے۔ فاخر کا دل توڑنا ہمیں منظور نہ ہوا۔ اس کی اتری ہوئی صورت اور مسکراتی ہوئی سخت ہمارے جگر کا ناسور بن گئی تھی۔ اس کے ارمانوں کا خون کہاں تک کرتے؟...... ہم نے اپنے گھر میں، اپنے دامن میں آگ لگا کر اس کی دلی تمنا پوری کر دی۔ آپ کے، اپنی عزیز بھتیجی کے گناہگار ہیں ہم۔ فاخر نے ہم سے کوئی مطالبہ یا اصرار نہیں کیا تھا۔ بس اس کا سلگنا دیکھا نہ جا سکا ہم سے۔"

ابا میاں کا دلگداز لہجہ اور بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھ کر دلاور حسین تڑپ اٹھے۔ ہمیشہ کے کم گو اور دبدبے والے بھائی کی شخصیت کا قطعی نیا انداز ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے انتہائی شفقت سے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھر لئے اور محبت آمیز خفگی سے بولے۔

"بالکل ہی عقل جاتی رہی ہے کیا؟...... کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ خبردار جو آئندہ ایسا ہذیان ہمارے سامنے بکا۔ ہم تمہارے دل کا احوال تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ اور فاخر کیا ہمیں کم عزیز ہے؟ ایسے واقعات نرالے نہیں ہیں۔ یہ قدرت کی طرف سے انسانی تعلقات کی آزمائش ہوتے ہیں۔ محبت کسی کی میراث ہے نہ زر خرید۔ انسانی جذبوں کو سمجھ لینا نہایت ہی نازک معاملہ ہوتا ہے۔ فاخر کے لئے ایک باپ کی حیثیت سے جو کچھ تم نے کیا، ہم بھی اس سے کم نہ کرتے۔ ہمیں ملال نہیں، فخر ہے تمہارے اقدام پر۔ اس مسئلے پر ہماری تمہاری ایک سیر حاصل گفتگو اس نکاح سے قبل بہاولپور میں

ہو بھی چکی ہے۔ جو کٹھن یا مشکل لمحہ تھا وہ آ کر جا چکا۔ اس کا افسوس بے کار ہے بلکہ یہ امر قابل اطمینان ہے بجائے اس کے کہ بعد میں کوئی پریشان کن صورت حال سامنے آتی۔ خدانخواستہ اس وقت ہماری دیگر عزیز داری بھی متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ ہر کام میں اوپر والے کی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے جسے وقتی طور سے انسانی عقل اور شعور سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔"

وہ مسلسل بھائی کا سر تھپتھپا رہے تھے۔ ان کی باتوں سے ابا میاں کو ڈھارس سی ہوئی اور دل کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس ہوا۔

دلاور حسین دوبارہ گویا ہوئے۔ "تم تو اس وقت بہت ہی پراگندہ خیال معلوم ہو رہے ہو اس لئے بغیر کسی بحث و مباحثے کے ہم خود ہی تمہیں مشورہ دیئے دیتے ہیں کہ تم کسی بھی صورت فوراً سے پیشتر فاخر کو گھر پر بلوا لو تاکہ گھر میں سب کی تسلی تشفی ہو جائے۔ سرور باجی جب پوچھیں گی شادی کے لئے تو ظاہر ہے وہ منع ہی کرے گا۔ اس وقت تم حکمت عملی سے کام لینا اور تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد سب کے سامنے اسے سال دو سال کی چھوٹ دے دینا۔ کچھ ٹال مٹول سے کام ہم بھی لیں گے۔ پھر اس مدت کے دوران ممکن ہے قدرت کی طرف سے کوئی انتظام ہو جائے۔"

ابا میاں نے تشکر آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھا اور احسان مندی سے بولے۔ "آپ کی باتیں زخموں پر پھاہے کی طرح ہیں۔ آج تو مجھے یوں لگ رہا ہے کہ آپ نے اپنے بھائی کی کوتاہی کو معاف کر دیا ہے۔"

"پھر کی بات۔" وہ مشفقانہ انداز میں بولے۔ "ہمارے سامنے کبھی آئندہ احسان و ممنون جیسی باتیں مت کرنا۔ خدا بہت ہی مسبب الاسباب ہے۔ ضرور شگفتہ کے لئے مناسب سبب پیدا کرے گا۔"

"آمین۔" ابا میاں نے بے اختیار کہا۔ "آپ کی تجویز موجودہ حالات میں نہایت معقول ہے۔ ویسے بھی پہلے [illegible] کا خیال پاکستان کے شمالی علاقہ جات وغیرہ کا ہے۔ بہر حال، جہاں بھی جائیں، وہ چند ماہ کے لئے جائیں گے۔ ہم شہاب الدین صاحب [illegible] کی طویل غیر حاضری بہتر تو ہو گی تاہم یونیورسٹی [illegible] کا زبردست اقدام اٹھایا ہے لیکن خدا [illegible] کہ آئندہ کیا ہو گا؟"

"جو کچھ ہو گا، بھلا ہو گا۔" دلاور حسین نے تسلی آمیز مسکراہٹ سے انہیں دلاسا دیا اور حقے کی نے اپنی طرف کر کے گڑگڑانے لگے۔

※●※

معطر کی ایک چیخ زمین پر تھی تو دوسری آسمان پر۔ اماں بی کلیجہ پکڑے پکڑے منے کے آس پاس گھوم رہی تھیں۔ نازیہ بھی بیٹھی ہوئی تھر تھر کانپے جا رہی تھی۔ کسی کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ فقط ایک کرائے دارنی تھی جس کے حواس بحال تھے اور وہ اپنی سی تدبیر کرنے میں لگی ہوئی تھی مگر کوئی کوشش بار آور ہوتی نظر نہ آ رہی تھی۔ منا قطعی ساکت و صامت پڑا تھا۔ گویا سن رہا تھا نہ بول رہا تھا۔

کرائے دارنی نے اس کے سینے کے مقام پر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ دل دور کہیں دھڑک تو رہا تھا لیکن سہم سہم کر۔ سوچ سوچ کر۔ دفعتاً اماں بی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اے بی! خدا کے واسطے تم باہر سے کسی کو بلواؤ۔ معلوم نہیں فرحت کہاں گیا ہے۔" پھر انہوں نے دہشت زدہ نازیہ سے پوچھا۔ "دلہن! فرحت کچھ بتا کر گئے ہیں؟"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"صبح یونیورسٹی جانے کا کہہ رہے تھے۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"ابھی آتو خیر کرتا۔" اماں بی ہاتھ ملتے ہوئے ڈیوڑھی کی طرف چلی گئیں۔ کرائے داری نے نازیہ کو اشارے سے بلایا اور دھیرے سے بولی۔

"منّو کا شپ بے ہوش پڑا ہے...... تم ذرا معطر کو سنبھالو، ہم کسی لڑکے کے ہاتھ سے فرحت کو ڈھونڈوائیں۔"

نازیہ کا دم بالکل فنا ہو گیا۔ نہ تو اس سے معطر کا رونا دیکھا جا رہا تھا نہ ہی اس کے دہائیاں دیتے ہوئے بچے سنبھل رہے تھے۔ بے ہوش پڑے منّے کو دیکھ دیکھ کر الگ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ تاہم اس نے کرائے داری کے توجہ دلانے پر پھر ہمت باندھی اور سارے حوصلے یکجا کر کے معطر کے قریب آئی اور اس کا ہاتھ تھام کر نہایت دلسوزی سے کہنے لگی۔

"معطر باجی! تسلی رکھیے۔ ان شاء اللہ منّے کی طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اگر آپ اسی طرح رو رو کر ہلکان ہوتی رہیں تو خود بیمار ہو جائیں گی۔ دیکھیے تو، آپ کو روتا پا کر سب بچے کس قدر بلک رہے ہیں۔ خالہ جان بھی بہت پریشان ہیں۔"

معطر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور چیخ کر بولی۔ "تم کیا جانو میرے دل کا درد۔ مت روکو مجھے رونے سے۔ میرا بچہ بے سدھ پڑا ہوا ہے۔ میرے دل میں آگ سی لگی ہوئی ہے۔ میں حوصلہ کہاں سے لاؤں؟ میرا جگر کٹ رہا ہے اور تم تسلی رکھنے کو کہتی ہو۔"

نازیہ سن سی ہو گئی مگر ارادے بغیر [illegible] پریشان ہو جائے گی۔" "آپ کی تڑپ دیکھ کر خالہ جان زیادہ ہول رہی ہیں۔ اگر آپ حوصلے سے کام نہیں لیں گی تو ان کو نہ کچھ ہو جائے۔ خدا کے لئے سمجھداری سے کام لیجئے اس وقت۔"

"تم خاموش ہو جاؤ۔" معطر حلق پھاڑ کر چلائی۔ پورے برآمدے میں اس کی آواز گونج گئی۔ بچے رونا دھونا چھوڑ کر ماں کا تپا ہوا چہرہ دیکھنے لگے اور دہشت زدہ ہو گئے۔ اس کے دھاڑنے کی آواز سن کر اماں بی بھاگی آئیں اور پریشان ہو کر پوچھنے لگیں۔

"کیا ہو گیا؟...... کیا کہہ دیا نازیہ نے؟"

"کچھ نہیں...... کچھ نہیں ہوا اماں بی!" نازیہ نے جلدی سے جواب دیا اور جھک کر منّے کے قریب بیٹھ گئی اور پنکھا اسے ہوا جھلنے لگی۔ اپنے تاثرات صاف چھپا گئی تھی۔ اک آہ بھر کر اماں بی بھی اس کے پاس بیٹھ گئیں اور غمناک نگاہوں سے بے حس و حرکت پڑے منّے کو تکنے لگیں۔

پل بھر میں کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔

فرحت صبح سے ہی اپنے کسی سرٹیفکیٹ کے چکر میں یونیورسٹی جا چکا تھا۔ سب بچوں کو ناشتہ کروا دینے کے بعد نازیہ باورچی خانے میں مصروف تھی۔ معطر نے منّے کو دودھ پلا کر اسے بہن بھائیوں میں کھیلنے چھوڑ دیا تھا خود میلے کپڑے سمیٹ کر ہینڈ پمپ کے نیچے دھونے بیٹھ گئی۔ کئی روز سے سستی کرتے کرتے آج بچوں کے کافی کپڑے جمع ہو گئے تھے۔

اماں کو شدید زکام ہو گیا تھا۔ وہ ذرا کی ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ رہیں۔ برآمدے کے آخری کونے میں بچے کھیل رہے تھے۔ "آنے کی بوری آئی، آنے کی بوری آئی" کہتے کہتے بڑے والے نے منّے کو پیٹھ پر لاد کر صحن کے دو تین چکر لگائے، پھر پلنگ پر لٹا کر گدگدانے لگا۔ منّا کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

تھوڑی دیر میں وہ سب مل کر "آپا بوا" کھیلنے لگے اور کھیلتے کھیلتے آنگن کے دوسرے حصے میں نکل گئے۔ منّا پلنگ پر اکیلا بیٹھا رہ گیا۔

اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اکیلے رہ جانے سے اکتا کر اس نے پلنگ سے اترنے کی کوشش کی یا پھر کہیں نیند کی جھونک میں پٹی سے کھسکتا ہوا نیچے آ گرا یا یونہی اترنے کے شوق میں چھلانگ لگا ڈالی ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا، صورت حال یہ دیکھنے میں آئی کہ وہ سجدے کی سی حالت میں پکے فرش پر پڑا ہوا ملا۔ دیکھنے والی بھی معطر تھی۔ چنانچہ گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔

نچڑے ہوئے خاصے کپڑے اکٹھے ہو گئے تو پانی میں بھر کر وہ الگنی پر ڈالنے کے لئے آئی۔ دور سے دیکھنے پر تو وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔ قریب پہنچ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ یہ تو اس کا منّا تھا۔ گویا نماز پڑھ رہا ہو! بے تحاشا چیخیں مارتے ہوئے اس نے سجدہ ریز بیٹے کو سیدھا کیا مگر وہ ہوش میں ہوتا تو ماں کو دیکھ کر کھلکھلاتا، کلکاریاں مارتا۔ وہ تو مٹی کی مورت بنا ہوا تھا۔ چپ چاپ، خاموش، مثل تصویر۔ ہنستا بولتا چلبل دم سادھے ساکت پڑا تھا۔

معطر کی ایک چیخ زمین پر تھی تو دوسری آسمان پر۔

چشم زدن میں پورا گھر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اماں بی خود سے پہلے سنبھالتی دوڑیں۔ منّے کو الٹ پلٹ کر ہلا جلا کر دیکھا۔ نہ کہیں سے خون بہا تھا نہ بظاہر کسی طرح کی ٹوٹ پھوٹ نظر آ رہی تھی۔ کرائے داری نے جسم کے ہر حصے پر ٹٹول کر دیکھا کہیں سے سوجا تھا نہ ورم آلود ہوا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، معطر کا دم خشک ہو رہا تھا۔ اس کی جان پر بن رہی تھی۔ مارے ہول کے اماں بی الگ آدھی ہو رہی تھیں۔ وہ [illegible] بچوں کو پالے تھے مگر ایسی افسوس ناک صورت حال سے کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ بچپن میں بچوں کو بڑی بڑی چوٹیں لگ جایا کرتی ہیں مگر اللہ رکھے لوٹ پوٹ کر اٹھ جاتے ہیں۔

کرائے داری کو گئے کافی دیر ہو گئی۔ بالآخر اماں بی ایک عزم کے ساتھ اٹھیں۔ دل میں بھی ارادہ تھا کہ [illegible]

عین اسی لمحے ڈیوڑھی [illegible] فرحت [illegible] گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے تعاقب میں کرائے داری کسی ڈاکٹر صاحب کو لئے چلی آ رہی تھی۔ اندر پہنچ کر فرحت کو اصل صورت حال کا علم ہوا۔

پھر سب کچھ جلدی جلدی وقوع پذیر ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے منّے کو دیکھتے ہی کیس چھوڑ دیا اور کسی دماغ کے ڈاکٹر کو دکھانے کی ہدایت کر کے چلے گئے۔

فرحت نے اگلا لمحہ ضائع کئے بغیر منّے کو گود میں بھر لیا۔ جب تک باہر نکل کر اس نے سواری روکی، اماں بی اور کرائے داری بھی ہانپتی کانپتی اس کے پیچھے پہنچیں۔ ان لوگوں کے سوار ہوتے ہوتے معطر بھی برقع اوڑھ کر روتی بلکتی ان کے تعاقب میں دوڑی۔

"اماں بی! میرا منّا...... میرا منّا......" سسکیوں، ہچکیوں میں اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ کرائے داری نے سہارا دے کر اسے بھی سوار کرا لیا اور اپنے قریب بٹھا لیا۔ منّے کو اس وقت تک کوئی ہوش نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے جس ہسپتال کا پتہ دیا تھا، قریب ہی واقع تھا۔ اتفاق سے دماغ کے ڈاکٹر صاحب اس وقت فارغ ہی مل گئے۔ کاؤنٹر پر فیس جمع کرانے کے بعد فرحت نے ان کے کمرے کا رخ

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

کیا۔ وہ جس طرف مڑ رہا تھا، تینوں خواتین اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ ایک نازک صورتِ حال ہونے کے باوجود فرحت کو کوفت ہو رہی تھی۔ جس وقت ڈاکٹر کے اشارے پر اس نے منے کو ایک اسٹریچر پر لٹایا، اس لمحے بھی وہ تینوں قریب کھڑی تھیں اور بڑی بڑی نگاہوں سے ساری کارروائی دیکھے جا رہی تھیں۔ معطر کے منہ سے اب تک ہلکی ہلکی سسکیاں نکلے جا رہی تھیں۔ بری طرح دھڑکتے پریشان دل میں سو طرح کے وہم آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار ٹوٹنے میں نہ آ رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے ساکت پڑے منے کی بند آنکھوں کے پپوٹے پلٹ پلٹ کر دیکھے، پھر نبض دیکھنے لگے۔ اس دوران وہ برابر ضروری سوالات کیے جا رہے تھے۔ چونکہ فرحت پوری طرح آگاہ نہ تھا اس لیے وہ ہر سوال پر چپ رہ جاتا لہٰذا جواب ان تینوں خواتین میں سے کسی نہ کسی طرف سے آ جاتا۔ یوں چند لمحوں میں منے صاحب کی کیس ہسٹری تیار ہو چکی تھی۔

اس اثناء میں ڈاکٹر صاحب نے منے کو بالکل سیدھا کر کے لٹا دیا پھر اس کے سر کی طرف آ گئے۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا سر تھاما، اس طرح کہ ان کی ہتھیلیاں منے کے کانوں اور کنپٹیوں پر تھیں۔ پلک جھپکتے انہوں نے اس کے سر کو کسی خاص مہارت سے ہلکا سا جھٹکا دیا اور فوراً اسے پشت سے اٹھا کر بٹھا دیا۔

"اماں!...... ہم...... اماں!...... ہم......" منے کے حلق سے ایسی متواتر آواز برآمد ہو رہی تھی جیسے دیر سے رکا ہوا نیپ بجنے لگا ہو۔

"اللہ تیرا شکر۔" اماں بی کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ سب کے لٹکے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ غیر متوقع صورتِ حال نے معطر میں تو جیسے دوبارہ جان ڈال دی۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ لپک کر آگے بڑھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئی۔

ڈاکٹر صاحب نے منے کا دوبارہ چیک اپ شروع کیا۔ انہوں نے کئی طریقوں سے اس کے سر کے پچھلے حصے کا معائنہ کیا۔ اس دوران منے نے خوب رونا دھونا مچا دیا تھا اور ہمک ہمک کر ماں کے پاس جانے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر فرحت نے بری طرح مچلتے ہوئے منے کو گود میں بھر کر وزن کرنے والی مشین پر بٹھا دیا۔ وزن نوٹ کر کے اس نے مچلتے ہوئے منے کو معطر کے سپرد کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے روم میں واپس چلے گئے تھے۔ فرحت کو بلوا کر انہوں نے منے کی چوٹ سے متعلق ضروری معلومات فراہم کیں اور اپنے مشورے سے بھی نوازا۔ فرحت باہر آیا تو منے صاحب نہایت اطمینان سے اپنی "پیٹ پوجا" میں مصروف تھے۔ معطر اب خوش باش نظر آ رہی تھی۔ باقی دونوں خواتین ڈاکٹر صاحب کی قابلیت کے گیت گا رہی تھیں۔ فرحت نے والدہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"اماں! ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ 'اگلے چوبیس گھنٹے تک بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ ایک اندرونی چوٹ تھی سر کی۔ جس کے صدمے سے مریض کئی گھنٹے تک بے ہوش رہا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ہوش و حواس درست ہو جانے کے بعد کسی بھی وقت اسے قے شروع ہو جائیں۔ اس لیے دو صورتیں ہیں۔ یا تو چوبیس گھنٹے کے لیے منے کو ایڈمٹ کر دیا جائے یا اگر گھر لے جایا جائے تو قے شروع ہوتے ہی وقت ضائع کیے بغیر فوراً یہاں پہنچا دیا جائے۔"

یہ تینوں ہکا بکا ہو کر اس کی صورت تکنے لگیں۔ معطر پریشان ہو کر بولی۔

"نہیں، نہیں...... میں اپنے منے کو ہرگز داخل نہ کروں گی۔"

اماں بی اور کرائے دارنی بھی متفکر تھیں۔ فرحت نے سب کو تسلی دی۔ "یہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے۔ چلیے، اگر آپا کا دل نہیں مانتا تو گھر چلتے ہیں۔ خدانخواستہ کوئی تشویش ناک بات ہوئی تو دوبارہ چلے آئیں گے۔"

"نہیں...... ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔" دفعتاً اماں بی نے کچھ سوچتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔ "اگر ڈاکٹر صاحب کی یہی تشخیص ہے کہ اندرونی چوٹ ہے تو پھر ہم منے کو گھر لے جانے کے حق میں ہرگز نہیں ہیں۔"

"اماں!" معطر نے انہیں شاکی انداز میں دیکھا۔

"جہالت کی بات مت کرو۔" انہوں نے اسے جھڑک دیا۔ "تمہاری جلد بازی میں ہم بنا بنایا کام بگاڑ نہیں سکتے۔ ہم فرحت کے ساتھ منے کو لے کر رک جاتے ہیں، تم دونوں گھر جاؤ۔"

معطر پھر تڑپی۔ "یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟...... منا میرے بغیر کیسے رہے گا؟"

"پھر بے تکی کیوں ہانکے جا رہی ہو؟" اماں بی نے خفا ہو کر اسے دوبارہ ڈانٹا۔ پھر فرحت کو مخاطب کیا۔ "میاں! انہیں داخل کرا کے تم انہیں لے کر گھر پہنچو۔" انہوں نے کرائے دارنی کی طرف اشارہ کیا۔ "دلہن سے کھانا پکوا کر منے کے دو تین جوڑے بھی لے آنا۔ رات بھر کی بات ہے۔ اللہ ساتھ خیریت کے گزارے۔ بچوں اور دلہن کے ساتھ رات کو پڑوسن ٹھہر جائیں گی۔ ہم نے انہیں بھی کہہ دیا ہے۔"

اس کے بعد کسی کو "چوں" کرنے کی بھی مجال نہ ہوئی۔ بات نے طول کھینچا۔ رات آٹھ بجے کے قریب فرحت کی واپسی ہوئی۔ وہ ساتھ فرمانبرداری کے ساتھ اماں بی کی حسب ہدایت سارے کام کیے تھے۔

دلہن نے صرف یہ کہ گرم گرم کھانا تیار کر کے بھیجا تھا بلکہ ایک تھرماس چائے، دو کپ، دو پلیٹیں اور ایک گلاس، اور منے کے ساتھ معطر کے لیے بھی استری شدہ تین جوڑے بھی ٹوکری میں رکھ دیے تھے اور کہلا بھیجا تھا کہ "باقی بچوں کی طرف سے معطر آپا بے فکر رہیں۔ میں سنبھالے بیٹھی ہوں۔"

اماں بی نے اطمینان کا گہرا سانس لے کر اپنے حسنِ انتخاب کو داد دیتے ہوئے خدائے بزرگ و برتر کا شکر ادا کیا تھا۔

✖●✖

"خیر، پہلی پہلی عید ہے۔" دادی صغریٰ نے سلسلۂ کلام کو مختصر کیا۔ "اللہ تمہارا بھلا کرے، دو دو بیاہی بیٹیوں کا معاملہ ہے۔ تم یوں کرو، ایک ایک سیر منگوا لو سویاں۔ ایک ایک سیر شکر بلکہ آدھا سیر شکر بہتر رہے گی۔ باقی لڑکیوں کے جوڑے کے ساتھ مہندی اور چوڑیاں تو ضرور ہی جائیں گی۔ بس اسی کو کہتے ہیں عیدی۔ اللہ لڑکیوں بالیوں کے میکے سدا آباد رکھے۔ ماں باپ کے دم قدم سے عید تہوار بھی کرنے پڑتے ہیں ہمیشہ۔ باقی رہی دامادوں کی عیدی تو جب عید ملنے آئیں تو جو توفیق ہو، سلام کے بعد ہاتھ پر رکھ دینا۔ اللہ اللہ اور خیر صلا!"

سعید احمد جو باقاعدہ کاغذ قلم سنبھال کر بیٹھے تھے، سامان لکھنے کے لیے حیران ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگے۔ ان کی بیوی مسکرانے لگیں۔ بتانے کو تو وہ خود بھی بتا دیتیں عیدی کی تفصیل، آخر کو عورت ہی

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY
Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

تھیں وہ بھی۔ مگر میاں کو کمی تھی اماں سے معلومات لینے کی۔ آج روزے کے بعد انہوں نے بطور خاص ان کو گھر سے بلوایا تھا اور مسئلہ ان کے حضور پیش کر دیا تھا۔

بیوی کی مسکراہٹ انہوں نے بھی محسوس کی تھی اس لئے کھسیا گئے۔ پوچھا۔

"اماں! اسے عیدی کہتے ہیں؟"

"ہاں تو اور کیا۔" انہوں نے تکیہ سر کے نیچے کھسکا کر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔ پھر ان کی صورت غور سے دیکھ کر گویا ہوئیں۔ "ویسے جوڑے کا دینا کوئی ضروری بھی نہیں۔ سویاں، شکر اور مہندی چوڑی ہی بہت ہے۔ وہی بچی کا تو عمر بھر کا دین ہوتا ہے۔ ہر موقع پر دینا ہوتا ہے۔"

"اُف واہ......" سعید احمد کوفت کھا کر رہ گئے۔ تاہم تحمل سے بولے۔ "میں تو پوچھ رہا ہوں کہ بس اتنا سا سامان؟"

"ہائے میاں...... یہ اتنا سا ہے؟" وہ تعجب کے مارے اٹھ بیٹھیں۔ "میاں! لینے جاؤ گے بازار تب پتہ چلے گا۔ معلوم بھی ہے شکر کا بھاؤ؟ اور کپڑے کے تو دو جوڑے ہی ہو گئے۔ میں تو کبھی تمہیں بھی مشکل لگ رہا ہے اس لئے کہا کہ جوڑے رہنے دو۔ پھر کسی موقع پر دے دینا۔ ابھی تو شادیوں سے فارغ ہو کر بیٹھے ہو۔ مگر تم نے تو اناپ شناپ ... بیچاری ان کی تنگ بندی ہو گی۔"

اچانک انہوں نے روئے سخن ان کی بیوی کی طرف پھیر دیا اور انہیں مشکوک انداز سے گھورتے ہوئے اضافہ کیا۔ "صاف منہ پر ... بیویاں ہوتی ہی عاقبت نااندیش ہیں۔ ان کی نظر ہمیشہ میاں غریب کی جیب پر ہوتی ہے ... انہیں کیا معلوم پیسہ کس کس طرح خون پسینہ ایک کر کے کمایا جاتا ہے۔ بس انہیں تو ..."

سعید احمد کی بیوی دوپٹے میں منہ چھپا کر ہنسنے لگیں۔ "ہائے اللہ...... اماں! میں نے کیا کر دیا؟ قسم لے لیجئے ..."

"بس بس، بہت جانتی ہوں تم بی جمالو بہوؤں کو۔" انہوں نے بگڑ کر کہا۔ "پہلے آگ لگاتی ہو، پھر پانی لینے دوڑتی ہو۔ ..."

"لیکن اماں! انہوں نے تو مجھ سے پوچھا ہی نہیں۔"

"چلو بس، رہنے دو۔" وہ بدستور اسی لہجے میں بولیں۔ "بیٹیوں کی ماں ہو۔ تمہیں تو پہلے ہی سارے انتظامات رکھنے چاہئیں۔ اب جو کچھ ہے، ہم ہی کو کرنا پڑے گا۔ ہم کس طرح اپنے بچے کو پریشان دیکھ سکتے ہیں۔ تم بس آرام سے جاؤ اور مجھے ... بتاتی چلی جاؤ۔"

سعید احمد کی بیوی نے اٹھ کر ہنستے ہوئے انہیں پانی کا گلاس لا کر دیا اور بولیں۔ "اماں! آپ تو بیکار میری طرف سے بدگمان ہو رہی ہیں۔ جوڑے تو میرے پاس اللہ کے کرم سے پہلے ہی ایک دو چھوڑ، پانچ سات رکھے ہیں۔ ہمارے دونوں سمدھیانے نے جہیز لینے سے منع کر دیا تھا لیکن اب عیدی کی تیاری تو کر رکھی ہے میں نے۔ بس آپ دیکھ کر مشورہ دے دیجئے گا۔"

دادی صغریٰ کے ساتھ ساتھ سعید احمد بھی ششدر رہ گئے۔ بیوی کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھ میں آیا تو وہ خود بھی دلی خوشی اور فخر کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مسکرانے لگے۔ خود بخود دل کو سکون کا احساس ہوا۔

دادی کا پارا بھی اترنے لگا۔ پانی پی کر مزید تقویت ہوئی۔ انہوں نے دوبارہ تکیے پر سر رکھ دیا اور اطمینان سے گویا ہوئیں۔

"ہاں، ایسی ہوتی ہے اچھی بیوی اور اچھی ماں۔ تمہاری یہ سلیقہ مندی ہی اصل میں اس گھر کا سنگھار اور سکون ہے۔ اسی لئے تمہاری بیٹیوں کے نصیب ایسے اونچے اور اچھے نکلے۔ اللہ اور اللہ کے رسول نے چاہا تو ہمیشہ اپنے گھروں میں سکھی رہیں گی۔ تمہاری تربیت بھی رائیگاں جائے گی نہ ہماری دعا۔"

سعید احمد نے انہیں دوبارہ یاد دہانی کرائی۔

"بازار سے کیا کیا سامان آئے گا، لکھوا دیں اماں! مجھے۔"

خلاف توقع اس دفعہ انہوں نے نہایت سہولت سے بتا دیا۔ "سویاں، شکر اور اس کے ساتھ تھوڑا سا میوہ بھی لے آنا۔ چھوہارے ضرور لے لینا۔ ہم ذرا گھر میں موجود چیزیں دیکھ لیں، پھر بتائیں گے۔ اللہ تمہارا بھلا کرے، آدھے سے زیادہ روزے تو گزر چکے۔ سب تیاری کر کے حمید کے ہاتھ دونوں لڑکیوں کی طرف بھجوا دینا۔ سچ ہے، اب زیادہ دن تو باقی رہے نہیں۔"

یہ گفتگو جاری رہتی کہ اسی دوران پڑوس سے ایک ملنے والی آ گئیں۔ سعید احمد اندر چلے گئے تو آنے والی نے سعید احمد کی بیوی کو مخاطب کر کے اپنا مدعا بیان کیا۔

"بھئی ہمارے ایک جاننے والے ہیں۔ انہیں کرائے کے مکان کی ضرورت ہے۔ کافی دنوں سے تلاش ہے انہیں۔ کل مجھے تمہارے گھر کا خیال آ گیا۔ وہ بے چارے بہت پریشان ہیں۔ جس گھر میں رہ رہے ہیں، مالک مکان نے ... تمہارا گھر بھی تو کرائے کے لئے خالی ہو گا آج کل۔"

"لیکن وہ تو ایک ہی کمرہ ہے۔" دادی صغریٰ نے اعتراض کیا۔ "... کس طرح گزارہ ہو گا ان کا؟...... پہلے تو ... کرتے تھے، وہ بھی کمائی کے باہر سے آتے تھے۔ اس لئے گزارہ ہو جاتا ہو گا۔"

"وہ ... ان کے بھی ... وہ میاں بیوی ہیں۔ میاں بے چارے تو بہت بیمار اور مجبور ہیں۔ بیوی سلائی کڑھائی کا کام کر لیتی ہیں۔ بہت ہنرمند اور شریف عورت ہیں۔ ... میں ان کی ضامن بننے کو تیار ہوں۔"

دادی صغریٰ نے ... اس دفعہ سعید احمد کی بیوی نے دخل دینا ضروری سمجھا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اب وہ کمرہ کرائے کے لئے ہے ہی نہیں۔"

پڑوسن لجاجت سے بولی۔ "سعید کی امی! میں تم سے کہہ رہی ہوں نا کہ تمہارا کرایہ بھی نہیں روکیں گے وہ لوگ۔ ضمانت دینے کے لئے میں بیٹھی ہوں نا۔"

"ہائے بہن! یہ بات ہرگز نہیں ہے۔" انہوں نے یقین دلایا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ وہ کمرہ حمید کے ابا نے کرائے پر اٹھانے کے لئے منع کر دیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ کرائے یا ضمانت کا کیا سوال ہے؟"

"کیوں؟" اس نے بے ساختہ دریافت کیا۔

دادی صغریٰ کو ایک دم ہی سعید احمد کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی جس میں خود انہوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں بھئی! خوب یاد آیا۔" انہوں نے دماغ پر زور دے کر کہا۔ "بات یہ ہے بہن! کہ کمرہ کرائے پر دینے میں تو کوئی منع نہیں ہے مگر تم جانو کہ اب خیر سے یہ دامادوں والی بھی ہو گئی ہیں۔ ماشاء اللہ سمدھیانوں میں سے اللہ رکھے کسی نہ کسی کا آنا جانا ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس لئے ایک فالتو کمرہ

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

گھر میں ہونا ہی چاہئے۔ منع کر دینے کا مقصد صرف یہ ہے۔ ورنہ آتا ہوا کرایہ بھلا کسے برا لگتا ہے۔ اب سمجھیں یا نہیں؟"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" آنے والی نے گہرا سانس لے کر کہا۔ وہ تھوڑی دیر باتیں کرتی رہی۔ پھر اٹھ کر چلی گئی۔

"ارے بھیا! ادے دیجئے کرائے پر کمرہ۔" دادی صغریٰ نے سعید احمد کو بلا کر کہا۔ "چار پیسوں کی آمد ہوگی۔"

"اللہ مالک ہے اماں!" وہ گھر سے باہر جاتے ہوئے بے نیازی سے بولے۔ "مہمانوں کے لئے ایک اضافی کمرے سے بڑی سہولت رہتی ہے۔ آپ کچھ خیال مت کیجئے۔"

ان کی بیوی بھی کسی کام سے ادھر ادھر ہو گئیں۔ اتنے میں حمید کمرے سے آنکھیں ملتا ہوا نکلا۔

"کہاں چل دیا اب اس وقت؟" دادی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تراویح پڑھنے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اچھا رک۔ ذرا مجھے گھر تک چھوڑ دینا۔" وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

"بہت اچھا۔" حمید نے جواب دیا۔ پھر ان کے قریب پہنچ کر نہایت سادگی سے پوچھنے لگا۔ "دادی! آپ کی کمر مل گئی؟"

"ہیں......؟" دادی نے چکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا بک رہا ہے؟"

"وہ...... اس دن آپ کہہ رہی تھیں نا کہ میری کمر غائب ہو گئی۔" اس نے وضاحت کے ساتھ یاد دہانی کرا دی۔

"ہائے میرے اللہ!" دادی اٹھتے اٹھتے رہ گئیں [illegible] اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ "ارے دیکھو، ناس پیٹا ہم سے مذاق کرتا ہے۔" انہوں نے پیر کی جوتی اتار کر اس کی طرف پھینکی۔ اور اس کے بے تحاشا شور مچا دینے سے حمید ڈر کر پیچھے ہٹا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

Free pdf Library

✻●✻

جس دن سعدیہ کے گھر سے عیدی آئی، وہ بہت اداس تھی۔ حمید واپس چلا گیا تو وہ سب سے چھپ کر روئی۔ حالانکہ اسے کیا تکلیف یا کمی تھی؟ مگر دل کے نہاں خانوں میں رہ رہ کر کسی محرومی کا احساس کھٹک رہا تھا۔ کتنے دکھ کی بات تھی کہ ان برس برس کے دنوں میں وہ اکیلی تھی۔ تنہا تھی۔ یہ ایک ایسا اذیت ناک احساس تھا جسے صحیح طور سے وہی سمجھ سکتی تھی۔

ابا میاں کے بلاوے پر فاخر ایسا گیا کہ بس جا کر ہی رہ گیا۔ اب وہ تھی اور اس کی لامتناہی سوچیں۔ ایک دن کے لئے وہ آیا ضرور تھا لیکن اسے تسلی دلاسے دے کر چلا گیا تھا۔ بلکہ سعدیہ کو تو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ بند کمرے میں ڈاکٹر منان سے کوئی خاص باتیں کر گیا تھا تاہم ڈاکٹر صاحب کے تاثرات بھی اس کے لئے بے تاثر تھے۔

سارے گھر والوں سے اور خصوصاً نازش سے سعدیہ کیسی ہی گھل مل گئی تھی لیکن فاخر کی مسلسل غیر حاضری سے وہ خود کو ادھورا سا محسوس کر رہی تھی۔ حالانکہ بھابی بہت دلجوئی کرتی تھیں۔ نازش اسی کے کمرے میں سوتی تھی۔ مگر بسا اوقات سعدیہ خود ہی الجھ کر رہ جاتی۔ بس یہ تھے اس کے شب و روز ان دنوں!

کبھی ایک دوپہر وہ نازش اور بھابی کی گفتگو سن کر حیران رہ گئی۔ اسے یہ احساس ہوا کہ اپنی

سوچوں میں گم کر وہ گھر کے دیگر مسائل سے بہت بے خبر ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر اس کی نازش سے کبھی بات نہ ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ دونوں یونیورسٹی کی ساتھی تھیں۔ ہم عمر تھیں۔ اب حسن اتفاق سے دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہی تھیں۔ دن رات کا ساتھ تھا۔ دونوں کی باتوں سے اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ میں بہت ہی خود غرض ہوں۔ سوائے اپنے مسائل کے باقی کسی کے مسئلے سے سروکار نہیں رکھتی۔ ممکن ہے، معلوم کرنے پر نازش خود ہی اپنا مسئلہ اس سے ڈسکس کرتی! وہ بغور ان کی باتیں سننے لگی۔

بھابی نے شاید نازش کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ موضوع کا احساس کر کے سعدیہ ان کے کمرے میں جاتے جاتے رک گئی۔ آگے بڑھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ ذرا سے ہٹے ہوئے پردے سے نازش صاف دکھائی دے رہی تھی جو مسہری کے ایک کنارے سے لگی بھابی کو خفا خفا نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔

"نازو...... میری جان! تم بلاوجہ کی ضد میں چھوڑ دو۔ لڑکیاں ایسی باتیں کرتی اچھی نہیں لگتیں۔ یہ موضوع چھڑتے ہی تم موڈ بگاڑ لیتی ہو۔ بھلا کوئی بات ہوئی۔"

جواب دینے کی بجائے نازش انہیں خالی خالی انداز میں دیکھتی رہی۔ پریشان سی بھابی اس کے پاس جا بیٹھیں اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔

"دیکھو بیٹے! تم مجھے اولاد کی طرح عزیز ہو [illegible] تو تمہیں کوئی شرم نہیں ہونا چاہئے۔ اگر تمہیں سوچ [illegible] کبھی سمجھانے بیٹھ جاتی [illegible] ہوں۔ تم اس بات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو کہ مجھ سے زیادہ تمہارے بھائی جان کو جلدی ہے کہ کسی طرح تم جلد از جلد اپنے گھر بار کی ہو جاؤ۔ ایک [illegible] مسرت اور خوشیوں بھری زندگی گزار سکو۔ دراصل قصور ان کا بھی نہیں بلکہ پاپا اور خصوصاً امی کی بے وقت [illegible] اوپر سے نیچے [illegible] لیکن زندگی کی بے وقتی نے انہیں بہت حساس بنا دیا ہے۔ بسا اوقات تو ان کے [illegible] میں بھی گھبرا اٹھتی ہوں۔ لیکن نازو! وہ ہمیشہ اپنی بہن کی بہتری کے لئے ہی سوچتے ہیں۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئیں۔ پھر دوبارہ گویا ہوئیں۔

"خیر...... ایک نہ ایک دن شادی تو ہر لڑکی کی ہوتی ہے۔ اگر تمہارا کچھ خاص مسئلہ ہو تو بھابی کی بجائے ماں سمجھ کر مجھے بتاؤ...... میں ہر ممکن طریقے سے تمہاری مناسب حمایت کروں گی۔"

نازش کو ان کی طویل بات کا آخری حصہ سخت ناگوار محسوس ہوا۔ لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے جواب دیا۔ "بھابی جان! کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ کوئی وجہ وغیرہ نہیں ہے۔ آپ اس طرح سے شرمندہ کیا کیجئے۔ بس میرا کہنا یہ ہے کہ آپ میرے سامنے شادی وادی کی بات ہی نہ کیجئے۔ مجھے اچھی معلوم نہیں ہوتیں یہ باتیں۔"

"لیکن آخر کب تک؟" بھابی نے جم کر سوال کیا۔

نازش کی قوت برداشت جاتی رہی۔ اس نے چڑ کر بھابی کو بھرپور نظروں سے دیکھا پھر کچھ رنج، غصے اور کچھ دکھ کے ملے جلے احساسات سے مغلوب ہو کر بولی۔

"اگر...... میں ایسی ہی آپ پر بوجھ ہوں تو بہتر ہے۔ آپ بھائی جان کو اطمینان دلا دیجئے، میں ملازمت کر کے اپنی کفالت کر لوں گی۔"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بھابی چپ کی چپ رہ گئیں اور گم صم ہو کر اس کی صورت تکنے لگیں۔ اس کے سخت اور کھردرے لہجے سے سعدیہ بھی سناٹے میں رہ گئی۔

وہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا اسے مناسب نہ لگا۔ ممکن تھا کوئی نوکر ہی دیکھ لیتا اور سمجھتا کہ وہ کن سوئیاں لے رہی ہے۔ چنانچہ وہ جس کام سے آئی تھی، اسے ملتوی کر کے اپنے کمرے میں واپس چلی آئی۔ لیکن سر سے پیر تک ایک نئی فکر میں مبتلا ہو چکی تھی۔ ساتھ ہی اپنے محسنوں کی طرف سے شرمندگی بھی محسوس کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں خیال کر رہی تھی کہ اگر گھر میں کسی طرح کی ٹینشن ہے تو جس حد تک ممکن ہو اسے ان کے کام آنا چاہیے۔ آخر نازش ہر طرح کے وسائل ہونے کے باوجود شادی سے انکاری کیوں ہے؟ اس کا سبب کیا ہے؟...... وہ بہت دیر تک غور کرتی رہی مگر اس گتھی کو سلجھانے سے قاصر رہی۔

کروٹیں بدلتے بدلتے ایک پہر دن گزر گیا۔ آج نازش اوپر بھی نہیں آئی تھی۔ پورے گھر کے ماحول پر ایک غیر معمولی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی یا پھر سعدیہ کو ایسا لگ رہا تھا۔ بہرحال اس کے خیال میں کوئی بات تھی ضرور۔

جوں جوں اس کا یہ خیال پختہ ہوتا گیا، وہ اپنے دل میں مصمم ارادہ کرتی رہی کہ ہر صورت نازش کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرے گی۔ [illegible] نازش تمام دن پھر اوپر نہ آئی۔ بالآخر دن ڈھلنے لگا۔ اب تو روزے کی تیاری کے لیے [illegible] نیچے آنا تھا۔ چنانچہ وہ کچن میں آ کر مصروف ہو گئی۔ چاچی بوا تو حسب دستور اس کا [illegible] تھیں لیکن نازش اور بھابی کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔

یہ بات بھی ہر روز کے معمولات سے ہٹ کر تھی۔ تاہم اس نے غیر ضروری حیرت کا اظہار نہیں کیا بلکہ اپنے کام میں لگی رہی۔ [illegible] صاحب بھی ہسپتال سے آ گئے۔ تب بھابی اور نازش بھی کچن میں آ چکی تھیں۔ سعدیہ نے بغور ان کے موڈ کا جائزہ لیا مگر کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکی۔ البتہ بھابی قدرے چپ چپ سی لگ رہی تھیں۔ آج اتفاق سے فرخ بھی روزہ کھولنے نہیں آیا تھا اس لیے [illegible] اور سامان زیادہ [illegible] تھے۔ ایسا بھی تو اتنے دنوں میں پہلی دفعہ ہوا تھا۔

بعض اوقات انسانی ذہن سوچتا کچھ ہے، وقوع کچھ اور ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ سعدیہ کے ساتھ ہو گیا اس روز۔ وہ جو دل میں عہد کیے بیٹھی تھی کہ آج رات نازش سے ضرور کرید کر درست مسئلہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گی تو بس سوچتی کی سوچتی رہ گئی اور بات نہایت آسانی سے ٹل گئی اور وہ اس طرح کہ اس دن بھی افطار سے چند منٹ قبل فاخر آ پہنچا۔ سب نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ سعدیہ بھی پھول کی طرح کھل اٹھی سارے عہد اور ارادے بھول کر۔

"کیا بات ہے، آج بہت سناٹا سا لگ رہا ہے۔" فاخر نے فروٹ چاٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے۔ "ارے بھائی! سمجھنے کی کوشش کرو۔" پھر اس کی طرف جھک کر رازداری سے مگر باآواز بلند دریافت کیا۔ "تم نے اپنی دلہن کو عید کی شاپنگ کرا دی؟"

"نہیں!" فاخر کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

سب کے قہقہوں میں اس کی "نہیں" دب کر رہ گئی۔ وہ خود بھی ہنسنے لگا۔

بھابی بولیں۔ "اصل خاموشی تو فرخ کے نہ ہونے سے ہے۔"

"ارے ہاں...... آج وہ نظر نہیں آ رہے؟"

"ہاں، آج معلوم نہیں کیوں نہیں آیا۔" بھابی نے جواب دیا۔

مغرب کی نماز پڑھ کر فاخر اپنے کمرے میں آیا تو سعدیہ چند لمحے پہلے گرم گرم چائے لے کر پہنچی تھی۔ فاخر دھم سے اس کے قریب گر کر بولا۔

"ہاں تو بھئی کیا مصروفیات ہیں آج کل ہماری شریک حیات کی؟"

اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "بوریت، اکتاہٹ، کوفت اور انتظار، باقی بس۔"

"بہت خوب۔" وہ اس کی حاضر دماغی کی داد دینے لگا۔ "ماشاء اللہ حال دل تو بہت خوب سنانے لگی ہیں آپ۔ اس ترقی سے مابدولت خوش ہوئے۔"

سعدیہ نے دوبارہ برجستہ جواب دیا۔ "خوش ہونا تو سمجھ میں آ گیا مگر "خوش کرنا" بھی تو سیکھیے۔"

"خوب...... بہت خوب...... بہت اچھے...... بہت اچھے۔ واہ واہ...... سبحان اللہ!" وہ باقاعدہ جھوم جھوم کر لن ترانیاں گانے لگا۔ "ہماری چند دنوں کی غیر حاضری نیک گئی۔ ہماری شریک حیات تو پہلے سے کہیں زیادہ سگھڑ اور باصلاحیت ہو گئیں۔ ہم ان نیک اقدامات سے خوش ہوئے اور اس خوشی میں مابدولت کا ارادہ خیر یہ بن رہا ہے کہ آپ کے سگھڑاپے اور صلاحیتوں کے مزید نکھار اور قیام کی خاطر، مزید فیوض اور برکات حاصل کرنے کی غرض سے ہم کل علی الصباح دوبارہ سفر واپسی شروع کر دیں۔"

"ارے...... ارے......" سعدیہ کی [illegible] ہو گئی۔ "یہاں زیادہ فصیح و بلیغ اردوئے معلی استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اب "سفر واپسی" کا شوق فرمانے کی ضرورت ہے۔ بس اب بہت ہو چکا۔ فقط آپ ہی تنہا نہیں ہیں اپنے "بیٹے" کی چاہت کرنے والے۔ کوئی دوسرا بھی اب بیٹے کا خواہشمند [illegible] ہے۔"

"او...... ہو......" وہ ٹھوڑی پر ہاتھ مار کر کراہا۔ "تو اصل کیس یہ ہے۔"

"جی ہاں۔" وہ چائے کا کپ اسے تھما کر بولی۔ "یہ کیس نہیں، حقیقت ہے۔"

"تو مابدولت آپ کو اجازت مرحمت فرماتے ہیں [illegible] اپنے میکے یعنی ہماری سسرال روانہ ہو کر شکریے کا موقع عنایت فرمایئے۔"

"مین نوازش ہو گی جناب کی۔" سعدیہ نے اسی کے انداز میں جواب دیا اور خالی کپ اٹھا کر اطمینان سے باہر چل دی۔

"ارے سنو تو۔" فاخر نے جلدی سے اس کا آنچل تھام لیا۔

"کیوں اب کیا ہوا؟" اس نے تیکھے پن سے پوچھا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے مہربان؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔ سعدیہ بھی منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔

⁂

فرحت، اماں بی کی حسب ہدایت پہنچا تو کافی سے زیادہ نازیہ اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھی۔ قدرتی طور پر اس کا دھیان بار بار اسی کی طرف جا رہا تھا اور اماں بی کی طرح وہ بھی اپنے خدا کا شکر گزار تھا جس نے نازیہ کی سی سمجھدار اور حالات سے سمجھوتہ کرنے والی، گھر کو گھر سمجھنے والی بیوی عطا فرما دی تھی۔ ورنہ خدانخواستہ کوئی نخرے کرنے والی اور گھبرا جانے والی بے حوصلہ لڑکی ہوتی تو اس ایمرجنسی میں معلوم نہیں کتنے کرتب دکھا جاتی۔ جب کہ ایسی صورت حال کے برعکس جتنی دیر شام کو وہ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

گھر میں رہا، اس کو پھرکی کی طرح تمام انتظامات میں نہایت منظم انداز میں ملوث دیکھتا رہا۔ اس نے اچانک بڑھ جانے والے امور خانہ داری اور معطر کے روتے دھوتے بچوں کو بیک وقت خاصی مہارت اور خندہ پیشانی سے سنبھال رکھا تھا۔ یہ امر اس گھر کے لیے قابل اطمینان اور باعث فخر تھا۔

منا خوب ہوشیار اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ معطر کئی مرتبہ الجھ الجھ کر کہہ چکی تھی۔ "اماں! بے کار آپ نے فرحت کو سامان لانے بھیج دیا۔ دیکھیے تو منا ماشاءاللہ بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ ہسپتال میں داخل ہونے کی کیا تک ہے؟ مجھے تو یہاں کی فضا سے ہی خوف لگ رہا ہے۔ یہ ڈاکٹر بس یونہی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ تو اچھے بھلے بندے کو بھی سوئیاں بھوک بھوک کر ختم کر ڈالیں۔ منے کے دادا کی کیسی گت بنائی تھی ان ڈاکٹروں نے۔"

"ارے بی! چپ ہو جاؤ۔" اماں بی نے جھرجھری لے کر جواب دیا تھا۔ "تم یونہی بے وقت کی راگنی الاپنے بیٹھ جاتی ہو۔"

فرحت گھر سے لوٹا تو معطر منے کو لیے ہسپتال کے باغ میں ٹہل رہی تھی۔ اونچے اونچے، بلند و بالا درختوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے مرکری بلب دودھیا روشنیاں اگل رہے تھے۔ کئی جگہ لوگ ٹولیاں بنائے سبزے پر یا کہیں کہیں نصب بنچوں پر بیٹھے تھے۔ یہاں پر فضا کھلی کھلی اور ماحول پرسکون لگ رہا تھا۔

تینوں نے ایک صاف ستھری جگہ کا انتخاب کر کے کھانا کھایا۔

فرحت نے ہسپتال کے اندر جا کر ضروری کاغذی کارروائی نمٹائی۔ جو کمرہ منے کو ملا تھا وہاں تین مریض اور بھی داخل تھے۔ ہسپتال کے اصولوں کے مطابق مریض کے ساتھ ایک وقت میں ایک فرد رہ سکتا تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ معطر منے کے ساتھ رہے گی اور فرحت واپس چلے جائیں گے۔ اور اماں بی احتیاطاً دونوں جگہ آتی جاتی بھی رہیں گی اور اگر موقع مل گیا تو معطر کے ساتھ پڑ رہیں گی۔ رات تو بہرصورت بتانی تھی۔

فرحت نے اپنا سامان لا کر وہاں سیٹ کر دیا۔ یہاں بچوں کے ایک کاٹ کے علاوہ ایک بیڈ لگا تھا۔ ڈاکٹرز کے راؤنڈ کا وقت ہو گیا تھا۔ فرحت بھاگم بھاگ باغیچے سے منے اور معطر کو لے کر آیا۔ معطر دس رنگ کے منہ بناتی ہوئی اندر آئی مگر باتیں بنانے کا موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ فوراً ہی چند ڈاکٹروں اور نرسوں پر مشتمل ایک ٹیم سر پر پہنچ گئی اور مریضوں کا چیک اپ اور چارٹ ریڈنگ کی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ اماں بی نے خود تمام معلومات فراہم کیں۔ منا اس وقت بھی جاگ رہا تھا اور کوئی علامت طبیعت خرابی کی نہیں تھی۔

اپنے فرائض کی بجا آوری کے بعد ٹیم چلی گئی تو کمرے کی افراتفری بھی سکون پذیر ہوتی گئی۔ لیکن معطر سخت بدحواس دکھائی دے رہی تھی۔ اس تصور سے اس کی روح فنا ہوئی جا رہی تھی کہ پوری رات اسی بند کمرے کے وحشت زدہ ماحول میں گزارنی پڑے گی۔ سوچ سوچ کر اس کی کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔ اتنے میں منے نے پیشاب کی رٹ لگا دی۔ معطر اسے لے کر کمرے سے متصل غسل خانے میں گھس گئی۔ بس یہی غضب ہو گیا۔

بمشکل چشم اسے تو فارغ کرا لائی مگر مارے ابکائیوں کے خود کا جی لوٹ گیا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے ضبط کی کوشش کرنے لگی لیکن متلی تھی کہ چلی آ رہی تھی۔ آنکھوں اور ناک سے پانی جاری ہو گیا۔ بالآخر زوردار کھانسی آئی اور اس نے بڑی سی قے کر دی۔ کچھ دیر پہلے کا غیر ہضم شدہ کھانا فرش پر دور

تک پھیل گیا۔

اماں بی اس کی غیر حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے نڈھال بیٹھی تھی۔ قریبی مریض بچے کی ماں ہمدردی سے اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ کسی نے پانی کا گلاس لا کر ہاتھ میں دیا۔ اماں بی منے کو لیے تھیں جو اب تک سویا نہیں تھا۔ فرحت نے جمعدار کو بلا کر فرش صاف کرایا۔

اب معطر صرف ابکائیاں لے رہی تھیں اور ہر ابکائی پر مطالبہ جاری ہو گیا تھا۔

"گھر چلیے...... جلدی گھر چلیے...... میں یہاں نہیں رک سکتی...... اماں! میں مر جاؤں گی...... گھر چلیے...... میری سانس رک رہی ہے...... دیکھیے! منا بالکل ٹھیک ہے۔ اسے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔"

اس کی کیفیت کے پیش نظر ایک دو عورتیں بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔ اماں بی اور فرحت سخت کشمکش میں پڑ گئے۔ بالآخر اماں بی نے ہتھیار ڈال دیے اور واپسی کا رخت سفر باندھا۔

باہر سڑک پر ہی فرحت کو خالی ٹیکسی میسر آ گئی۔ لہٰذا وہ سامان سمیت سب کو لے کر باہر آیا اور عجلت میں ہسپتال کے کاؤنٹر کو کوئی اطلاع دیے بغیر گھر کی جانب چل دیا۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔

باہر کی تازہ ہوا کھاتے ہی معطر کی ... اور طبیعت کی گراوٹ جاتی رہی اور وہ لمحوں میں بھلی چنگی ہو گئی۔ اس پر سے ہسپتال کے ماحول کا ... تو اس کی طبیعت ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اماں بی بھی تو رہی تھیں مگر چپ ہو رہی تھیں۔

ٹیکسی ان کے دروازے پر رکی تو ... تراویح کب کی ختم ہو چکی تھی اور اگلی سحری کے منتظر لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک کر سو چکے تھے۔ گلی کوچوں میں سناٹوں کا راج تھا۔ چوراہے پر اکا دکا ہی نظر آ رہا تھا۔

کئی بار کی مسلسل دستک کے بعد دروازہ کرائے داری نے کھولا جو آنکھیں ملتی ہوئی، بمشکل جھومتی ہوئی آئی تھی۔ غیر متوقع طور پر ان سب کو دیکھ کر اس کی نیند ہوا ہو گئی۔ وہ اونچی آواز میں بولی۔

"اللہ رحم کرے...... سب خیریت ہے نا؟"

"جی ہاں...... سب خیریت ہے۔" فرحت نے سامان ڈیوڑھی میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

ایک تو معطر آج سارا دن پریشان رہی تھی، دوسرے خود بھی الٹی کرنے کے بعد سے کمزوری سی محسوس کر رہی تھی۔ دروازے پر کچھ ٹھہرنا پڑ گیا تو اسے مزید جھنجھلاہٹ چڑھ گئی۔ بگڑے ہوئے تیور کے ساتھ گویا ہوئی۔

"آپ سو گئی تھیں تو کیا وہ دلہن رانی بھی سر شام منہ سر لپیٹ کر سو رہی ہیں؟...... ان کا بھی اس گھر سے تعلق ہے۔ اتنا تو سوچنا چاہیے، گھر کے دوسرے مکینوں پر کیا بیت رہی ہے۔ ایسی کاہے کی آرام داری؟"

اس کی بڑبڑاہٹ کا کسی نے جواب دیا نہ نوٹس لیا۔ فرحت اس کی صورت دیکھ کر رہ گیا۔ دخل نہیں دیا۔ اتنے میں نازیہ کسی طرف سے تیز تیز چلتی ہوئی آئی۔ وہ تراویح پڑھ رہی تھی اس لیے پہلی دستک پر نہ آ سکی تھی۔ بڑے سے دوپٹے کے ہالے میں اس کے معصوم چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا اماں جان؟ میرا تو دم ہی نکل گیا۔" کہتے کہتے اس کی نگاہ منے پر جم کر رہ گئی۔ بات

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ادھوری چھوڑ کر جلدی سے بانہیں پھیلا کر اسے گود میں لے لیا اور پیار کرتے ہوئے اندر لے گئی۔

تھوڑی دیر میں سب آرام و سکون سے بیٹھ گئے تو اماں بی نے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ منا چونکہ ٹھیک ٹھاک تھا اس لئے کرائے داری نے بھی یوں ہسپتال سے چلے آنے پر جرح نہیں کی۔ نازیہ نے سب سے چائے کا پوچھا مگر سب نے پینے سے انکار کر دیا۔ معطر نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔

"اگر پاپے ہوں تو مجھے دودھ میں بھگو کر دے دو۔ تب پتے آنے کے بعد سے تو میرا کلیجہ بیٹھا جا رہا ہے۔ رات کتنی مشکل ہو رہی ہے۔"

نازیہ نے جواب دیا۔ "پاپے تو اس وقت نہیں ہیں آپا! ہاں، سحری کے لئے پھینیاں رکھی ہیں۔"

"چلو وہی دے دو۔"

"جی اچھا۔" اس نے مستعدی سے کہا اور جلدی جلدی باورچی خانے میں جا کر چولہا جلایا۔ دودھ گرم کیا اور پھینیاں بڑے پیالے میں بھگو کر معطر کو لا دیں۔ فرحت کپڑے بدلنے کے لئے جا چکا تھا۔ اماں بی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"جاؤ دلہن! تم بھی جا کر آرام کرو۔ اب تو کافی رات ہو گئی۔ سحری میں بھی اٹھنا ہوتا ہے تمہیں۔ خیر سے سارا دن دھندے سے لگی رہتی ہو۔"

نازیہ کے جانے کے بعد کرائے داری بھی صحن کے دروازے سے اپنے ہاں چلی گئی اور اماں بی اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ آج تو وہ تھکاوٹ سے چور ہو رہی تھیں۔ لیٹتے ہی غافل ہو گئیں۔

معطر نے پھینیاں کھا کر پیالہ [illegible] اور خود بھی منے کے ساتھ لیٹ گئی۔ اس کے دیگر بچوں کے بستر بھی برآمدے میں لگے ہوئے تھے اور سب کے سب خواب غفلت کے مزے لوٹنے میں مصروف تھے۔

رات آدھی ادھر تھی، آدھی ادھر۔

ایک ہولناک چیخ سے سارا گھر لرز اٹھا۔ اماں بی ہڑبڑا کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھیں۔ دیکھتی کیا ہیں کہ منا معطر کے ہاتھوں پر بے ہوش پڑا ہے اور معطر بے حد ہسٹریائی انداز سے چلائے جا رہی ہے۔

جس بات کا خدشہ تھا بالآخر وہی ہو گئی تھی۔ اماں بی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت نظر انداز کر کے اور خصوصاً معطر کی ضد مان کر انہوں نے سخت غلطی کی تھی اور اب اس غلطی کا خمیازہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے انہیں بیٹی پر سخت طیش آیا مگر اس امر سے خوب واقف تھیں کہ یہ وقت ایسی باتوں کے لئے ہرگز نہیں ہے۔ تقاضائے وقت کچھ اور ہی تھا۔ گھر بھر میں ذرا سی دیر میں پھر بھگدڑ ہو گئی۔ ماں کو چنگھاڑتے پا کر معطر کے سارے بچوں نے باجماعت سُر سے سُر ملانا شروع کر دیا تھا۔

وقت وقت کی بات ہے۔ نازیہ اور فرحت کو موقع پر پہنچنے میں قدرے تاخیر ہو گئی۔ ظاہر ہے وہ بھی بندہ بشر تھے۔ دیر سے سوئے تو باہر کی چیخ دھاڑ کا بروقت احساس نہ ہو سکا۔ بس پھر کیا تھا! معطر کی پریشانی غصے میں تبدیل ہو گئی۔ اس کا دھارا با آسانی فرحت کی طرف بہہ نکلا۔ جب تک وہ موقع پر پہنچا، بہن نے سینکڑوں صلواتیں سنا ڈالیں۔ وہ اس وقت بھی بھائی بھاوج کی طرف سے سخت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی لیکن فرحت نے بھی اماں بی کی طرح سب برداشت کیا اور کسی بھی رنجش کو جی میں جگہ دیے بغیر فوراً [illegible] نیم بے ہوش منے کو گود میں بھر لیا۔

آدھی رات کا سماں...... سڑک یہاں سے وہاں تک خالی پڑی سنسنا رہی تھی۔ اگر سحری کا وقت ہوتا تو تب بھی کوئی بات تھی۔ بالآخر فرحت نے دو گلی پیچھے ایک رکشے کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ وہ بھی کوئی بچوں والا بھلا مانس آدمی تھا۔ فوراً تیار ہو گیا اور منے سمیت ان تینوں کو لے کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

⌘●⌘

اگلی صبح فاخر نے سعدیہ سے تیار ہونے کو کہا اور خود نیچے بھابی کے پاس چلا آیا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھیں۔ فاخر نے انہیں آگاہ کیا۔

"بھابی! میرا خیال ہے سعدیہ کو چند دن کے لئے اس کی امی کے ہاں......"

"چھوڑ آؤ۔ کوئی حرج نہیں۔" انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "اچھا ہے، اپنے بہن بھائیوں سے مل آئے گی۔ میکے جانے کی خوشی کا تو کہنا ہی کیا ہے۔"

اب فاخر نے اصل بات کھولی۔ "بھابی! اگر سعدیہ عید وہیں کرے تو کیسی رہے گی؟ غلط تو نہ ہو گا؟"

بھابی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ ذرا وضاحت سے...... کھل کر بات بتاؤ۔"

"بات اصل میں یہ ہے بھابی!" وہ جلدی جلدی بولنے لگا۔ "سعدیہ کو بتانا مجھے مناسب نہیں معلوم ہو رہا۔ وہ بہت زیادہ فکرمند ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب سے تو سارے حالات بیان کر چکا ہوں۔ درحقیقت وہاں گھر کے میرے لئے حالات بہت پریشان کن ہو چکے ہیں۔ سب لوگ ہاتھ دھو کر بڑے ابا کی صاحبزادی سے میری شادی کروانے کے پیچھے پڑے ہیں۔ تاہم میرا دل اندر سے مضبوط ہے۔ کیونکہ ابا میاں تو بہر حال میرے ساتھ ہیں۔ بڑے ابا بھی مشورہ دے کر گئے ہیں کہ فی الوقت گھر کی خواتین سے بگاڑ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شادی کے قصے کو ان دونوں نے مل کر کسی نہ کسی طرح ڈھیل دی۔ وہ حال کے لئے [illegible] کرا دیا ہے مگر مجھ پر کچھ اقسام کی شرائط عائد کر دی گئی ہیں جن کی رو سے میں فی الحال وہاں سے ہٹنے کا بھی مجاز نہیں ہوں۔"

بھابی نے مذاق کیا۔ "کہیں مجبوری مجبوری میں مجبور نہ ہو جانا بھیا!"

"خدا نہ کرے۔" فاخر نے بے ساختہ جواب دیا۔ "سچ یہ ہے بھابی! اگر میں قدرے اپنی بے پناہ چاہنے والی سرور پھوپھی کی وجہ سے دب گیا ہوں ورنہ ایک لمحے کے لئے بھی وہاں نہ ٹکتا۔ ان کا رونا مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ انہیں مجھ سے بے انتہا محبت ہے۔ یوں بھی عید کے بعد میں اور سعدیہ ملک سے باہر ہوں گے۔ اس لئے خاصے عرصے تک کے لئے مجھے ان سے دور رہنا پڑے گا۔ اسی کی تلافی میں لگا ہوں آج کل۔"

بھابی نے کچھ سوچ کر سنجیدگی سے کہا۔ "تو پھر کیا ضروری ہے کہ عید کرنے کے لئے سعدیہ کو میکے چھوڑ کر آؤ۔ ہاں، ایک دو دن کے لئے ملوا کر لے آؤ۔ رہتی وہ یہیں رہے اور تم چکر لگا کر جاتے رہو۔ اللہ خیر کرے عید کے بعد سیر و تفریح کے لئے نکل جانا۔ واپس آ کر جو بھی حالات ہوں، کرنا۔"

فاخر نے جواب دیا۔ "دراصل آپ ہمارے گھر کے ماحول سے ناواقف ہیں اس لئے یہ سب آپ کو آسان لگ رہا ہے۔ ورنہ تو بہت دشوار ہیں وہاں کے اصول اور قاعدے قرینے۔ میری والدہ صاحبہ تو مستقل مجھ سے خفا ہی رہتی ہیں۔ شادی کا مسئلہ کل جانے سے تو آج کل بہت ہی چراغ پا

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ہیں۔ لہٰذا میں کسی طرح کا رسک لیتے ہوئے ہچکچاتا ہوں۔ سوچتا ہوں جب تک ضروری نہیں ہے تو حالات کو کیوں آؤٹ کروں؟ آج کل وہاں رُکے رہنے کا ایک بڑا سبب شاکر بھائی کی علالت بھی ہے۔ ابھی ان کی صحت زمینداری کے جھمیلوں میں پڑ جانے کی اجازت نہیں دے رہی۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں مجھے ان کی قائم مقامی بھی نبھانی پڑ رہی ہے۔"

بھابی زچ ہو کر گویا ہوئیں۔ "چلو مان لیا کہ تمہاری مجبوریوں اور بے بسیوں کی داستان نہایت دلگداز ہے۔ مگر اس میں سعدیہ کی عید میکے میں کرنے کا کیا جواز ہے؟"

وہ ہنس کر بولا۔ "آپ بھی بال کی کھال نکال رہی ہیں۔ اجی بھابی صاحبہ! میرے اس خیال کا مقصد فقط یہ ہے کہ شاید اپنی گھریلو روایات کا جال توڑ کر عید کے دن میں نہ آسکوں تو سعدیہ زیادہ رنجیدہ نہ ہو سکے۔ اپنے میکے میں اسے......"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے بھئی۔" سعدیہ کو زینے سے اترتا دیکھ کر بھابی نے جلدی سے فاخر کی بات کاٹ دی۔

فاخر اور سعدیہ دونوں اکٹھے گھر پہنچے تو سب انہیں دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے۔ سعید احمد بھی بہت خوش ہوئے۔ دادی صغریٰ، سعدیہ کی آمد کا سن کر فوراً دوڑی آئیں۔

جب سب کو یہ معلوم ہوا کہ وہ عید یہیں منانے کے ارادے سے آئی ہے تو چھوٹوں بڑوں، گھر بھر کی خوشی دوبالا ہو گئی۔

"ارے...... حمید دکھائی نہیں دے رہا؟" فاخر نے چونک کر پوچھا۔

"وہ...... نازیہ کی عیدی لے کر گیا ہے۔" سعید احمد کی بیوی نے بتایا۔

فاخر کو اچانک ہی فرحت کی یاد آئی [illegible] سعدیہ سے کہا۔

"کیوں نہ آج ہم لوگ تمہاری بہن کے پاس ہو آئیں۔ پھر تو تمہیں یہاں رہنا ہی ہے۔ میں فرحت سے بھی ملاقات کر لوں گا۔ بہت مدت گزر گئی ملے ہوئے۔"

سعدیہ خوشی خوشی تیار [illegible] سعید احمد سے اجازت لے کر فاخر اسے چند گھنٹوں کے خیال سے فرحت کے ہاں لے کر چل دیا۔ آج دونوں بہت ہی خوش اور مگن تھے لیکن ان کی خوشی کافور ہو گئی۔ فاخر کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

وہ لوگ ٹیکسی سے اترے تو فرحت کے دروازے پر فرشی دری بچھی تھی اور محلے پڑوس کے چند لوگ بیٹھے دھیرے دھیرے باتوں میں مصروف تھے۔ فرحت اسے کہیں دکھائی نہ دیا تو وہ سعدیہ کو اتروا کر ڈیوڑھی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

ابھی وہ دونوں چند قدم آگے بڑھے تھے کہ دفعتاً کوئی چیز ایک زوردار زناٹے کے ساتھ اڑتی ہوئی آئی اور ان لوگوں سے ٹکرا کر ادھر اُدھر بکھر گئی۔ سعدیہ نے گھبرا کر دیکھا۔

فاخر کے قدموں میں نازیہ کا عیدی کا جوڑا لپٹ گیا تھا۔

مہندی کی کھل جانے والی پڑیا سے سوکھی مہندی پھوار کی طرح برس رہی تھی اور کانچ کی سرخ سرخ چوڑیاں ڈیوڑھی کے طول و عرض میں بکھر گئیں۔ سوئیوں اور شکر کے پیکٹ دھپا دھپ دہلیز پر جا گرے تھے...... سعدیہ اور فاخر کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔

❖❖○❖❖

ڈیوڑھی کے ایک کونے میں چھپا ہوا حمید تھرتھراتا ہوا آگے بڑھا اور "آپا!" کہہ کر سعدیہ سے چمٹ گیا۔

اس نے بے اختیار گھبرائے ہوئے بھائی کو آغوش میں سمیٹ لیا اور زخمی نگاہوں سے ہر طرف بکھری ہوئی چوڑیوں کو دیکھنے لگی۔

دفعتاً ایک تیز اور چیختی ہوئی آواز ان کی سماعت سے گرم گرم سیسے کی طرح ٹکرائی۔

"قاتلو!...... بے حسو!...... میرے بچے کو مجھ سے چھین لیا اور خود عیدیں منانے چلے ہیں۔ آگ نہ لگا دوں تمہاری عیدی میں...... میری گود میں انگارے بھر دیے۔ میرا تن من جلا ڈالا اور اب میرے اجڑنے کا احساس تک نہیں...... [illegible] ہو گی۔"

"حمید! کیا ہوا ہے؟...... بتاؤ نا بھئی۔" سعدیہ نے چمکار کر پوچھنا چاہا۔ وہ اور بھی زیادہ کپکپا کر بولا۔

"چلیے آپا! چلیے...... جلدی سے [illegible] گھر نکل چلیے یہاں سے۔"

[illegible]

"[illegible]" فاخر نے ملائمت سے کہا۔ پھر دونوں بہن بھائی کو لے کر ڈیوڑھی سے آگے بڑھا۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں [illegible] دب کر چرمرانے لگا۔

سامنے برآمدے میں [illegible] بے ترتیب فرش پر بچھی دری پر [illegible] پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کی ایک ٹک زمین کی [illegible] آسمان [illegible] جو منہ میں آ رہا تھا بک رہی تھی۔ اپنے بال نوچ رہی تھی۔ کپڑے پھاڑ رہی تھی۔ [illegible] مار مار کر اس نے اپنا چہرہ لال کر لیا تھا۔ محلے کی چند عورتیں اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ حمید سہمی سہمی نظروں سے ادھر ہی دیکھے جا رہا تھا۔

غیر متوقع طور سے ان دونوں کو اپنے گھر میں دیکھ کر اماں بی آنسو پونچھتی ہوئی ان کی طرف لپکیں۔ سعدیہ کو سینے سے لگایا، حمید کو پیار کیا اور گلوگیر آواز میں بولیں۔

"بیٹا! معطر کی طرف سے میں دست بستہ معافی چاہتی ہوں۔ اسے معاف کر دو۔ اس وقت وہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔ بہت بڑی قیامت بیت گئی ہے میری بچی پر۔ جو کچھ تمہاری آنکھوں نے اس وقت دیکھا ہے اسے اپنے تک محدود رکھنا۔ بے شک آج وہ پاگل ہو چکی ہے۔"

پریشانی اور ناگہانی آفت سے سعدیہ کے آئے حواس گم ہو رہے تھے تاہم اس نے اماں بی کے جڑے ہاتھوں پر اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ رکھ دیے اور نرم لہجے میں بولی۔

"خالہ جان! یہ مقدس ہاتھ جوڑ کر گنہگار مت کیجیے۔ یہ بتائیے، ہوا کیا ہے؟"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اماں بی کے آنسو مزید شدت سے بہنے لگے۔ انہوں نے جواب دینے کی بجائے غسل خانے کی طرف اشارہ کر دیا۔ جہاں منے کے آخری غسل کی تیاری ہو رہی تھی۔

سعدیہ کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل کر اس کے ہونٹوں پر دم توڑ گئی۔ وہ پوری جان سے تھرا گئی تھی۔ اماں بی مدھم آواز میں وضاحت کرنے لگیں۔

"جیتی زندگی میں یہ دن بھی دیکھنے کو لکھا تھا۔ ہنستا کھیلتا بچہ لمحوں میں چٹ پٹ ہو گیا۔ بس بھیا! آئی کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور بڑھی سانسوں کو کوئی گھٹا نہیں سکتا۔ مگر میری تو جان ہولوں میں جکڑی ہے۔ معطر کی سسرال ملتان میں فوراً ہی خبر کر تو دی ہے مگر تدفین سے پہلے ان کا پہنچ جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ دیکھیں اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اپنی جانب سے تو ہم نے کچھ کوتاہی کی نہیں ہے۔ جو قدرت کو منظور تھا وہ ہو گیا۔ اللہ عزت و آبرو سے اس جانگسل مرحلے سے گزارے۔ معطر تو اپنے حواس کھو چکی ہے۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ڈیوڑھی کی طرف بڑھ گئیں اور اپنا غرارہ سنبھال کر جلدی جلدی اپنی بہو کی عیدی سمیٹنے میں مصروف ہو گئیں۔

موقع نہ ہونے کے باوجود فاخر کو ان کی [illegible] الفاظ کا رعب دھار گئی۔ اس نے اپنی بیوی کو عجلت میں صبر و تحمل سے کام لینے کی خصوصی ہدایت کی اور عیدو کو لے کر باہر چلا گیا۔

اب سعدیہ کی نگاہ نازیہ پر پڑی جو [illegible] کھڑی پتھر کے بت کی طرح ٹکٹکی باندھے ادھر دیکھے جا رہی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سپید ہو رہا تھا۔ صدمے نے اسے گنگ کر ڈالا تھا۔

سعدیہ نے بے اختیار قدم بڑھائے [illegible] کی پچھاڑیں کھاتی نند کو بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ بھی اسے پہچانے بغیر اس کے گلے لگ گئی اور رو رو کر دہائیاں دینے لگی۔

"ہائے میں لٹ گئی..... برباد ہو گئی..... میرا لعل چلا گیا..... ابھی کل تک تو بھلا چنگا تھا۔ اب میں اسے کہاں سے ڈھونڈ لاؤں؟..... ہائے اللہ! میں خود مر کیوں نہیں جاتی..... جلنے والوں کے کلیجے ٹھنڈے ہو جائیں۔ وہ جی بھر کے عیدیں، جتر عیدیں تو کر گئیں..... کوئی نہیں جو میری فریاد سنے..... سب کے سب اپنی اپنی خوشیوں میں مست ہیں..... ہائے کیا میں ملتان سے اپنا گھر بار لانے کے لئے نکلی تھی..... ہائے اپنے بچے کو بھینٹ چڑھا دیا میں نے۔"

کرائے دارنی سے ضبط نہ ہو سکا۔ اسے سمجھا کر بولی۔

"ارے خدا کے آگے توبہ کرو بیٹی! وہ اوپر والا بہت بے نیاز ہے۔ اس طرح کی بے سروپا باتیں مت کرو۔ وہ تو معصوم بچہ تھا۔ اس سے یا تم سے کس کی دشمنی ہے؟ یہاں سب تمہارے اپنے سگے خون کے رشتے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھو تو۔ سب کیسے بلک بلک کر رو رہے ہیں۔ بے چین و بے قرار ہیں۔"

"چپ رہو میرے دشمنوں کی بچی!" دفعتہ وہ لال لال دیدے نکال کر دیوانوں کی طرح دھاڑی۔ جن لوگوں نے اسے عید سے عیدی جھپٹ کر جھپٹتے دیکھا تھا، وہ اس کی بدتمیزی پر آنکھیں پھاڑ کر رہ گئے۔ ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ ہر کسی کو سانپ سونگھ گیا۔ اماں بی بے چاری پر گھڑوں پانی پڑ رہا تھا۔ زمین میں گڑی جاتی تھیں۔ لیکن کرائے دارنی نے بے مثال تحمل کا مظاہرہ کیا اور زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر اٹھ کر فرشی دری بچھانے میں مصروف ہو گئی۔

موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے سعدیہ نے بہن کو نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ نازیہ کے قریب سے بھی گزر گئی تو وہ اس سے چمٹ کر پھوٹ بہے گی اور مزید غضب ہو جائے گا۔ اس لئے وہ وہیں سب کے بیچ بیٹھ گئی۔ ایک بات سے اسے بہت کوفت ہو رہی تھی کہ وہ بہن کی سسرال کے لحاظ سے اور وہ بھی فاخر کے ہمراہ پہلی مرتبہ آنے کی وجہ سے اچھی خاصی تیار ہو کر آئی تھی۔ اپنا خوش رنگ ریشمی جوڑا اسے پریشانی اور خجالت میں مبتلا کئے دے رہا تھا۔ پرسے کے لئے آنے والوں میں سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ فرحت کی بڑی سالی ہے۔ چنانچہ موت کا گھر ہونے کے باوجود کوئی سعدیہ کو ستائشی نظر سے دیکھ رہا تھا تو کوئی تمسخر سے۔ کسی کی نگاہ میں افسوس تھا تو کوئی حیرت زدہ!

کرائے دارنی نے اس کی شرمساری بھانپ لی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے گھر گئی اور ایک بڑا سا سادہ دوپٹہ لا کر اسے دے دیا۔ سعدیہ نے احسان مند نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ دوپٹہ تبدیل کیا اور باورچی خانے کے قریب والے ہینڈ پمپ پر آ کر خوب رگڑ رگڑ کر منہ دھو ڈالا اور جب وہ دوپٹے سے منہ خشک کر رہی تھی، اسے اپنے قریب سے ہلکی سی سسکی سنائی دی۔ نازیہ باورچی خانے کے اندر کھڑی زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ سعدیہ کے دل پر گھونسا سا لگا۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور چند قدم بڑھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔

"آپا!..... آپا!..... میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ ہچکیوں کے درمیان بمشکل بولی۔ "میں نے کچھ نہیں کیا ہے آپا!..... معطر باجی بلاوجہ [illegible] ہو رہی ہیں۔"

سعدیہ نے اسے بھینچ کے گلے سے لگا لیا اور تنبیہ آمیز لہجے میں بولی۔ "حوصلہ کرو نازیہ! حوصلہ! منہ سے آواز مت نکالو۔ یہ تمہاری سسرال ہے اور سسرال کے معاملات بہت نازک ہوا کرتے ہیں۔ اپنی کسی معمولی سی [illegible] ورنہ [illegible] رشتوں میں ہمیشہ کے لئے گرہ پڑ سکتی ہے [illegible] اور اس میں سب سے زیادہ نقصان تمہارا ہو گا۔"

"آپا!" اس نے بچوں کی طرح مچل کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔

"بس خاموش ہو جاؤ [illegible]" سعدیہ نے [illegible] ڈانٹ دیا۔ "اب تم ایک شادی شدہ لڑکی ہو۔ اور لڑکیوں کی زندگی کا یہ دور آزمائشوں سے پر ہوتا ہے۔ قدم قدم پر نئے نئے تجربوں اور مشاہدوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ مہربانی کر کے ان گیلی آنکھوں کو خشک کر کے پوری طرح کھلی رکھو۔ دل و دماغ پر کنٹرول رکھنا سیکھو۔ آزمائش کی اس گھڑی میں اپنی جان کی تربیت کو رسوا مت ہونے دینا۔ ہمارے میکے میں ابھی ہماری اور بھی بہنیں موجود ہیں۔ دیکھو کہیں ان کے حق میں کانٹے مت بو دینا۔"

نازیہ کے بہتے ہوئے آنسو آنکھوں کی دہلیز پر ٹھٹک گئے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر اپنی کم سخن آپا کو دیکھا مگر سعدیہ اسے مزید حال دل سنانے کا موقع دیئے بغیر جا چکی تھی۔

وہ واپس آ کر سب کے درمیان بیٹھی تو رنگ محفل بدل چکا تھا۔ معطر کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ نازیہ کی بڑی بہن سعدیہ ہے۔ قریب سے دیکھ کر پہچان بھی گئی تھی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے اس کے گلے لگی رو رہی تھی مگر اب اسے بری طرح گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ تیور بگڑے ہوئے تھے۔ سعدیہ کے قریب بیٹھی ایک بڑی بی نے دریافت کیا۔

"بیٹی! تم دلہن کے گھر سے اکیلی آئی ہو۔ تمہاری اماں کیوں نہیں آئیں؟"

سعدیہ نے ادب سے جواب دیا۔ "خالہ جی! امی کو خبر نہیں ہے۔ ورنہ وہ فوراً آ جاتیں......"

معطر نے اس کی بات کاٹ دی اور ہذیانی ہنسی ہنس کر بولی۔ ”تو جی...... جھوٹے دلاسے سن لو۔ وہ اپنی سسرال کا چھو فرحت اپنی سسرال کو بھول جائے گا؟ اور بھی کسی کو نہیں، اپنی سسرال کو۔ واہ واہ سبحان اللہ۔“

سعدیہ نے تحمل اور متانت سے وضاحت کی۔

”میں بھولنے کو نہیں کہہ رہی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں آج ہی میکے آئی تھی۔ وہیں اچانک ہم نے یہاں آنے کا پروگرام بنا لیا۔ یہاں ہو جانے والے المیے کا تو کسی کو کانوں کان معلوم نہ تھا۔ ہم یہاں آنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں اطلاع بعد میں پہنچی ہو گی۔ بس یہ بات ہے۔“

پھر اس نے معطر کو براہ راست مخاطب کر کے بے حد نرمی اور ملائمت سے کہا۔

”اگر یہ بات نہ ہوتی تو خود میرا حلیہ دیکھ لیجیے۔ کیا انتقال کی خبر سن لینے کے بعد میں اس طرح سے تیار شیار ہو کر آنے کی جرأت کر سکتی تھی؟“

معطر نے آنکھیں رگڑتے ہوئے تلخی سے طنز کیا۔ ”کیوں...... تو کیا ہو گیا؟ تمہیں یا کسی دوسرے کو کیا ضرورت ہے سوگ منانے کی؟...... کوکھ میری اجڑی ہے۔ بیٹا میرا بچھڑا ہے مجھ سے۔ ساری عمر ماتم کرنا تو میرے حصے میں آیا ہے۔ تم سب خوب خوشیاں مناؤ، قہقہے لگاؤ، جشن برپا کرو۔ کس نے منع کیا ہے بناؤ سنگھار کرنے سے۔“

اردگرد بیٹھی ہوئی جمع ہونے والیوں میں ایک ایک کے چہرے پر تجسس پھیل گیا۔ ایک گرم لہری دوڑ گئی ہر طرف۔ سب سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔

معطر کے عجیب و غریب رویے پر سب کو حیرت تو تھی مگر یہ موقع ہرگز گہرائیوں میں اترنے کا نہیں تھا۔ اس وقت ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا [illegible] زیادہ وہ خود بھی آزمائش کی کسی بھی منزل میں جا گری ہو تاہم ضبط و حوصلے کی جانے کون سی منزلوں سے گزر کر اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

مگر آج کے دن قدرت کو سعید احمد کے گھرانے کی آزمائش ہی آزمائش منظور تھی۔ جیسے ہی منے کی آخری تیاری مکمل ہوئی اور لائے کفنائے کے بعد مردوں نے اسے اٹھا کر [illegible] ہوئے برآمدے میں لا کر رکھا۔ بے حال معطر نے بال نوچ نوچ کر اپنے آپ کو پیٹ ڈالا۔ اچانک اس کی نظر سعید احمد کی بیوی پر جم کر رہ گئی جو آنسو پونچھتی ہوئی چھوٹی بچی کے ساتھ ڈیوڑھی میں داخل ہوئی تھیں۔ اس کے ماؤف ہوتے دماغ کا پرزہ ایک دفعہ پھر گھوم گیا اور کسی تردد میں پڑے بغیر وہ چلا چلا کر دہائی دینے لگی۔

”ہائے لوگو...... عیدیاں بھیجنے والے بھی آ پہنچے...... ہائے...... ہائے میرا بھائی اور بیٹا ایک ساتھ چھین لیا...... چھین لیے ان لوگوں نے میرے سارے پیارے رشتے۔ ہائے میری زندگی کن سہاروں پر گزرے گی...... اب میں کس پہ ناز کروں گی...... کون میرے دکھ درد سمیٹے گا؟...... بھائی کو تو اب فرصت پاس بیٹھنے کی بھی نہیں رہی۔ عیدوں پر عیدیں منائی جا رہی ہیں۔ میرے ویران دل میں کوئی نہیں جھانکتا...... ہائے...... ہائے میرے اللہ...... ماموں، ماموں پکارتا ہوا میرا معصوم بچہ موت کے گڑھے میں جا گرا مگر افسوس کہ ظالموں کے کانوں پر جوں نہ رینگی...... ہائے اللہ! میرے لعل کو چار کندھے پہنچا دیا اور اب خود بھی آ گئے آنسو بہاتے...... دکھاوے کے نیر بہاتے ہوئے...... ارے کوئی میرے منے کے باوا کو بلا لائے۔ اس کی دادی، پھوپھیاں کہاں گئیں؟...... انہیں پکارو۔“

اس کی چیختی ہوئی آواز تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ سارے گھر پر موت کا سناٹا طاری تھا۔

اپنے پرائے سب کھلی آنکھوں اور پوری سماعت سے سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے۔ سعید احمد کی بیوی کے بدن میں کاٹو تو لہو نہ تھا!

✖●✖

شاکر حسین کی طبیعت پہلے کی نسبت خوب بحال اور بہتر ہو چکی تھی مگر مجال ہے کہ اندرونی حصے میں ٹک کر رہتے ہوں۔ گو کہ آج کل فاخر کے مستقل یہیں رہنے کی وجہ سے انہیں زمینداری کے جھمیلوں سے فرصت ملی ہوئی تھی تاہم گھر پر ان کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ جتنی دیر ٹکتے، اپنے بیٹے شاہکار اور ننھی کشور جہاں سے کھیلتے رہتے۔ پھر اکتا کر باہر مردانے میں آ پڑتے۔ فاخر کی غیر موجودگی میں انہوں نے کئی بار دوسرے گاؤں جانے کی ٹھانی لیکن اجازت نہ مل پائی۔ ان دنوں گھر کی ماؤں کی خوب بن آئی تھی۔

چچی جان نے سب کی منت اور مرادیں اچھی طرح ذہن نشین کر رکھی تھیں لہٰذا شاکر کے ہسپتال سے آنے کے بعد فوراً اس طرف متوجہ ہو گئیں۔ ان کا بس چلتا تو ایک دن سے بھی کم مدت میں تمام منتیں پوری کروا ڈالتیں مگر رمضان المبارک کے اشارے پر سب سے پہلے شاکر کی ذہن شگفتہ کی منت پوری کی گئی۔

نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ [illegible] پکائے گئے۔ مالکن تھی یا خادمہ، سب کا جوش و خروش اور خوش عقیدگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ رات بھر ایک جشن کا سا سماں رہا۔

[illegible] منہ اندھیرے سحری کے بعد [illegible] ملنگنیوں کی ٹولی روانہ ہو گئی اور یوں یہ حسن و خوبی مسجد کا طاق گلگلوں کے چڑھاوے سے بھر کر خیر و عافیت سے واپسی ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ہر دوسرے تیسرے دن کسی نہ کسی کی منت پوری ہونے لگی۔ کیونکہ چچی جان کا کہنا تھا کہ چونکہ مراد پوری ہو چکی ہے [illegible] بعد از جلد اتار دینا چاہیے۔

[illegible] بی بی کے کونڈے والی منت انہوں نے بہ ذات خود اپنی نگرانی میں شگفتہ سے پوری کروائی تب [illegible] اس گھر کا تھا۔

”[illegible] بس قوت کی جو بھی منت مانی گئی ہو اسے عید سے پہلے پہلے پوری کر ڈالے ورنہ [illegible] (شاکر) [illegible] خدا خدا کر کے تو جان بخشی ہوئی ہے۔ اگر کسی کو منت پوری کرنے میں کسی مالی اسباب کی مجبوری ہو تو ہم سے رجوع کرے۔ جو اس معاملے میں ہم سے درکار ہو گا، ہم مہیا کر دیں گے۔ مگر یاد رکھنا، کوتاہی اور بھول چوک ہرگز قابل معافی نہ ہو گی۔ بعد کو کوئی حیلہ نہ سنا جائے گا۔“

تانیا ابھی تک سہمی تھی۔ ایک تو ننھی کشور جہاں کی پیدائش کے فوراً بعد ہی شاکر کو چوٹ لگ گئی تھی۔ ان دونوں واقعات کا اثر شگفتہ کے جسم و جاں اور دل و دماغ نے براہ راست قبول کیا تھا۔ چنانچہ چھوٹی بھابی کی دلجوئی اور دل بستگی کے خیال سے تانیا ہر وقت ان کا سایہ بنی رہتی۔ کشور کے کام اس نے خوشی خوشی اپنے ذمے لے لیے تھے اور دن رات اسے تحویل میں رکھتی تھی۔ بچی بھی اس سے خوب مانوس تھی۔ چنانچہ پھوپھی، بھتیجی سارا سارا دن مگن رہتیں۔ سسرال سے اسے بلانے کا تقاضا ہوا تو تھا مگر زہرہ بیگم نے بہانے سے مہلت مانگ لی تھی۔ کیونکہ بوا پھولن کو بستی مہر ولی بھیج کر انہوں نے تانیا کی گود بھرائی کے لیے منت تو مان لی تھی مگر سات جمعرات چراغ جلوانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہر جمعرات پھولن کو کسی نہ کسی صورت مہر ولی کے مزار پر چراغ جلانے کے لیے بھیجا تو جا رہا تھا لیکن

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

نہایت رازداری اور خاموشی کے ساتھ۔ حتیٰ کہ گھر کی بہو شگفتہ تک لاعلم تھیں۔

پھولن، تانیا کی چوٹی کے بال مزار مبارک پر باندھ آئی تھی مگر اس نے کہا تھا کہ تانیا کو سات جمعرات تک یہیں رہنا ہوگا۔

تقریباً روزہ افطار کے بعد تانیا کو ہر روز ایک نہ ایک کہانی سننا ہوتی تھی۔ کبھی بی بی سیدہ کی، کسی دن دس بیبیوں کی۔ ماماؤں کی خوب بن آئی تھی۔ سب مل بیٹھ کر نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ سنتیں۔ نذر نیاز دلائی جاتی۔ شیرینی کھا کھا کر سب کے دل بھر گئے تھے۔

یوں شاکر حسین کے رو بہ صحت ہونے کے ساتھ ساتھ سارے کام یکے بعد دیگرے سرانجام دیے جا رہے تھے بلکہ پایہ تکمیل کو پہنچ رہے تھے۔ بالآخر عید کے ہوتے ہوتے سب کی نذریں اور منتیں اتر چکی تھیں سوائے زمانی بیگم کی شکستہ مسجدوں کو دوبارہ بنوا دینے والی منت کے۔

جمعرات کا دن تھا۔

آج پھولن بوا آخری چراغ جلانے گئی ہوئی تھیں۔ اندر ہی اندر گھر کی تینوں بڑیوں کو شدت سے ان کی واپسی کا انتظار تھا۔ تانیا بھی دن گن گن کر کاٹ رہی تھی۔ سسرال سے کوئی نہ کوئی لینے آ جاتا تو بہانے بنا بنا کر جان چھڑانی مشکل ہو جاتی تھی۔ آج ساتویں جمعرات پوری ہونے کو تھی۔ وہ دل میں امیدوں، آرزوؤں کے سینکڑوں چراغ جلائے بیٹھی تھی۔

خدا خدا کر کے پھولن بوا اپنے قدم [illegible] نمودار ہوئیں اور سیدھی زمانی بیگم کے قدموں میں آ بیٹھیں۔ قریب ہی [illegible] شاکر بھائی اخبار پڑھنے میں مصروف تھے لہٰذا زبان کی بجائے انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں [illegible] بیگم صاحبہ کو خیر صلا سے آگاہ کر دیا۔ زمانی بیگم نے دل ہی دل میں [illegible] اور بلند آواز میں دریافت کیا۔

"اے ہے ولاری آج کہاں دفعان ہے [illegible]"

ایک ملازمہ نے قریب آ کر ادب سے جواب دیا۔ "بیگم صاحبہ ولاری کو تو رات سے جاڑا بخار چڑھا ہوا ہے۔ [illegible]"

"اے ہے......" انہوں نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ "روزوں نے تو عقل چوپٹ کر دی۔ عید کیا گزری، گھر کا گھر بیمار پڑ گیا ہے۔ جا بھائی، جا کر اس کی خیر خبر لے۔ بغیر اس کے تو ٹوٹ چکا اس گھر داری کا سلسلہ۔"

ملازمہ نے جاتے جاتے تفصیل سے جواب دیا۔ "رات کو میں نے جوشاندہ ابال کے پلا دیا تھا اور صبح بھی۔ مگر وہ تو ذرا سی آنکھ کھول کر تکیں دیکھ رہی۔ چڑیا بچے کی طرح بھن رہا ہے بیگم صاحبہ! صورت لال بھبوکا لگ رہی ہے۔ ابھی حکیم جی سے نسخہ بندھوایا ہے۔ دوا پلانے جا رہی ہوں۔"

ملازمہ گئی ہی تھی کہ سرور باجی لنگڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ پھولن بوا کو بیٹھے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔ کسی طرف توجہ دیے بغیر پوچھا۔

"آ گئیں تم خیر سے؟ .... کہو خیر صلا رہی سب؟ اب ختم سارے پھیرے؟"

زمانی بیگم نے اپنی آنکھوں آنکھوں میں سمجھانا چاہا مگر تیر، کمان سے نکل چکا تھا۔ پھولن تو کوئی جواب دے نہ سکی، تخت پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے مزید اظہار اطمینان کر ڈالا۔

"واہ! کیا خوب ہے بستی مہرولی بھی۔ ہمیشہ یاد رہے گی اگر ہمارا کام بن گیا تو۔"

اخبار پڑھتے پڑھتے شاکر بھائی اچھل پڑے۔ یوں گویا انہیں کرنٹ چھو گیا ہو۔ "کیا ہوا؟ ......

کیا ہوا بستی مہرولی کو؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

اب سرور باجی کو ہوش آیا مگر تب تک وہ دوسرا سوال کر چکے تھے۔ "کون گیا تھا بستی مہرولی؟"

پھولن بوا کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بیٹھی بیٹھی کھسکنے لگی۔ شاکر بھائی اب تک ایک ایک کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کا انداز عجیب ناقابل فہم سا تھا۔ جسے کوئی بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ تاہم یہاں سب کو اپنی اپنی خیریت مطلوب تھی۔ کسی نے ان کی کیفیت کو نوٹ نہیں کیا۔

سرور باجی تو سٹپٹائی ہوئی تھیں، زمانی بیگم نے بات بنائی۔

"اے بھیا! ہم نے بتایا تو تھا کہ ہم نے تمہارے اچھے ہونے کے لیے دو شکستہ مسجدوں کو از سر نو بنوانے کی منت مانی تھی۔ اسی سلسلے میں آج پھولن بوا کو بستی مہرولی بھیجا تھا۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہاں ایک مرمت طلب مسجد موجود ہے۔ بس یہ بات ہے۔"

شاکر نے دیر سے رکا ہوا سانس بحال کیا اور بے پروائی سے بولے۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں اماں! .... اللہ نے توفیق دی ہے تو کہیں بھی نئی بنوا دیجئے۔ مسجد تو اللہ کا گھر ہے۔ بھلا یہ کیسی منت ہے کہ شکستہ مسجد دوبارہ بنواؤں گی۔"

آئی بلا کو ٹلتے دیکھ کر سرور باجی کا بھی دم میں دم آیا۔ اطمینان سے بولیں۔

"تم کیا جانو ان نازک معاملات کو۔ منت مرادیں اسی طرح سے مانی جاتی ہیں۔ کرم ہے مولا کا کہ ہماری ساری منتیں پوری ہو گئیں۔ تمہاری جان کی سلامتی سے بڑھ کر ہمارے لیے مال نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے، آس پاس کے محلے میں کوئی ٹوٹی ہوئی مسجد نہیں ہے جسے بنوا کر منت پوری کی جائے۔"

شاکر بھائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ دھیرے سے بولے۔

"غریبوں [illegible] اپنے رب کے گھر خوب اچھے اچھے بناتے ہیں۔ ہمارے اردگرد اکثریت پکے گھروں میں رہنے والوں کی ہے۔ [illegible] ہر مسلمان بستی میں ایک عمدہ صاف ستھری مسجد ضرور دکھائی دے جاتی ہے جسے وہ سب مل کر [illegible] بنواتے ہیں [illegible] ہر موقع پر اس کی مرمت اور دیکھ بھال کی خصوصی [illegible] سوچ رکھتے ہیں۔"

"ہاں بھیا! ...... یہ تو آپ نے سو آنے کی بات کی۔" پھولن بوا نے بے اختیار عقیدت سے جھوم کر کہا۔ "اب بستی مہرولی کے مزار شریف والی مسجد کو ہی لے لو۔ کیا اونچے مناروں والی حسین و جمیل مسجد ہے۔ احاطے کی دیواروں تک میں عقیدت مندوں نے چکنی مٹی چکنی کر کے کیسی کیسی مینا کاری کی ہے اور گل پھول بنائے ہیں کہ کیا تعریف بیان کروں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ سنگ مرمر کا گمان گزرتا ہے۔"

شاکر بھائی ایک دفعہ پھر حیران رہ گئے۔ کرید کے پوچھا۔ "پھولن بوا! تم مہرولی میں کیا کرنے گئی تھیں؟"

پھولن کا دم نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے سٹی گم ہو گئی مگر تھیں دبنگ عورت۔ زمانے کا سرد و گرم چکھا ہوا تھا۔ جانتی تھیں اس وقت دونوں بیگمات کے چھکے چھوٹے ہوئے ہیں۔ اس لیے شاکر بھائی کو مطمئن کرنا بھی ان کی ذمے داری تھی لہٰذا جی کڑا کر کے انہوں نے جم کر جواب دیا۔

"میاں! بستی مہرولی میں بہت عرصہ پہلے میری رشتے کی ایک خالہ رہا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

میں کئی مرتبہ مزار شریف کے اندر بھی گئی ہوں۔ بس وہی دیکھی دکھائی، سنی سنائی کہتی رہتی ہوں۔"

"ہاں، یہ ہوئی بات۔" شاکر بھائی ہنس پڑے۔ "اور ابھی دونوں کاموں میں تم بہت ماہر ہو۔ ورنہ مہرولی تو یہاں سے کئی کوس پر واقع ہے۔ تمہارا آنا جانا باکمال بات ہوتی۔"

پھولن بوا ایک دفعہ پھر دم سادھ گئیں۔ اب زمانی بیگم نے انہیں وہاں سے ٹالا۔

"بوا! تم ذرا باورچی خانے کا چکر لگا آؤ۔ آج دلاری اپنی کوٹھری میں پڑی بخار میں پھنک رہی ہے۔ لونڈیوں کی بن آئی ہوگی۔"

"بہت بہتر بیگم صاحب!" پھولن بوا نے مستعدی سے جواب دیا اور برقع بغل میں دابے جلدی سے وہاں سے کھسک گئیں۔ شاکر بھائی نے اخبار الٹتے پلٹتے ہوئے خوش دلی سے پوچھا۔

"پھر اماں! کب جا رہی ہیں آپ مہرولی میں مسجد؟"

زمانی بیگم نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "خود ہی تو بتا رہے ہو کہ وہاں مسجد بنی ہوئی ہے۔"

وہ ہنس دیے۔ کہنے لگے۔ "چلیے، علاقہ میں بتا دوں گا، تعمیر آپ کرا دیجیے گا۔"

زمانی بیگم نے فوراً رضامندی دے دی مگر اپنی شرط بتا کر۔ "ٹھیک ہے...... تعمیری اخراجات کی ذمہ داری ہماری رہے گی مگر ساتھ ہی [illegible] میں ایک عدد مسجد بھی تلاش کرنا ہوگی۔"

شاکر بھائی ہنسنے لگے۔ سرور باجی نے [illegible] ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں تو اور کیا۔ منت کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ جس طرح مانی جائے [illegible] ہماری بھابی ہے۔ انہوں نے ٹوٹی ہوئی مسجد کی مرمت کا کہا تھا اس لیے یہ پہلو بھی [illegible] نظر رکھنا ہوگا۔"

"اسی طرح تمہاری اماں نے" پھر بلا سوچے سمجھے ان کی معلومات میں اضافہ کرنے بیٹھ گئے۔ [illegible] بکرے ذبح کر [illegible] ہی اس بستی مہرولی میں دے آیا تھا لکھو جا کر۔"

شاکر بھائی نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا اور بولے۔ "پھوپھی جان! بھلا اس دفعہ مہرولی کا تذکرہ مسلسل کیوں ہو رہا ہے؟"

زمانی بیگم نے بے چینی سے پہلو بدلا مگر سرور جہاں نے بھی مسکرا کر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اور بھیا تم کچھ زیادہ ہی اس تذکرے سے برافروختہ نہیں ہو رہے؟"

چچی جان بھی آ بیٹھی تھیں۔ سب ہنسنے لگے۔ شاکر بھائی نے جھینپ کر کہا۔ "گھر میں بٹھا بٹھا کر آپ لوگوں نے تو میری ذہنی حالت مشکوک بنا ڈالی۔ بس آج ہی اٹھا ہوں۔"

"بستی مہرولی؟" سرور باجی نے لقمہ دیا۔ شاکر بھائی ہنستے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ چچی جان نے سرور باجی کو گھور کر دیکھتے ہوئے جتلایا۔

"سرور! تم کچھ زیادہ ہی نہیں سٹھیا گئیں؟ بلاوجہ ہی اس گھوڑ ماری بستی کا ذکر کیے جا رہی تھیں۔ اگر جو شاکر کو ذرا سا بھی شبہ ہو جائے کہ ہمارے ہاں سے ماما کی جا کر وہاں چراغ جلا رہی ہیں تو کیسی ہماری سبکی ہوگی۔ گھر کے مرد تو ہماری جراتوں پر حیران ہی رہ جائیں گے۔ اور پھر خدانخواستہ اگر اڑتی ہوئی یہ خبر لڑکی کے سسرال جا پہنچے تو کیا نتائج نکلیں گے؟ سوچو ذرا۔"

زمانی بیگم بھی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ سرور باجی نے تنک کر جواب دیا۔

"اے ہمیں کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ ذرا دیر پہلے آ کر سنتیں، وہ آپ کی وضع دار ماما پھولن یہاں بیٹھی کیسے گل پھول جھاڑ رہی تھی۔ اور یہ زمانی بیٹھی چپکی سن رہی تھی۔ ہم نے تو بلکہ معاملہ رفع دفع کیا

ہے آ کر۔"

"اللہ توبہ ہے سرور باجی!" زمانی بیگم پیشانی پر ہاتھ مار کر مسکرائیں۔ "یہاں ہول ہول کر اختلاج ہونے لگا اور آپ نے انصاف ہی کر ڈالا۔ ہم تو کبھی آپ کو دیکھتے تھے، کبھی پھولن کو اور اس کی تو زبان کے یونہی ٹانکے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ بولنے پر آئے تو بولتی چلی جائے۔ اس وقت بڑی خیریت گزری ورنہ معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا۔"

چچی جان اکتا کر بولیں۔ "چھوڑو اس قصے کو اب۔ شکر ہے مولا کا کہ سات جمعرات پوری ہو گئیں۔ اب بٹیا کو رخصت کرو اس کی سسرال۔ پھولن سے تعریف سن سن کر باجی تو ہم نے بھی جھرجھری لی مگر ہر جمعرات کی جمعرات اتنی دور چراغ جلوانا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اب صاحب مزار سے بھلائی کی توقع رکھو۔ مولا ہم سب کی آرزو پوری کرے اور ہماری بٹیا کی گود ہری ہو۔"

"آمین!" سرور باجی نے جھوک کر کہا، پھر چونک کر کہنے لگیں۔ "کاش! ہم پہلے ہی عقل کر لیتے اور اس کام کے ساتھ ساتھ فاخر کی شادی کے لیے بھی منت مان لیتے۔ ابھی خاصی ہماری تو عقل خبط ہو چکی۔"

زمانی بیگم نے پاندان کھولتے ہوئے پلٹ کے کہا۔ "یہ تو آپ کے صاحبزادے کی مرضی پر منحصر ہے۔"

"کیا مطلب؟" باجی نے فوراً ان کی بات اچک لی۔ "تمہارا مطلب ہے کہ فاخر کو خود ہی اپنی شادی نامنظور ہے؟"

زمانی بیگم نے متانت سے جواب دیا۔ "اس دن اپنے بڑے ابا کے سامنے جو فاخر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، پھر سرور باجی [illegible] بیٹے کی بجائے دو برس کی مہلت عنایت کر دی تھی تو آپ ہی کی [illegible] باجی۔"

"خدا کے غضب سے ڈرو زمانی! ایسے کھلم کھلا ہمارے بچے کو ہمارے منہ پر بیہودہ الزام ٹھہرا رہی ہو۔ وہ باتیں تو سب [illegible] دونوں کے درمیان طے پا رہی تھیں۔ ان باتوں میں اس کا کیا قصور۔ تمہاری ہمیشہ کی یہی عادت ہے۔ انہوں کے سامنے ایک کی اٹھارہ بنا لیا کرتی ہو۔"

"اللہ میری توبہ۔" زمانی بیگم لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ "صاحبزادے کی محبت میں آپ تو سچ کہنے نہیں دیتیں۔"

"اے خبردار زمانی!" وہ بالکل ہی غضبناک ہو گئیں۔ "بس بہت ہو چکیں بدگمانیاں۔ ہر وقت مرنے کی ایک ہی ڈھنگ۔ اگر تمہیں ایسی ہی بے کلی ہے تو چلو کر لو تیاری۔ ہم اپنے بچے کو سہرا بندھوانے کے لیے چلتے ہیں بہاولپور۔ فوراً نکاح پڑھوا دینا اس کا۔ دیکھیں ہم کیسے انکار کرتا ہے وہ۔ تم نے ہمیں سمجھ کیا رکھا ہے۔ اور کیا وہ ایسا احمق ہے کہ انکار کر دے گا؟"

ان کا بے پناہ جوش و خروش دیکھ کر چچی جان کو دخل دینا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے بیک وقت دونوں کو جھاڑ پلا ڈالی۔ "کیا دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہو؟ بے تکی باتوں پر بیٹھی چونچیں لڑا رہی ہو؟ جب گھر کے مرد کسی ایک نکتے پر متفق ہو چکے ہیں تو پھر اب ایک دوسرے پر چوٹیں کرنے سے کیا فائدہ؟ بس بند کرو اپنی اپنی لن ترانیاں۔"

"نہیں چچی جان! آپ خاموش ہو جائیے۔" سرور باجی نے بضد ہو کر کہا۔ "آج ان کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ شادی کرنے سے انکار فاخر نے کیا ہے یا بھیا نے خود اپنی کسی مصلحت کی بنا پر اسے چھوٹ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

دے دی ہے۔ غضب خدا کا یہ کیسی جوتوں سمیت آنکھوں میں گھس رہی ہیں۔ جس طرح سے ہم اس دن موجود نہیں تھے۔ ساری کارروائی ہمارے روبرو ہوئی ہے۔ مجال نہیں کسی کی جو جھٹلا دے ہمیں۔"

زمانی بیگم برا مانے بغیر مسکرا کر بولیں۔ "خودسر اور دلاری اولاد کو چھوٹ نہ دی جائے تو اور کیا کیا جائے۔ اب اسے مصلحت کا نام دیجئے یا کیسی ہی پردہ داری کیجئے۔ کون منع کرتا ہے۔"

سرور باجی برداشت نہ کر سکیں۔ جل کر بولیں۔ "دلاری تم خود کم ہو جو دوسروں سے جلنے لگیں۔ ہم کہتے ہیں زمانی! تم خدا کو یاد کرو۔ بہت بڑے بڑے بول بولنے لگی ہو۔ انسان بڑا نوالہ کھائے مگر بڑے بول نہ بولے۔"

"خدا کی پناہ ہے تم دونوں سے۔" چچی جان نے ایک بار پھر دونوں کو پھٹکارا اور آگے بڑھ کر زمانی بیگم کو ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ وہ بھی خفتی ہوئی ان کے پیچھے اٹھ کر چل دیں۔

***

دسمبر کی نرم گرم دھوپ پورے لان پر پھیلی ہوئی تھی۔ پیڑوں، پودوں کے ہرے ہرے پتے سنہری کرنوں سے دمک رہے تھے۔ چاروں طرف دل و جاں کو بھلی سی لگنے والی گرماہٹ اور پرسکون فضاؤں کا احساس بکھرا تھا۔

شہتوت کے چھدرے پتوں سے چھن کر آنے والے دھوپ چھاؤں کا حسین امتزاج نکلیں گھاس پر بکھر رہا تھا۔ بھابی اور سعدیہ دونوں بھی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھی اپنی اپنی مصروفیت میں کھوئی ہوئی تھیں۔ پورے گھر پر سناٹے کا راج تھا۔

دونوں بچے اسکول گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہسپتال اور نازش آج فرح کا اسٹوڈیو دیکھنے گئی ہوئی تھیں جہاں وہ پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ بھابی سویٹر بنتے ہوئے بولیں۔

"سعدیہ! تم ہی کسی دن نازش کو سمجھانے کی کوشش کرو۔ میں اسے برے وقت کا احساس دلا دلا کر عاجز آ گئی ہوں۔ ادھر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ جب بھی کوئی لمحہ فرصت کا پاتے ہیں اس موضوع کو چھیڑتے ضرور ہیں۔"

سعدیہ نے اخبار کے اوراق میز پر ڈال کر انہیں حیرت سے دیکھا پھر کچھ سمجھ میں نہ آنے والے انداز میں دریافت کیا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ پائی بھابی!...... کیا ہو گیا ہے نازش کو؟"

بھابی نے فوراً ہی بُنائی کا سامان باسکٹ میں رکھ دیا اور دور نظر آنے والے بیرونی گیٹ پر نظر جما کر رازداری سے کہنے لگیں۔

"کتنے ہی رشتے اچھی فیملیز کے آئے اور گئے۔ مگر نازش تو ہامی بھرنا تو در کنار، معمولی سا سنجیدہ ہونا بھی گوارا نہیں کر رہی۔"

"کیوں بھابی؟" سعدیہ کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ لیکن فوراً ہی اس کی دماغی اسکرین پر جھماکا سا ہوا۔ اسے وہ دن یاد آ گیا جب اس نے اتفاق سے نند بھاوج کی گفتگو سن لی تھی۔ حالانکہ انہی لمحات میں اس نے عہد کیا تھا کہ نازش کو اس سلسلے میں کریدے گی ضرور۔ کیونکہ اس نے دونوں کی بات چیت کے موضوع اور انکار و اصرار کی کیفیت کو بہ ہوش و حواس سنا تھا۔ مگر اتفاق وقت کہ اسی روز اسے میکے جانا پڑ گیا تھا اور پھر اس کے بعد اسے آزمائش کے ایک اچھے خاصے دور سے گزرنا پڑا جو اگر ایک کڑا دور کہلاتا تو بے جا نہ تھا۔ کیونکہ ایک طرف تو شادی کے بعد پہلی عید ہونے کے باوجود فاخر اس یادگار دن میں بھی اس سے دور رہا اور دوسری کٹھن ترین گھڑی یہ تھی کہ میکے میں ہونے کے باوجود سب گھر

والوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنی پیاری بہن نازیہ سے عید ملنے سے محروم رہی۔ چنانچہ سعدیہ کو بیک وقت دو محاذوں کا مورچہ سنبھالنا پڑا تھا۔

اول تو گھر کے جملہ افراد اور خصوصاً صغریٰ دادی کی توجہ اس نکتے سے ہٹائے رکھنا کہ فاخر کو اپنی دلہن سے اور خصوصیت کے ساتھ عید کے دن ہی جدا کیوں رہنا پڑا؟ ویسے تو شکر ہے وہ عید کے اگلے روز کسی نہ کسی صورت آ پہنچا تھا۔ دوئم نازیہ کا سسرال سے میکے نہ آنا۔ یقیناً وہ وہاں بہت دلگیر اور رنجیدہ ہو رہی ہو گی۔ مگر یہاں اس کے میکے میں بھی اس کی غیر موجودگی سب کی آنکھ کا آنسو اور دل کا درد بنی رہی۔ امی جان اٹھتے بیٹھتے آہیں بھرتی رہیں۔ بہن بھائیوں نے پل پل یاد کیا۔ سعید احمد نے ایک جامد چپ اور گہری خاموشی کے ساتھ اس لمحے کو بسر کیا۔ صغریٰ دادی "کچھ سمجھے، کچھ نہ سمجھے" والی کیفیت میں مبتلا رہیں لیکن جیسے ہی عید کا اگلا دن قریب اختتام ہوا انہوں نے شور مچا دیا۔

"ہائے ہائے!...... لڑکی کی سسرال ہے یا حوالات۔ مانا کہ نند کا بیٹا مر گیا مگر تھا تو معصوم بچہ ہی۔ اب کیا نئی دلہن بھی سوگ میں بیٹھی رہے؟"

سعدیہ نے ان دونوں معاملات کی کمان اپنی سوجھ بوجھ سے بڑی خوش اسلوبی اور احسن طریقے سے سنبھالے رکھی۔ وہ بیک وقت سب کو مطمئن کرنے کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف رہی۔ والدین کی دلجوئی کرتی رہی لیکن فاخر کے آ جانے کے بعد وہ مجبور ہو گئی۔ کیونکہ فاخر نے سسرال میں دو گھنٹے رکنے اور شیر خرمے سے انصاف کرتے ہی واپسی کا نعرہ لگا دیا تھا۔

تاہم وہ آتے آتے بھی امی جان کے کان میں اچھی طرح پھونک کر آئی تھی کہ کہیں صغریٰ دادی کے کسی جذباتی فیصلے کے بہاؤ میں نہ بہہ جائیں۔ بیاہتا بیٹی کے سسرالی معاملات میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہے۔

اس طرح حالات اور واقعات نے اس کے ذہن سے نازش والا معاملہ تقریباً محو کر ڈالا تھا لیکن بھابی کی بات سنتے ہی وہ چونکنا ہو گئی۔

اس کی "کیوں؟" سن کر بھابی اسے نہایت سنجیدگی سے تفصیل بتانے لگیں۔

"دیکھو! دنیا کی کون سی لڑکی نہیں جانتی کہ شادی ایک نہ ایک دن کرنی ہی پڑتی ہے۔ بڑے سے بڑے وزیر، سفیر کی لڑکی بھی دیکھنے والوں کو نکاح بیاہ کے بغیر بھلی نہیں لگتی کیونکہ یہ راستہ تو ہماری شریعت بلکہ دنیا کے ہر مذہب نے اپنایا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی اپنے مقام پر مسلم ہے کہ یہ نیک کام عمر کی ایک مناسب حد کے اندر اندر سرانجام ہو جانا زیادہ احسن اور مناسب ہے۔ اس کے بہت سے فوائد اور برکات ہیں۔ سعدیہ! لوگوں کے مختلف تجربات اور مشاہدات نے اس حقیقت کو ثابت کر ڈالا ہے کہ اور اتنے ہو جانے کے نتائج اور خاص طور پر لڑکیوں کے لئے بعض اوقات نہایت بھیانک اور افسوسناک نکلتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر ہر لڑکی یا ہماری نازش کی طرح ضد لگا کر بیٹھ جائے تو پھر تو نسل انسانی کا تو نظام ہی درہم برہم ہو جائے!

پیار و محبت، الفت و ہمدردی کا کون سا راستہ ہے یا طریقہ جو میں نے اپنا کر نہ دیکھ لیا ہو۔ وہ کسی صورت راہ راست قبول نہیں کر پا رہی۔ پاپا کے انتقال کے بعد ایک نہایت نازک اور اہم ذمہ داری آ پڑی تھی مجھ پر مگر خدا گواہ ہے میں بھی اس ذمہ داری سے نہیں گھبرائی۔ دل میں ہمیشہ یہی سوچا کہ قدرت نے ایک عدد جیتی جاگتی بیٹی سے نواز دیا ہے۔

یونیورسٹی سے فارغ ہو کر یہ گھر بیٹھی تو میں تب بھی زیادہ سنجیدہ نہیں تھی۔ مجھے گھر کی رونق میں

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اضافہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہمارے گھر میں ذہنی کشمکش کی یہ کیفیت بہت دنوں تک خارج از بحث رہی۔ کیونکہ میں نے اس معاملے کو زیادہ سیریس نہیں لیا۔ وہ تو ایک دن ڈاکٹر صاحب اس کی مسلسل خاموشی پر چیخ پڑے۔ تب میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ نازش مسلسل اس تذکرے پر کتنی کترا جاتی ہے۔ ظاہر ہے، نازش یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تو عمر کے اس دور سے گزر رہی تھی جب عزیز داری بڑھانے کے لیے لوگ از خود متوجہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے کئی رشتے آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی پسند ناپسند معلوم کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپ دی جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ اب وہ تقریباً ہر روز مجھ سے جواب طلبی کرتے ہیں مگر مجھے کوئی جواب موصول ہوتا تو میں انہیں مطمئن کرتی نا۔ بالآخر یہ کام التوا میں پڑتا گیا۔ میں گہرائی میں اترے بغیر ڈاکٹر صاحب کو سمجھا بجھا دیتی۔ یہ تو اب کچھ عرصے سے میں چونکی ہوں۔ خاص طور سے کوئی بے تکلف ملنے والی مل جائیں تو کسی طرح کی بات ہنسی ہنسی میں کہہ جاتی ہیں۔ تب میں سوچتی ہوں کہ میں کسی کو کیا جواب دوں؟ نند کی شادی نہ کرنے میں میرا کیا مفاد ہو سکتا ہے...... ماشاء اللہ تم دونوں یونیورسٹی کی ساتھی ہو۔ تمہیں دیکھ کر مجھے بھی احساس ہوتا ہے کہ نازش کو بھی زندگی کا یہ اہم فیصلہ کر لینا چاہیے۔ چار روزہ زندگی میں اور کیا رکھا ہے؟ اتفاق سے ڈاکٹر صاحب نے کسی کا ذکر کیا ہے بلکہ لڑکے کی چند تصویریں بھی دی ہیں۔ مگر یہاں معاملہ وہی ہے...... نازش ...

سعدیہ ... بھابی خاموش ہو گئیں تو ... سمجھ گئی۔ اس کی ذہنی رو کہیں سے کہیں بہتی جا رہی تھی۔ دسمبر کی ہوائیں اونچے اونچے درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی پھڑپھڑا رہی تھیں۔ کئی لمحے بیت گئے۔ بھابی چپ ... بے شمار موسمی رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے اپنی بہار دکھلا رہے تھے جن پر خوشنما پروں والی تتلیاں منڈلا رہی تھیں۔ دوپہر کا سناٹا پنجرے میں بند کئی ننھی چڑیوں کی چوں چوں سے گونج رہا تھا۔ فضا میں پھولوں کی باس مہک رہی تھی۔ بھابی کے چہرے پر ملال کا رنگ ... سعدیہ نے تجسس لہجے میں دریافت کیا۔

"اس دفعہ آپ نے پوچھا تو ہوگا۔ کیا جواب دیا اس نے؟"

بھابی نے ایک گہرا سا سانس لیا اور پہلو بدل کر بولیں۔

"اس دفعہ تو اس نے میرا دل دکھانے کی حد کر ڈالی ہے۔ کیونکہ میں ڈاکٹر صاحب کے ایما پر اس سے حتمی جواب کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ وہ کم ذات مغرور کی معلوم نہیں کیا سمجھی، منہ پھاڑ کر بولی...... اگر میں ایسی ہی آپ پر بوجھ ہوں تو...... تو بہت بہتر ہے۔ آپ بھائی جان کو اطمینان دلا دیجئے۔ میں ملازمت کر کے اپنی کفالت کر لوں گی۔" بھابی ایک دفعہ پھر گم صم ہو گئیں۔

سعدیہ بھی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اس نے جو سنا تھا، اس کی تصدیق ہو گئی تھی۔ بھابی بالکل سچ کہہ رہی تھیں۔ کچھ دن پہلے یہ ساری گفتگو سعدیہ خود اپنے کانوں سے سن چکی تھی۔

"بھابی جان!" وہ اٹھ کر ان کے قریب آ گئی۔ "آپ فکر مند مت ہوں۔" اس نے محبت اور ملائمت سے ان کے شانوں پر اپنے بازو پھیلا دیے۔

"یہ کوئی ایسا گمبھیر مسئلہ ہرگز نہیں ہے۔" سعدیہ کی آواز میں سچی ہمدردی کی مٹھاس اور پرخلوص گداز کا رچاؤ تھا۔

"آپ یہ سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس کے انکار کی تہہ میں ہرگز کوئی ایسی ویسی رازوں والی بات نہیں چھپی ہے۔ میں اسے اپنے تعلیمی دور سے جانتی ہوں اور

بات میں آپ کو سچ ثابت کر کے دکھا دوں گی۔ بس تھوڑی سی مہلت درکار ہے۔"

"تم دونوں تو...... ہنی مون پر جا رہے ہو!"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔" سعدیہ تسلی آمیز انداز میں ہنس پڑی۔ "آج سے تو فاخر نے باہر جانے کی دوڑ دھوپ کا آغاز کیا ہے۔ میرے پاس بہت وقت ہے۔ آپ بے فکر رہیے۔ جاتے جاتے اس نازش کی بچی کو ایسا ٹھیک کر کے جاؤں گی کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

⁂

"امی جان! معطر آپا کے منے کا چالیسواں ہے۔ آپ ضرور آئیے گا۔ اماں بی نے خصوصاً کہلوایا ہے۔" رات کو جب ملنے ملانے سے فرصت مل چکی تو نازیہ نے اپنی ساس کا پیغام ماں کو دیا۔ وہ بہت سارے دنوں کے بعد آج شام ہی میکے آئی تھی۔ فرحت اسے گھر پہنچا کر حمید کے ساتھ باہر گھومنے چلا گیا تھا۔

آج نازیہ کے اچانک آ جانے سے سارا گھر خوش ہو گیا تھا۔ امی جان بھی قدرے مطمئن ہو گئی تھیں اور اس کے قریب دوسری چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ بیٹی کی بات انہوں نے حیرت کے عالم میں سنی اور بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

"منے کا چالیسواں؟...... کون کر رہا ہے؟"

"کون کرے گا؟" نازیہ نے سوال کر کے خود ہی جواب دیا۔ "آپ بھی کمال کرتی ہیں امی جان! اماں بی کر رہی ہیں۔ اور کون کرے گا؟"

ان کی حیرت قدرے کم ہوئی۔ سنبھل کر بولیں۔ "ہاں بیٹی! اماں نہ کریں گی تو کون کرے گا؟ بے چارہ امی کے پاس آ کر تو فوت ہوا ہے۔ خدا کسی کی گود یوں نہ اجاڑے۔ سب کی مامتا ٹھنڈی رہے۔ ہمیں تو اب تک یقین نہیں آتا کہ ہنستا کھیلتا بچہ ... جب ... ہو گیا ... تو سکتے کی سی ... ساری عمر بھی رنجیدہ رہیں گے اس کے لیے۔"

نازیہ نے متاثر ہو کر کہا۔ "سچ کہا آپ نے۔ مجھے تو ہر وقت یاد آتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے گود میں لیے بیٹھی ہوں ... شروع میں تو مجھے گھر کے ہر کونے سے اس کی ... سنائی دیتے تھے۔ بعض دفعہ سوتے میں لگتا، منہ پر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تھپڑ لگا رہا ہو۔"

"ہاں...... تم سے مانوس بھی بہت تھا۔ کتنے لاڈ اٹھاتی تھیں اس کے۔"

"مجھ سے کہیں زیادہ تو اپنے ماموں کا لاڈلا تھا۔ بسا اوقات وہ تو خود کو اس کی موت کا ذمہ دار ٹھہرانے لگتے ہیں۔"

"ارے بیٹی! یہ کیا بات کہہ دی تم نے؟ اللہ کے آگے توبہ کرو۔"

"نہیں امی جان!...... میں اپنے دل سے گھڑ کر نہیں کہہ رہی۔" نازیہ نے سنجیدگی سے انہیں یقین دلایا۔ "جس دن معطر آپا کا موڈ زیادہ خراب ہوتا ہے اور وہ اپنے آپے میں نہیں رہتیں، سب کو چلا چلا کر برا بھلا سنانے لگتی ہیں۔ اس دن وہ ضرور اکیلے میں مجھ سے کہتے ہیں، آپا بے چاری کا منا ہماری غفلت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ہماری بے توجہی لے ڈوبی اسے۔ اگر میں اس روز سمجھداری سے کام لیتا اور منے کو ہسپتال سے نہ لے کر آتا تو یقیناً یہ اتنا زبردست اور خوفناک سانحہ جنم نہ لیتا۔"

امی جان نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر اداسی سے کہا۔ "ارے یہ سب انسانی عقل اور شعور کا پھیر ہے۔ ورنہ قدرت کے فیصلوں کو کون چیلنج کر سکتا ہے؟...... موت و حیات کے معاملات اس

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

قدرت والے نے اپنے اختیار میں رکھے ہوئے ہیں۔ جمعرات قبر میں آتا ہو، وہ بھی باہر نہیں آ سکتی۔"

نازیہ کسی خیال میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد امی جان نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

"معصوم بچہ تھا۔ جنت کا پرندہ۔ چالیسواں کاہے کو رکھ لیا تمہاری ساس اماں نے؟"

نازیہ نے دبی زبان سے جواب دیا۔ "اماں بی بھی آپ والی بات کہہ رہی تھیں مگر معطر آپا نے اودھم مچا دیا۔"

"اس میں اودھم کی کیا بات تھی؟"

"تھی کیوں نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میرا بچہ کوئی لاوارث تھا کہ جس کے لئے کہہ دیا جائے کہ مر گئے مردود، نہ فاتحہ نہ درود۔"

"ہائے غضب۔" امی جان کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "اتنے ذرا سے معصوم کے لئے ایسی کہاوتوں کی کیا ضرورت ہے؟ میری نظر میں تو تمہاری نند نے کوئی قاعدے قرینے کی بات نہیں کی۔ قطعی ضروری نہ تھا کہ ماں کو اس وجہ زیر بار کرتیں۔ وہ بے چاری پہلے سے ہسپتال، دوا دارو سے لے کر موت میت، کفن دفن جھیل کر بیٹھی ہیں۔ ان کے سسرالی تو آ گئے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔" نازیہ نے سادگی سے بتایا۔

"ملتان سے منے کے سوئم والے دن اس کے ابا، دادی اور ایک پھپھو آ پہنچے تھے۔ اب بھی ہیں سب لوگ۔"

"سوئم میں؟" امی نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا منے کا سوئم بھی ہوا تھا؟ میں تو دو دن متواتر جاتی رہی تعزیت کے لئے۔ مجھ سے کسی نے کہا نہ کھلایا۔"

"دراصل..... اماں بی کا تو خیال تھا ذرا سا ہو مختصر سا کرنے کا۔" نازیہ تفصیل سے بتانے لگی۔ "ورنہ ظاہر ہے وہ آپ سے ذکر ضرور کرتیں۔ اس روز آپ کے اٹھ جانے کے بعد ملتان والے پہنچے تھے۔ ان سب سے مل کر تو معطر آپا ایسی بکھریں، ایسی بپھریں کہ سارا گھر سہم کر رہ گیا۔ کسی طرح چپ نہ ہو رہی تھیں۔ تب ہی انہوں نے رٹ لگائی کہ منے کا سوئم ہو گا تو ضرور ہی ہو گا۔ جس کسی نے سمجھانا چاہا، انہوں نے پلٹ کر بری طرح لتاڑ دیا۔ لہٰذا ان کے بھائی نے سب کو دخل دینے سے منع کر دیا اور آپا کو من مانی کرنے دی۔"

امی جان نے کرید کر پوچھا۔ "کھانا وغیرہ پکوایا ہو گا؟"

"جی ہاں...... بھی کچھ ہوا تھا۔" نازیہ بتانے لگی۔ "پوری دیگ بھر کھانا پکوایا گیا تھا۔ آپا نے بھائی سے کہہ کر باقاعدہ مدرسے سے بہت سارے پڑھنے والے بلوائے تھے۔ پارے بھی پڑھوائے گئے۔ فاتحہ خوانی ہوئی۔ تھوڑے تھوڑے کئی اقسام کے کھانے کے علاوہ دودھ پر بھی فاتحہ دلوائی کیونکہ منا دودھ جو پیتا تھا۔"

"اللہ اکبر۔" امی جان پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھیں۔ "میری تو آنکھیں کھلی جا رہی ہیں کم فہمی اور ناسمجھی کی یہ بات سن سن کر۔ تمہاری ساس تو بہت سمجھدار خاتون ہیں۔"

نازیہ کو بھی آج بہت دنوں کے بعد جی کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا۔ وہ امی جان کا ہی دیا یہ سبق بھول گئی کہ شادی شدہ لڑکیوں کو بھی سسرال کی باتیں میکے اور میکے کے مسائل سسرال میں جا کر بیان نہیں کرنے چاہئیں۔ بلکہ آج تو امی جان بھی کسی دوسری ہی دھن میں تھیں۔ نازیہ نے مزید کھل کر

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بتانا شروع کر دیا۔

"سوئم کے بعد معطر آپا نے دسواں، بیسواں سب نہایت اہتمام اور دل سے کیا ہے۔ ہر جمعرات کی جمعرات محلے بھر سے بچے جمع کر کے انہیں دودھ پلانا، نت نئے حلوے اور پھل کھلانا اپنے معمولات میں شامل کر لیا ہے۔ جمعرات کے دن صبح سے باورچی خانہ سنبھال لیتی ہیں۔ مجھے قریب میں پھٹکنے تک نہیں دیتیں بلکہ نکال باہر کرتی ہیں۔"

امی جان نے حیرت کے عالم میں دریافت کیا۔ "کیا جمعرات کو کھانا وانا خود پکاتی ہیں؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔" نازیہ نے جواب دیا۔ "ان کے بچے خواہ کتنے ہی روپیٹ رہے ہوں، انہیں قطعی قابل توجہ نہیں سمجھتیں۔ اور ایسا نہیں ہے کہ اس روز سارے گھر کے لئے کھانا پکاتی ہوں۔ جی نہیں، وہ کہتی ہیں میں اپنے بچے کے لئے نیاز دلوانے کی تیاری کر رہی ہوں۔ اس سلسلے میں وہ کئی طرح کے گوشت سبزی ترکاری وغیرہ تیار کرتی ہیں۔ پہلے تو باورچی خانہ کو نئے سرے سے دھو دھلا کر صاف کرتی ہیں، چولہا برتن آئینہ کر لیتی ہیں۔ عصر کے بعد ایک مولوی صاحب کو بلوا کر فاتحہ لگواتی ہیں۔ اور ہاں، جمعرات کو قرآن خوانی بھی کرواتی ہیں۔"

امی جان نازیہ کی روداد سنتے سنتے تھک سی گئی تھیں۔ تکیے پر سر رکھتے ہوئے دھیرے سے بولیں۔

"کچھ بھی ہے، بھئی ہم تو یہ کہتے ہیں کہ فضول قسم کے اخراجات ہر کسی کے لئے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اللہ اپنا رحم کرے، موت ہو یا شادی، ہر موقع پر بے جا ہی خرچ ہوتا ہے لیکن اسراف بے جا کی پکڑ اللہ کے ہاں بھی ہے۔"

نازیہ نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "ان باتوں کی وہاں کوئی گنجائش نہیں ہے......" مزید کچھ کہتے کہتے اس نے اپنی زبان روک لی ورنہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ آج ماں کو اپنے جگر کے وہ ناسور دکھا ڈالے جو بد دماغ نند کی زبان درازیوں نے اس کی روح میں چھید کر کے ڈالے تھے۔

یہ حقیقت بھی تھی کہ معطر نے منے کی موت کے بعد سب سے زیادہ بھاوج کو ہی ستم کا نشانہ بنایا اور بلاوجہ تاک تاک کر ایسے کاری وار کئے تھے کہ نازیہ زخموں سے گھائل اور نڈھال ہو گئی تھی۔

اس دوران جب بھی اس نے میکے آنے کا قصد کیا تھا، معطر نے ہی اس کا راستہ روک لیا تھا۔ "ہائے ہائے! اس بے حس بھاوج کو اپنے سیر سپاٹے کی پڑی ہے۔ یہاں گھر لٹ گیا، برباد ہو گئے، کوکھ اجڑ کر خاک ہو گئی مگر ان اپنوں کی بے مروتی نہ گئی۔ لوگو! ایسا ستم دیکھا سنا کہیں؟"

کبھی کہتی۔ "توبہ! موت والا گھر ہے۔ تعزیت کے آنے والوں کا تانتا بندھا ہے اور ہماری اکلوتی بھاوج کو میکہ یاد آ رہا ہے۔ اب لڑکی بھی کیا اپنی ہی گھرداری سے بے پرواہ۔ چولہا چوکا تو عورت اپنا ہی کرتی ہے نا! بھلا یہ ذمہ داری کے کام کون سنبھالے گا۔ کام بڑھ گیا تو کیا گھر بار چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں؟ ایسی خود غرضی اور مطلب پرستی کس کام کی؟"

نازیہ اندر ہی اندر سینکڑوں آنسو اتار کر اوپر سے پرسکون رہنے کی ہر وقت بھرپور کوشش کرتی رہی۔ گھر میں ساس کا احوال اور طریقہ بھی دیکھ اور سمجھ رہی تھی۔ ان دونوں نے بالکل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

شروع میں تو اندر باہر ہر وقت واقعی مہمان بھرے رہتے تھے۔ ہر گھڑی ایک ہاہاکار مچی رہتی۔ کوئی آ رہا ہوتا تو کوئی جا رہا ہوتا۔

رفتہ رفتہ حالات پرسکون ہوئے۔ بالآخر گھر آنے والوں سے خالی ہو گیا۔ فقط معطر کے سسرال

والے باقی رہ گئے اور انہیں اصرار کر کے روکنے والی تھی معطر۔

اس کا خود تو ابھی جانے کا ارادہ نہیں تھا مگر اپنی ساس اور نند کو اس نے زبردستی روک لیا تھا اور کہا تھا کہ "ارے میرے لاڈلے کے چہلم تک تو رک جاؤ۔ میری سونی گود کا تماشا دیکھتی جاؤ۔ ہائے میرا منا کیسے قبر سے میری گود میں آنے کے لئے ہمک رہا ہوگا۔ ہائے میرے بچے! تجھے آخر وقت میرا دودھ بھی تو نصیب نہیں ہوا۔ آہ! تو وہاں بھیانک جنگل کی ویرانی میں کیا کھاتا کیا پیتا ہوگا! ہم تجھے یاد نہ آتے ہوں گے؟ دیکھ، سن! تیری دادی آئی ہیں...... پھپھو بلاتی ہیں تجھے!"

اس کی ہیجان بازی سن سن کر وہ لوگ زار و قطار رونے لگتیں۔ آہستہ آہستہ وقت نے کروٹ بدلی مگر معطر کی وہی رٹ تھی۔ "منے کا چہلم ہوگا اور ضرور ہوگا۔"

اماں بی اور فرحت نے آپس میں بیٹھ کر طے کیا کہ یہ آخری کام بھی ہو جانا چاہئے۔ کیا فائدہ کسی بدمزگی میں! انسان کے سو دشمن ہوتے ہیں۔ کیا معلوم معطر کی یہ ضد کیا رنگ لائے؟ اس کے شوہر اور ساس نند پر کیا اثرات مرتب ہوں۔ کل کلاں کو لڑکی کے لئے یہ کسی طعنے تشنے کا باعث نہ بن جائے؟ جہاں سیر وہاں سوا سیر۔

اماں بی نے معطر کی پرواہ کئے بغیر فاخر کو ایک دن کے لئے میکے بھجوا دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ذرا دن بھر کے لئے اس کا ماحول بدل جائے گا اور اس کے میکے میں منے کے چہلم کی اطلاع بھی پہنچ جائے گی۔

حمید کے ساتھ گھومتا گھامتا فرحت بہت پیار سے ہنستے ہوئے پان اور لفافہ بھرا مونگ پھلیوں کا لے کر گھر میں داخل ہوا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کی بیوی اور ساس دونوں آمنے سامنے چارپائیوں پر یوں بیٹھی تھیں جیسے صدیوں سے سوئی نہ ہوں۔

***

دسمبر آخری سانسیں لے رہا تھا۔ سردی اپنے بام عروج پر تھی۔ خنکی یہ کہ اس روز سر شام ہی ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہوائیں نمی سے لدی پھندی تھیں اور خوشنما لان کے درختوں، پودوں کے پتوں میں سرسراہٹیں پیدا کرتی چل رہی تھیں۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ سرمئی سڑکیں بارش کے شفاف قطروں سے دھلی دھلی چمکتی لگ رہی تھیں۔

بادل ایک دفعہ زور سے گرجے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ آتش دان میں سرخ سرخ انگارے دہک رہے تھے۔

فاخر آتش دان کے پاس آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی روشنی میں اس کا بھرا بھرا خوبصورت چہرہ چمک رہا تھا۔ سامنے بیڈ پر کمبل اچھی طرح لپیٹے سعدیہ بغور اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ اچانک بادلوں کی دھما دھم میں زوردار اضافہ ہو گیا۔ شیشے کے دریچوں پر آسمانی بجلی کا عکس چکا چوند پیدا کرنے لگا۔ سعدیہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گرم شال کو کس کر سر پر لپیٹا اور نہایت خوش الحانی سے آیات قرآنی کا ورد کرنے لگی۔

فاخر نے مسکراتی ہوئی شرارتی نگاہوں سے اسے تاکا، سیدھے ہو کر قریب رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور اس کا چوبی دستہ ہاتھوں میں دبا کر انگاروں پر جم جانے والی راکھ کریدنے لگا۔ کئی لمحے وہ خاموشی کے ساتھ سرخ انگاروں کو الٹتا پلٹتا رہا، پھر پوکر کو اس کے مقام پر رکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"اچھا...... تو تمہاری سوئی "شمالی علاقہ جات" پر اٹک چکی ہے۔"

سعدیہ نے پڑھتے پڑھتے اسے چبھتی ہوئی نظر سے گھورا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

"چلو جی، ٹھیک ہے۔" وہ اسے سنانے کے لئے زور زور سے "سوچنے" لگا۔ "ہم تو چاہتے تھے موقع غنیمت ہے۔ ابا میاں مہربان ہیں۔ ہم دونوں بھی آزاد پنچھی ہیں۔ کیوں نہ ان مبارک ساعتوں کو یورپ کی خوبصورتیوں میں گم کر کے چند میٹھے "پھیرے" اڑا لئے جائیں۔ مگر وائے افسوس کہ ہماری احمق شریک حیات کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ ارے بھئی! کوئی ان عقل سے پیدل اور بھوسا بھری کھوپڑی کی مالکن کو سمجھائے کہ اپنے وطن میں تو جب چاہے بلا ٹکٹ بھی گھومنے پھرنے کا چانس مل سکتا ہے بلکہ وہ چار "فرزندان توحید" اور چار پانچ "چھپتی چھپاتی" کے ذیلی معاہدین کر بھی ہم با آسانی سیر و تفریح کر گزریں گے۔ مگر بیرون ملک جانے کا چانس پھر مل جانا کس قدر دشوار گزار ہوگا۔ مگر کون سمجھائے ان کو۔"

اچانک فاخر کی نظر اس کی خفگی بھری نگاہ سے دوبارہ ٹکرا گئی۔ وہ گھبرا کر پٹری بدل گیا۔ "ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے ملکۂ عالیہ! بندہ معافی کا خواستگار ہے۔ جیسا آپ فرمائیں گی ویسا ہی رزلٹ پائیں گی۔ لہٰذا اٹھ کر رخت سفر باندھئے۔ ہم نگٹ کا کرتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔ سعدیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

بھیگی بھیگی اندھیری رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ تیز ہوا اور درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی بھنبھنا رہی تھی۔ جس کی سائیں سائیں کمرے میں بیٹھ کر بھی سنائی دے رہی تھی۔ تیز بارش سے باہر جل تھل ہو گیا تھا۔ مرغابیوں کی ٹکڑیوں میں ایک دم ہی ڈھیروں ڈھیر اضافہ ہو گیا تھا۔ بارش کے چھینٹے کھڑکی سے ٹکراتے ہواؤں کے دوش پر ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے۔

کتنا خوب... سعدیہ کا دل اندر ہی اندر دہل گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اس کا خوف ایک سرمست اطمینان میں ڈھل گیا۔ فاخر دھیرے سروں میں گنگناتا ہوا اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

[illegible] پلکوں میں
بھرا تن من [illegible] کر اٹھتا ہے

"وقت اور حالات کیسے بھی ہوں، آپ کا گانا بجانا جاری و ساری رہتا ہے۔" اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔

وہ برا مانے بغیر ڈھٹائی سے بولا۔ "ہمارے جذبات کی کیا بات کرتی ہو۔ ہم سادہ دل معصوم بندے ریاکاری اور بناوٹ کی دنیا سے کوسوں دور ہیں۔ جو ہمارے اندر کا موسم ہے، وہی باہر بھی دکھائی دے گا۔ یقین نہ آئے تو کبھی وہاں ابا میاں کے ہاں پہنچو اور چھپ کر ہمارے دگرگوں حالات اور ذہنی کشمکش کی کیفیت کا مشاہدہ کر لو۔ بس مارے باندھے چلے جاتے ہیں۔ مجبوری کا نام شکریہ ورنہ دل و دماغ، پھیپھڑے، جگر، گردے، آنکھیں بلکہ ہاتھ پیر سب یہیں پڑے رہتے ہیں۔"

سعدیہ نے شوخی سے گرہ لگائی۔ "اتنی لمبی چوڑی نثر نگاری کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ایک عدد شعر سنا دیا ہوتا۔ کوزے میں سمندر مقید کر کے۔"

"ابھی لو۔" فاخر نے شوخی کا جواب شوخی سے حاضر کر دیا اور اپنی انگلیوں سے اس کے بال بکھیر کر گنگنانے لگا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

میرے لیے موسم بھی گزارا ہم نے
کتنی جب اپنی تھیں، شامیں اس کی
نیند اس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اس کی
دور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے باہیں اس کی"

سعدیہ کے سیج چہرے پر حیا اور دلی مسرت کے ہزار رنگ لہریں مارنے لگے۔ مگر وہ زبان سے کچھ بولی نہیں۔

فاخر نے اس کی خاموشی پر چوٹ کی اور مسکرا کر بولا۔ "کوڑھ مغز شریک حیات! ابھی تو شعر کا جواب شعر میں دے دیا کرو۔ کوئی لاگت تو نہیں آتی۔ ایک معصوم کا دل ہی خوش ہو جائے گا۔ موسم بھی ہے، وقت بھی ہے، حالات بھی ہیں۔"

سعدیہ نے لمحہ بھر غور کیا، سوچا پھر شرمیلی سی آواز میں گویا ہوئی۔

"وہ چاند بن کے میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی رہی"

"وہ مارا......" فاخر اچھل پڑا۔ اس نے دونوں بانہوں کے حلقوں میں لے کر اسے گھما ڈالا۔

"ارے، ارے......" وہ اس کے بے پناہ جوش و خروش سے گھبرا کر چیخ اٹھی۔ "بالکل ہی ہوش و حواس جاتے رہے کیا؟"

"بھئی اسے کہتے ہیں حاضر دماغ شریک حیات اور جملے پہ دہلا۔" وہ مارے خوشی کے واقعی مور کی طرح رقص کر رہا تھا۔

باہر بارش کی شوریدہ سری میں کمی آ رہی تھی۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج بھی تھمنے لگی تھی۔ دھواں دھار برستی سیاہ گھٹاؤں کا دم ٹوٹنے لگا۔ بالآخر رم جھم برستی شفاف موتیوں کی سی جھاروں والی پھواروں کا روپ دھار لیا۔ رم جھم برسنے والی رم جھم نے جب کلیوں اور پھولوں کے گرد گھومنے چومنے تو...... بارش تھم چکی تھی۔

❋●❋

اگلی صبح...... سورج چڑھ کر درختوں کے اوپر آ چکا تھا۔ کہرے کی دھند چھٹنے لگی تھی۔ رات بھر کی بارش کے بعد آسمان نکھر گیا تھا۔ بادل جگہ جگہ سے چھٹ گئے تھے۔ دن چڑھتے چڑھتے گہرے نیلے آسمان کا حسین روپ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جھلملاتی کرنوں کے تعاقب میں بڑے بڑے پروں والی ست سی چیلیں پر پھیلائے ننھے ننھے جہازوں کی طرح محو پرواز تھیں۔ دسمبر کی اجلی دھوپ پگھلے ہوئے سونے کی مانند ہر طرف پھیلی تھی۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر جیسے ہی فاخر نے گھر چھوڑا، سعدیہ فوراً نازش کی تلاش میں اپنے کمرے سے نکل پڑی۔

فاخر آج کل ہنی مون کے لیے بیرون ملک روانگی کے انتظامات میں بہت مصروف تھا۔ بعض دفعہ بعد دوپہر واپس آتا تھا۔ ابامیاں کے ہاں سے آئے ہوئے اسے چار پانچ دن گزر گئے تھے۔ حالانکہ شاکر بھائی صاحب اب بالکل ہشاش بشاش تھے اور زمینداری کے سارے جھمیلے انہوں نے دوبارہ تمغے کی طرح اپنے چوڑے چکلے سینے پر سجا لیے تھے۔ تاہم اندر سے فاخر کو ہر دم دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ

کہیں گھر کی خواتین سازش کر کے دوبارہ اسے بلا کر تنہا ہی "پیج" لگا کر مقید نہ کر لیں۔ اس لیے وہ خواہ چند ماہ کے لیے سہی مگر جلد از جلد ملک چھوڑ کر فرار ہو جانے کے چکر میں تھا۔

نازش، سعدیہ کو لان میں درختوں کے بیچ گھومتے ہوئے مل گئی۔

"ہاں، اب بتاؤ۔ کہاں اڑی پھرتی رہتی ہو؟" سعدیہ نے جاتے ہی ڈائریکٹ حملہ کیا۔

"کیا مطلب؟" نازش نے اسے تیوری چڑھا کر دیکھا۔ "میں تمہیں چڑیا، کوا، فاختہ، چیل یا گدھ نظر آ رہی ہوں کہ اڑی اڑی پھروں گی۔"

"اوہو...... بڑے سوال جواب آ گئے جناب کو۔" سعدیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور خود بھی سبزے پر ٹہلنے لگی۔

"نازش! زندگی رب کی کتنی خوبصورت عطا ہے...... ہے نا؟" اس نے معصومیت سے دریافت کیا۔

نازش ہنس پڑی۔ شوخی سے جواب دیا۔ "دریں چہ شک۔ اس حقیقت سے کون کافر انکار کرے گا۔ اور پھر تم تو مکمل وضاحت ہو اس جملے کی...... فاخر کی سنگت میں؟"

اس کا جواب اتنا واضح اور مکمل تھا کہ سعدیہ عش عش کر اٹھی۔ اب وہ کہاں موقع گنوانے والی تھی۔ فوراً اس کی پکڑ کر لی۔ لمحہ بھر غور کیا۔ کہیں [illegible] بات نہ ہو جائے۔ بالآخر کہہ گزری۔

"پھر...... تم نے کیوں خود کو اس نعمت خداوندی سے محروم رکھا ہوا ہے؟...... کہیں کوئی پرابلم تو نہیں؟"

"کوئی پرابلم۔" نازش نے چونک کر اسے دیکھے بغیر جواب دے دیا۔

"پھر...... بھائی جان کو کیوں [illegible] میں جتلا کیا ہوا ہے؟"

"وہ ابھی [illegible] کیا کروں؟" اس بار نازش نے بہت رکھائی سے جواب دیا۔ [illegible] بہت کبیدہ خاطر نظر آنے لگی تھی۔

"کیا بات [illegible] اس کا ہاتھ دبایا۔ "تم ایک نارمل اور گھر کے ہر رشتے سے [illegible] بہت محبت، خلوص اور پیار ہی پیار بانٹنے والی ہستی ہو۔ پھر یہ [illegible] ہیں کیوں؟...... خواہ مخواہ خود کو ایک بچھڑی ہوئی ساتھی کی حامل کیوں ثابت کرنا چاہ رہی ہو؟ کیا ملازمت کرنے، یا کسی بارش کے تالی کرنے کو آباد کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لو گی؟...... ہیرے پیارے پیارے بچے، جان چھڑکنے والی بھابی اور مضبوط سائبان کی مثال بڑے بھائی تمہیں یاد نہ آئیں گے؟"

سعدیہ نے لمحہ بھر ٹھہر کر ایک انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا اور اس کی گیلی گیلی آنکھوں میں سچ کی جوت سے جگمگاتی ہوئی آنکھیں گاڑ کر بولی۔

"اس محفوظ ترین گھر کی چار دیواری کو عبور کر کے ممکن ہے تم یہاں رہ جانے والے پیارے رشتوں کو فراموش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ لیکن ان دوسروں کو کس طرح مطمئن کرو گی جو تمہیں اکیلا دیکھیں گے؟ تنہا پائیں گے؟...... دیکھنے والوں کو کیا بتاؤ گی کہ تمہارے اپنے سب کہاں گئے؟ کیا تم آشیانے سے بچھڑی ہوئی خوفزدہ چڑیا کی طرح نہیں کپکپاتی پھرو گی؟...... کوئی بااعتماد اور بھروسے کے قابل جائے پناہ مل سکے گی تمہیں؟...... معلوم نہیں تم نے کس برتے پر ماں کی طرح چاہنے والی بڑی

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بھابی کو ایسا منہ توڑ جواب دے ڈالا۔ مگر ان کی بے پناہ شفقتوں کو سلام کرو جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کو آج تک تمہارے جواب کی تلخی سے آگاہ نہیں کیا۔ کیا تمہارے شرمندہ اور سرنگوں ہو جانے کے لئے یہ ایک دلیل ہی کافی نہیں ہے؟...... کیونکہ تم خود بھی تو وہ بے مثال بیٹی اور باکردار بہن ہو، جو شاہراہ حیات کے ہر موڑ پر اپنا دامن عفت ہر قسم کی آلودگی سے پاک اور منزہ رکھنے میں بے نظیر ہو۔ بس ذرا سی سمجھ کا پھیر ہے ورنہ تم اور بھابی جان دونوں ہی اپنے اپنے مقام پر پکی ہو اور ایک دوسرے کے لئے کھوٹ اور بناوٹ سے پاک نیت رکھتی ہو۔ کیا میں نے غلط کہا نازش؟"

سعدیہ نے دیکھا، نازش موٹے موٹے آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ سعدیہ نے بڑھ کر اپنے دوپٹے کے آنچل سے اس کے آنسو خشک کئے۔ چند لمحے گہری خاموشی کا راج رہا، پھر سعدیہ نے نہایت دلسوزی سے پیار بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"مگر پاگل بھروسہ بھی ہو تو سعدیہ حاضر ہے یہ اشکوں کی برسات سمیٹنے کو۔"

نازش آنکھیں صاف کر کے وہیں گھاس پر بلا پاؤں پسار کر بیٹھ گئی اور اسے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے خفگی سے بولی۔

"تم...... افلاطون کی نانی...... معلوم نہیں کیا سمجھتی ہو۔ اگر تم نے اور بھابی جان نے اتحاد کر ہی لیا ہے تو میں تمہیں اپنے کچھ حالات سناؤں گی تاکہ تمہارے دماغ کا خناس اتر سکے۔ ورنہ جیسے الفاظ کے نشتر اور تیر، بھابی نے تم نے استعمال کئے ہیں وہ سب رائیگاں چلے جائیں گے اور تمہاری جاسوسی ساری دھری رہ جائے گی...... انجانی خوشی کرو۔"

لمحہ بھر رک کر اس نے اپنے تیور بدلے پوچھا۔ "یہ بتاؤ شرلاک ہومز! تمہیں اپنے زمانہ طالب علمی کی وہ لڑکی یاد ہے...... رخشندہ چوہدری؟...... دماغ پر زور دو ذرا۔"

"کون رخشندہ چوہدری؟" سعدیہ کی آنکھوں میں...

"سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ کی اسٹوڈنٹ۔" نازش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا پنچھی پنکھ پھیلائے آ بیٹھا۔

"وہ جو ہاسٹل میں رہا کرتی تھی؟"

"بالکل ٹھیک۔"

"ہاں جو تمہارے ساتھ نظر آیا کرتی تھی؟"

"تم کہتی ہو تو ٹھیک ہی کہہ رہی ہو گی۔"

"لیکن...... وہ تو کالی......؟"

"ہاں...... کیا کالی؟" نازش نے چونک کر دریافت کیا۔

"میرا خیال ہے......" سعدیہ جھجک کر چپ ہو گئی۔

"ہاں، ہاں...... کہو نا۔" نازش نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"میرا مطلب ہے...... وہ لڑکوں کے ساتھ بہت کثرت سے نظر آیا کرتی تھی۔" رکتے رکتے سعدیہ کہہ ہی گئی۔ "مجھے یاد پڑتا ہے رخشندہ نے ایگزامز بھی نہیں دیئے تھے۔"

"ہاں، یہ سچ ہے۔" نازش نے ایک گہرا سانس لے کر اعتراف کیا۔

اس کی آنکھوں سے فکر، دکھ اور افسوس کے ملے جلے تاثرات جھلکنے لگے۔ سعدیہ نے اسے ٹوک دیا۔ "پہیلیاں ہی بجھواتی جاؤ گی یا کچھ بتاؤ گی بھی؟"

"اب بتانے کو کیا باقی رہ گیا ہے؟" نازش نے عجیب سے دکھی لہجے میں کہہ کر اپنا سر سعدیہ کے شانے سے ٹکا دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جل تھل بہہ رہے تھے۔ کچھ ایسی شدت اور تواتر سے کہ اس کی زبان سے کوئی لفظ بھی نکل نہ پا رہا تھا۔

سعدیہ اس کو دھیرے دھیرے تھپکنے لگی۔ خود اس کا تجسس سے برا حال تھا۔ ذہنی رو بھٹکی ہوئی کہیں سے کہیں اڑی جا رہی تھی مگر وہ کچھ بھی نتیجہ اخذ کر لینے سے قاصر تھی۔

بہت دیر روتے رہنے کے بعد نازش کے بے قرار دل کو قدرے قرار نصیب ہوا۔ اسے اپنے چاروں طرف سسکیاں اور آہ و بکا کی دلدوز آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

سعدیہ اسے منتظر نگاہوں سے تکنے لگی۔

"سعدیہ......" وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔ "رخشندہ...... ایک ایسا نام، یا ایسی شخصیت کا ہیولا ہے کہ اس کے تذکرے کے ساتھ ہی میری کئی مجسم ہو کر میری آنکھوں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں۔ میں تمہیں کن الفاظ میں بتاؤں؟"

سعدیہ نے بے تابی سے پوچھا۔ "کچھ تو بتاؤ نازش۔"

نازش ایک ثانیہ اسے زخمی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر اچانک بولی۔

"سعدیہ! اسی دن کی...... مر گئی تھی...... ٹھیک اسی دن۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

❖❖○❖❖

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

نازش کا ندامت سے برا حال تھا!

پشیمانی کے پسینوں سے پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ممی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر چٹان کی مانند اپنی جگہ اٹل نظر آئیں۔ نازش کو ایک دم ہی ڈھیروں ڈھیر مایوسی نے آن گھیرا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ صورت حال اس درجہ سنگین ہو جائے گی اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا۔ لمحات کیا تھے بھاری پتھر اور ناقابلِ تقسیم ٹکڑے تھے جو کسی طرح ٹوٹ رہے تھے نہ پگھل رہے تھے۔

خوب اچھی طرح گرج برس لینے کے بعد بھی ممی کا موڈ خراب تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی صاحبزادی کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتیں کہ نازش نے چھوٹا منہ اور بڑی بات کے باوجود معلوم نہیں کن جراتوں اور بے شمار حوصلوں کے ساتھ ممی کو اصل قصے سے آگاہ کر ڈالا تھا مگر اب ہونٹ خشک اور دل ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے اڑا جا رہا تھا۔ وہ سہمی نظریں نیچی کئے بیٹھی تھی۔ اس کی مجرمانہ کیفیت کے باوجود مجال ہے کہ ممی کو اس پر رحم آ رہا ہو۔

جنوری کی شاداب سرد ہواؤں کے باوجود وہ کھڑکی کے پردے پٹ کھولے کھڑی تھیں اور اپنا غصہ کم کرنے کے لئے ہونٹ کاٹتے ہوئے مسلسل باہر دیکھ رہی تھیں۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ آج سے قبل وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ ان کی ہونہار اور شرمیلی صاحبزادی خود ان سے اس موضوع کے لئے سوالی بن کر چلی آئے گی۔ جو ان کے مقدس پیشے کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ثابت ہوگا۔

اس کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ سن کر وہ حیرت اور صدمے سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی تھیں مگر حالات کی سنگینی سمجھ لینے کے بعد وہ غصے کی شدت سے پاگل ہو اٹھیں۔ جو جی میں آیا، بنی سے کہہ گزریں۔ طیش کا عالم جوں کا توں تھا۔ ادھر نازش کی جان پر بنی تھی۔ جوں جوں لمحات آگے کو سرک رہے تھے وہ اپنی سوچوں کے کرب سے بے حال ہو رہی تھی۔ یوں بھی آج کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے ممی کے سامنے بہ مشکل تمام گویا جان ہتھیلی پر رکھ کر دستِ سوال دراز کیا تھا لیکن اب احساس ہو رہا تھا جیسے انجانے میں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دے دیا ہو۔ شاید اپنی بات اور مطالبے کی اصل سنگینی سے وہ پوری طرح آگاہ اور واقف نہ تھی۔

بہت دیر کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ ان کا موڈ قدرے بحال ہوا ہے۔ نازش نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس کی جان میں جان آئی۔ وہ سمجھی کہ مطلع صاف ہو چکا ہے۔ لہٰذا ایک دفعہ پھر جان پر کھیلا جائے۔ اس نے ریزہ ریزہ حوصلوں کو پھر یکجا کیا اور دبی زبان سے دریافت کیا۔

"ممی جان!....... پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"بکو مت۔" وہ اتنے زور سے دھاڑیں کہ نازش اچھل پڑی۔ مگر وہ متاثر ہوئے بغیر فیصلہ کن

انداز میں اسے وارننگ دے کر باہر چلی گئیں۔

"تمہیں اپنی ماں سے ایسی بات کرتے ہوئے ڈوب مرنا چاہئے، چلو بھر پانی میں۔ بدتمیز کہیں کی! خبردار جو آئندہ تم نے ایسی ویسی دوستیاں بڑھائیں تو۔ ایسے گرے ہوئے حالات کے شکار لوگ دوسروں کے لئے بھی رسوائیوں کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔ اور اب میں مزید تمہاری کسی احمقانہ وکالت کو سن سکتی ہوں نہ برداشت کر سکتی ہوں۔ آگے کے لئے تمہیں آگاہ کر رہی ہوں کہ میرے سامنے اس کا ذکر تک نہ آنے پائے...... بلکہ اسے کبھی یہاں بلانے یا یونیورسٹی میں بھی ملنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گی۔"

نازش دونوں ہاتھوں میں گھومتا سر تھامے بدحواس اور ہراساں سی اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ اسے ہرگز یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ واقعی اس کی ممی ہی تھیں یا کوئی اور؟...... ایسی سنگدل، اتنی بے رحم اور بے حس تو وہ کبھی ہی نہیں!! یہ کیا ہو گیا تھا؟...... معاملہ اس کے خیالات کے بالکل برعکس ثابت ہوا تھا۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ ضرور سہنی پڑے گی مگر ایسا بھی کیا؟

آج تو ممی کا مشفق لہجہ، پیار بھری چاہت اور ٹھنڈی میٹھی ممتا جانے کہاں جا سوئی تھی۔ وہ تو بہت زیادہ ہی چڑچڑا ہو گئی تھیں۔ اتنا ناز اٹھانے والی، اتنا پیار کرنے والی تھیں کہ ساری زندگی کی کسر نکل گئی تھی۔ اسے یاد تھا کہ ممی نے کبھی اسے پیشانی پر بل ڈال کر بھی دیکھا ہو...... آج تو وہ اتنے شدید غصے کے عالم میں تھیں کہ اگر نازش مزید بولتی تو شاید مار پٹائی بھی کر ڈالتیں۔ چند لمحوں کے اندر اندر ممی کی پُرشفقت شخصیت ایسی بدل گئی تھی کہ وہ کوئی اور ہی روپ لگ رہی تھیں کہ ہوش کرکے نازش کو اپنی ہی پڑ گئی تھی۔ زندگی میں پہلی دفعہ ممی سے اتنی زوردار ڈانٹ اور جھڑکیاں کھائی تھیں۔ حساس دل و دماغ پر تازیانے برس پڑے تھے۔ شدید گھبراہٹ اور وحشت کے احساس نے بے اختیار مجبور کر دیا اور روتے روتے ہی جانے کب وہ وہیں سو گئی۔

⁂

ڈاکٹر سحرش عمران کا شمار اپنے علاقے کی بہت معزز اور چیدہ نام ہستیوں میں ہوتا تھا۔ اردگرد کے لوگ ان کے لئے اپنے دلوں میں محبت سے زیادہ عقیدت کے جذبات رکھتے تھے۔ وہ اور ان کے شوہر عمران ایک عرصے سے یہیں رہائش پذیر تھے۔ دنیا کے لئے ان کے کردار آئینہ تھے۔ کوٹھی کا ایک حصہ ڈاکٹر سحرش اپنے کلینک کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ جہاں دن رات خواتین کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

عمران صاحب کا ذاتی کاروبار تھا لیکن دمے کے دائمی مریض ہونے کی وجہ سے انہیں اپنی کاروباری مصروفیات کو بار بار خیرباد کہنا پڑ جایا کرتا۔ ان کی بیماری بھی اس نوعیت کی تھی کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اپنی پیار کرنے والی بیوی اور معصوم بچوں کا ساتھ کچھ زیادہ دور تک نہ دے سکے بلکہ ان کے بہت چھوٹے پن میں ہی انہیں اپنی شفقتِ پدری سے محروم کر گئے۔ وہ ڈاکٹر سحرش کی زندگی کا کٹھن ترین دور تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اور خود کاروباری رموز سے ناآشنا اور نابلد۔ شوہر کے اچانک بچھڑ جانے سے زندگی بے ترتیب اور سہما ہوا آنسو بن کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ شہر میں پھیلا ہوا کاروبار ان کی موت کے ساتھ ہی تتر بتر ہونا شروع ہو گیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

تاہم ڈاکٹر سحرش نے ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کیا اور اپنے مقدس پیشے اور مسیحا ہاتھوں کے ہنر اور سلیقے کے زور پر دونوں بچوں کو پروان چڑھایا۔ دونوں کی پرورش، نگہداشت اور دیکھ بھال کے لئے خود کو وقف کر ڈالا۔ باپ کی کمی محنت اور جدوجہد کے ساتھ دن رات ان کی رہنمائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بہترین زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ ہونہار بیٹے نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی اور راولپنڈی میں پوسٹنگ ہو گئی۔ بالآخر ڈاکٹر منان نے ممی کا خواب شرمندۂ تعبیر کر ڈالا تھا۔

دو برس کے مختصر وقفے کے بعد ڈاکٹر سحرش نے بڑی دھوم دھام سے بیٹے کی شادی عمران صاحب کی بھتیجی سے کر دی اور ایک بے مثال ماں کا کردار ادا کرتے ہوئے بہو بیٹے کو وہیں راولپنڈی میں رہائش پذیر ہونے کی اجازت دے دی۔

پوسٹنگ، رہائش اور شادی کے بعد ڈاکٹر منان نے بارہا کہا کہ ممی اپنا کلینک اور گھر بند کر کے ہمیشہ کے لئے ان کے پاس سیٹ ہو جائیں لیکن ممی نے یک زبان جنبش ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ انہیں کسی قیمت پر منظور نہ تھا کہ اپنے اس گھر اور شہر کو خیرباد کہہ دیں، جہاں انہوں نے اپنے شوہر کی ہمراہی میں ایک یادگار دور گزارا تھا اور گھر کے گوشے گوشے اور قدم قدم پر انمول سنہری یادوں کے خزینے مدفون تھے۔ ان دلی معاملات کے علاوہ بھی کئی رکاوٹیں ایسی تھیں، جن کے زیر اثر وہ بیٹے کے اصرار کا خیر مقدم کرنے سے قاصر تھیں۔ اوّل تو نازش کے تعلیمی حرج کا امکان تھا۔ بیٹے کو تو مجبوراً دوسرے صوبے میں بھی تعلیمی مدارج طے کرنے پڑے تھے، جس کی بنا پر انہیں ہاؤس جاب کے بعد وہیں پوسٹنگ آرڈرز کی تکمیل کے لئے رہنا ایک مجبوری بن گیا تھا لیکن بہرحال وہ نازش کی طرح صنف نازک میں سے نہ تھے کہ ماں زیادہ فکرمند ہوتیں۔ چنانچہ بیٹے کو اللہ کے سپرد کر کے وہ بیٹی کے قریب تر رہیں۔ حتیٰ کہ پوسٹنگ کے فوراً بعد اس کی شادی کے فرض سے فارغ ہو کر انہوں نے صحیح معنوں میں سکون کا سانس لیا۔ یہ محسوس کر کے کہ ان کا لخت جگر اب اپنا گھر آباد کر کے اپنی تکمیل سے آسودگی حاصل کر رہا ہو گا، ان کو روحانی طور پر ... تربیت کوش کا ثمرہ خود بخود مل گیا تھا۔

... خاتون تھیں اور ... ان کی بے پناہ مضبوط شخصیت بھی اس راہ کی رکاوٹ بن کر حائل ہو گئی۔ لہٰذا چونکہ خود کفیل بھی تھیں اس لئے ان کی ... سے اپنی زندگی کی یہ واحد ضد منوا سکے۔

پھر ہوا یہ کہ ڈاکٹر منان اپنی ہی گرہستی کے ہو کر رہ گئے اور ... خیال ترک کر دیا۔ مگر ایسا بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح جب دو بیٹیوں کے باپ بن گئے تو انہوں نے اپنی والدہ اور ہمشیرہ کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے ہوں۔ قطعی ایسا نہیں تھا۔ ان کی تکمیل نے تھا کہ خدانخواستہ ... اپنی تمام تر تعطیلات ہمیشہ ممی اور نازش کے ساتھ شیئر کی تھیں اور جب جب پہلا موقع ملا، بچوں کو خود آ کر چھٹی لے جاتے۔ ڈاکٹر منان وقت اور فاصلوں کو کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دور ہونے کے باوجود دونوں گھرانے ایک دوسرے کی روزمرہ روٹین تک سے آگاہ رہتے تھے۔ بلکہ آج کیا پک رہا ہے، کس کا کیا پروگرام ہے، کس کو کہاں اور کس کے ہاں جانا ہے؟ وہ اس طرح ایک دوسرے کی مصروفیات سے واقف رہتے تھے جیسے ایک ہی چھت کے نیچے رہ رہے ہوں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ ایک دوجے کی دوستیوں سے بھی آگاہ رہتے تھے۔

ڈاکٹر سحرش اور نازش...... دونوں ماں بیٹی بے حد محفوظ اور ایک آسودہ حال زندگی گزار رہی تھیں۔ وقت بے حد اطمینان بخش اور پُرسکون تھا۔ نہ کوئی فکر تھی، نہ فاقہ۔ کلینک اپنا ہی ہونے کی وجہ سے زیادہ مطمئن اور مصروف رہتیں مگر نازش کے یونیورسٹی سے آنے کے بعد ایک مناسب وقت اس کے ہمراہ گزارنا بھی ان کے ضروری ترین اصولوں میں سے ایک اہم اصول رہا۔

نازش پر وقت، حالات اور زمانے کے رنگ ڈھنگ سے زیادہ اپنی ممی کی ذاتی تعلیم و تربیت کے اثرات گہرے اور غالب تھے جس کے نتیجے میں وہ ایک بہت حد تک سلجھی ہوئی خوبصورت شخصیت کی

لڑکی کے طور پر اپنا تعارف خود تھی۔ فیشن اور نئی تہذیب کے تقاضے پورے تو کرتی تھی مگر نہایت میانہ روی سے۔ لہٰذا ممی اس کی طرف سے مطمئن اور بے فکر رہتی تھیں۔ بہت معاملات میں انہیں اپنی بیٹی چلبلی فطرت اور قابل تقلید معلوم ہوتی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب نازش کی ملاقات اپنے ہی شعبے کی ایک ذہین اور بہت ہی خوبصورت لڑکی رخشندہ سے ہوئی۔

رخشندہ ایک پسماندہ علاقے سے حصول علم کی خاطر یہاں آئی ہوئی تھی۔ گو کہ اس ملاقات میں پہل رخشندہ کی طرف سے ہوئی تھی تاہم بعد میں نازش کو اتنی بھائی اور اچھی لگی کہ وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

دراصل نازش نے اب تک کی زندگی تقریباً تنہا ہی گزاری تھی، بغیر کسی بہن بھائی کے۔ نہ بہت ساری سہیلیاں تھیں نہ ہمجولیاں۔ اب جو رخشندہ نے اپنائیت سے لبریز انداز میں دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو وہ زندگی کے ایک نئے رنگ اور لطف سے آشنا ہوئی۔ چنانچہ نہایت مختصر وقت میں ان کی دوستی ایک گہری شناسائی اور دلی تعلق میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ یونیورسٹی کے رنگین اور کھلے ماحول میں وہ اکیلی گھومتے اکتا چکی تھی۔ اپنی افتاد طبع کی بنا پر صنف مخالف کی طرف بڑھنے یا ان کی حوصلہ افزائی کی جرأت سے تعلق کوری تھی ایسے میں رخشندہ کی دوستی اور اس کی شوخ و شریر باتیں اس کے لئے نعمت بن گئیں۔ اسی طرح وہ دونوں ... ساتھ دکھائی دینے لگیں۔ گھر سے دور ہونے کی وجہ سے رخشندہ ہاسٹل میں رہتی تھی۔ اب وہ ... نازش کے ساتھ ان کے گھر آنے لگی۔ بعض اوقات اصرار پر رات کو بھی رک جاتی۔ ایسے موقعوں پر دوست کی ... ہٹ پر نازش کھل اٹھتی۔ اسے اپنا خالی خالی گھر ایک دم بھرا بھرا نظر آنے لگتا اور وہ بار بار اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی۔

رخشندہ میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں ... وہ ... حسین ... باتونی، ہنس مکھ اور حاضر جواب بھی تھی، وہیں ... کہ اس کے ساتھ ہی حد درجہ آزاد خیال اور بے باک بھی تھی۔ اگرچہ تھی وہ ایک پسماندہ علاقے سے ...... یہ دو صفات نازش سے میل نہ کھاتی تھیں۔ نازش کی سرزنش اور روک ٹوک کے باوجود ... بلکہ ہوا یہ کہ اس کی بے باکی اور آزادی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ شاید اس بے راہ روی کی بہت بڑی وجہ رخشندہ کا گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر ایک دم کھلی فضاؤں میں چلے آنا تھا۔ گو نازش سے اس کی دوستی پائیدار اور مضبوط تھی مگر تھوڑے سے عرصے میں اس نے یکے بعد دیگرے کئی ساتھی بدل ڈالے۔ کبھی کسی لڑکے کے ساتھ دکھائی دیتی، کبھی کسی کے!

رفتہ رفتہ اس کی شہرت خراب ہونے لگی اور اکثر لڑکوں کی پارٹی میں اس سے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی تھیں جو اپنے مقام پر محدود رہنے والی نازش تک کم کم پہنچ پاتی تھیں۔ البتہ اسے کچھ نہ کچھ بھنک پڑ جاتی تو وہ کئی کئی دن تک پریشان سی رہتی۔ بسا اوقات رخشندہ کی دوستی چھوڑ دینے کی حد تک سنجیدہ ہو جاتی مگر جب رخشندہ سے ملاقات ہوتی تو وہ ہزار طرح کی قسمیں کھا کھا کر اسے منا لیتی۔ ایسے مواقع پر نازش نے کئی کئی دن مسلسل اس کو نظر انداز کئے رکھا۔ وہ جہاں کہیں نظر آتی، اس سے کنی کترا جاتی۔ مگر بھلا رخشندہ کی شوخیوں اور چلبلے پن کا کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی گوشے میں نازش کو جا پکڑتی۔ نازش کیسی ہی بے اعتنائی برتتی یا بے رخی سے پیش آتی، وہ اس کی تمام تر بے رخی ہنس ہنس کر خندہ پیشانی سے برداشت کرتی۔ کبھی بھی بات زیادہ بڑھتی تو نازش اسے جھڑک کر گھر چلی جاتی اور اس کی خوشامد درآمد کو بھی خاطر میں نہ لاتی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

مگر رخشندہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

وہ لمحہ بھر کے لیے بھی سفر کرنے سے نہ چوکتی۔ شام تک کسی نہ کسی طرح ضرور گھر آ پہنچتی اور سیدھی کلینک کے اندر پہنچ کر آتی سے نازش کی چھوٹی بڑی شکایتیں جڑ دیتی۔ اس کا بات کرنے کا انداز کچھ ایسا دلربا اور معصومیت سے لبریز ہوتا کہ ممی اس کے شکوے بجا سمجھ کر اسی وقت نازش کو بلاتیں اور سخت سست کہہ کر فوراً دوستی کا رابطہ بحال کرا دیتیں۔ یوں ساری خفگیاں آئی گئی ہو جاتیں۔

ممی کی غیر موجودگی میں جب نازش اسے آڑے ہاتھوں لیتی اور کھول کھول کر بیان کرتی کہ اس سے ناراضی کا تعلق سب کیا تھا تو وہ دوبارہ قسما قسمی پر اتر آتی اور اپنی شفاف آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتی۔ "خدا گواہ ہے نازی! میرا کسی لڑکے سے بالکل کوئی تعلق ہے نہ لمبی چوڑی مشکوک قسم کی دوستیاں۔ ان کے ساتھ گھومتی ضرور ہوں مگر...... محدود ہو کر...... تمہاری ناراضی بے جا ہے...... میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔"

✻●✻

"ہاں...... دوہرے جی سے [illegible]" کرائے داری نے اثبات میں سر ہلا کر غور سے معطر کی طرف دیکھا مگر وہ ان کی طرف [illegible] دوسری جانب منہ کر کے لیٹ گئی تھی۔ شاید زیادہ تھک گئی تھی۔ کسی طرف بھی توجہ [illegible] نہیں دی تھی اس نے۔

"ذرا گھر کا چکر لگا کر آتی ہوں۔" کرائے داری نے اماں بی سے کہا اور تیز قدموں سے اٹھ کر چلی گئی۔

اماں بی [illegible] کی سوچ میں مستغرق رہیں، پھر اٹھ کر باورچی خانے میں چلی آئیں۔ ملازمہ [illegible] داخل رہے تھے۔ ادھر سے [illegible] ایک دوائی لا کر معطر کو اوڑھائی اور اسے مخاطب کر کے اطمینان کر کے وہ پچھلی کوٹھری میں آ گئیں۔

بولیں۔ "اتنی جلدی سو رہی ہو کیا؟ [illegible]" جواب نہ ملنے پر جھک کر دیکھا۔ وہ واقعی گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ کر دوبارہ اپنی جگہ آ بیٹھیں۔ چہرے پر تفکر کا غبار چھایا تھا۔ گھر کے ماحول پر خاموشی طاری تھی۔ آسمان پر ابر ہونے کی وجہ سے سردی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور اس ٹھٹھرا دینے والی خنکی نے معطر کے بچوں کو کونے کھدروں میں گھس جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی کسی کمرے میں گھس گیا تھا، کوئی کسی گوشے میں بیٹھا کھیل کود میں مصروف تھا۔ نازیہ کی بچی بھی سو گئی ہوئی تھی۔ فرحت نے کسی سے مشورہ کر کے اچھے پیسے لگا کر میڈیکل اسٹور کھول لیا تھا۔ اس لیے اس کا وقت بہت مصروفیت کے عالم میں گزرنے لگا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد کرائے داری تھکی ہوئی واپس آئی اور ان کے قریب بیٹھتے ہوئے فکر مندی سے پوچھنے لگی۔

"کچھ کھایا پیا معطر نے یا یونہی لیٹی ہے؟"

"وہ تو سو بھی گئی۔" اماں بی ملال کے لہجے میں بولیں۔ "پکارا تو تھا میں نے لیکن اس نے ہوں نہ ہاں...... سو گئی ہے۔"

کرائے داری نے پیر سمیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چلنا تو زیادہ نہیں پڑا۔ وہ گلی آگے کی نکڑ پر ہے ڈاکٹر صاحبہ کا شفاخانہ۔ وہ تو یوں کہو کہ یہ خود ہی اپنی طبیعت سے نڈھال ہیں۔ اندر خواتین کی طرح بھیڑ لگی تھی عورتوں کی۔ بہ مشکل ہمارا نمبر آیا۔"

"ساری ہی دوہرے جی سے تھیں کیا؟" اماں بی نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ بعض عورتوں کو تو ڈاکٹرنی صاحبہ بری طرح جھڑک رہی تھیں اور سب کے سامنے صاف لفظوں میں کہے جا رہی تھیں۔

"ناک پکڑے تو دم نکل رہا ہے، خون بدن میں نام کو نہیں ہے مگر اپنے کوتک سے باز نہیں آتی ہو۔ خواہ جان باقی رہے یا نہ رہے لیکن گود سونی نہ رہے۔ ارے عاقبت نااندیش ماؤ! اس طرح اپنی جانوں پر کھیل کر شوہروں کی بھینٹ کیوں چڑھاتی ہو خود کو؟" وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگی تو اماں بی بھی مسکرا کر بولیں۔

"تو بھئی، یہ بھی خوب رہی۔ یوں کھل کھلا کہہ رہی تھیں سب کے بیچ۔ اگر جو سب انہی کے کہنے پر چل پڑیں تو ہو چکی نسل انسانی کی بقا۔"

کرائے داری فوراً گلے پڑ کر بولی۔ "اگر جو وہاں آنے والی بیمار، مدقوق، لاغر، نڈھال، کمزور اور پیلی زرد عورتوں کو آپ دیکھتیں تو کبھی ایسا نہ کہتیں۔ ڈاکٹرنی صاحبہ نے ایسا کہا تو مجھے بے جا نہیں لگا۔ کوئی کوئی تو ایسی کہ ہڈی سے چمڑا لگا [illegible] خون کی کمی کی شکار ہو رہی تھیں۔ انہی کو پکار رہی تھیں وہ۔ کچھ ماشاء اللہ خوب [illegible] اور چاق و چوبند بھی تھیں۔ مگر بہت کم کم۔"

اماں بی نے سرسری انداز میں پوچھا۔ "[illegible] بتاؤ معطر کو کیا کہا معائنے کے بعد؟...... خیریت تو ہے سب؟"

"چار ماہ بتاتے ہیں۔ جب [illegible] کہا ہے [illegible]۔"

اماں بی [illegible] پڑی طبیعت سے اندازہ تو ہمیں بھی ہو رہا تھا۔"

کرائے داری [illegible] ڈاکٹرنی [illegible] خون کی بہت زیادہ کمی بتائی ہے۔ دوا بھی لکھ کر دی ہے، انجکشن بھی لگایا ہے۔ اس لیے تو اتنی نڈھال ہو رہی ہے۔ کہا ہے یہ انجکشن ہر روز [illegible]۔"

اماں بی [illegible] اللہ [illegible] غریب کے حال پر۔ معلوم نہیں کیا ہونے کو ہے۔"

کرائے داری نے دلاسا دیا۔ "اب سے تردد کا کیا فائدہ؟ اللہ پر بھروسا رکھئے۔ سب بہتر ہوگا۔"

یہ دونوں خواتین آمنے سامنے بیٹھی دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھیں۔ جاڑے کے دن۔ بوند بھر کے [illegible] بادل جھک آئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا شام اتر آئی ہو۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ ٹھنڈی یخ اور برفیلی ہوا۔

آج کئی دنوں کے اصرار کے بعد اماں بی نے زبردستی کر کے معطر کو ایک لیڈی ڈاکٹر کے معائنے کے لیے بھیجا تھا۔ ابھی تک تو یہی سمجھا جا رہا تھا کہ منے کی اچانک موت نے اسے بیمار ڈال دیا ہے۔ کھانا پینا برائے نام ہو گیا تھا۔ ہر وقت طبیعت خراب رہتی تھی۔ کبھی سر درد، کبھی متلی، کبھی اختلاج، کبھی بے وجہ گھبراہٹ۔ ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر وہ بہت جھک کر رہ گئی تھی۔ نہ بچوں پر توجہ تھی، نہ گھر بار یا اپنے آپ پر۔ منے کے چالیسویں کے بعد شوہر نے ملتان چلنے کو کہا تو ٹال گئی۔ بالآخر اماں بی کو دخل انداز ہونا پڑا اور اس کی ساس سے کہہ کر مزید رہنے کی اجازت دلوانی پڑی۔ تب یہ مسئلہ حل ہوا تھا۔

نازیہ اکیلی جان پر کام کا بہت بوجھ آ پڑا تھا۔ وہ اور اماں بی مل کر تمام تمام دن معطر کے بچوں کی

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

دیکھ بھال اور دس طرح کے کاموں میں مصروف رہنے لگی تھیں۔ نازیہ کی مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے اماں بی نے اوپر کے کاموں کے لئے ایک ملازمہ رکھ لی تھی۔ جس سے کام کے بارے میں خاطر خواہ فائدہ ہوا تھا۔

پچھلے دنوں سعید احمد کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ معلوم ہونے پر اماں بی نے نازیہ کو بھجوا دیا تھا۔ دو روز سے وہ وہیں تھی۔ معطر کی حالت کسی صورت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ سارا سارا دن پلنگ پر لیٹی رہتی۔ اماں بی کو مصروف دیکھ کر کرائے داری اکثر و بیشتر ان کا ہاتھ بٹانے آ موجود ہوتی تھی۔

اماں بی نے دھیرے سے دریافت کیا۔ ''انجکشن لگوانے کے لئے وہیں شفا خانے جانا ہوگا کیا؟''

''ہاں تو اور کیا۔'' اس نے ہنکارا بھرا۔ ''ڈاکٹرنی صاحبہ خود اپنے ہاتھ سے لگاتی ہیں، اور وہ بھی کولہے پر۔ فرحت آ جائے تو آپ دوا بھی منگوا لیجئے گا۔ آج سے ہی شروع کی جائے گی۔''

اماں بی کچھ سوچ کر بولیں۔ ''اگر یہی سبب ہے مسلسل طبیعت خرابی کا کہ معطر دوسرے جی سے ہے تو پھر اس نے خود کیوں نہیں بتایا؟ ہم کتنے پریشان ہیں اس کی طرف سے۔''

''تمہیں پتہ چلا ہوگا بے چاری کو۔ [illegible] رہتے ہیں ان حالات میں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے......'' اماں بی نے [illegible] کہا۔ ''اپنی طبیعت کو تو وہ خود ہی بہتر طور سے جان سکتی ہے۔ اللہ رکھے کئی ایک بچوں کی ماں ہے۔ [illegible] بات تو بتاتی تو سہی۔ اسے جب بھی قے ہوئی یا جی متلایا اس نے یہی کہا کہ [illegible] معدہ الٹ رہا ہے۔ ہمیں تو سو طرح کے وہم آ رہے تھے۔''

کرائے داری نے ہنس کر [illegible] ''کمسن'' والدہ محترمہ ہیں۔ خود ہی سمجھ جاتیں اس کی الٹیوں سے۔''

''اے بی! انہیں کیا خبر ان بکھیڑوں کی۔'' اماں بی قدرے بے زار ہو کر بولیں۔ ''اول تو سب سے بڑی بات یہ کہ شادی کے بعد معطر ہمارے پاس بہت کم رہی ہے، بچوں کی باری پر ہم اس کے مزاج سے نا آشنا رہے نہ عادت کو سمجھ پائے۔ ہر بچی بچے کے موقع پر اللہ رکھے اس کی ساس نے نہایت چاؤ چونچلوں کے ساتھ اپنی آنکھوں کا تارا بنائے رکھا کیونکہ تین شادی شدہ بیٹوں میں ان کا بس یہی بیٹا صاحب اولاد ہے۔ اب یہ بھی قدرت کی مصلحت ہے۔ کسے معلوم کیسی مصلحت ہے۔ خسر بھی مرتے دم تک ان پوتے پوتیوں پر جان چھڑکتے رہے۔ تم نے دیکھا نہیں ان کی زندگی میں یہ سب اتنے دن بھی یہاں رہ پائے؟ اور اگر کہیں منے کا انتقال ان کے سامنے ہوا ہوتا تو شاید وہ بھی ساتھ ہی مر جاتے۔ لہٰذا انہی محبتوں اور شفقتوں نے مل جل کر ہمیں اپنی بچی سے کوسوں دور رکھا۔ تاہم اس خیال نے ہمارے دل و دماغ کو ہمیشہ شاد رکھا کہ وہ اپنے گھر میں راضی خوشی ہے۔ اب ہمیں کیا پتہ ان کی الٹیوں اور طبیعت خرابی کا حال۔'' اپنی بات پوری کر کے وہ پان لگانے لگیں۔

کرائے داری کو دل لگی سوجھ رہی تھی۔ شوخی سے ہنس کر بولی۔ ''مگر اب تو ان بے خیالیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ خیر سے فرحت میاں کی دلہن......''

اماں بی چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔ پھر بڑبڑا کر بولیں۔ ''اے بی! آج تم موتی چور کے لڈو کھا کر آئی ہو کیا؟ نئے نویلے سندیسے سنا رہی ہو۔''

کرائے داری شرارت سے ہنسنے لگی تو اماں بی کو بھی ہنسی آ گئی۔ ان دونوں کی ہنسی کی آواز سے معطر کی آنکھ کھل گئی۔ کنی سے منہ بنا کر بولی۔

''کسی کی جان پر بنی ہے، لوگوں کو ہنسی، دل لگی سوجھ رہی ہے۔''

اماں بی نے برجستہ کہا۔ ''اے بی! تم بھی ہنس لو۔ تمہیں کس نے منع کیا ہے۔''

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ ''اپنی قسمت ہی کھوٹی ہے۔ ہنسی ٹھٹھول ہماری تقدیر میں کہاں؟''

کرائے داری تو چپ رہی۔ بہت پہلے اس کی تنگ مزاجی بھگت چکی تھی۔ اماں بی نے ناگواری سے اسے دیکھا اور تیکھے لہجے میں بولیں۔

''قسمت اور تقدیر تو واقعی خدا کے اختیار میں ہے۔ اس پر تبصرے کا ہم گنہگاروں کو حق کہاں۔ لیکن تمہیں گلہ شکوہ کس بات کا ہے؟...... میں دیکھتی ہوں، تم ہر وقت اسی نوعیت کی ناشکری اور بے صبری کی باتیں کیا کرتی ہو۔ کیا حوصلے ختم ہو گئے؟''

اماں کے لہجے کا اندازہ کر کے وہ خاموش سی رہ گئی۔ ملازمہ نے لگن میں اُبلے ہوئے آلو لا کر اماں بی کے سامنے رکھ دیئے۔ دونوں مل کر آلو چھیلنے لگیں۔ فضاؤں نے خاموشیوں کی چادر اوڑھ لی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی مخاطب ہوئی اور آہستہ سے پوچھا۔ ''آج کیا پکا رہی ہیں آپ؟...... بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''

اماں بی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''اس وقت آلو بھرے پراٹھوں کا ارادہ ہے۔ چٹنی، رائتہ اور شامی کباب رکھے ہیں۔ [illegible] تمہیں بھوک لگی ہے تو کھا لو۔''

معطر نے کن انکھیوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے ملازمہ کو پکارا۔ جب وہ آ گئی تو لیٹے لیٹے ہی نقاہت بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔ ''بی بوا! اگر ہو سکے تو مجھے کچھ کھانے کو لا دو۔ سارا دن ہو گیا آج تو۔''

ملازمہ گردن ہلا کر چلی گئی تو اماں بی نے اسے ٹوک دیا۔ ''اے بی! خدا کو مانو۔ تم نے تو آلکسی کی حد کر دی۔ [illegible] دو گھڑی [illegible] تاکہ سستی دور ہو۔ کچھ کرو، ہاتھ منہ دھوؤ۔ یہ کیا کہ لیٹے لیٹے کھاؤ پیو گی؟ اللہ سے رحم مانگو۔''

معطر نے شرمندہ ہونے کی بجائے تنک کر جواب دیا۔ ''اماں! آپ تو مجھے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں۔ آج آپ کی بہو بستر تھامے [illegible] ہیں تو آپ ان کی خدمت [illegible] میں نے کیا قصور کر ڈالا؟''

اماں بی اس کی کم عقلی پر غصے سے بھنا کر رہ گئیں مگر کچھ بولیں نہیں۔ اول تو جانتی تھیں کہ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ڈاکٹر سے انجکشن لگوا کر آئی تھی۔ طبیعت یوں بھی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ بد مزگی بڑھ جانے سے کیا فائدہ تھا۔ اس وقت در گزر کرنا ہی بہتر جانا۔ تاہم اتنا ضرور کہہ گزریں۔

''جس بات میں انسان کا اپنا فائدہ ہو، اس پر ضرور کان دھرنے چاہئیں۔ بلاوجہ کی بدگمانی سے دل میلے ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔''

لیکن اتنی بڑی تنبیہ کے باوجود معطر کے سر سے ان کی وضاحت گزر گئی۔ اس نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا۔

ملازمہ کھانے کی کشتی لے کر آئی تو اس نے لوٹے میں گرم پانی منگوا لیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے سلفچی میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد کھانا کھانے لگی۔

⌘●⌘

''اُف! آج تو گودا ہڈیوں میں جم جائے گا۔'' سرور باجی کروٹ بدل کر بے بسی سے بڑبڑائیں۔

نرم نرم روئی کا گرم گرم لحاف بھی انہیں برف کا ڈھیر معلوم ہو رہا تھا۔ پیر تھے کہ کسی صورت گرم ہونے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

میں نہیں آ رہے تھے۔ دونوں گھٹنوں میں اٹھنے والی درد کی لہریں بے چین و بے حال کیے دے رہی تھیں۔ وہ پہلو پہ پہلو بدل رہی تھیں۔ پھولن بوا ان کے گھٹنوں کی مالش کے بعد اب بیٹھی دبا رہی تھیں۔ ابھی ابھی وہ اٹھ کر کمرے سے باہر گئیں تو اونگھتی ہوئی سرور باجی ہوشیار ہو گئیں۔

کمرے کے درمیان میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی انگیٹھی رکھی تھی۔ اس لئے باہر کی نسبت اندر کی فضا خوب تر لگ رہی تھی۔ لیکن سرور باجی کو تو جیسے جاڑے پہ جاڑا چڑھ رہا تھا۔ لحاف سے ہاتھ باہر نکالنے سے قاصر تھیں۔

صبح سے سب باری باری آ کر ان کی طبیعت پوچھ رہے تھے۔ خدانخواستہ حرارت تک نہ تھی۔ چنانچہ یہی غالب خیال تھا کہ اچانک آنے والی سردی کی شدید لہر نے ان کو بھی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ چچی جان۔ نفس نفیس آ کر ان کی نظر اتار چکی تھیں مگر وہ بستر چھوڑنے پر آمادہ نہ تھیں۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ باہر برفیلی ہواؤں کے جھکڑ فراٹے بھر رہے تھے۔ دن ہونے کے باوجود ہر طرف سناٹوں کا راج تھا۔ موسم کے سرد جھونکوں نے لوگوں کو کمرہ بند ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ گلی کوچوں میں بھی سوکھے پتوں کے انبار بکھر رہے تھے۔ یخ بستہ فضائیں اونگھ رہی تھیں۔ ماحول ٹھٹھرا ٹھٹھرا سا محسوس ہو رہا تھا۔ سرور باجی کافی دیر تک سوتی جاگتی کیفیت میں ڈوبتی ابھرتی رہیں۔

اچانک زمانی بیگم ہانپتی سنبھالتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ "سرور باجی!.......سرور باجی!" انہوں نے آہستگی سے اپنا نرم ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھ دیا۔ ابتدائی چند پکاروں پر وہ غافل سی رہیں پھر چونک کر ان کی صورت تکنے لگیں۔

"باجی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" انہوں نے محبت سے گندھے میٹھے لہجے میں دریافت کیا۔ "اٹھ بیٹھیے۔ آج اتنی نیند آئے جا رہی ہے کیا؟ بس بھئی بہت ہو گئی۔ اٹھیے۔"

"ہاں ہاں.......اٹھ جاتی ہوں۔ تم جاؤ۔" باجی نے نیند بھری آواز میں ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

زمانی بیگم نے دلار سے اصرار کیا۔ "کھانا نہیں کھائیں گی؟ دستر خوان لگ رہا ہے۔ اٹھ جائیے۔"

"بھوک نہیں ہے تو کیا کھائیں؟ خاک؟ جاؤ، تم کھاؤ جا کر۔" انہوں نے نہایت تند آواز میں جواب دے کر کروٹ بدل لی۔ اب ان کی نیند کافی حد تک غائب ہو چکی تھی اور تمام حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔ زمانی بیگم برا مانے بغیر بولیں۔

"باجی! اگر طبیعت خدانخواستہ ناساز ہے تو حکیم جی کو بلوا لیں؟"

"تمہیں کس نے کہہ دیا کہ ہم بیمار ہیں؟" اس دفعہ سرور باجی نے تکیے سے سر اٹھا کر براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ لیا۔ لہجہ بے حد سرد اور انداز کاٹ کھانے والا تھا۔ لیکن زمانی بیگم نے تحمل سے جواب دیا۔

"سارا دن آپ نے کچھ کھایا نہ پیا۔ کسی سے بات کر رہی ہیں نہ بستر سے اٹھ رہی ہیں۔ کوئی تو سبب ہے۔ آخر بتانے میں کیا حرج ہے؟ سب کو فکر لاحق ہے۔"

ان کے آخری جملے پر باجی کی تیوری چڑھ گئی۔ انہوں نے دوبارہ سر تکیے پر ڈال دیا اور انجانی سی تلخی اور خفگی سے کہا۔

"کسی کو ہمارے لئے فکر مندی کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ، جا کر آرام کرو۔"

زمانی بیگم نے بے بس ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی مگر سمجھانے والا کوئی نہ تھا اور سرور باجی بتانے پر آمادہ نہیں لگ رہی تھیں۔ لیکن بہرکیف کوئی نہ کوئی راز تھا ضرور

جس کی پردہ داری تھی۔ ابھی وہ ایک کشمکش کے عالم میں چپ بیٹھی تھیں کہ ابا میاں تیز قدموں سے چلتے ہوئے آئے اور باجی پر جھک گئے۔ زمانی بیگم گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ ابا میاں کے پیچھے پیچھے چچی جان بھی چلی آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں ایک ایک کر کے گھر کے دیگر افراد جمع ہونے لگے۔ دستر خوان پر اس وقت سرور باجی کی غیر موجودگی تعجب خیز تھی۔ انہیں بے وقت اور خلاف معمول بستر پر دیکھ کر ابا میاں کا ماتھا ٹھنکا۔ آج وہ اتفاق سے ہی موجود تھے۔ سراسیمہ ہو کر پوچھا۔

"خیریت تو ہے باجی؟......کیسے لیٹی ہیں بے وقت؟"

ان کی آواز پہچان کر باجی ان سے بھی زیادہ سراسیمہ ہو گئیں اور جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

"باجی!" ابا میاں نے بے چین ہو کر دوبارہ پکارا اور محبت سے پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بخار تو معلوم نہیں ہو رہا۔ پھر کیا بات ہے؟" وہ حیرت کے عالم میں بڑبڑائے۔ پھر دوسرے ہاتھ سے نبض ٹٹول کر بولے۔ "کیا محسوس کر رہی ہیں؟......کہیں درد وغیرہ ہے؟"

ان کی بے قراری دیکھ کر سرور باجی کا دل بھر آیا۔ ان کو خود سے اتنا قریب پا کر وہ بے اختیار اٹھ تو بیٹھی تھیں لیکن ٹکر ٹکر سب کی صورتیں دیکھ رہی تھیں۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ بولیں۔ سارے سوال تشنہ رہے۔ گھر کے ہر فرد کی نگاہیں انہی پر جمی تھیں مگر وہ سب سے نظر چرائے بیٹھی تھیں۔

"چلیے نا......کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے بڑی چچی جان۔" شگفتہ نے بھی آگے بڑھ کر یاد دہانی کرائی۔

"ارے ہم تو ایک گھنٹے سے بیٹھے ترس رہے ہیں۔" زمانی بیگم نے کسی کو مخاطب کیے بغیر سب کو سنایا۔ "مگر مجال ہے کہ باجی نے منہ سے کچھ بول دیا ہو۔"

ان کی آواز سن کر سرور باجی نے گھور کر ان کی طرف دیکھا مگر رہیں چپ ہی۔ ابا میاں نے مڑ کر چچی جان کو مخاطب کیا۔

"چچی جان! اب کیا کریں؟ آپ ہی پوچھیے ان سے۔"

پریشانی اور فکر مندی چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ چچی جان تو پہلے ہی دریائے حیرت میں غوطہ زن تھیں۔ دور کی کوڑی لانے میں لاثانی تھیں۔ بہت دیر سے ان کا دماغ اسی گتھی کو سلجھانے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اچانک ان کی دور رس سوچوں میں جھماکا سا ہوا۔

"ارے!" انہوں نے چونک کر دل ہی دل میں سوچا۔ "اتنی سامنے کی بات ہمیں پہلے کیوں نہ سمجھ میں آ گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ شاید ہم بھی سٹھیا چکے ہیں۔ ظاہر ہے اس ایک اتنی بڑی وجہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے بھلا؟"

انہوں نے پان چبانا ترک کر دیا اور رومال سے باچھیں خشک کر کے گویا ہوئیں۔ "ارے بھیا! ہم نے صاف بوجھ لی سرور کی بیماری۔ حیران ہیں کہ اب تک یہ سیدھی سی بات کسی ایک کی عقل میں کیوں نہ آ سکی۔"

"بتائیے۔ بتائیے۔ ہمیں بتائیے۔ شاید ہم کچھ سدباب کر سکیں۔" ابا میاں نے بے تابی سے دریافت کیا۔

اب ہر کوئی چچی جان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور ہمہ تن گوش تھا۔ چچی جان آگے بڑھ کر سرور باجی کے قریب بیٹھ گئیں اور نہایت دل سوزی کے ساتھ انکشاف کیا۔

"سرور کو فاخر میاں کے بیرون ملک سدھارنے کا غم ہے۔ بس اس کی جدائی کا روگ لگا لیا ہے جان کو۔ اس کے سوا کوئی بات ہو نہیں سکتی۔"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

سرور باجی کے منہ سے ایک تیز سسکاری نکلی اور آنکھوں سے جھل جھل آنسو بہنے لگے۔ سچ سچ ان کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔

ابا میاں ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔ باجی کی خاموشی کی اصل وجہ وہ بھی سمجھ گئے تھے۔ محبت آمیز تسلی سے بولے۔

"یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ بہتر مستقبل اور اپنے شوق و لگن کی تکمیل کی خاطر بچوں کو خود سے جدا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس میں اتنے تردد اور فکرمندی کی چنداں ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ مردوں کو بیرون خانہ بلکہ پوری دنیا کے معاملات سمجھنے کے لئے اپنے وطن سے باہر کے سفر زندگی میں نہ معلوم کتنی مرتبہ کرنے پڑ جاتے ہیں۔ وہ تو آپ سے باقاعدہ مل کر اور اجازت لے کر گیا ہے۔ آپ اس کی سچی خیر خواہ ہیں۔ آپ کو تو ہر وقت اس کے لئے دعا گو رہنا چاہئے۔ گھر سے دور، کسی مجبوری کے تحت جانے والے کو اپنے ہمدردوں کی نیک تمناؤں کی زیادہ ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جب آپ نے بخوشی اسے جانے کی اجازت دے دی تو بس اب دن رات اس کے اچھے نصیبوں اور بھلائیوں کی دعائیں کرتے رہنا چاہئے۔"

ابا میاں آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلتے جا رہے تھے اور بولتے جا رہے تھے۔ اس وقت ان کا سرخ و سپید چہرہ بہت حساس ہو رہا تھا۔ عموماً باجی کے معاملات میں وہ دخل نہیں دیا کرتے تھے مگر آج سرور باجی کی حالت نے انہیں بے بس کر دیا تھا۔ باجی سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ دم سادھے کھڑے تھے۔ وہ بولتے بولتے خاموش ہوئے تو گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ جسے سرور باجی کی رندھی ہوئی آواز نے توڑ دیا۔ آج ان کی آنکھیں برسات بنی ہوئی تھیں۔ سسکتے ہوئے بولیں۔

"ہم نے کب اس کے جانے کی مخالفت کی ہے۔ بڑھ کر اس کی اللہ آمین کون کرے گا۔ اس نے ہمیں اپنے تعلیمی دورے کی ایک ایک بات سے آگاہ کیا ہے۔ ہر بات سے مطلع کیا ہے۔ جس لمحے وہ رخصت ہو کر سدھارا ہے، ہمارا رواں رواں اس کی سلامتی اور بخیریت واپسی کے لئے دعا گو ہے۔ جیسے مولا نے اس کی پیٹھ دکھائی ہے ویسے ہی منہ کی صورت دکھائے۔ اس کی سلامتی کے لئے ورد ہم نے کتنی ہی منتیں مان لی ہیں۔ مگر ہمیں تم سے ایک گلہ ہے...... بہت بڑا گلہ۔"

اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لئے تھمیں تو ابا میاں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ چچی جان نے فوراً حوصلہ افزائی کی اور بڑھ کر بولیں۔ "گلے شکوے کی بات دل میں رکھنے سے فائدہ؟ صاف کہو تاکہ مناسب تدارک کیا جائے۔"

سرور باجی نے براہ راست ابا میاں کی طرف دیکھ کر شکوہ کیا۔ "اگر اس کا پردیس جانا ایسا ازبس ضروری ہی تھا تو اسے اکیلے کو کیوں جانے دیا؟ اور اگر تعلیمی دورے کی وجہ سے اکیلے جانا لازمی تھا تو کم از کم نکاح تو ضرور کر دیا ہوتا۔ اس میں کون سی قباحت یا پریشانی ہوتی!"

ابا میاں کے چہرے پر مسکراہٹ کی معدوم سی چمک دوڑ گئی۔ سمجھا کر بولے۔

"ارے باجی! آپ بھولپن کی باتیں کر رہی ہیں۔ فرض کیجئے کہ اسے نکاح کے بندھن سے باندھ دیا جاتا مگر بقول آپ کے اسے اپنے "تعلیمی دورے" پر جانا تو بغیر بیوی کے ہی پڑتا نا۔ کیونکہ وہ تو دوستوں کے ہمراہ گیا ہے نا!"

زندگی میں شاید پہلی بار زمانی بیگم نے میاں کی بے معلوم سی حمایت کی اور انہیں کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"رہا سوال فاخر کی پردیس میں تنہائی اور دوسری راحت کا تو وہ کون سا نرالا گھر سے دور ہوا ہے؟ سب جانتے ہیں اس کی زندگی کا زیادہ حصہ گھر سے باہر ہوسٹلوں میں گزرا ہے۔ کوئی تو اس کے کھانے پینے، رہنے سہنے کا خیال رکھتا ہی ہوگا۔" یہ کہہ کر آنسو پونچھ ڈالے۔

سرور باجی غضب ناک آواز میں بولیں۔ "اے خبردار زمانی! ہم تمہیں صاف آگاہ کئے دیتے ہیں کہ ہمارے معاملات میں بھی دخل اندازی مت کیا کرو۔ مگر تمہیں کسی کروٹ چین نہیں ہے۔ ادھر ہمارے بچے کا ذکر آیا اور تم نے جلی کٹی شروع کیں۔ اے ہم کہتے ہیں تم جب بھی بولو باون گز کی کیوں بولتی ہو؟ تمہیں اس کا وجود ہی ناگوار گزرتا تھا، اسی لئے تو وہ کالے کوسوں دور چلا گیا ہے۔ اب بیٹھ کے روتی رہو۔ وہ نہیں آنے کا اس جنم میں!"

زمانی بیگم منہ پھیر کر مسکرانے لگیں۔ ابا میاں بھی مسکراتے ہوئے باجی کے قریب بیٹھ گئے اور شگفتہ انداز میں بولے۔ "وہ ایک آدھ ماہ میں انشاء اللہ اسی "جنم" میں لوٹے گا۔ یہ کیا فضول مفروضہ ہے۔ اس میں چنداں دشواری نہیں ہے۔ بس آپ کی خوشی مقصود ہے ہمیں۔"

ساری باتیں چھوڑ کر باجی نے نیا سوال جڑ دیا۔ "اچھا...... اگر خدانخواستہ...... ہمارے منہ میں خاک اگر اس نے وہاں کی "گوری" سے بیاہ رچا لیا تو؟"

ابا میاں کے چہرے سے سایہ گزر گیا۔ چچی جان دبنگ آواز میں بولیں۔ "کیسے کرے گا؟ اس کے باپ نے کر لی تھی ایسی، جو وہ کرے گا؟"

شگفتہ منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔

سرور باجی، چچی کا جواب نظر انداز کر کے ایک آہ بھر کر بولیں۔ "اسی لئے تو ہم کہتے ہیں، اس اونٹ کو کسی کروٹ بٹھا کر ہی باہر کی ہوا خوری کے لئے بھیجو۔ مگر افسوس کے نقار خانے میں طوطی کی کون سنے؟"

شگفتہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ ابا میاں بھی ہنس کر بولے۔ "باجی! آپ بھی معلوم نہیں کہاں کہاں کی کہاوتیں خوب صرف کرتی ہیں۔ اب ماشاءاللہ آپ تو "طوطی" ہی بن گئیں۔ ہم سو باتوں کی ایک بات کہتے ہیں، اگر آپ کہیں تو ہم اس کو مستقل واپس بلوا لیں۔"

"نہیں بھئی، ایسا ہرگز مت کرنا۔" سرور باجی نے فوراً ہاتھ ہلا کر انہیں منع کیا۔

"ہماری بات کا غلط مطلب اخذ مت کرو۔ جو ہمارے جی کو لگی تھی، وہ ہم نے کہہ دی۔ ہم اس کے اچھے مستقبل کے لئے بدخواہی ہرگز نہیں کر سکتے۔ وہ جہاں رہے، خوش رہے۔ ہمیں معلوم ہے پڑھنے لکھنے والے بچوں کے معاملات بھی بڑے ہوتے ہیں۔ اسے سکون سے اپنا کام کرنے دو۔"

ابا میاں مطمئن ہو کر چلے گئے۔ زمانی بیگم پہلے ہی باہر جا چکی تھیں۔ اس وقت کی گفتگو نے انہیں خاموش سا کر ڈالا تھا۔ ان کی طبیعت خود بخود مکدر سی ہو گئی تھی۔ اپنے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر وہ خلاف معمول بہت دیر تک اپنے آپ کو اندر باہر سے ٹٹولتی رہیں، مگر اپنے اس وقت کے اضمحلال کا کوئی سبب تلاش کرنے میں ناکام رہیں اور یہ گرہ کھل نہ سکی۔

※●※

سعید احمد سو گئے تو صغریٰ دادی بھی جو باتیں کر کر کے تھک چکی تھیں، اٹھ گئیں اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اپنے گھر کو چلی گئیں۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد امی جان بھی دوسرے کمرے میں آ گئیں۔ چارپائی پر لیٹتے ہوئے خود بخود بڑبڑائیں۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"بعض دن تو اماں اس قدر بولتی ہیں، اس قدر بولتی ہیں کہ دماغ کی چولیں ہلا ڈالتی ہیں۔ اللہ میری توبہ...... آج تو بھیجا چٹ گیا۔"

نماز کے لئے جائے نماز پر کھڑی ہوتی ہوئی نازیہ ہنس پڑی پھر اس نے نیت باندھ لی۔ باورچی خانے سے برتنوں کی کھٹ پٹ کی آوازیں کسی کی موجودگی کا پتہ دے رہی تھیں۔ نازیہ نماز پڑھ کر اٹھی ہی تھی کہ حمیدہ دو پیالی چائے لئے ہوئے نمودار ہوئی۔

"ارے...... تم چائے کیوں بنا لائیں؟" نازیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی میں نے کہہ کر بنوائی ہے۔" امی بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ شاید چائے سے کچھ سکون ملے۔"

"سر درد کی کوئی بھی کھا لیجئے امی جان!" حمیدہ نے مشورہ دیا۔

"ہاں...... وہی ڈھونڈ رہی ہوں۔" امی نے پاندان میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

حمیدہ نے گلاس میں پانی لا کر دیا۔ وہ گولی کھا کر چائے کی چسکیاں بھرنے لگیں۔ حمیدہ پلیٹ میں تلے ہوئے مٹر کے دانے بھی لا لائی تھی۔

"لیجئے نا امی۔" نازیہ نے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔

"نہیں بھئی اس وقت تو فقط چائے کی طلب ہے بس۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ نازیہ ایک ایک دانہ اٹھا اٹھا کر مزے سے کھانے لگی۔

"حمیدہ لو نا تم بھی۔"

"نہیں بجیا! میں کھا چکی ہوں۔" وہ جواب دے کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ اپیا اور بجیا کی رخصتی کے بعد سے حمیدہ بہت زیادہ ذمے دار ہو گئی تھی۔ اماں کو کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ وہ از خود آگے بڑھ بڑھ کر سارے کام انجام دینے لگی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی سب میں چھوٹی بھی دیگر اٹھانے دھرنے کے کاموں پر توجہ دینے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ امی کو بھی بچیوں کی شادی سے فراغت کے بعد بھی گھر کے کام کاج میں کسی کمی یا وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ کوئی تسلسل بگڑا تھا نہ قاعدہ قرینہ۔ ہر کام اور ہر اصول اسی پہلے کی سی باقاعدگی اور روز مرہ کے معمولات کے مطابق جاری رہے تھے۔ محلے کی اکثر خواتین اس گھر کی مثال اچھے لفظوں میں دیا کرتی تھیں۔

چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی نازیہ کا دل اندر تک شاد ہو گیا۔ چائے کی پتی اور دودھ سے ملتی ہوئی الائچی کی مانوس سی خوشبو اسے باغ باغ کر گئی۔ بابل کے اسی آنگن میں گزرے ہوئے یادگار ماہ و سال چپکے سے یاد آ گئے۔ وہ کنوارپن کے شوخ قہقہوں کی برات اور الہڑپنے کی برسات!

پتہ نہیں، "وہاں" اس چائے میں یہ لطف کیوں نہیں ملتا؟" اس کے دل میں اچانک ہی ایک پُرشور سا خیال اُودھم مچانے لگا لیکن مزید سوال جواب سے بچنے کے لئے اس نے ماں کی طرف دیکھ کر دریافت کیا۔

"امی جان! سر کا درد کچھ کم ہوا؟"

"ابھی تو گولی کھائی ہے۔" انہوں نے اطمینان دلایا۔

اتنے میں چھوٹی آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی اور چپکے سے پوچھنے لگی۔

"بجیا! آپ بقر عید کے بعد جائیں گی نا، دولہا بھائی کے ساتھ؟"

نازیہ ہنس کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا کہہ رہی ہے یہ؟" انہوں نے پیچھے پان سے پوچھا۔

نازیہ نے اس کا سوال دہرایا۔ ان کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔ خوش دلی سے پوچھا۔ "اچھا تو چھوٹی اس فکر میں جتلا ہے۔ کیوں بھئی! یہ بتاؤ تم اپنی بجیا اور دولہا بھائی کو کھلاؤ گی کیا بقر عید کے دن؟"

چھوٹی، ماں کی شہ پر اُچھل پڑی اور جوش و خروش سے جواب دیا۔

"بکرا...... بکرے کی کلیجی...... بکرے کی بوٹیاں...... چربیاں اور......"

حمیدہ بھی کہیں سے وارد ہو گیا تھا، اس نے لقمہ دیا۔

"اور بکرے کے پائے...... بکرے کی سری...... بکرے کی اوجھڑی۔"

سب ہنسنے لگے۔ نازیہ نے اسے ایک دھپ رسید کر کے کہا۔ "پاجی کہیں کا۔ ہمیں اوجھڑی کھلائے گا۔ خود کھا لینا مکروہ چیز۔"

وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ چھوٹی نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اچھا تو اوجھڑی مکروہ ہوتی ہے؟ کھانا نہیں چاہئے نا بجیا؟"

نازیہ سے پہلے امی جان نے تصحیح کر دی۔ "لیکن...... حرام نہیں ہے۔ اس لئے کھانا مکروہ ہے، منع نہیں۔"

"یہ حمید کہاں چلا گیا؟ ابھی تو یہیں تھا۔" نازیہ نے چاروں طرف دیکھ کر دریافت کیا۔

"بجیا! وہ قربانی والا بکرا لے کر باہر گیا ہے۔ روزانہ جاتا ہے اس وقت۔" حمیدہ نے باورچی خانے سے پکار کر بتایا۔

امی جان ہنس کر بولیں۔ "آج کل بکرا تو اسی لاڈلے کے ساتھ رہے گا۔ پرسوں تو بابا سے خوب ڈانٹ کھائی۔ بکرے کی چاہت میں اسکول کی چھٹی کر کے بیٹھ رہا تھا۔ ہم صبح سے سمجھتے رہے، ناشتہ کر کے اسکول گیا ہے۔ دوپہر میں حمیدہ نے اس کا بستہ دیکھا تو وحشت سے چلا اٹھی۔ سارا گھر گھبرا گیا کہ لڑکا بالا کہیں کھو گیا، کہیں حادثہ ہو گیا۔ بکرے صاحب بھی غائب ہیں۔ تمہارے بابا بھی گھر پر تھے۔ ان کے ڈر سے حوصلہ قائم رکھا۔ تھوڑی دیر میں حمید اسکول سے آیا تو پتہ چلا موصوف بکرے کو میدان میں ٹہلا رہے تھے۔"

چھوٹی اپنا جوڑا، ہار، بندے اور چوڑیاں اٹھا لائی اور خوشی خوشی بولی۔ "بجیا! یہ دیکھئے، ہماری بقر عید کی چیزیں۔"

نازیہ شوق سے دیکھنے لگی۔ پھر کپڑوں کو الٹتے پلٹتے ہوئے پوچھا۔ "کس نے سی کر دیا ہے؟"

چھوٹی نے فخر سے گردن تان کر جواب دیا۔ "اپیا نے۔"

نازیہ کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ "اپیا نے؟...... وہ کب؟"

امی جان نے پاندان بند کرتے ہوئے تفصیل سے بتایا۔

"پچھلی دفعہ جب سعدیہ آئی ہے تو اللہ رکھے کئی دن رہ کر گئی تھی۔ رُکے رُکائے بہت سے کام نمٹا گئی تھی۔ مشین رکھی تو بہت سارے کام کرتی چلی گئی۔ حمیدہ اور چھوٹی کے بھی دو دو جوڑے سی گئی تھی۔ کہہ گئی تھی امی جان! بقر عید پر یوں بھی قربانی کی وجہ سے زیادہ اخراجات سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ جوڑے اٹھا کر رکھ دیجئے گا۔ تہوار کے موقع پر سلے سلائے نکل آئیں گے۔ اس کے علاوہ دو چھ تکیے کے غلاف، دو پلنگ کی چادریں، میرے اور اپنی صغریٰ دادی کے کپڑے سی گئی تھی۔ کیاریوں میں موسم سرما کے نئے پودے جو لہرا رہے ہیں، ان کی قلمیں اور بیج حمید کے ساتھ مل کر بڑی محنت اور ترتیب سے لگا

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کر رکھی تھی۔ بیٹھک کی میز اور کرسیوں کے نئے غلاف اور میز پوش بھی تیار کر دیے تھے جو اب حمیدہ بقر عید کے موقع پر تبدیل کرے گی۔"

امی جان ایک سرشاری کے انداز میں بتاتی چلی گئیں۔ سب کچھ سن کر نازیہ کو رشک آ رہا تھا۔ روح کے اندر کہیں رہ رہ کر اک کانٹا سا کھٹک رہا تھا۔ کوئی خلش اور چبھن سی تھی جو اک ہوک بن کر رگ و پے میں سرایت کیے جا رہی تھی۔

'اے کاش! میں بھی کبھی اپنے ماں جائے بہن بھائیوں کے کام آ سکتی! اپنے بزرگوں کی خدمت کر سکتی! جس روز سے شادی ہوئی ہے، ایک دفعہ بھی جی بھر کر میکے میں رہنا نصیب نہیں ہوا۔ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔'

معطر اور اس کے خشک اور طنز بھرے رویے کا خیال آیا تو وہ مزید بجھ گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

'پتہ ہی نہیں چلتا کہ معطر آپا ہر بات پر کیوں چڑھ دوڑتی ہیں۔ اماں بی تو کبھی ایسا نہیں کرتیں۔ خدانخواستہ اگر ان کا دم نہ ہو تو معلوم نہیں میرا کیا حشر کریں۔ ہر بات میں روک ٹوک اور کاٹ سے کام لیتی ہیں...... یوں لگتا ہے میرے یہاں آنے سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اب ابا جان کی بیماری پر بھی اگر اماں بی زور دے کر نہ بھیجتیں تو میں تو یہاں آنے سے محروم رہ جاتی...... تو...... مجھے تو پتہ ہی نہیں ابا جان کو اتنے دنوں سے بخار آ رہا ہے۔ اگر فرحت سے ملنے والے ڈاکٹر صاحب تذکرہ نہ کرتے تو علم ہی نہ ہوتا۔ وہ تو میڈیکل اسٹور پر کچھ دوائیوں کا اسٹاک لینے اتفاق سے آ گئے تھے۔'

وہ سوچ کر گلی کوچوں میں معلوم نہیں کب تک بھٹکتی کہ معاً کسی نے اسے آواز دے کر پکار لیا۔ وہ چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔ سعید احمد جانے کب کے آ گئے تھے اور اس کی طرف آج کا اخبار بڑھا رہے تھے۔ نازیہ بھی ان کی ہدایت پر اخبار میں دیکھ کر خبریں پڑھنے لگی۔ امی جان بھی شوق سے کان لگائے سن رہی تھیں۔ لگتا ہے وہ دونوں کسی خاص خبر پر تبصرہ بھی کرنے لگتے تھے۔ کچھ وقت نہایت مسرت کے ساتھ بیت گیا۔

پوری خبریں سن کر سعید احمد اخبار اٹھا کر وہ باہر اندر چلے گئے اور نازیہ امی کے ساتھ بیٹھ کر میتھی بنانے لگی۔ میتھی کے ہرے ہرے تازہ پتوں سے چھابی بھرتی جا رہی تھی۔ امی کے درد میں افاقہ ہو گیا تھا۔ شاید اب ان کی طبیعت بحال لگ رہی تھی۔

"ارے بھئی بیٹی آئی ہوئی ہے۔ کوئی اچھا سا کھانا بنا لو۔ یہ کاہے کی تیاری ہو رہی ہے؟" سعید احمد قریب سے کہتے ہوئے گزرے۔

امی ہنسنے لگیں۔ نازیہ جلدی سے بولی۔ "نہیں ابا جان! مجھے تو آلو میتھی بہت پسند ہے۔ دوپہر میں تو یوں بھی کوفتے بنے تھے اور مونگ کی بھنی ہوئی دال بھی تھی۔"

"میرا خیال ہے کوفتوں کا سالن بچا بھی ہے۔" امی جان نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" کہیں قریب سے حمیدہ نے جواب دیا۔ "ایک ڈونگا بھرے رکھے ہیں۔"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ باہر کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور آگے بکرا پیچھے حمید ایک دوسرے کے تعاقب میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ بکرے نے ایک نعرہ مستانہ بھی لگایا۔

"میں......"

حمید نے اس کے پیچھے ایک لمبی سی ٹھوکر کھائی اور اپنے ہی زور میں بھاگتا ہوا برآمدے تک آ گیا۔ اتنی دیر میں بکرے صاحب نے اتنے دنوں کی بے مہاری کا حق ادا کر دیا۔ حمید کے ہاتھ سے رسی چھوٹتے ہی مارے خوشی کے اونچی "کوداری" مارنے کے شوق میں لمبی سی چھلانگ لگا ڈالی اور اپنے اگلے دونوں کھروں میں کپڑے لٹکانے کی رسی لیے ہوئے دھڑام سے زمین بوس ہو گئے۔ ہینڈ پمپ کے چبوترے پر بیٹھی چھوٹی بدک کر بھاگی۔ امی اور نازیہ دونوں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ اپنی ہی جھونک میں پھسلتے ہوئے حمید نے بمشکل سنبھالا لیا اور اپنا رخ بکرے کی طرف پھیر لیا۔ متوقع شامت کے پیش نظر انہوں نے اپنا مزید لیٹے رہنے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ ایک عدد زوردار جھرجھری کے ساتھ فرش سے اٹھے اور عرش کی طرف محو پرواز ہو گئے۔ پورے گھر میں ایسی دھاچوکڑی مچی کہ اللہ توبہ! ابھی وہ ہری بھری کیاریوں کو روند رہے تھے، کبھی صحن میں چوکڑیاں بھرنے لگتے، کبھی بکھرے ہوئے کپڑوں کے ڈھیر کو پھلانگتے ہوئے بیرونی دروازے کو تقریباً رگڑتے ہوئے صحن کی دیواروں کے ساتھ ساتھ قلانچیں بھرنے لگتے۔ حمید کا بھاگتے بھاگتے دم پھول گیا۔ سعید احمد بھی کمرے سے نکل کر برآمدے میں حیران و پریشان کھڑے تھے۔

باورچی خانے میں موجود حمیدہ کو وہاں سے نکل بھاگنے کا موقع مل رہا تھا نہ حوصلہ کہ قربانی کے پلے بلائے بکرے سے مقابلہ کرتی باہر نکل پڑتی۔ کیونکہ کمروں اور باورچی خانے کے درمیان میدان کارزار گرم تھا۔

اچانک حمیدہ کا دم فنا ہو گیا۔ بکرے صاحب کا رخ سیدھا اسی طرف تھا...... پھر چشم زدن میں وہ اپنے گلے کے گھنگھرو اور کھروں کی جھنجھناہٹ کے ساتھ باورچی خانے کے اندر تھا۔ حمیدہ چیخ کر دیوار سے جا لگی۔

باہر دیکھنے والوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ امی جان، سعید احمد اور نازیہ بیک وقت اسی طرف دوڑ پڑے۔ مگر حمید کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ برتنوں کی کھٹ پٹ اور چھنا چھن میں اضافہ تو ضرور ہوا لیکن حمید کامیاب ہو گیا۔ رسی ہاتھ میں آتے ہی بکرے صاحب ایسے شریف اور معصوم ہو گئے جیسے اس گھر کے صحن میں پانی پت کرنال کی تیسری جنگ کا نقشہ انہوں نے بذات خود نہیں بلکہ ان کے پڑوسی بکرے نے پیش کیا تھا۔ حمیدہ غریب کا دہشت میں کانپ کانپ کے برا حال ہو گیا۔

حمید کو اس دن بھی باپ سے خوب ڈانٹ پڑی۔ گھر کا بگڑا ہوا انتظام اور ٹوٹ پھوٹ سنوارتے ہوئے امی نے الگ لتاڑا۔ باقی سب طرف سے بھی حسب توفیق پھٹکاریں موصول ہو گئیں۔ وہ منہ بسور بسور کر اپنی صفائی پیش کرتا رہا لیکن سب کے اس متفقہ خیال کو نہ بدل سکا کہ قربانی کے جانور کو شرارتی کرنے میں سو فیصد دخل اسی کا ہے۔ اسی لعنت ملامت کی وجہ سے اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا اور سب سے منہ پھلا لیا۔ وہ سخت ناراض اور دلگیر تھا۔

شدید سردی تھی۔ کھانے کے بعد سب جلد ہی لحافوں میں گھس گئے۔ سب بہن بھائیوں کے بستر بڑے کمرے میں لگے ہوئے تھے۔ حسب دستور امی جان نے سب بچوں کو ایک ایک مٹھی خشک میوہ بانٹا۔ حمید نے لینے سے انکار کر دیا۔ نازیہ نے حمیدہ کو اشارہ کیا۔ وہ چھوٹی سینی میں کھانا نکال لائی۔

"مجھے نہیں کھانا ہے۔" وہ بگڑ کر بولا۔ "خود ہی کھا لو سب کچھ۔"

حمیدہ کو ہنسی آ گئی۔ امی جان مسکرا کر بولیں۔ "چلو چھوڑو ناراضگی بیٹا! چند دن کا مہمان ہے بکرا۔ آج تو سب ہی پریشان ہوئے۔ تمہیں اس لیے سب نے آڑے ہاتھوں لیا کہ تم ہی اس کے گھیرے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اسے تو برا نہیں کہا جا سکتا نا!"
دوست ہو۔ ایک تو وہ جانور، دو بے قربانی کا۔
سب مسکرا کر حمید کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ چڑ کر کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ امی جان دوبارہ بول پڑیں۔ "اور ہاں...... تم بھول گئے، اس روز تمہاری دادی نے کیا کہا تھا کہ قربانی ہو جائے تو ایک ران اپنی آپا کو اور دوسری ران اپنی بجیا کی سسرال پہنچا کر آنا۔"

"ہرگز نہیں...... ہرگز نہیں۔" وہ جیسے پھٹ پڑا۔ غم و غصے سے تپ کر بولا۔ "بجیا کی سسرال تو کبھی نہیں جاؤں گا۔ پتہ ہے پچھلی عید پر دولہا بھائی کی ہمشیرہ صاحبہ نے کیا، کیا تھا؟...... میرے ہاتھ سے عیدی کا جوڑا چھین کر باہر پھینک دیا تھا...... سب لوگ دیکھ رہے تھے۔"

امی جان کا مسکراتا ہوا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ صد شکر کہ بیمار سعید احمد دوسرے کمرے میں تھے۔ سب کے چلتے ہوئے منہ رک گئے۔ نازیہ دل ہی دل میں پچھتا کر رہ گئی۔ کتنے جتن سے یہ تکلیف دہ واقعہ چھپا رکھا تھا اب سے۔ ورنہ تو سعدیہ نے حمید کو طوطے کی طرح پڑھایا تھا، رٹایا تھا، سمجھایا تھا مگر آج سب ملیامیٹ ہو گیا تھا۔ امی جان نے غم آلود نگاہیں اٹھائیں...... نازیہ کے ہاتھوں سے اون سلائیاں گر پڑیں۔

***

"میرے ہاتھ پہ تیرے پیار کا ہاتھ
روز [illegible] ہو جیسے"

نازش نے ہلکے سُروں میں گنگناتے ہوئے سعدیہ کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور نم آنکھوں اور مسکراتے لبوں [illegible] دیکھتے ہوئے اس کے آنسو اپنے آنچل میں سمیٹ لیے اور نرمی سے بولی۔

"اس دن ڈاکٹر بھائی جان کے اچانک آ جانے والے مہمانوں کی وجہ سے تمہاری بات پوری نہ ہو سکی اور آج موقع ملا تو تم نے رونا شروع کر دیا۔ نازش! [illegible] اتنی کمزور دل نہیں سمجھتی تھی۔ تم بہت ہی بودی ثابت کر رہی ہو خود کو۔"

اس نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"یہ نئی بات نہیں ہے۔ ہر دفعہ یہی ہوتا ہے میرے ساتھ۔"

یہ دونوں بھابی کے بیڈ پر نیم دراز باتوں میں مصروف تھیں۔ ڈاکٹر سلطان فیملی سمیت کہیں مدعو تھے۔ کینیڈا سے آنے والے ان کے دوست کی فیملی آج دس دن کے بعد صبح کی فلائٹ سے روانہ ہوئی تھی۔ اتنے دنوں کے بعد اس وقت یہ دونوں فرصت اور سکون سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اس دوران فاخر بھی مسلسل کئی دن تک گھر رہ کر آیا تھا مگر یہاں مہمانوں کی موجودگی کی وجہ سے نازش والا باب بند ہی ہو چکا تھا۔ لیکن آج سعدیہ چاہ رہی تھی کہ نازش کی زبانی تمام تفصیل سے آگاہ ہو جائے۔ نازش کی خاموشی پر دوبارہ اسے اکسایا۔

"اس روز سے رو رو کر مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم نے رخشندہ کا ذکر کیوں کیا تھا؟" اس کی اڑتی رنگت دیکھ کر سعدیہ نے فوراً اسے ہلکی سی چپت رسید کر دی۔ "خبردار جو کارٹونوں جیسا منہ بنایا۔ خدا جانتا ہے ابھی تیری جان ایک کر دوں گی۔"

نازش نے بھی بروقت سنبھالا لے لیا اور زچ ہو کر پوچھا۔ "اچھا جج صاحب! کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟...... پوچھیے۔ دماغ چاٹ لیا لے کے۔"

سعدیہ نے فوراً سوال داغ ڈالا۔

"مگر امتحان میں عقل مند طلبہ غیر ضروری سوال پہلے حل کرتے ہیں۔ اس لیے براہ کرم آپ بھی محترمہ رخشندہ صاحبہ کے کردار پر سب سے پہلے روشنی ڈال دیجیے۔ شکریہ۔"

نازش تھوڑی دیر تک چپ بیٹھی کچھ سوچتی رہی جیسے دل ہی دل میں کسی خاص نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے انداز میں ایک نامعلوم سی ہچکچاہٹ پنہاں تھی۔ بالآخر ایک گہرا سانس کھینچ کر فیصلہ کن لہجے میں گویا ہوئی۔

"اس دن مہمانوں کی آمد کو میں تائید غیبی سمجھ کر پکا ارادہ کر بیٹھی تھی کہ ہرگز کچھ نہ بتاؤں گی۔ اس لیے دانستہ خاموشی اختیار کیے رکھی۔ حتیٰ کہ دسمبر سے جنوری آ گیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے تمہیں خصوصاً اس کام پر مامور کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اللہ مجھے معاف کرے، آج تمہیں بھی اس راز میں شامل کیے لیتی ہوں۔ آگے جو ہو سو ہو۔"

"امتحانات قریب تھے، تب اچانک ہی ایک دن رخشندہ غائب ہو گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ یکلخت بارہ دن سے غیر حاضر تھی۔ ہر طالب علم کی طرح میں بھی دن رات پیپرز کی تیاری میں مصروف تھی۔ مجھے اپنے سر پیر اور کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ [illegible] کی بے پناہ مصروفیات کے باوجود رخشندہ کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ اس کا خیال کسی صورت ذہن سے اتر نہ پا رہا تھا۔ آخر میں بھی یونیورسٹی کے ماحول میں ہی رہی تھی۔ اتنا ضرور جانتی تھی کہ وہاں وہ ایک بے حد تیز طرار لڑکے کے ساتھ زیادہ وقت گزار رہی ہے۔ [illegible] عادت کی طرح [illegible] بچی تھی مگر رخشندہ ہنس ہنس کر ٹال گئی تھی۔ حالانکہ وہ لڑکا اس کے شیشے سے بھی [illegible] رکھتا تھا۔

امتحانات آ [illegible] رخشندہ دوبارہ نظر نہ آئی۔ پیپرز کے بعد میں اپنے گھر تک محدود ہو گئی۔ مارے دکھ، خوف اور پریشانی سے کہیں آنے جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ سارا سارا دن گھر میں بیٹھی سوچتی رہتی، اسے یاد کرتی رہتی۔ مگر اس کے غائب ہونے کا کوئی سبب [illegible] رخشندہ کی گمشدگی میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں تقریباً مایوس ہو بیٹھی تھی کہ ایک صبح اچانک ہاسٹل سے رخشندہ کا ٹیلی فون آ گیا۔ اس نے فوراً سے پیشتر بلایا تھا۔ میں پوچھ پوچھ کر عاجز آ گئی کہ کیا ہوا؟ وہ اب تک کہاں تھی؟ اور مجھے کیوں بلا رہی ہے؟ مگر اس نے ایک سوال کا بھی جواب نہ دیا۔ بس یہی رٹ تھی کہ فوراً چلی آؤ۔

امی حسب معمول کلینک میں تھیں۔ ان سے اجازت لے کر میں بھاگم بھاگ ہاسٹل آ گئی۔ رخشندہ کا حال دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ وہ سر سے پاؤں تک اجڑ کر رہ گئی تھی۔ اس کی سرسبز و شاداب شخصیت کو گرہن لگ گیا تھا۔ جانے کس کی نظر کھا گئی تھی۔ اس کی شرارت بھری ہنسی، کھنکتی ہوئی آواز، شوخ و شنگ قہقہے اور بے پرواہ انداز و ادائیں سب کہیں کھو گئی تھیں۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی، التجا کرتی آنکھیں، زرد زرد کملائے ہوئے رخسار، لاغر سراپا اور پریشان صورت...... خدا گواہ ہے میں تو چکرا کر رہ گئی۔ ایک نظر میں وہ رخشندہ لگ ہی نہیں رہی تھی!

وہ دیر تک میرے گلے لگی روتی رہی۔ باوجود کوشش کے میری زبان سے ایک لفظ بھی تسلی تشفی کا نہ نکل سکا۔ دل کی بھڑاس اچھی طرح نکالنے کے بعد رخشندہ نے زبان ہلائی تو...... اس پر بیتے واقعات سن کر میرے پاؤں تلے زمین کھسک گئی۔ اس روز میرے تمام خدشات اور اندیشے ایک

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ہولناک حقیقت بن کر سامنے آچکے تھے۔ اس کی لرزہ خیز داستان سے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ ایک وہ نہیں، کئی ساتھیوں نے مل کر اسے بے وقوف بنایا تھا...... جی بھر کے لوٹا تھا اور عین امتحانات کے زمانے میں اسے ورغلا کر کہیں دور لے گئے تھے...... ان ہوس پرستوں نے اس عاقبت نااندیش لڑکی کے ساتھ وہی صدیوں پرانا کھیل کھیلا تھا جو موقع پرست کھلاڑیوں کا من پسند کھیل ہے۔ رخشندہ کی بے راہ روی نے اسے ایسی خوف ناک سزا دی تھی کہ وہ چپکے جی غرقوں میں شمار کی جا سکتی تھی۔ وہ بار بار خودکشی کر لینے کی بات کر رہی تھی۔ وہ مکروہ چہرہ مردوں کی دغا باز فطرت سے ہمیشہ کے لئے متنفر ہو چکی تھی۔ مگر اب اس نفرت اور کراہت کے اظہار کا کیا فائدہ تھا۔ اس کا پچھتانا اور رونا سب بیکار اور فضول تھا۔ ان تمام باتوں کا وقت کمان سے تیر کی طرح نکل چکا تھا۔ اس گھناؤنے جرم کے مجرم دنیا کے وسیع و عریض دامن میں روپوش ہو چکے تھے۔ ان کو ان کے گناہ کی سزا روز محشر تو ضرور ہی ملتی مگر فی الحال تو اس وقت اور روز قیامت کے درمیان وہ بھیانک وقفہ ضرور حائل تھا جو رخشندہ پر عرصہ حیات تنگ کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس فکر اور اندیشے کی جابری کے خوف سے وہ اپنی زندگی ختم کر لینے کے درپے ہو گئی تھی۔

اب تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا اور اسے لعنت ملامت کا بھی فائدہ نہ تھا۔ میں اس کے پاس سے واپس آئی تو سر سے پاؤں تک سوچ میں غرق تھی۔ ہمدردی ہی ہمدردی میں اُسے اقدام خودکشی سے روک کر اور اس کا موجودہ مسئلہ حل کرنے کا وعدہ کر کے آئی تھی۔ مگر اب کروں تو کیا کروں؟ حالانکہ روتے دھوتے بھی ترکیب اسی لااُبالی مجھے سوجھی تھی مگر میری جرأت لڑکھڑائے جا رہی تھی۔ جو ملے شرمندہ اور ہمت جواب دے رہی تھی۔ شروعات کے چند لمحے تو اسی کشمکش اور ہیجان میں گزر گئے کر روں تو کیا...... لیکن وہ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی التجا کرتی آنکھیں، زرد زرد کملائے رخسار اور خودکشی کا سوال مجھے لرزائے دے رہا تھا۔ چنانچہ بہت سوچ سوچ کر میں نے اس مسئلے کا حل یوں نکالا کہ جیسے بھی بن پایا سارے حالات ایک کاغذ پر لکھ کر چاندنی بوا کے ہاتھوں ممی کو کلینک میں بھجوا دیا اور خود چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھ گئی۔

مگر امی جان نے ذرا سی رعایت نہ برتی۔ فوراً کلینک سے گھر آ گئیں۔ اپنے روبرو طلب کیا اور تمام قصہ زبان سے بتانے کا حکم دیا۔ یہ مرحلہ بدقت تمام حل ہوا تو ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آنسوؤں کے ریلوں کے درمیان بھی میں نے بار بار انہیں وقت کی نزاکت، وقت کی کمی اور رخشندہ کی حالت زار کا واسطہ دے دے کر رام کرنا چاہا مگر افسوس کہ ہر دفعہ ان کا بی پی ہائی ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ سخت سست اور برا بھلا کہتی ہوئی کلینک چلی گئیں اور میں رخشندہ کی حالت زار کا احساس کر کے جلتے کڑھتے اور روتے روتے وہیں سو گئی۔"

نازش بات کرتے کرتے سانس لینے کے لئے رکی تو سعدیہ نے اٹھ کر اسے گلاس میں پانی لا کر دیا اور گہری سنجیدگی سے بولی۔

"اب رخشندہ کا کردار بہت حد تک سمجھ میں آ چکا ہے۔ بلکہ اگر تم نہ بتاؤ تب بھی حالات کی سنگینی سب کچھ از خود بتائے دے رہی ہے۔ تاہم کوئی بات ایسی بھی ضرور ہے جو تمہارے دل کا زخم بنی ہوئی ہے۔ وہ بات بتاؤ گی؟"

نازش نے اس کی بات ان سنی کر دی اور پانی پی کر دوبارہ بولنے لگی۔

"اس قیامت کی شام میں سو کر جاگی تو سب سے پہلا خیال رخشندہ کا ہی آیا۔ اس کی بے بسی

رہ رہ کر کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی، چبھ رہی تھی۔ وہ یقیناً حالات کی سولی پر چڑھی میرے فون کا انتظار کرتی رہی ہوگی۔ ایک دہشت ناک خیال یہ بھی بے چین کر رہا تھا کہ کہیں وہ مایوس ہو کر خودکشی نہ کر لے۔ ان دنوں بھی انسانیت اور دوستی کا ناتا میرے نزدیک اعلیٰ و ارفع تھا۔

ممی کا اتنا شدید ردِعمل میرے لئے ناقابل فہم بلکہ ناقابل قبول تھا۔ مجھے ان کے رویے سے مکمل ناامیدی تو ہو چکی تھی مگر پھر یہ ناامیدی شدید قسم کی جھنجلاہٹ اور ممی سے خفگی میں تبدیل ہونے لگی۔ میں جی ہی جی میں ان سے ناراض ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ چاندنی بوا کے چائے کے بلاوے کو بھی رد کر ڈالا مگر اسی دوران انہونی ہو گئی۔ ممی خود چل کر میرے قریب آئیں اور بھاری لہجے میں گویا ہوئیں۔

"ساری دوپہر میں اسی مسئلے پر غور کرتی رہی۔ نئی نسل کی بے راہ روی اپنی جگہ مگر لڑکیوں کی بے بسی، نادانیاں اور مظلومیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وقت سے پہلے پرواز کر جانے والی لڑکیوں میں زیادہ تعداد ان جذباتی اور فطری طور پر معصوم لڑکیوں کی ہوتی ہے جو شاطر قسم کے شکاری لڑکوں کے بہلانے پھسلانے میں با آسانی آ جاتی ہیں اور ان کے نقلی عشق اور اظہار محبت کے سستے اور جھوٹے دعوؤں کو حقیقت جان کر بے خطر آگ کے دریا میں کود پڑتی ہیں۔ اور دوسری قسم ان لڑکیوں کی ہے جو لڑکوں سے آزادانہ میل جول رکھتی ہیں۔ لہٰذا اس راہ کے پرانے اور سودی کھلاڑی موقع محل دیکھ کر وار کر جاتے ہیں۔ رخشندہ بھی کسی ایسے ہی بے حمیت راہزن کے ہتھے چڑھ گئی ہوگی۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے مجھ سے رخشندہ کو فون کر دو کہ گھر آنے کا کہا۔ اس وقت میری ممی صبر و برداشت کا ایک پیکر عظیم نظر آ رہی تھیں۔ دوپہر والا جلال اور گرم گرم غصے کی لہر شاید دب گئی تھی۔ ان کی حسب ہدایت رخشندہ ...... بات چیت کرتی رہیں۔ ظاہر ہے اس تفصیل سے میں لاعلم ہوں۔ مجھ پر رخشندہ سے ملنے پر پابندی عائد ہو چکی تھی۔ تاہم میں مطمئن تھی۔ میرے لئے یہ اطمینان کافی تھا کہ میں نے ممی کو اس کی امداد پر آمادہ کر لیا ہے۔

ایک دن ممی نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔

"میں نے یہ فیصلہ کیا ہے...... رخشندہ کو اس گناہ سے چھٹکارا ضرور دلانا چاہئے۔ جو ہوا سو ہوا مگر اب اس کی آئندہ زندگی کا سوال ہے۔ اس سلسلے میں، میں اس کی مدد ضرور کروں گی۔ مگر بذات خود یہ کام نہیں کر سکتی۔ اپنی ایک دوست ڈاکٹر کے ذاتی ہسپتال میں داخل کروائے دیتی ہوں۔ تمام اخراجات اٹھانے کے علاوہ صحت یابی کے بعد اس کے گھر تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ تمہاری دوستی کا حق ادا ہو جائے گا لیکن اس شرط کے ہمراہ کہ اب آئندہ اس کا مقام یونیورسٹی کی بجائے اسکا گھر ہوگا۔ یہ بات میں نے اس سے کی ہے اور یہ شرط منظور ہے اس کو...... اس شرط کا دوسرا حصہ تم سے منسلک ہے۔ اس پر ہمیشہ عمل پیرا رہنے کی پابند تم ہوگی اور وہ یہ کہ...... تم رخشندہ اس کے ماضی سمیت ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ گی۔ تاکہ وہ تمہیں دیکھ کر بھی اپنا ماضی یاد کر کے شرمسار نہ ہو...... شرمندہ نہ ہو...... تم دونوں کو ایک دوسرے کو فراموش کرنا ہوگا۔"

ممی کی حتمی اور واضح شرائط سن کر مجھے خوشی بھی ہوئی، افسوس بھی۔ جہاں اس امر سے بے پناہ خوشی اور سکون نصیب ہوا کہ میری ممی ایک مظلوم اور شکست خوردہ لڑکی کی نہایت مناسب انداز میں مدد کر رہی ہیں بلکہ رہنمائی بھی کر رہی ہیں۔ ویسے اس سے بھی نہ ملنے کا دکھ بھی تھا۔ تاہم غم سے خوشی کا

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

وزن زیادہ تھا۔"

نازش چند لمحوں کے لئے تھمی، پھر براہ راست سعدیہ کو دیکھ کر بولی۔

"اور پھر سعدیہ! میری زندگی میں وہ شام آئی جو میری یادداشت میں ہمیشہ کے لئے گڑ کر رہ گئی ہے، جم چکی ہے۔ ایسی محفوظ ہوئی ہے وہ شام کہ اگر اس کی تفصیل مجھ سے نزع کے عالم میں بھی کوئی پوچھ لے تو شاید جانکنی کا عذاب بھول کر میں اس شام کی کیفیت سنانے بیٹھ جاؤں...... ممی اس شام کو اپنے کلینک پر نہیں تھیں۔ باہر سے لوٹیں تو بہت تھکی تھکی تھیں۔ چائے کے دوران مجھے مخاطب کر کے بولیں۔

"آج...... رخشندہ کا یوم نجات ہے۔ وہ ڈسچارج ہو رہی ہے۔"

میں سانس روک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ آگے نامعلوم کیا کہیں وہ۔ میری سوالیہ نظریں دیکھ کر کہنے لگیں۔

"میں نے سات بجے والی فلائٹ سے اس کے جانے کا انتظام کر دیا ہے۔ اور اب اسے ایئرپورٹ پہنچانے جا رہی ہوں۔"

میں نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا اور بے قرار ہو کر پوچھا۔

"ممی! میں بھی چلوں آپ کے ساتھ؟"

"نہیں...... قطعی نہیں۔" انہوں نے قطعیت سے جواب دیا۔ پھر نرم پڑ گئیں۔ "بیٹا! وہ تمہیں دیکھ کر بے کل ہو جائے گی۔ یوں بھی بہت بیمار اور حساس ہو گئی ہے...... کوئی سبب ہے اسی لئے تو یہاں نہیں لائی اسے۔"

جانے کیوں ان کو دیکھتے ہی دل کو دھچکا سا لگا، گویا پہلو میں خنجر اتر گیا ہو۔ میں بھاگ کر ان کے قریب گئی اور آنکھوں میں اشک لئے پوچھا۔

"ممی! سچ بتایئے کیا رخشندہ ٹھیک تو ہے؟...... اب اسے کوئی خطرہ تو نہیں؟"

انہوں نے خلاف معمول نظر اٹھا کر میری صورت دیکھی اور منہ پھیر کر سنجیدگی سے بتایا۔ "اب تو کوئی خطرہ نہیں مگر...... ڈاکٹر کی رپورٹ ہے کہ شادی کے بعد...... وہ کبھی ماں نہ بن سکے گی۔"

یہ اندوہناک خبر سنا کر امی چلی گئیں اور ایسی گئیں کہ میری منتظر نگاہیں...... منتظر ہی رہ گئیں۔"

"کیوں؟...... کہاں گئیں ممی؟" سعدیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

نازش تکیے پر اوندھی پڑی سسکتی رہی۔ چاندنی بوا نے چائے بڑھائی اور آنسو پونچھ کر بولیں۔

"اس لڑکی کو جہاز میں سوار کرا کے واپس آتے ہوئے تو بیگم صاحب کی گاڑی کو ٹرک نے ٹکر مار کر چکنا چور کر دیا تھا۔"

سعدیہ کے منہ سے نکلنے والی چیخ ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فاخر نے مسکراتے ہوئے چند کاغذ اس کی گود میں ڈال دیئے۔

"سنبھالئے ہمارا دوسرا نکاح نامہ۔"

❖❖○❖❖

لیکن...... فاخر کو یہ مذاق بہت مہنگا پڑا۔ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اسے فوراً ہی سنجیدہ ہو جانا پڑا۔ سعدیہ اسے مسلسل ٹکٹکی باندھے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔ اس سے نظر چرا کر فاخر نے تکیے پر اوندھی پڑی نازش پر غور کیا تو مزید پشیمان ہو کر رہ گیا۔ وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ اس کے سرخ سرخ گال بھیگے ہوئے تھے۔ وہ بھی پُراشک نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

غنیمت یہ ہوا کہ چاندنی بوا اس منظر کو دیکھے بغیر جا چکی تھیں۔

فاخر کو اچانک ہی ماحول کی سنجیدگی کا احساس ہو گیا۔ راستے بھر جو سعدیہ کی پریشانی سے لطف اندوز ہونے کے منصوبے بناتا آیا تھا، پل بھر میں اڑن چھو ہو گئے۔ دونوں کا حال زار دیکھ کر الٹی آنتیں گلے پڑ گئیں۔ پہلا خیال اسے یہی آیا کہ "نکاح" اور "دوسرا نکاح" دونوں پر ایٹم بم کی طرح پھٹے ہیں اور وہی ردعمل فوری طور پر سامنے آیا ہے۔

اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر عرفان کیلی کے ساتھ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ خصوصاً نازش کو روتے دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ بھائی کے اچانک آ جانے کے خوف سے اس کا دم فنا ہو گیا۔ وہ جلدی سے ان دونوں کے درمیان میں بیٹھ گیا اور گھگھیایا۔

"مائی ڈیئر لیڈیز!...... او...... نن...... نہیں...... میرا مطلب ہے کہ ون گرل اینڈ ون لیڈی! پلیز میرا قصور معاف کر دیں۔"

مگر ان دونوں کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ نازش کے آنسو اسی تواتر سے بہتے رہے۔ سعدیہ بھی اسی سکتے کے عالم میں تھی۔

"پلیز سعدیہ!" فاخر نے اسے شانوں سے پکڑ کر ہلایا۔ "مانا کہ میری بات سے تمہیں شاک لگا لیکن کیا میں تم سے پہلی مرتبہ مذاق کر رہا ہوں؟...... دیکھو نا، ہمارے درمیان ایسا جوک تو ہوتا رہتا ہے نا۔ اور اس نازش کی بچی کو دیکھو، کس طرح رو رو کر تمہارے غم میں شریک ہو رہی ہے۔ خدا کے لئے سنبھالو! کہیں بھابی جان آ کر میری شامت نہ بلوا دیں۔ وہ تو صاف کہیں گی کہ ایک چھوڑ، دو دو کو رلا ڈالا۔"

پھر وہ رونی صورت بنا کر نازش سے مخاطب ہوا۔

"نازش! پلیز فاخر کو معاف کر دو۔ قسم لے لو اگر کبھی تمہاری پیاری اور دلاری دوست کی زندگی میں دوسرا نکاح بھی کروں۔ یہ میں آج تم دونوں کے سامنے وعدہ کرتا ہوں...... میں اپنے اس عہد پر تا زندگی قائم رہوں گا۔"

سعدیہ نے فاخر کی طرف دیکھتے دیکھتے ایک لمبی جھرجھری لی جیسے کسی بھیانک خواب کا سلسلہ اچانک ہی منقطع ہو گیا ہو۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہوئی تو فاخر کی کہی ہوئی بات سمجھ کر وہ ہلکے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

سے مسکرائی۔ اس کے مسکراتے ہی وہ شیر ہو گیا۔ لگا دل تول بکنے۔ جیب سے رومال نکال کر نازش کو پیش کرتے ہوئے مسخرے پن سے بولا۔

"اپنے یہ قیمتی آنسو پونچھ ڈالو نازش!...... یہ دوست کی محبت اور الفت میں بہہ نکلنے والے انمول آنسو ہیں...... ان کی قدر و قیمت میرے دل سے پوچھو۔ میں ہرگز اتنا بے حس نہیں ہو سکتا کہ تم دونوں کو رونے دوں اور خود دوسرا بیاہ رچا کر بیٹھ جاؤں۔ ارے بھی لعنت ہو ایسے سنگدل پر۔ خدا نہ کرے کہ میں ایسا پتھر دل ہو جاؤں۔ بس اے خوش نصیب دوستو! یاد رکھنا کہ یہ ایک مرد کا قول ہے۔ اور قول دے کر پھر جانا مرد کی شان نہیں۔"

سعدیہ کی حسیات اب پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ اس نے ایک تیز سی نظر مسلسل بولتے والے فاخر پر ڈالی پھر اپنے شانے اس کی گرفت سے چھڑا کر نازش پر جھک پڑی۔ اس کے موٹے موٹے آنسو اسے براہ راست اپنے دل پر گرتے محسوس ہو رہے تھے۔ فاخر کی اچانک دخل اندازی دونوں پر اثر انداز ہوئی تھی۔

فاخر نے پھر فقرہ کسا۔ "ایک آنکھ کے آنسو اپنے آنچل سے خشک کیے ہیں تو دوسری کے میرے رومال سے کر دو۔"

"اچھا بس اب خاموش ہو جائیے۔" سعدیہ نے جھلا کر اسے ٹوک دیا۔

اس کے اٹھ کھڑے ہوتے ہی وہ کاغذ گر کر ادھر ادھر بکھر گئے جو فاخر نے اس کی گود میں ڈال دیے تھے۔

"اوئی اللہ......" وہ زنانی آواز میں چیخا۔ "ارے بی! میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم میرے "ہنی مون" سے یوں لگا بیٹھیں؟"

"ہنی مون!" [illegible]

وہ بچ بچ کر غرایا۔ "ہاں، ہنی مون نہیں تو ہمارا سر۔ یہ ملاحظہ فرمائیے اپنا ویزا۔"

نازش رونا دھونا بھول کر اٹھ بیٹھی اور بغور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ فاخر نے بکھرے ہوئے کاغذ بٹور کر ان دونوں کے بیچ ڈال دیے اور خود بہت لاتعلق بنتے ہوئے کمرے میں ٹہل ٹہل کر گنگنانے لگا۔

"سویرے والی گاڑی سے چلے جائیں گے
سویرے والی گاڑی سے چلے جائیں گے"

نازش بے اختیار چیخ کر کھڑی ہو گئی۔

"کتنے چالاک ہیں آپ فاخر بھائی!...... ساری کارروائی اندر ہی اندر کر لی۔"

"کیا ہو گیا؟...... کیا کر لیا میں نے اندر ہی اندر؟" فاخر نے تجاہل عارفانہ سے چبا چبا کر پوچھا۔

نازش ابھی تک حیرت زدہ تھی۔ ہکلا کر بولی، کاغذ اس کے ہاتھ میں ہی تھے۔ "یعنی...... کل کی فلائٹ ہے اور گھر والوں کو خبر ہی نہیں؟"

سعدیہ سناٹے میں گم صم بیٹھی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ بولی کچھ نہیں۔ حالانکہ یہ ایک خوشی سے بھرپور یادگار لمحہ تھا لیکن اچانک ہی یہ احساس کہ اسے کل ہی یعنی فوراً اسے پیشتر اپنا وطن، اپنا شہر، اپنے پیارے سب کو چھوڑ کر بہت دور کے دیس چلے جانا ہے، خواہ جانا تفریحی نوعیت کا تھا۔ محبوب شوہر کی رفاقت میں بسر ہونے والے خوش آئند سفر کے احساس کے باوجود تھوڑی دیر کے لیے وہ چپ رہ گئی۔ سارے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔

"اور...... آپ کو کیا ہو گیا؟...... خیریت تو ہے؟" فاخر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر پوچھا مگر وہ تب بھی خاموش بیٹھی ٹکر ٹکر اس کی صورت تکتی رہی۔ وہ دوبارہ شوخی لیکن بناوٹی فکرمندی سے گویا ہوا۔

"ارے بی! اپنے ہوشوں پر سے کچھ تصدق کرو۔ کیوں ایسی بے دھیانی سے بیٹھی ہو؟ کیا ہماری خوشی بھلی معلوم نہیں ہو رہی؟ کیا مقصود ہے تمہارا؟...... کیا منظور ہے تمہیں؟...... اور ذرا ان بی نازش کی صورت ملاحظہ کرو، بارہ بج گئے ہیں۔ آخر ہم نے کیا کہہ دیا کہ دونوں سہیلیاں "ٹک ٹک دیدم" کی تفسیر بن گئی ہیں۔ یہ آنسو، یہ آہیں، یہ فریاد بھری نگاہیں...... آخر یہ سب کیا چیز ہے؟"

نازش جو اپنی وحشت پر قابو پا چکی تھی۔ جھلا کر بولی۔ "کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اول تو سب کو اندھیرے میں رکھا، اب لگے باتیں بگھارنے۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ سعدیہ کا سر ہلا کر بولا۔

"تو بھی...... انہوں نے ہمیں خاصا ہراساں بنا ڈالا۔ "باتیں" بھی کوئی ماش کی دال ہیں جسے ہم "بگھاریں" گے؟...... معلوم ہوتا ہے بھوک لگی ہے محترمہ کو۔"

"فاخر بھائی! زیادہ بننے کی کوشش مت کریں......" نازش نے جھلا کر جواب دیا۔ "ایک تو اچانک نمودار ہو کر ہم دونوں کو ہولا دیا، اوپر سے [illegible] کر رہے ہیں۔ آپ کو تو بھابی آ کر ٹھیک کریں گی۔"

"تو بھی...... یہ تو اتنا فضیحتا ہو گیا۔" وہ اپنی کھوپڑی سہلا کر بولا۔ "آج شاید ستارہ گردش میں ہے۔"

"آپ نے بھی تو حد کر دی۔" اب سعدیہ نے بھی زبان کھولی۔ "اچھا خاصا مشورہ دیا تھا کہ شمالی علاقہ جات گھوم آتے ہیں مگر آپ کے تو لمبے پروگرام ہیں۔ یہی بات ہے اچانک ہی نکل جانے کا سن کر طبیعت کو دھچکا سا لگا ہے۔"

"چلو جی...... صاف ہی ہو گیا۔" وہ باری باری دونوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

نازش جل کر بولی۔ "جائیے پیکنگ کیجیے جا کر۔"

سعدیہ بھی اس کی تقلید میں بولی۔ "چلیے، پیکنگ کیجیے چل کر۔"

"یا اللہ خیر۔" وہ ڈرے ڈرے انداز میں بولا۔ "معلوم نہیں ایسی تشویش ناک، ہیبت ناک اور خوف ناک سچویشن میں مجھے لاحول ولا قوۃ پڑھنا چاہیے یا معوذتین۔"

نازش نے سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔ "کچھ بھی مت پڑھیے۔ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے جائیے۔"

سعدیہ اس سے بھی متانت سے گویا ہوئی۔ "آپ کسی بھی تردد میں مت پڑیے۔ بس کمرے میں تشریف لے چلیے۔"

اتنا کہہ کر وہ نہ صرف اٹھ کر کھڑی ہو گئی بلکہ باہر بھی چلی گئی۔ فاخر بیچ ہی دونوں کے رویے پر بھونچکا رہ گیا۔ تاہم وہ سعدیہ کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا وہ بیڈ پر ایک سکوت کے عالم میں ساکت بیٹھی کسی گہری سوچ میں مستغرق ہے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر دھیرے سے کھنکارا۔ سعدیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

"بالآخر آپ نے اپنی ہی کر لی نا؟"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فاخر دیر سے اس کی کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ اس نے لمحہ بھر غور کیا پھر اس کے دونوں ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں بھر کر محبت آمیز لہجے میں بولا۔

"سعدیہ! میں نے تمہیں پہلی نظر دیکھتے ہی "نوجیون کی ہری گلی" سے تشبیہ دی تھی اور اس زمانے میں خود کو "میں جنگل کا رستہ ہوں" کہا کرتا تھا۔ پھر قدرت کو میری بے بسی پر رحم آ گیا اور میرے جذبوں کی سچائی کے ثبوت میں تمہیں میری زندگی میں شامل کر دیا۔ رب کائنات کا کتنا بڑا اور ناقابل یقین کرم ہے کہ ہمارے طن کے تمام کام ہمارے والدین کے ذریعے ہی پایہ تکمیل کو پہنچے۔ جو کچھ بھی ہوا تم ہر مرحلے سے آگاہ ہو۔ زندگی کی ہر دشواری مجھے شاہراہ حیات کے اس حسین موڑ کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے جس کی منزل تم ہو۔ تمہاری ایک ذات میرے نزدیک تمام تر کٹھنائیوں اور مشکلات کا انعام ہے۔ یہ سب محسوس کرتے ہوئے مجھے یہ بات کفران نعمت معلوم ہوتی تھی کہ خود کو "میں جنگل کا رستہ ہوں" کہتا رہا ہوں۔ لہٰذا تم سے شادی کے بعد میں نے یہ اصرار ترک کر دیا تھا لیکن آج جب میں بہت خوش خوش گھر آیا ہوں تو مجھے اپنی خوش بختی پر شبہ ہو رہا ہے۔"

سعدیہ جو اس کی بات بغور سن رہی تھی۔ فوراً اس کا مطلب سمجھ گئی۔ بہہ نکلنے کو بے تاب آنسو آنکھوں کی منڈیروں پر ہی ٹھٹک گئے۔

"سعدیہ!...... ناشکری!!"

کسی نے جیسے چٹکی بھری ہو۔ پشیمانی اور ندامت کے کچوکوں نے اسے لب دم کر ڈالا۔

اس کے اندر کی معاملہ فہم اور بردبار سعدیہ نے اس وقت کی گھبرا اٹھنے والی سعدیہ کے آنسو پونچھ ڈالے اور حوصلے و تحمل کا پرچم ہاتھ میں تھما دیا۔

"مجھے...... معاف کر دیجئے" [illegible] شانوں سے لگا دیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا جو آپ سمجھے۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے وضاحت کی۔ "آپ کی طرح آج میں بھی آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کبھی آپ میری زبان سے کوئی شکوہ نہیں سنیں گے۔ مجھے ہمیشہ اپنے ہم قدم پائیں گے۔ میں آپ کو [illegible] پریشان کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

فاخر کے چہرے پر خوبصورت اور چنچل مسکراہٹ نے پنکھ پسار دیئے۔

"جانتا ہوں......" اس نے سعدیہ کو محبت سے تھپک کر کہا۔ "لیکن...... وہ یہ دیکھ کر اس قدر بے اوسان کیوں ہو گئیں؟"

سعدیہ نے ندامت اور خجالت سے سر جھکا لیا۔ "بس...... وہ اچانک ہی......" پھر سنبھل سنبھل کر بولی۔ "آپ کو معلوم تو ہے کہ ابھی کئی معاملات ایسے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔ ابھی عید پر بھی آپ کے سامنے نازیہ کے سسرال میں کیا ہوا تھا! اس روز کے بعد سے اب تک میری اس سے دوسری ملاقات بھی نہیں ہوئی ہے۔ نہ انہی کے کچھ حالات معلوم ہیں۔ جب کہ آپ کا کہنا ہے کہ ہم ملک سے باہر گھومنے کے لئے گئے تو دو تین ماہ کے بعد واپسی ہو گی۔ بس یہی خیال میری پریشانی کا موجب بن گیا۔ اور کوئی دوسری وجہ وغیرہ کیوں ہونے لگی؟ آپ قطعی خاطر جمع رکھئے...... میں آپ سے بدگمان کیونکر ہو سکتی ہوں۔" بات مکمل کرتے کرتے وہ مسکرائی جیسے منہ بند کلیوں کے احمریں لبوں پر شفاف شبنم کے قطرے تھرائے ہوں۔

"بہت خوب۔" فاخر نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی اور سنجیدگی سے بولا۔ "میرے خیال میں نازیہ والے معاملے کا تردد بے کار ہے۔ اس کے سسرال والے ماشاء اللہ کافی سمجھدار لوگ ہیں۔

فرحت سے میری آج ملاقات ہوئی ہے۔ کافی باتیں ہوئیں۔ بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ آپا اس کی ملتان چلی جائیں گی تو گھر میں پھر ہے ہی کون والدہ کے سوا؟ یوں تو زندگی نشیب و فراز کا دوسرا نام ہے۔"

سعدیہ نے کچھ بے چین ہو کر پوچھا۔ "اور کیا کیا باتیں ہوئیں فرحت سے؟"

"نازیہ تم سے زیادہ سمجھدار نکلی۔ فرحت تو پھولے نہیں سما رہا تھا۔"

"ارے سچ......؟" سعدیہ اچھل پڑی۔ "آپ کے منہ میں گھی شکر۔ اتنی حسین خوشخبری سنائی آپ نے۔"

وہ منہ لٹکا کر بولا۔ "اور...... ہمارے پاس کچھ تھا ہی نہیں اسے سنانے کو۔"

سعدیہ نے اس کی بات گول کر دی اور تجاہل عارفانہ سے بولی۔ "کیوں؟...... آپ کو تو دیوان کے دیوان حفظ ہیں۔ سنا دیا ہوتا کچھ۔"

وہ بھی کم نہ تھا۔ فوراً بات پکڑی۔ شرارت سے پوچھا۔ "غزل...... یا گیت؟...... حضور اتنی رہنمائی تو کر دے۔"

"اللہ توبہ!" سعدیہ اس کا مطلب سمجھ کر دہری ہو گئی۔

"ویسے "دو گانا" بھی چلے گا۔" وہ کچھ سمجھا کر بولا۔ "اگر ایسا ہو جائے تو کیا کہنا۔ ہم بھی خوش...... تم بھی خوش...... پیلی پتنگ والے بھی خوش...... پانچ سال کی چھٹی۔"

بیک وقت ہنسی اور شرم سے وہ سرخ ہو گئی۔ بولی۔ "نازیہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ باتیں تمہاری کوئی آپ سے سیکھے۔"

"ارے ہاں......" فاخر کو یاد آ گیا۔ "نازیہ اس دن کیوں رو رہی تھی؟ کہیں اسے میری کوئی بات بری لگ گئی؟"

سعدیہ نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ اپنی ممی کی ناگہانی وفات کا واقعہ سنا رہی تھی۔"

"اوہ...... آئی سی......" فاخر بھی سنجیدہ ہو گیا۔

✱●✱

فروری کے اوائل دن تھے۔ رات ابھی تک ٹھنڈی مگر قابل برداشت تھی۔ شام اور سویرے ٹھنڈ ذرا بڑھ جاتی تھی۔

سید احمد مغرب کی نماز ادا کر کے لوٹے تو گھر کی فضا کو خاموش سا پایا۔ بیوی کی تلاش میں اندر تک بڑھتے چلے گئے اور پچھلے کمرے کے دروازے پر ٹھٹک کر رک گئے۔ فضا میں ہلکی ہلکی سسکیوں کے ساتھ ساتھ کوئی سرگوشی بھی گونج جاتی۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی تھیں۔ نماز ادا کر چکی تھیں۔ ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ہوئے تھے۔

وہ خاموشی سے برآمدے میں آ کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ دماغ الجھ سا گیا۔ اب تک کی زندگی میں پچاسوں بار بیوی کو نماز ادا کرتے دیکھ چکے تھے مگر اتنی شدت سے روتے آج دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر نکلیں تو گریہ وزاری سے چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں متورم اور گلابی تھیں۔ سید احمد نے انہیں نظر بھر کر دیکھا مگر بولے کچھ نہیں۔ وہ بھی چپ چاپ سی سامنے چارپائی پر بیٹھ گئیں۔

سید احمد کی بیوی کا شمار اپنے وقت کی خوش شکل خواتین میں ہوتا تھا۔ ماشاء اللہ جوان بچوں کی

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ماں تھیں بلکہ داماد والی ہو چکی تھیں مگر صحت اور عمر کے لحاظ سے جوان العمر دکھائی دیتی تھیں۔ جس کا اہم ترین سبب ان کے والدین کی دور اندیشی اور اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا جس کی افادیت اور درستی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ثابت ہوتی جا رہی تھی۔ اور اب آثار بتا رہے تھے کہ وہ اپنے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی اپنی عمدہ صحت و تندرستی اور چلتے ہاتھ پیروں کے زمانے میں با آسانی گود کھلا سکیں گی۔ جیسا کہ بیٹوں کی ماؤں کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی گود میں پوتے پوتیاں کھیلیں۔ شاید پہلے وقتوں کے ماں باپ صحیح معنوں میں ماں باپ کہلائے جانے کے مستحق ہیں جو اپنی اولاد کی فلاح و بہبود کا درست ادراک رکھتے تھے اور انہیں مناسب عمر میں مناسب بر تلاش کرنے کی فکر لاحق ہو جایا کرتی تھی۔ بچیوں کا بڑھتا ہوا سن وہ اپنے جگر کا ناسور بنا لیا کرتے اور دن رات اسی ادھیڑبن میں مبتلا رہ کر بالآخر اپنے فرائض کی ادائیگی کا کوئی نہ کوئی راستہ، کوئی نہ کوئی سبیل نکال لینے میں کامیاب ہو جایا کرتے تھے۔

ابھی وہ اپنے پاندان کی کلیاں درست کر رہی تھیں کہ حمیدہ باورچی خانے سے برآمد ہوئی اور وہ پیالی بھاپ اڑاتی چائے رکھ کر چلی گئی۔

"لیجیے!" بیوی نے چائے کی پیالی ان کی طرف کھسکائی۔

سعید احمد نے پیالی لیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دریافت کیا۔ وہ صاف نظر چرا گئیں۔ سرخ ناک رگڑ کر جواب دیا۔

"نزلہ سا لگ رہا ہے۔"

سعید احمد نے چائے کی چسکی لے کر کہا۔ "تو حکیم جی سے جوشاندہ منگوا کر پیو۔ بس اتنے سے کام کے لیے [illegible]"

انہوں نے گڑبڑا کر میاں کی طرف دیکھا۔ وہ چالاکی سے ہنس پڑے۔ "سچ اگل دیجیے بیگم صاحبہ! جھوٹ اس صورت میں پکڑا گیا۔"

وہ پہلے ہی جی میں زیر ہو گئیں۔ لیکن زبان سے تائید نہ کی۔ سعید احمد تھوڑی دیر ان کے بولنے کے منتظر رہے پھر کرسی ان کی جانب کھسکا کر بہت رازداری سے دریافت کیا۔

"کیا ہم اس قابل نہیں کہ آپ...... آپ ہمیں......"

انہوں نے فوراً شوہر کی بات کاٹ دی اور متانت سے بولیں۔ "آپ ہر بات مذاق میں لے جا رہے ہیں اور ایک ہم ہیں کہ جان پر بنی ہوئی ہے۔"

اس بار سعید احمد نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "یہی تو مجھے کرید لگی ہے کہ اصل قصہ کیا ہے؟ کون سا گمبھیر مسئلہ درپیش ہے؟"

بیوی نے چائے کی پیالی رکھ دی اور ایک گھٹا ہوا سانس لے کر گویا ہوئیں۔ "نازیہ کے نند کے بچے کا انتقال ہوا ہے تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ اللہ رکھے سعدیہ اور فاخر آئے ہوئے تھے اور یہیں سے ان کے ہاں بے خبری میں جا پہنچے تھے۔"

"ہاں، ہاں...... میں جانتا ہوں۔" سعید احمد نے اقرار کیا۔

"فرحت میاں نے جس آدمی کو بچے کی خبر دے کر بھیجا تھا وہ ان لوگوں کے جانے کے کافی دیر کے بعد یہاں پہنچا تھا۔ مجھ ہی سے بات ہوئی اس کی۔ پھر وہ فوراً ہی چلا گیا۔ اس کے پیچھے ہی میں روانہ ہو گئی تھی۔" وہ تفصیل سے بتانے لگیں۔ "نازیہ کی سسرال پہنچ کر میرا عجیب ہی استقبال ہوا۔

میری بچی کی نند اس قدر اول فول بک رہی تھی کہ میرے اوسان خطا ہو گئے۔"

سعید احمد کو حیرت ہوئی مگر ہمدردی کے لہجے میں بولے۔

"لاحول ولا قوۃ۔ تم بھی عجیب عورت ہو۔ جس ماں کا بچہ آناً فاناً چل بسے اس کے اوسان خطا ہو جانے پر تعجب کیا؟ مگر تم نے شاید زیادہ ہی اثر لے لیا۔ بجائے اس غریب کو تسلی دینے کے خود بے اوسان ہو گئیں۔ اور میرے سوال سے اس قصے کا کیا تعلق؟"

"وہی تو بتا رہی ہوں۔" وہ ایک ٹھنڈا سانس بھر کر رنجیدگی سے بولیں۔ "اس وقت تو میں نے آپ کو بتانا مناسب نہ جانا تھا۔ مگر آج یہ موضوع خود بخود سامنے آ گیا ہے۔ اگر کھل کر نہ بتاؤں گی تو آپ کو الجھن رہے گی۔ بچے کی فوتگی کے وقت فرحت کی بہن کے عجیب و غریب بین اور فقرے میں کچھ سمجھ رہی تھی، کچھ نہیں۔ مگر اس وقت وہاں جتنی بھی عورتیں تھیں جن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ معلوم نہیں وہ اپنی بیان بازی میں کیا کیا ہذیان بک رہی تھی!"

سعید احمد نے الجھ کر کہا۔ "میں کچھ بھی نہیں پا رہا کہ تم دراصل کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

قدرے رک رک کر بالآخر وہ دبے لفظوں میں کہہ گزریں۔

"دراصل...... وہ ہر ہر بات میں فرحت کی سسرال کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔"

سعید احمد کی پیشانی پر بل پڑ گئے انہوں نے سوالیہ [illegible] پوچھا۔ "فرحت کی سسرال...... یعنی ہم؟"

"جی ہاں...... انہوں نے [illegible]۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ اتنی بہت سی عورتوں میں ایسی سبکی ہوئی کیا بتاؤں۔ تماشا بن کر رہ گیا تھا۔"

"لیکن...... آخر کیوں؟" سعید احمد اب [illegible] ہو گئے تھے۔ اسی عالم میں بولے۔ "کسی نے ان سے معلوم نہیں کیا کہ [illegible] انتقال پر فرحت کی سسرال والوں کا کیا قصور تھا؟"

"کون پوچھتا؟" بیوی نے الٹا انہی سے سوال جڑ دیا۔ "فرحت کی جان اور عزت پر بنی ہوئی تھی۔ ان کی اماں الگ گھبرائی پھر رہی تھیں۔ باقی رہیں محلے پڑوس کی عورتیں تو انہیں کیا پڑی تھی کسی کی بلا اپنے سر لینے کی۔ [illegible] بات تو یہ ہے کہ اس روز مجھے حالات کا درست اندازہ جانے کیوں نہ ہو سکا۔ مگر اب خیال کرتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اس روز سعدیہ نے بار بار مجھے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ شاید وہ بہت کچھ بھانپ چکی تھی۔"

سعید احمد کچھ دیر تک گم صم بیٹھے رہے۔ ان کے دل پر خاصا اثر ہوا تھا یہ سب سن کر۔ لیکن وجہ سمجھنے سے قاصر تھے بے چارے۔ کچھ دیر گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر دھیرے سے پوچھا۔

"یہ تو وہ واقعہ ہے جو بچے کے انتقال کے وقت ہوا۔ مگر تم نے بہت ٹھہر ٹھہر کر سنایا۔ اب یہ بتاؤ کہ موجودہ قصہ کیا ہے؟...... تم کیوں رو رہی تھیں؟"

بیوی کی آنکھیں دوبارہ گیلی ہونے لگیں۔ آہستہ سے بولیں۔ "اب ہنسنے اور خوش ہونے کی بات ہی کون سی رہ گئی جو روؤں نہ۔ حمید بتا رہا تھا کہ جب وہ بچیا کی عیدی لے کر خوش خوش اس کی سسرال پہنچا تو نازیہ کی نند نے اس کے ہاتھ سے عیدی کی چیزیں چھین کر دور اچھال کر پھینک دی تھیں۔"

حمید نے نازیہ کی موجودگی میں جس طرح اور جو کچھ حقیقت حال گزری بتائی تھی، سعید احمد کی بیوی نے سب ان سے کہہ سنائی۔ بات پوری سن کر وہ بالکل ہی سناٹے میں رہ گئے۔ کافی دیر غور کرنے کے بعد ملائمت سے سمجھانے لگے۔

"کسی طرح کے مسائل کا حل رونا دھونا نہیں ہوا کرتا۔ ہاں! بندہ اپنے رب سے عاجزی اور

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

انکساری کے ساتھ بہتری کے لئے دعائیں مانگ سکتا ہے۔ دعا میں بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ دعا تقدیر بدل سکتی ہے۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "اپنی اور اپنی اولاد کی خیر و عافیت اور بھلائی کی دعائیں تو ہم کثرت سے ہی مانگتے ہیں مگر دکھ یہ ہو رہا ہے کہ ہم نے فرحت کی بہن سے کون سی ایسی زیادتی کر لی ہے کہ اس نے حمید کے ہاتھ سے عیدی کی چیزیں چھین کر باہر پھینک دیں۔ آپ نے دنیا میں کہیں یہ اندھیر سنا ہے؟ کم از کم میری نگاہوں نے یا کانوں نے کہیں یہ سب دیکھا نہ سنا۔ ذرا آپ سوچئے، میری معصوم بچی کے دل پر کیا گزری ہوگی؟"

ان کا سوال سن کر سعید احمد کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ ایک لمحے کے لئے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے ایک بچی کے باپ کی حیثیت سے کچھ سوچنا چاہا۔ خون جگر قطرہ بن بن کر بہنے کو بے تاب ہو گیا۔ انہوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، بیوی کو جواب کا منتظر پایا مگر جواب بن نہ پایا۔ وہ بے بسی کے ساتھ پہلو بدل کر رہ گئے۔ بالآخر انہوں نے حوصلے سے کام لیا اور بے پناہ تحمل سے مسکرا کر گویا ہوئے۔

"بیٹیوں کی ماؤں کو برداشت اور صبر کی عادت ہونی چاہئے۔ تم سے میری بچی نے تو کوئی گلہ شکوہ نہیں کیا نا۔ جب وہ حوصلے سے کام لے رہی ہے تو تم ماں ہو کر بے اوسان کس طرح ہو رہی ہو؟ اپنے گھر کے مسائل اور ان کے حل وہ زیادہ بہتر جانتی ہے۔ اپنی تعلیم و تربیت پر بھروسہ رکھو اور اس کی ہر وقت ثابت قدمی کے لئے دعا کرو۔ ...... اس پہلو کو بھی تو نگاہ میں رکھو کہ اس کی ساس اور شوہر بھی گھر کے حالات کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہرگز نہیں بیٹھے ہوں گے۔ یقیناً وہ اس قدر غافل نہیں ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اہم بات ہے پھر کیا وہ ممکن ہے کہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی ہو۔ ایسے نازک اور المناک موقع پر زبان سے نکل جانے والی بڑی سے بڑی گالی بھی میری نظر میں قابل معافی ہے۔ اگر تم دوست کرو، دل میں مسلسل رنجش جانے والی کدورت تعلقات میں دراڑ ڈال دیا کرتی ہے۔ تم اسے کھلے دل سے معاف کر دو۔ اللہ تمہاری اولاد کے حق میں اچھا کرے گا۔ کیونکہ مثل مشہور ہے۔ کر بھلا، ہو بھلا...... اچھی اور مثبت سوچ بھی آپ کے ہی حق میں بہتر ہوتی ہے۔ سمجھ آئی بیگم؟"

بیوی نے انہیں شاکی نظروں سے دیکھا مگر وہ صاف کترا گئے۔

عین اسی وقت باہر کا دروازہ دھڑ سے کھلا۔ حمید بھاگتا ہوا آیا اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔ "امی!...... امی!...... دولہا بھائی اور آپا آئے ہیں۔"

ان دونوں نے اپنی باتوں سے چونک کر دیکھا۔ فاخر اور سعدیہ دونوں مسکراتے چلے آ رہے تھے۔

❊●❊

سرور باجی بہت دنوں سے خاموش سی تھیں۔

اتنی سست اور چپ چپ سی رہنے لگی تھیں کہ بعض اوقات زمانی بیگم کو الجھن ہونے لگتی۔ مگر ان کی تنک مزاجی سے ڈرتی تھیں اس لئے انہیں چھیڑنے سے گریزاں رہتیں۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ ان کی مسلسل چپ اب چبھنے لگی تھی اور حویلی کے اندرونی ماحول پر ایک غیر معمولی سا جمود طاری رہنے لگا تھا۔ آج کل نہ تو وہ ماماؤں کو سخت سست کہتی نظر آتی تھیں اور نہ ہی زمانی بیگم سے الجھتیں۔ ہر کسی کو جلی کٹی سنانے کی بجائے چپ کا روپ دھارے دلگیری ادھر ادھر گری پڑی رہتیں۔

ایک روز چچی جان انہیں گھیرنے میں کامیاب ہو گئیں۔

سرور باجی حسب معمول سست سی تھیں عجیب سی سوچوں کے تانے بانے بن رہی تھیں کہ معاً چچی جان نے انہیں ٹوک دیا اور ملامت بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

"یہ کیا ہر وقت اٹوانی کھٹوانی لئے پڑی رہتی ہو سرور! ایسے کون سے تمہاری الائچیوں کے جہاز ڈوب گئے ہیں جن کے حساب کتاب میں مستغرق رہنے لگی ہو؟"

باجی نے ان کی بات سنی ان سنی کر دی۔ چچی جان نے چالاکی سے انہیں بولنے پر آمادہ کرنا چاہا۔

"اتنی خبر بھی نہیں کہ ماماؤں کم بختوں نے باورچی خانے میں کیا اندھیر مچا رکھا ہے؟ بیماری سے اٹھنے کے بعد سے ہماری میں وہ پہلے کا سا دم خم کیا ٹوٹا، ہر طرف جیسے لوٹ مچ گئی ہے۔ اوپر سے تم پلنگ پر دوہائی رہنے لگی ہو۔"

"اے ہماری بلا سے۔" بہت دیر کے بعد سرور باجی نے ناک چڑھا کر جواب دیا۔ "ہم کہیں کے قاضی تھوڑی ہیں جو شہر کے اندیشے میں دبلے ہوں۔ یہاں کا سب راج پاٹ سب آپ کی بہو بیگم (زمانی) کا ہے۔ انہی کو مبارک ہو۔"

چچی جان نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ زمانی بیگم کو نہ پا کر اطمینان کا سانس لیا اور انہیں ڈانٹ ڈالا۔ "ارے بھئی تمہارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کہاں تو بھائی بھاوج کی گھر گرہستی میں گھسے گھسے دخل دینے کو عادت جاتی ہو اور کہاں ایسی آدم بیزاری کہ بے تکی باتیں کرنے میں آگے آگے۔ بس بھئی، ہم بچے ہم نہیں۔"

اس بار انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی سی دیر انتظار کے بعد چچی جان نے انہیں دوبارہ کسا اور زیادہ ہمدردی سے پوچھا۔

"آخر جی اچھا نہ ہو تو کھل کر بیان کرو۔ ممکن ہے ہم تمہارے ہی کام آ سکیں۔ کوئی صائب رائے مشورہ دے سکیں۔"

"جی ہمارا بالکل اچھا ہے......" سرور باجی نے عجلت سے جواب دیا۔ "آپ کو فکرمندی کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ سردی کا موسم ہونے کے باوجود آج کل تو ہمارے گھٹنے بھی زیادہ دکھ نہیں دے رہے۔"

چچی جان نے خوش ہو کر کہا۔ "چلو یہ امر تو قابل اطمینان ہے۔ شاید پھولن جو میر ولی کے مزار سے تیل لے کر آئی تھی، یہ اسی کی مالش کا کرشمہ ہے۔"

باجی نے قدرے چونک کر جواب دیا۔ "یہ آپ نے ٹھیک ہی کہا۔ ہم تو بھول ہی گئے تھے۔"

دوپہر کے اس سمے دونوں اکیلی ہی اس گوشے میں بیٹھی راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ سرور باجی کی مزاجی کیفیت بحال ہوتی جا رہی تھی۔ چچی جان مزید کچھ کہنے کو تھیں کہ اسی وقت شاکر بھائی صاحب کی طرف سے آ نکلے۔ باجی پر نظر پڑتے ہی لپک کر آئے۔

"آہا...... پھوپھی جان تشریف فرما ہیں۔ کہئے، اب کیسی طبیعت ہے؟"

سرور باجی بھی انہیں دیکھ کر کھل اٹھیں۔ کھسک کر ان کے لئے جگہ بنائی۔ محبت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "ہم اچھے ہیں...... یہ تو بتاؤ تم اتنے دنوں سے کہاں تھے؟"

"بس پھوپھی جان! آپ کو کیا سنائیں زمینوں کے بکھیڑے۔" وہ ایک گہرا سانس کھینچ کر بولے۔ "آپ سنائیے، گھٹنوں کا درد کیسا ہے؟"

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"بہتر ہے۔" باجی نے اطمینان دلایا۔ پھر محبت سے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "بیٹا! ایک بات تو سچ سچ بتاؤ۔"

"ہاں ہاں، پوچھیے۔" انہوں نے جلدی سے کہا۔

ان لمحات میں باجی، چچی جان کو فراموش کر چکی تھیں۔ شاکر بھائی کو امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "فاخر کی کوئی خیر صلا، خیر و عافیت نہیں ملی پردیس سے؟"

وہ بے چارے گڑبڑا گئے۔ بوکھلا کر بولے۔ "جی ہاں...... کیوں نہیں...... کیا ابا میاں نے نہیں بتایا آپ کو؟"

وہ سوکھا سا منہ بنا کر بولیں۔ "وہ خود ہی کہاں دکھائی دے رہے ہیں اس روز سے۔ بس دو دفعہ ملے ہیں۔ ہمیں پوچھنا یاد بھی نہ رہا۔"

شاکر بھائی نے محبت بھرے نرم لہجے میں بتایا۔ "آپ بالکل بے فکر رہیے پھوپھی جان! فاخر بخیریت اور خوب خوش و خرم ہیں۔"

باجی خوش ہو کر جلدی سے بولیں۔ "الٰہی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ تم نے ہمارا جی خوش کر دیا۔"

چچی جان ان کی باتیں سن سن کر مسکرائے جا رہی تھیں۔ ذرا دیر کے بعد شاکر بھائی نے اٹھنے کو ہوئے تو سرور باجی نے ان کا ہاتھ تھام کر سرگوشی میں پوچھا۔

"ایک بات اور بتا جاؤ بیٹا! فاخر آپ جس ملک میں دورے پر گیا ہے، کیا اس میں اس کے ساتھ لڑکیاں بھی گئی ہیں؟"

چچی جان کی مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔ شاکر بھائی بھی بے ساختہ مسکرا اٹھے۔ شگفتہ نے ہی جواب دیا۔

"جی تو ضرور ہوں گی پھوپھی جان! کیونکہ یونیورسٹی کا ٹرپ ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ آپ کو کیا پریشانی لاحق ہو گئی ہے؟"

"پریشانی تو خیر کیا۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولیں۔ "بس ہم یہ سوچتے ہیں کہ......"

"کہیں وہاں وہ کسی "گوری" سے بیاہ نہ رچا لے۔"

اچانک ابھرنے والی آواز نے ان کی بات اچک کر پوری کر دی۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ زمانی بیگم کھڑی ہوئی زیر لب مسکرا رہی تھیں۔ باجی اچھل پڑیں۔ ان کی مسکراہٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

"اے زمانی! تم پھر بولیں؟" وہ غضب ناک ہو کر اٹھ بیٹھیں۔ "دس مرتبہ تمہیں منع کیا ہے کہ ہماری بات میں دخل مت دیا کرو۔ مگر تم تو بولنا فرض سمجھتی ہو۔ دیکھو! آج کان کھول کر سن لو ہم سب کے بیچ کہے دیتے ہیں۔ اگر وہ گوری تو کیا کالی بھی کر لائے تو...... ہم اسے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔ تم سے جو بن پڑے، بنا لینا۔"

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ زمانی بیگم نے تو ہنسی ہنسی میں ایک بات کہہ دی تھی بلکہ انہی کی کہی ہوئی بات دل لگی کے طور پر کہہ ڈالی تھی۔ مگر آج تو بازی الٹ گئی تھی۔ شاکر بھائی کی دلہن شگفتہ بھی آ موجود ہوئی تھیں اور اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پھوپھی کے بدلتے رنگ دیکھ رہی تھیں۔

محفل کا رنگ دیکھ کر چچی جان نے تیز لہجہ اختیار کیا اور ڈانٹ کر بولیں۔ "ہوش کے ناخن لو سرور! ہوش کے۔ معلوم ہو گیا ہے بالکل ہی سٹھیا گئی ہو۔"

سرور باجی مزید بھڑک گئیں۔ زیادہ تنک کر جواب دیا۔

"جو ہمارے دل میں تھا، ہم نے کہہ دیا۔ اب چاہے کسی کو اچھا لگے یا برا۔ صاف کہہ رہے ہیں۔ اپنے بچے کی محبت میں ہمیں، جس حد تک بھی جانا پڑے، بلا تکلف چلے جائیں گے۔ چاہے کوئی ہمیں سٹھیایا ہوا سمجھے یا پاگل۔ اور ہمیں ہرگز پروا نہ ہوگی۔"

سننے والوں کی سٹی گم تھی۔ سب میں بری حالت شگفتہ کی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔ اچانک شاکر بھائی نے دخل دینا ضروری سمجھا اور ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولے۔

"فاخر کی تو پانچوں گھی اور سر کڑاہی میں والا معاملہ ہو گیا ہے خواتین و حضرات!"

ان کی آواز سے شگفتہ کا سکتہ ٹوٹا۔ شاکر بھائی براہ راست انہی کی طرف دیکھ کر شرارت سے ہنس رہے تھے۔ آنکھوں میں شوخیاں رقص کر رہی تھیں۔ شگفتہ بھی پیچھے رہنے والی نہ تھیں۔ چیک سے جواب دیا۔ "حضرت تو یہاں ایک ہی دکھائی دے رہے ہیں، انہی کی رال ٹپک پڑی۔ حسد ہی حسد میں اپنا بھی سر کڑاہی میں نہ کر بیٹھیے گا۔"

"حسد تو نہیں، رشک آ رہا ہے فاخر پر۔" شاکر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ہنستے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ مگر فوراً ہی انہیں الٹے پیروں لوٹنا پڑا۔ وہ زور سے بولے۔ "ارے بھئی دیکھیے! آج کے مہمان گرامی تشریف لائے ہیں۔ ذرا ادھر بھی دیکھیے۔"

سب نے چونک کر دیکھا۔ شاکر بھائی کے پیچھے تانیا کی ساس اماں وزیر بیگم چلی آ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے چلنے والی ماما کے ہاتھوں میں مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔ غیر متوقع طور پر سمدھن کو اپنے گھر میں دیکھ کر زمانی بیگم جلدی سے ان کے خیر مقدم کو اٹھیں اور بڑھ کر ان سے گلے ملنے لگیں۔ یہاں چھڑی ہوئی نئی بحث جہاں کی تہاں رہ گئی اور سب اس طرف متوجہ ہو گئے۔

"مولا اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آج تو ہمارے بھاگ جاگ گئے جو وزیر بیگم تشریف لائی ہیں۔ کہیے، اچھی تو ہیں؟ گھر میں سب خیریت سے ہیں؟" چچی جان نے انہیں گلے لگاتے ہوئے کئی سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔ ادھر سرور باجی پلنگ سے اترتی ہی رہ گئیں اور وزیر بیگم نے جھٹ انہیں وہیں جا لیا اور گرمجوشی سے گلے لگاتے ہوئے سب کو مخاطب کرتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"ہاں جی...... اللہ تبارک و تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، ہم خیر و عافیت سے ہیں اور گھر میں بھی ہر طرح کی خیر و برکت اور امن و آشتی ہے آپ کی دعا سے۔"

شگفتہ نے جھک کر آداب کیا۔ دعائیں وصول کر کے بڑے کمرے کی نشست گاہ تک چلنے کی درخواست کی مگر انہوں نے ایک پُر شفقت مسکراہٹ کے ساتھ منع کر دیا اور نہایت بے تکلفی اور اپنائیت سے وہیں سرور باجی سے جڑ کر بیٹھ گئیں۔ ایک ماما نے فوراً حاضر ہو کر انہیں سادہ پانی پلایا۔

زمانی بیگم بذات خود تیز قدموں باورچی خانے تک گئیں اور دلاری کو خصوصی ہدایات دے کر آئیں اور اپنا پاندان اہتمام سے وہیں منگوا لیا۔

جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ سکون اور اطمینان سے بیٹھ چکے تو وزیر بیگم نے اپنی ملازمہ کو حکم دیا کہ وہ مٹھائی کا ٹوکرا زمانی بیگم کو پیش کرے اور اعلان کیا۔

"آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ ہماری بہو تانیا بیگم امید سے ہیں۔ مولا کا لاکھوں بار شکر ہے کہ ہم یہ خوشخبری سنانے کے لائق ہوئے۔ آپ سب منہ میٹھا کیجیے۔"

"ایں......" سب نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سرور باجی نے بے تابی سے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ان کا کندھا ہلا کر دریافت کیا۔

"آپ کے منہ میں گھی شکر۔ آپ سچ کہہ رہی ہیں نا وزیر آپا؟"

انہوں نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "اے بہن! مولا نظر بد سے بچائے۔ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ یہ خبر سو فیصد سچ ہے....... ہم پوری تصدیق اور اطمینان کے بعد ہی زبان سے نکال رہے ہیں۔"

سرور باجی اپنی ساری پریشانیاں اور تفکرات بھول بھال گئیں اور خوشی کے جذبات سے بے قابو ہو کر وزیر بیگم کے بھاری بھرکم وجود سے چمٹ گئیں۔ انہوں نے بھی بڑی اپنائیت سے لپٹا لیا۔ دونوں خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں۔ سب انہیں بڑھ بڑھ کر مبارکباد دینے لگے۔

چچی جان خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔ "ہم مٹھائی کا ٹوکرا دیکھ کر ہی سمجھ گئے تھے کہ ضرور مولا نے بڑی خوشخبری کا سامان پیدا کر دیا ہے ہم عاجزوں کے واسطے....... مبارک ہو زمانی! تمہیں بھی۔"

زمانی بیگم مسلسل مسکرائے جا رہی تھیں۔ فرط مسرت سے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ خوشی خوشی مبارکبادیں وصول کر رہی تھیں۔ آج بھی وصوت کے خدا خدا کر کے ان کی صاجزادی کے گمن گلشن سے انہیں خوشی کی چہکار سنائی دی تھی۔

معاً انہیں کبھی مہر ولی کے مزار والی منت یاد آ گئی۔ وہ دل ہی دل میں رب کریم کی شکر گزار ہو رہی تھیں۔ ذرا کی ذرا انہوں نے سرور باجی کی طرف دیکھا۔ وہ ان لمحات میں بے پایاں خوشی کے احساس سے کھلی پڑ رہی تھیں اور نہایت زور و شور کے ساتھ وزیر بیگم سے باتوں میں مصروف تھیں۔ اس خوشی کی خبر نے ان کی ان کے اپنے دلوں کی ساری کلفت اور تلخی دور کر ڈالی تھی۔ وہ اس قدر مصروف اور مگن نظر آنے لگی تھیں کہ چند لمحوں کے اندر اندر ہی پہلے والی سرور باجی لگنے لگیں۔

زمانی بیگم دل ہی دل میں صدق دل سے دعا کرنے لگیں۔ "الٰہی! سرور باجی کو بھتی مہر ولی والا منت یاد نہ آ جائے۔ وہ جب بھی کوئی وزیر بیگم کے سامنے بیگم کی محبت ہی محبت میں سات جمعرات والا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیں۔"

زمانی بیگم کو خوب معلوم تھا کہ ان کا سمدھیانہ مزاروں پر منتیں مرادیں مانگنے کا سخت مخالف تھا اور خود وزیر بیگم تو خصوصیت کے ساتھ ایسی باتوں سے کوسوں دور تھیں۔ لہٰذا بدمزگی میں کیا مزہ تھا بھلا؟ ان کے نزدیک یہ امر بہت قابل فخر تھا کہ سمدھن بذات خود خوشخبری سنانے آئی تھیں۔ فخر کے ساتھ تفکر کی بھی کیفیت تھی۔

⌘●⌘

حالانکہ نازیہ کے سر میں شدید درد تھا۔ اس کے باوجود اس نے اٹھ کر فرحت کے لئے کھانا گرم کیا اور اہتمام سے سامنے لا سجایا۔

"آؤ......." فرحت نے پہلا نوالہ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"جی نہیں چاہ رہا۔" اس نے آہستگی سے جمائی لے کر جواب دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" وہ ڈانٹ کر بولا۔ "اگر خود ہی اپنا خیال نہ رکھو گی تو کیسے کام چلے گا؟"

نازیہ نے اس کے مزید گرم ہونے سے پہلے پہلے جلدی سے وضاحت کر دی۔ "بھوکا کیوں رہے ہیں؟ اماں کی دو ملنے والیاں آ گئی تھیں۔ خاصا چائے ناشتہ تھا۔ میں نے بھی کئی ایک گرم گرم پکوڑیاں کھائی تھیں۔"

"اوہو....... پکوڑیاں اور تم؟" وہ بے اختیاری سے ہنسا۔ "وہ بھی کئی ایک۔ میں کہتا ہوں نازیہ! جھوٹوں کی بادشاہ بلکہ ملکہ بننے کی کوشش مت کیا کرو۔ اگر میں سارا دن گھر پر نہیں ہوں تو کیا اتنا غافل اور بے پرواہ ہوں کہ مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ میرے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ اور پھر اب تو رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ شام کی چائے پر کھائی گئی پکوڑیاں ابھی تک......."

"یا اللہ!....... آپ تو بال کی کھال نکالتے ہیں۔" وہ تکیے پر سر رکھ کر اوندھ گئی۔

حقیقت یہ تھی کہ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ تمام دن کی اٹھک بیٹھک سے اماں بی بھی آج اس قدر غافل سو رہی تھیں کہ فرحت کے آنے پر انہوں نے دروازہ بھی نہیں کھولا تھا ورنہ عموماً رات کو فرحت کے آنے تک وہ جاگتی رہتی تھیں۔ فرحت کو اپنے میڈیکل اسٹور پر اکثر گیارہ بجے تک بھی بیٹھنا پڑتا تھا۔ دوپہر میں اسٹور پر کھانا بھی جاتا تھا جو ایک ملازم لڑکا ایک ڈیڑھ بجے آ کر لے جاتا تھا اور گوشت ترکاری وغیرہ پہنچا جاتا۔

آج اسٹور سے واپسی پر فرحت نے بار بار زنجیر بجائی مگر اماں بی گہری نیند سوئی رہیں حتیٰ کہ نازیہ کی آنکھ کھل گئی۔ طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے وہ بمشکل آدھا گھنٹہ سوئی تھی۔ زنجیر رک رک کر بج رہی تھی۔ وہ گرم بستر سے شال لپیٹ کر ہی دروازے کی طرف دوڑی گئی۔ تیز سر درد پہلے سے سوا ہو چکا تھا۔

"بس....... اب بولتی بند ہو گئی۔" فرحت نے پانی پیتے ہوئے چھیڑا مگر نازیہ نے جواب نہیں دیا۔

فرحت نے برتن سمیٹے۔ نازیہ نے اٹھنے سے پہلے باورچی خانے میں پہنچ کر دھوئے اور بڑے سلیقے سے نعمت خانے میں سب کچھ رکھ کر واپس کمرے میں آیا۔ تولیے سے ہاتھ پونچھتے دیکھ کر وہ پشیمان تھی۔

"کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ یہ عورتوں والے کام مت کیا کریں۔ یہ آپ کا شعبہ نہیں ہے۔"

بات پوری کرتے کرتے اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ اس نے بے قراری سے پہلو بدلا۔

فرحت اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فکرمندی سے پوچھا۔ "تمہیں ہوا کیا ہے؟....... تانی کیوں نہیں؟"

"ہونا کیا ہے؟" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ "سردی دیکھ رہے ہیں، کس غضب کی پڑ رہی ہے۔ موسم کا اعتبار ہی نہیں۔ جاتا جاتا کر واپس پلٹ رہا ہے۔ ٹھنڈ نے ہڈیاں توڑ دی ہیں۔"

"ہاں....... یہ تو ہے۔" فرحت نے جلدی جلدی کوٹ، مفلر، موزے ان کی مقررہ جگہوں پر رکھے۔ کمرے کا دروازہ بند کیا اور سردی سے سوں سوں کرتا ہوا مسہری کی طرف بڑھا جہاں ایک طرف نازیہ بے سدھ سی پڑی تھی۔ گھبراہٹ سے اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"نازیہ!....... نازیہ!" وہ بوکھلا بوکھلا کر اسے پکارنے لگا مگر نازیہ پر غفلت طاری تھی۔ وہ جواب کیا دیتی! پورا جسم آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ نفس تیز اور ناک کے نتھنے غیر معمولی انداز میں پھول پچک رہے تھے۔ فرحت نے اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے بغور دیکھا۔ اس کے گال انگارے کی طرح دہک رہے تھے۔ وہ عجلت میں اماں بی کو پکارنے کے لئے لپکا۔ اچانک نازیہ نے اس کا دامن تھام لیا۔

"تسلی رکھئے۔" اس نے بڑی ہمت سے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ "کچھ نہیں ہوا مجھے۔ سر درد کی کوئی گولی دے دیجئے۔ معمولی حرارت ہے۔"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"پاگل ہوئی ہو کیا؟" وہ ڈپٹ کر بولا۔ "آتے ہی کیوں نہیں بتایا تھا؟ میں اماں بی کو جگا کر ابھی ڈاکٹر لے کر آتا ہوں۔"

"نہیں، نہیں۔" نازیہ نے منت بھرے لہجے میں اسے منع کیا۔ "اماں بی کو آپ ہرگز نہ جگائیں۔ وہ سارا دن کی تھکی ہوئی ہیں۔ اور خود بھی سردی پالے میں باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ بس کوئی گولی دے دیجئے۔"

فرحت کا ہراساں دل و دماغ بیوی کی طرف سے بے پناہ اور بے شمار ممنونیت سے لبریز ہو گیا۔ خود بھی آگاہ تھا کہ اماں بی بہت ہراساں ہو جائیں گی۔ معطر کی طرف سے ملنے والی مسلسل فکروں اور پریشانیوں نے یوں بھی ان کو اندر سے نڈھال کر رکھا تھا۔

ان کو جگانے کا خیال چھوڑ کر فرحت نے جلدی جلدی تھرما میٹر تلاش کیا اور دھو کر اس کی زبان کے نیچے رکھ دیا۔

دھیرے دھیرے 104 کی طرف بڑھنے والے پارے نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ آہستگی سے ریشمی رضائی سرکا دی۔ درازوں میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر دو سوتی رومال نکالے اور اس کے سر پہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے لگا۔

آدھی رات کے اس سمے، جب کہ ٹھنڈی ہوائیں جنگلی بلیوں کی طرح روشوں میں غراتی پھر رہی تھیں اور گلی کوچوں کے ساتھ ساتھ گھروں کے آنگنوں میں بھی سناٹوں کا راج تھا، وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ بیوی کا بخار اتارنے کی فکر میں جتا تھا۔ خود اس کا جسم سارے دن کی تھکاوٹ سے چور تھا مگر ان حالات میں پڑ کر سو رہنا یا آرام کا خیال ہی ناممکن تھا۔ وہ بار بار اس کی نبض دیکھے جا رہا تھا۔

بخار کی غنودگی کے باوجود نازیہ کو بے کلی سے سخت وحشت معلوم ہو رہی تھی۔ جب بھی وہ بے چین ہو کر مچلتی یا ہاتھ مار کر اسے روکنا چاہتی، فرحت تیزی کے ساتھ اسے ایسا کرنے سے روک دیتا۔ بالآخر اس کی بار بار کوشش ناکام بنانے کے لیے فرحت نے اس کے نرم و نازک ہاتھوں کو اپنے ایک ہاتھ اور ایک گھٹنے سے دبا لیا۔

بالآخر رات ایک بجے کے بعد اس کا ٹمپریچر ڈاؤن ہونا شروع ہو گیا۔ فرحت کے وحشت زدہ دل کو بھی قرار نصیب ہونے لگا۔

خدا خدا کر کے نازیہ کی کیفیت یہاں تک بحال ہوئی کہ فرحت نے اسے سہارا دے کر بٹھایا۔ ایک گولی کھلائی اور سہولت کے ساتھ دوبارہ لٹا دیا۔

دور کسی گھر کے ڈربے میں مرغ اذان پر اذان دے رہا تھا۔ آسمان کے تارے ماند پڑنے لگے تھے۔ کچ کچ چلتی ہوئی رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوا چاہتی تھی۔ فرحت کا تھکن سے برا حال تھا۔ بیوی کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد تھکاوٹ کا احساس یکلخت دو چند ہو گیا۔ اب اس کی برداشت بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ کمر ٹکاتے ہی غافل ہو گیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ صبح اس کے اسٹور کی چھٹی تھی۔

نازیہ تو بخار کی حدت سے اور فرحت تھکاوٹ کی شدت سے دن چڑھے تک سوتے رہے۔ خلاف معمول اماں بی نے بھی توجہ نہ دی۔ کئی دنوں سے وہ خود بھی شدید قسم کے نزلے زکام کی زد میں تھیں۔ جب سے موسم سرما کا آغاز ہوا تھا، اماں بی دو مرتبہ بیمار ہو چکی تھیں۔ شاید اس کی وجہ کام کی زیادتی

بھی تھی۔ اللہ رکھے جس گھر میں پانچ چھ، اوپر تلے کے بچے ہوں اور سب کے سب ناسمجھ اور چھوٹے تو وہاں کے بڑوں کی مصروفیت کا کیا کہنا؟

ان کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سورہ یٰسین کی تلاوت کرتیں۔ ایک تسبیح درود شریف کی پڑھ کر گھڑے کے باسی پانی پر دم کر کے پیتیں، اس کے بعد خود ہی اپنے لیے چائے بناتیں۔ سردیوں میں وہ کسی نہ کسی طرح کا کوئی حلوہ ضرور تیار رکھتی تھیں۔ یہی ان کا ناشتہ ہوا کرتا۔

آج بھی وہ اپنے معمولات سے فارغ ہو کر دھوپ کے رخ پلنگ پر جا بیٹھیں۔ تھوڑی دیر میں کرائے دارنی بھی سوں سوں کرتی ہوئی ان کے پاس آ بیٹھی۔

"اللہ توبہ ہے۔ کیسی بے گمان ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔" وہ گرم دو شالہ اچھی طرح لپیٹتے ہوئے بولی۔ "اچھی خاصی گرمی آ گئی تھی۔ میں نے تو لحاف گدے دھوپ لگا کر رکھ بھی دیے تھے۔ مگر پرسوں پھر نکالنے پڑ گئے۔ کیسی کڑاکے کی سردی ہے نا؟"

اماں بی گردن ہلا کر بولیں۔ "ہاں...... اس میں کیا شک ہے۔ جا کر واپس لوٹ پڑی ہے۔"

"موسموں کا تو کوئی اعتبار نہ کرے۔" وہ ٹھٹھری ٹھٹھری آواز میں کہتے کہتے دفعتاً چونک پڑی اور تیز آواز میں ہنس کر بولی۔ "تو...... مجھے [illegible] ہو گا۔ اچھا، میں ابھی آئی۔ اور جو کچھ میں لا رہی ہوں، اسے دیکھ کر آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔" وہ چھلانگ مار کر پلنگ سے اتر گئی اور تیز تیز قدموں سے چلی گئی۔

اماں بی کچھ بھی نہ سمجھ پائیں مگر اس کی واپسی بھی ہو گئی۔ اماں بی واقعی اس کے تحفے سے خوش ہوئیں اور ہنس کر بولیں۔

"یہ تو تم نے بہت اچھا کام کیا۔ خوش رہو۔ جیتی رہو۔ سچ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔"

کرائے دارنی کے ہاتھوں میں کچی مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی سی خوبصورت انگیٹھی تھی جس میں آٹھ دس انگارے دہک رہے تھے۔ اس مرتبہ اماں بی پلنگ پر سے اٹھیں اور جھٹ پٹ اپنے باورچی خانے سے کھرا مٹی کی ایک بڑی سی تاب اٹھا لائیں اور آسمان کی طرف اشارہ کر کے بولیں۔

"بادل امڈے چلے آ رہے ہیں۔ اب کدھر کا سورج اور کہاں کی دھوپ۔ آ جاؤ ہمارے تختوں کے چوکے پر آ بیٹھو۔"

یہ کہہ کر وہ برآمدے کی طرف بڑھ گئیں۔ کرائے دارنی ان کے پیچھے تھی۔ دونوں نے دہکتی ہوئی انگیٹھی تاب پر دھری اور بیٹھی بیٹھی ہاتھ سینکنے لگیں۔ یخ بستہ ٹھنڈے موسم میں یہ دہکتے ہوئے چند انگارے ایک بڑی نعمت معلوم ہونے لگے۔ یہ دونوں خوش اور مطمئن اپنی باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

اب دن کافی چڑھ آیا تھا۔ حالانکہ ابھر کر سامنے آ جانے والے سورج کو ولی کی طرح دبکتے ہوئے بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا تاہم بڑھتے وقت کو کون روک سکتا ہے! چاروں طرف دن کا اجالا پھیل گیا تھا۔ ہوا بھی ہولی چل رہی تھی۔ جھونکے یخ بستہ تھے۔

معطر کے بچے ایک ایک کر کے اٹھ رہے تھے۔ وہ خود بھی دیر سے کمرے میں بیٹھی ہوئی ناشتے کا انتظار کر رہی تھی۔ بچوں کی چوں چاں شروع ہو گئی تھی۔

جب معطر کے اندازے سے بھی زیادہ وقت گزر گیا تو اس نے بڑے لڑکے سے کہا۔

"جا، اپنی ممانی جان سے کہہ ہماری امی کا ناشتہ دے دو۔"

وہ چلا گیا۔

سردی کا موسم شدید ہوتے ہی معطر کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔ نازیہ منہ اندھیرے اٹھنے کی عادی تھی۔ اپنی ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد وہ سب سے پہلے نماز فجر ادا کرتی اور سیدھی باورچی خانے کا رخ کرتی۔ دلہناپے کے دوران ہی اس نے اپنا یہ معمول بنا لیا تھا اور سختی سے خود کو اسی اصول کا پابند کر لیا تھا۔ ناشتہ تیار کرنے کے ساتھ ساتھ وہ معطر کے ایک دو بچوں کو بھی پکار کر باورچی خانے میں ہی بلالی رہتی پھر معطر کا ناشتہ اس کے کمرے میں بھی بھجوا کر، کبھی خود پہنچا کر فرحت کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ وہ اس وقت تک اٹھ جاتا تھا۔ یہ دونوں ایک ساتھ ناشتے سے فارغ ہوتے۔ فرحت اسٹور کے لئے روانہ ہوتا تو اسے ڈیوڑھی تک بھی چھوڑنے جاتی۔ اس کے بعد تمام دن کا کام دھندا منتظر ہوتا۔ نازیہ کو ان تمام معمولات کو اپناتے ہوئے کسی دشواری کا سامنا اس لئے بھی نہیں کرنا پڑا تھا کہ وہ اپنے میکے میں اپنے معمولات کی عادی تھی اور سادہ فطرت اور ماں کی بہتر تربیت کی وجہ سے اس نے سسرال میں قدم رکھنے کے بعد غیر ضروری نازو ادا اور نخروں کا اظہار نہ کیا تھا۔

ناشتے کے بعد جب خوب دھوپ نکل آتی اور در و دیوار نرم گرم ہو جاتے تو معطر بھی کمرے سے باہر نکل آتی۔ اس وقت تک نازیہ بھی ایک [illegible] نمٹا کر آ جاتی تھی۔ ویسے تھی بے چاری مسکین فطرت۔ معطر کے احکامات اور [illegible] کے درمیان پھرکی کی طرح گھومتی رہتی۔

نازیہ [illegible] کی ہنڈیا اس کی [illegible] کیونکہ پکانے کا سامان وہ ایک دن پہلے [illegible] استعمال کرتی تھی جو اسٹور [illegible] نازیہ نے کمسن ہونے کے باوجود نہایت ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ [illegible] نازک شانوں پر سنبھال لیا تھا۔ اماں بی ان تمام رموز اور باریکیوں سے پوری طرح آگاہ [illegible] اپنی نظر انتخاب پر ناز تھا تو بجا تھا۔ وہ اپنی ہر طرح سے [illegible] نثار ہوتی تھیں۔ بذات خود چلنا ممکن ہوتا وہ اس کی ہمرکاب و ہم قدم رہتیں۔ ہر طرح ہاتھ بٹاتیں اور اس کی ضروریات اور دکھ سکھ کا ایک ماں کی طرح سے خیال رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتی تھیں۔

لڑکے نے فوراً ہی واپس آ کر جواب دیا تھا۔

"ممانی جان نے ناشتہ نہیں بنایا ہے۔ اور وہ باورچی خانے میں بھی نہیں۔"

"لو اور سن لو۔" وہ مارے طیش کے پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی اور لنگڑاتی ہوئی باہر چل دی۔

"اماں!" اس نے غصے سے پکار کر کہا۔ "آنتیں مارے بھوک کے قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ آج ناشتہ ملے گا یا نہیں؟"

"ایں!" انہوں نے غصے سے لال پیلی ہوتی بیٹی کو حیرت سے دیکھا۔ ابھی کچھ بول نہ پائی تھیں کہ اس نے تقریباً چلا کر اپنی بات میں اضافہ کیا۔ "بچے سارے کے سارے بھوک سے بلبلا رہے ہیں، آج معصوموں کا بھی روزہ رکھوایا ہے کیا؟...... میرا خیال ہے آج ناشتہ پڑوسی کروائیں گے ہمیں۔"

اماں بی کے ساتھ ساتھ کرائے دارنی بھی سناٹے میں رہ گئی۔ تاہم اماں بی نے تحمل کا دامن تھامے رکھا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے حیرت سے بولیں۔

"کیا...... آج واقعی اب تک ناشتہ تیار نہیں ہوا؟"

معطر نے بھرپور طنزیہ مسکراہٹ سے جل کر جواب دیا۔ "جو آپ کی بہو بیگم کے مزاج میں آئے۔ ان کے رحم و کرم پر جو ہیں۔"

اتنے میں اس کا چھوٹا لڑکا بھاگا بھاگا ہوا آیا اور اطلاع دی۔ "امی! ماموں صاحب کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ وہ سوئے پڑے ہیں۔"

معطر نے معنی خیز نظروں سے کرائے دارنی کی طرف دیکھا اور منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔ اماں بی اس کی یہ حرکت دیکھ چکی تھیں۔ انہیں بہت برا معلوم ہوا۔ تاہم آہستگی سے بولیں۔

"بیٹی! اگر وہ نہیں اٹھی تو آج ناشتہ تم ہی بنا لو۔"

"کون...... میں؟" وہ تنک کر بولی۔ "واہ اماں! آپ نے تو انصاف کر ڈالا۔ اگر میں اس لائق ہوتی تو یہاں بھائی کے در پر ہی پڑی ہوتی؟...... بھاوج کی جوتیاں ہی سیدھی کر رہی ہوتی؟ خدا نہ کرے کہ کسی پر ایسا وقت پڑے۔ بس، نہ میں ملتان سے آتی اور نہ اس آفت کا شکار ہوتی کہ اچھا بھلا ہنستا کھیلتا جگر کا ٹکڑا بھی ہاتھ سے گنوایا اور برائی بھی، بیماری بھی اپنی جان کو لگالی۔ اسی کو کہتے ہیں کہ قدرت کسی کو بیٹی نہ کرے کہ چاروں طرف سے لعنت کے طوق گلے میں آ پڑیں۔"

وہ معلوم نہیں کیا کیا بکتی جھکتی کمرے میں جا گھسی۔ جاتے جاتے دودھ مانگتی چھوٹی لڑکی کو دو ہتھڑ بھی رسید کر گئی وہ وہیں فرش پر پیر پٹخ کر رونے لگی۔

کرائے دارنی کھڑی اماں بی کا منہ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی جی ہی جی میں دق بیٹھی تھیں۔ معطر تو دیکھتے ہی دیکھتے ان پر حاوی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ [illegible] کے بجائے [illegible] بن رہا تھا۔ نازیہ کے لئے اس کے منحوس ناک خیالات سن کر انہیں رنج ہوا تھا اور [illegible] کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ اونٹ بالآخر کس کروٹ بیٹھے گا۔

کئی منٹ وہ یونہی سکوت کے عالم میں چپ بیٹھیں۔ [illegible] کے انگارے رکھے ہوئے جا رہے تھے۔ کرائے دارنی نے اٹھ کر ان کے [illegible] جوڑ دیئے۔ اسی دوران اماں بی کی ملازمہ آ پہنچی۔ اماں بی نے سنبھالا لیا [illegible]

"نبی بوا! اب یہ کام چھوڑ کر ذرا آٹا گوندھ لو۔"

اتنے میں اسے معطر نے پکار لیا۔ وہ واپس آئی تو ہاتھ میں نوٹ دبا تھا۔

"بیگم صاحبہ! گڈو بی بی کہہ رہی ہیں بازار سے گرم ناشتہ لا دو۔ حلوہ پوری چنے۔"

اماں بی ایک دفعہ پھر ششدر رہ گئیں۔ شکست خوردہ انداز میں گردن ہلا دی۔

نبی بوا چلی گئی تو کرائے دارنی نے اماں بی کو ٹہوکا دے کر ہوشیار کیا۔ "آپ تو سارا تردد چھوڑ کر دلہن کی خبر لیں۔ وہ تو ابھی تک بے خبر نہیں ہوئی۔ اللہ خیر کرے۔"

ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ فرحت تیزی سے چلا آیا اور اماں بی کو مخاطب کر کے پریشانی کے عالم میں بولا۔

"اماں! نازیہ کو تو دیکھئے چل کر۔"

"اے ہے...... بیٹا! خیریت تو ہے؟...... کیا ہو گیا ہے دلہن کو؟" انہوں نے ہول کر کہا اور فوراً کھڑی ہو گئیں۔ "آؤ تم بھی ساتھ۔" انہوں نے کرائے دارنی سے کہا۔

دونوں آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔ نازیہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑی تھی۔ صورت لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ تپش تیز تھا اور پورا جسم آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اماں بی نے پریشانی کے لہجے میں پوچھا۔

"اس کی یہ حالت کب سے ہو گئی؟...... تم نے کسی کو بتایا تو ہوتا۔"

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فرحت نے موزے پہنتے ہوئے عجلت سے کہا۔ "رات کو تو بخار کم ہو گیا تھا۔ آپ کی بے آرامی کے خیال سے نہیں کہا۔ آپ رکیے، میں کسی اچھے ڈاکٹر کو لے کر ابھی آتا ہوں۔"

لیکن قبل اس کے کہ وہ باہر نکل جاتا، کرائے داری جو مسلسل کسی طرح کے غور و فکر میں مبتلا تھی، اسے روک کر کہنے لگی۔

"بھیا! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کسی ڈاکٹر کی بجائے کسی ڈاکٹرنی صاحبہ کو لے کر آ جاؤ؟"

"جی......" فرحت کو اس کی بات سمجھنے میں دشواری ہوئی۔

اماں بی نے چونک کر جلدی سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ زور زور سے سر اثبات میں ہلاتا ہوا باہر چلا گیا وہ عجلت میں دروازے سے نکلا تو معطر آڑ میں ہو گئی۔

کرائے داری کی بات سن کر اس کے چہرے پر گھٹیاں برس پڑی تھیں۔

"ہونہہ......" وہ واپس مڑتی ہوئی پھنکاری۔ "نخرے شروع چڑیل کے!"

⁂

کہنے کو سعدیہ اپنی ذات میں ایک فرد تھی۔ فاخر دن کے وقت گھر میں کم کم رہتا تھا۔ اتنے عرصے میں کافی سے زیادہ اسے بتول خود اس کے "...." میں رہنا پڑا تھا۔ لیکن ان دونوں کو روانہ کر کے گھر میں گھستے ہی پوری فیملی کو شدت سے ان کے جانے کا احساس ہوا۔

ڈاکٹر صاحب ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے با آواز بلند بولے۔ "ارے بھئی! آج تو یوں لگ رہا ہے جیسے کسی دوسرے گھر میں آ گئے ہوں۔"

بھابی جان کچن میں داخل ہوتے ہوئے اداسی ہو کر کہنے لگیں۔

"......کھانے کو دوڑ رہا ہے۔"

نازش سیدھی اوپر اس کے کمرے میں گئی اور جانے کس سوچ میں پڑ رہی تھی۔ سعدیہ کے اچانک چلے جانے کا احساس بھابی سے کم اس کو بھی نہ تھا بلکہ ہم سن ہونے کی وجہ سے زیادہ ہی تھا۔ فی الحال کسی سے بات کرنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ ایک عجیب سا خلا تھا جسے پر کرنے کو کچھ باقی نہ رہا ہو!

لیکن ان سب سے بھی سوا اداس چاندنی ہو رہی تھیں۔ واپس آ کر ڈاکٹر صاحب کی طلب پر کافی تو بھابی نے خود ہی بنائی تھی مگر دوپہر کے کھانے پر بہر حال انہیں کسی کی مدد درکار تھی۔ چنانچہ چاندنی کی تلاش ہوئی اور تلاش بسیار کے بعد وہ اپنے کوارٹر کی پچھلی کوٹھری میں پائی گئیں۔ رو رو کر آنکھیں چندھی اور ناک نماز ہو رہی تھی۔ آج وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری صاف گول کر گئی تھیں اور ایسا اتفاق ان کے یہاں کے دور ملازمت میں پہلی بار ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے سنا تو ان کے فلک شگاف قہقہوں سے کوٹھی کے در و دیوار گونج اٹھے۔ ابھی لحاف میں کہیں سے گھومتا گھامتا فرخ بھی آ نکلا۔ ساری صورت حال سے آگاہ ہو کر وہ چیخ پڑا۔

"یا حیرت! مجھے فاخر نے بتانے کی بھی زحمت گوارا نہ کی اور خود بیگم صاحبہ کو لے کر کوچ کر گیا۔ ایسا بے مروت! ایسا بد تہذیب!!"

"دھیرج...... دھیرج یارا!" ڈاکٹر صاحب نے اس کے شانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے دلاسا دیا۔ "اس کا کام اچانک ہی بن گیا۔ اس لیے اچانک جانا بھی پڑ گیا۔ اور بھی بتول بیچارا غالب" حق مغفرت کرے بڑا آزاد مرد تھا۔"

"بات کرنے کا انداز ہمیشہ محترم کا ایسا رہا کہ ہم بھی آخر تک یہی قیافہ کرتے رہے کہ "سالا جھوٹ بول رہا ہے۔"

"جی ہاں...... آپ کے ہاں جھوٹ بولنے کا تمغہ "سالوں" کو ہی دیا جاتا ہے۔" بھابی جان نے برا مان کر ان کی بات کاٹ دی۔

"چور کی داڑھی میں تنکا۔" ڈاکٹر صاحب نے تاک کر دوسرا حملہ کر دیا۔ ساتھ ہی قہقہہ لگایا۔

"فرنچ کٹ داڑھی میں۔" بھابی نے ان کے چہرے پر نظر جما کر چوٹ کی۔

"استغفر اللہ!" وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے اور ہنسی کے دوران بڑبڑائے۔ "ان خاتون خانہ سے جیتنے کی حسرت ہی رہ گئی۔"

اس مرتبہ ان کے قہقہوں میں فرخ بھی شامل تھا۔ ان سب کے ہنسنے کی آوازیں سن کر نازش نیچے آ گئی اور فرخ کو آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کس بات کا جشن منایا جا رہا ہے؟"

بھابی کی بجائے فرخ نے برجستہ جواب دیا۔ "کباب میں سے ہڈی کے ہٹ جانے کا۔"

نازش نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ "کباب کون ہے...... اور ہڈی کون؟"

فرخ کو ہنسی آ گئی۔ "لیجیے بھائی جان نہیں تو لوگ بہرے ہو گئے۔ اب ہمارا اللہ حافظ!"

نازش نے اسی انداز میں کہا۔ "جی تو بولے ابھی گئے ہیں پہلے تو پھر بولو۔ مگر عاقبت نا اندیش کیا جانیں۔"

"چلیے، ہم عاقبت نا اندیش ہی سہی۔" فرخ نے شکست تسلیم کر کے پوچھا۔ "مگر آپ کیوں اپنی آنکھیں پھوڑ رہی ہیں......؟ ...... حفاظت کرو۔ وہ آنکھیں مل کر بولی۔ "میری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟...... میں نے کیا کیا ہے؟"

وہ بڑے وثوق سے بولا۔ "آپ کی آنکھیں روئی ہیں یا سوئی۔ تیسرا کوئی سبب ہو نہیں سکتا۔"

اس کا اشارہ سمجھ کر نازش نے ایک لمبا سانس لیا اور بے پروائی سے جواب دیا۔ "اوہو...... بڑے قیافہ شناس......"

اسی وقت ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے سے واپس آ گئے اور ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر شور مچانے والے انداز میں گویا ہوئے۔

"ارے بھئی آج کھانا وانا ملے گا یا سب کچھ سعدیہ اپنے ہاتھ پاٹ میں لے گئی؟...... بھئی اس وقت تک وہ لوگ پاکستان کی سرحدیں بھی عبور کر چکے ہوں گے۔ اس خیال میں نہ رہنا کہ وہ پارسل تیار کر کے بھجوا دے گی۔"

بھابی جو ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی تھیں اور شاید اونگھ بھی گئی تھیں، میاں کی آواز سن کر ہڑبڑا کر سیدھی ہوئیں اور جمائی لے کر بولیں۔ "اچھا، کچھ کرتے ہیں...... مگر کریں کیا؟"

وہ دوبارہ دھاڑ کر بولے۔ "کرنا کیا ہے۔ ہری مرچ، ہرے دھنیے کی چٹنی بناؤ اور مزے لے کر کھاؤ۔"

فرخ نے چٹخارا بھر کر اضافہ کیا۔ "اور اس میں کچی کچی املی ملاؤ۔"

ڈاکٹر صاحب اسے آنکھ مار کر شہہ دینے لگے۔ "اور ساتھ میں بیسنی روٹی ہو...... واہ واہ! سبحان اللہ کیا کہنے۔ ہماری تو ابھی سے رال ٹپکنے لگی۔ کھائیں گے تب کیا بنے گا؟ خیر اللہ مالک ہے۔ نمکین

رکھ لیں گے۔"

بھابی اکڑ گئیں۔ بگڑ کر بولیں۔ "واہ، واہ...... کسی خیال میں مت رہئے گا۔ یہاں فارغ نہیں بیٹھے۔"

ڈاکٹر صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور غم ناک آواز میں بولے۔ "اف سعدیہ!...... کہاں گئیں؟...... کیوں گئیں؟...... کہاں سے پکاریں، ڈھونڈ لائیں تمہیں۔ اب تو ایک ایک پل یاد آؤ گی۔ لمحہ لمحہ یاد آؤ گی۔"

وہ مزید چراغ پا ہو گئیں۔ خفگی سے کہا۔ "وہی تو عادتیں بگاڑ گئی آپ کی۔ اب یاد کرتے رہیے اس کے ہاتھ کا مزہ اور ذائقہ۔ چار پانچ مہینے تک نہیں ملنے کے وہ مزے اور چٹخارے۔"

وہ اور زیادہ روتی آواز میں فریاد کرنے لگے۔ "آہ!...... یہ کیا کہہ دیا ظالم خاتون! آپ نہایت بے درد ہیں۔"

بھابی نے ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر فرخ کو مخاطب کیا۔ "فرخ بھیا! تم جاؤ اور کسی اچھے سے ہوٹل سے کھانا پیک کرا لاؤ۔" وہ اپنا پرس ٹٹولنے لگیں۔

ڈاکٹر صاحب برا سا منہ بنا کر وہاں سے ہٹ گئے۔ ایسا نہیں تھا کہ سعدیہ کوئی دنیا سے نرالی مخلوق تھی یا پھر یہ کہ کوئی اس جیسا تھا ہی نہیں، ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ہاں اس میں اگر کوئی خصوصیت والی بات تھی تو یہی کہ وہ بہترین اوصاف والے پاک صاف ماحول کی پروردہ تھی۔ اس کی پرورش، اس کی شخصیت کا آئینہ بن گئی تھی۔ اور اس کے یہ اوصاف ہی چار چاند اس وقت مزید لگ کر نکھر گئے تھے جب شادی کے بعد اس نے نہایت سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ اپنے ان اوصاف کا استعمال ایک قطعی نئے اور اجنبی ماحول میں کیا اور اللہ کے فضل و کرم اور ماں باپ کی دعاؤں کے طفیل ہر دل عزیز ہوتی چلی گئی۔ دھیرے دھیرے اپنی دیگر خوبیوں اور حسن سلوک سے اس نے سب گھر کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ بڑے تو بڑے، گھر کے ملازم اور بچے تک اس کے گن گاتے نہ تھکتے تھے۔ وہ ہمہ صفت سعدیہ بوقت ضرورت بڑوں کے ساتھ بڑی اور چھوٹوں کے ساتھ چھوٹی بن جایا کرتی تھی۔

کچھ قدرت نے ڈاکٹر سلطان کی فیملی کو بھی خاص فرصت میں گویا ترتیب دیا تھا۔ سب کے سب ہی نہایت ہی اچھے اخلاق، اوصاف اور نیت کے مالک تھے۔ حلیمی، بردباری اور محبتیں ان پر ختم تھیں۔ لہٰذا دونوں فریقین باآسانی ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ دیکھنے والی نگاہیں رشک کرتی تھیں۔

اس کی روانگی کے دن گھر میں ہر طرف اسی کی آہٹیں گونجتی رہیں۔ وہ سعدیہ بھی...... وہ سعدیہ آئی...... سعدیہ یہاں ہے...... سعدیہ وہاں ہے...... سعدیہ...... سعدیہ...... سعدیہ!! سب کو سعدیہ کے گمان آ رہے تھے۔ سب سعدیہ کو یاد کر رہے تھے۔

کھانے کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے چلے گئے۔ بھابی اور بچے بھی پڑھ رہے تھے۔ فرخ پہلے ہی جا چکا تھا۔

نازش دوبارہ سعدیہ کے کمرے میں آ گئی۔ اس کے ریکارڈ پلیئر کو ہاتھ لگاتے ہی فاخر کی دلگداز آواز خاموشی میں دھیرے سے گونجی۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

یاد ہے تم کو......
گھر کے پچھلے لان میں ہم تم
شب بھر باتیں کرتے تھے

جھگڑا ہوتا تو ہم لڑ کر
چاند کو منصف کر لیتے تھے
چاند سدا کا پاجی ہے
چاہے کچھ ہو
مگر ایک ہی بات کرتا تھا
تیری سائیڈ لیا کرتا تھا......

اچانک اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

وہ سعدیہ کے بیڈ پر بیٹھی ٹانگیں ہلا ہلا کر مست و بے خود فاخر کی آواز اور وصی شاہ کا کلام سن رہی تھی۔ سعدیہ اور فاخر کے نرم ملائم تکیوں کے درمیان اڑسا ہوا ایک کاغذ کھڑکھڑاتا ہوا اس کی انگلیوں سے ٹکرایا۔

نازش چونک کر کاغذ کی تہیں کھولنے لگی۔

تحریر سو فیصد سعدیہ کی تھی۔ اسے اپنی شناخت پر بھروسہ تھا۔

کاغذ کی سطح پر برق رفتاری سے چلتی اس کی نگاہیں سطور کو پڑھ نہیں رہی تھیں بلکہ نگلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اور پھر اس کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے پھیلتی چلی گئیں...... لب عجیب انداز میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ اور وہ ارد گرد سے بے خبر اس تحریر میں کھوتی گئی تھی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"عزیزی نازش!
ہمیشہ مسکراتی رہو!

کل جب کہ ہم تم ایک دوسرے سے دور ہوں گے، آج تم سے مخاطب ہوں۔ امید ہے میری بات کو قابل عمل بناؤ گی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بدگمان ہوئے بغیر سوچو کہ بھائی جان اور ڈاکٹر بھائی تمہارے لیے کس قدر متفکر اور پریشان رہتے ہیں۔ جس کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا تم سے رشتہ ہی ایسا ہے بلکہ تمہاری خوش نصیبی ہے یہ!

اگر میں لکھنے کی بجائے تم سے زبانی یہ باتیں کرتی تو یقیناً تم چٹکیوں میں اڑا دیتیں چنانچہ قلم کا سہارا لے رہی ہوں۔

نازش! زندگی کو تم جس انداز سے گزارنا چاہ رہی ہو، میرے نزدیک بے تکی راہ گئی ہے۔ وقت گزرنے کے بعد سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہ ہوگا...... محض کسی کی بیتی ہوئی واردات کو مدنظر رکھ کر مردوں کے خلاف کوئی نظریہ قائم کر لینا کہاں کا انصاف ہے اور کیا ہے؟...... کیا تمہارے بھائی جان مرد نہیں؟...... کیا میرے شوہر ایک مرد نہیں؟...... بس ایسی ہی پچاسوں مثالیں ہیں۔ دراصل مرد ہو یا عورت، دونوں کے لیے ہی اچھی بری کوئی حتمی رائے ہرگز لاگو نہیں ہو سکتی۔ یہ ہمارے سارے تجربے زندگی کے واردات ہیں، کہیں کچھ کہیں کچھ۔ اللہ سب کو صاحب ایمان رکھے۔ (آمین)

اب تم سے دل کی ایک بات کروں، دل سے سننا......

پیاری پیاری دوست! وہمی نازش! مجھے یوں لگتا ہے جیسے فرخ تم میں انٹرسٹڈ ہے۔ دیکھو! گھورو مت۔ مجھے اندازہ ہے اس وقت تمہارے تاثرات کیا ہو رہے ہوں گے۔ اگر ایسا ہے تو انہونی تو نہیں! معیوب بھی نہیں کہہ سکتے۔ گو کہ میں اس کے پس منظر میں نہیں دیکھ سکتی۔ شناسائی جتنی ہے وہ بھی تم جانتی ہو۔ مگر جس حد تک دیکھ سکتی ہوں، لاجواب ہے...... عمدہ ہے...... لائق ہے...... خوش شکل ہے...... صاحب کردار اور سو باتوں کی ایک بات، ڈاکٹر بھائی کا دوست ہے۔ وہ اس سے مطمئن ہوں گے۔ پرانی دوستی ہوگی، بھی تو آنا جانا ہے۔ ان تمام خصوصیات کو دیکھتے ہوئے مجھے اچھا لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے پسندیدگی اور گہری انسیت کے رنگ دیکھے ہیں جبکہ تم مسلسل اسے نظرانداز کیے رکھتی ہو۔ ہے نا یہی بات؟ لیکن میں کہتی ہوں نازش! اپنا انداز نظر ذرا بدل کر دیکھو۔ بہت ممکن ہے کہ ڈاکٹر بھائی کا بوجھ ہلکا ہو جانے کی کوئی راہ نکل آئے۔"

نازش نے پڑھتے پڑھتے نظریں تحریر سے ہٹائیں۔ اس کا چہرہ تپ اٹھا تھا۔ کاغذ گول مول کر کے دور پھینکا اور خود اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ شفاف فریم میں سے جھانکتی فاخر اور سعدیہ کی تصویر کے

سامنے رک گئی اور سعدیہ کو گھونسہ دکھا کر دانت پیستے ہوئے بڑبڑائی۔

"بے ہودہ...... بدتمیز...... بڑی آئی نصیحت کرنے والی...... ساون کے اندھے کو ہر جگہ ہرا ہی نظر آتا ہے۔ خود جو فاخر کو پا کر آدھی پاگل ہو گئی ہے تو ہر کسی کو اسی عینک سے دیکھنے لگی ہے...... خدا سمجھے تجھ سے سعدیہ! آ جاؤ واپس، پھر دیکھ کیسی گت بناتی ہوں تیری۔"

وہ کافی دیر تک ٹہل ٹہل کر بڑبڑاتی رہی۔ سعدیہ کو برا بھلا کہتی رہی۔ کمرے میں یا آس پاس کوئی تھا نہیں جو اس کی اوٹ پٹانگ حرکتیں دیکھ کر تعجب کرتا۔ مارے طیش کے اس نے فاخر کی کوکتی گدگداتی آواز بھی خیالوں میں آف کر دی تھی۔

جس تجسس اور فکرمندی کے ساتھ اس نے سعدیہ کی تحریر کو پڑھنا شروع کیا تھا، اس کا مدعا اور اصل مقصد جان لینے کے بعد اتنی ہی جھلاہٹ میں گرفتار ہو گئی تھی اسے روبرو کر سعدیہ کی جرأت اور پھر فرخ کے بارے میں اس کا مشورہ ناگوار محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے سچ لکھا تھا کہ اگر وہ اس وقت نازش کے روبرو ہوتی تو شاید یہ اس کی درگت بنانے سے ہرگز گریز نہ کرتی۔ تحریر پڑھنے کے شروع میں وہ جس بے قراری اور بے تابی میں مبتلا ہوئی تھی، وہ سارے احساسات پل بھر میں صابن کے جھاگ کی طرح غائب ہو گئے اور وہ ایک نامعلوم سی جھلاہٹ میں گرفتار ہوتی چلی گئی۔ اسی خبط میں اس نے آگے پڑھنے کی بھی کوشش نہیں کی کہ سعدیہ نے مزید کیا لکھا ہے؟ اور کن کن الفاظ میں اسے سمجھانے اور منانے کی کوشش کی ہے؟

کافی دیر کے بعد جب اس کی بھڑاس نکل گئی تو خود بخود ہی موڈ بحال ہوتا چلا گیا۔ گویا سعدیہ کا پہلا تجربہ درست نکلا کہ روبرو گفتگو کی بجائے تحریری ملاقات نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ زبانی بحث و مباحثہ دونوں کو دور تک اور دیر تک لے جا سکتا تھا۔

آخر میں وہ کمرے کے اس کونے کی طرف بڑھتی چلی گئی جدھر اس نے وہ کاغذ توڑ مروڑ کر پھینک دیا تھا۔ چاہے انداز میں بے پرواہی ہی تھی۔

✽●✽

اماں بی سخت پریشان تھیں۔

فرحت کی شادی کیا ہوئی، ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہو چلا۔ ایسی کشمکش میں ڈوبی رہتیں جس سے گزشتہ ساری زندگی واسطہ نہ رہا تھا۔ اب تو ہمہ وقت کی سوچوں اور فکرات نے انہیں تھکا ڈالا تھا۔ نہ اس پل چین تھا نہ اس پل قرار، صبر و برداشت کب تک ساتھ دے سکتے تھے!

وہ تمام دن عجیب طرح کے ادھیڑبن کا شکار رہنے لگی تھیں۔ نازیہ بہت دن بیمار رہنے کے بعد ٹھیک تو ہو گئی تھی مگر وہ اس کی اتری اتری سی صورت دیکھ کر ہولتی رہتی تھیں۔ خاصی کمزور اور زرد سی ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد جس تیزی سے حسن و شادابی، صحت اور تندرستی کی سیڑھیاں چڑھی تھی، اسی روانی کے ساتھ جیسے واپسی بھی چلی گئی تھی۔ اس کے باوجود گھر کے کام کاج کو دیکھ کر پیشانی پر بل ڈالتی نہ ہراساں ہوتی تھی اپنی طبیعت کے لیے۔

"میں ٹھیک ہوں...... جی ہاں اماں! بالکل ٹھیک ہوں۔"

مشینی انداز میں کہنا سیکھ گئی تھی۔ ہر وقت اماں بی کو یقین کراتی۔ لیکن اماں کی نگاہیں بہت کچھ دیکھ رہی تھیں۔

بڑے ارمانوں سے پرائی بیٹی بیاہ کر لائی تھیں مگر اب اس سے شرمساری رہنے لگی تھیں۔ معطری

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

طرف سے جاری و ساری نت نئے حربے انھیں ایک شدید قسم کی ندامت میں مبتلا رکھتے تھے۔ بیٹی اور بہو دونوں ہی دوسرے جی سے تھیں۔ اماں بی کے جی کو کچوکے سے لگے رہتے...... کیا کریں، کیا نہ کریں؟ وہ سارا دن ہولائی پھرتیں۔

بیٹی ہر اچھے سلوک کو غلط انداز سے لینے پر کمربستہ رہتی۔ وہ بہو کی دل دہی کرتیں تو تب برا لگتا۔ وہ تو ایک سانس میں اٹھارہ بتانے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن انھوں نے موقع پا کر نرمی سے اسے سمجھانا چاہا۔

"بیٹی!...... چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ اور کچھ نہیں تو تم انھی لوگوں کو سنبھال لیا کرو۔ اللہ رکھے فرحت کی دلہن سارا سارا دن تھک کر نہیں لیٹ، بیٹھ سکتی۔ آخر کو وہ بھی انسان ہے۔ غریب دل میں کیا خیال کرتی ہوگی کہ جس دن سے آئی ہوں، کولہو کا بیل بن کر رہ گئی ہوں۔ کسی کو احساس ہی نہیں ہے!"

معطر کو بہت برا معلوم ہوا۔ فوراً چمک کر بولی۔

"بہت خوب اماں!...... گھر بلا کر آپ نے میری خوب عزت افزائی کی۔ بہت شکریہ۔ ہم بھی ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ کیسا قدر دان میکہ نصیب ہوا۔ شاید ہم ہی جیسوں کے لیے کہا گیا ہے کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

"استغفر اللہ!" اماں بی ... بے چاری خجل ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"اماں!" معطر نے جی کا ... اس نے دوبارہ اسٹارٹ لیا۔ "میں دیکھ رہی ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ آپ کا رویہ اور سلوک میرے ساتھ سخت سے سخت ہوتا جا رہا ہے۔ ایسی میں نے کیا برائی کر دی ... کیوں تھا؟...... کیا مائیں اپنی بیٹیوں سے یوں ہی بدظن ہو جایا کرتی ہیں؟...... سچ تو یہ ہے کہ آپ کی نظر میں بیٹی کی بجائے بہو زیادہ معتبر ہے اور اچھے سلوک کی مستحق ہے۔ ظاہر ہے بیٹے کی بیوی جو ٹھہری۔"

اماں بی نے صبر و برداشت کی آخری حد تک ... اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا اور لہجہ بگاڑے بغیر ملائمت سے جواب دیا۔

"بیٹی! ایک تو تم میں یہ بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے کہ جب بولنے پر آتی ہو تو کسی کی سنتی نہیں ہو۔ اب میں نے ایسا کیا کہہ دیا کہ تم اس قدر چراغ پا ہو بیٹھیں؟ دوسرے یہ کہ تمہیں تمہارے بھلے کی سمجھائی جائے کہ کیا تمہارے حق میں بہتر ہے اور کیا مضر، تو تم بات کو غلط پیرائے میں لے جاتی ہو۔ اب بات ہو رہی تھی تمہاری اور تم درمیان میں گھسیٹ لائیں فرحت کی دلہن کا ذکر۔ اس حقیقت کو خوب ذہن نشین کر لو بیٹی! کہ ہر بیٹی جو آج ایک گھر کی بیٹی ہے، اس پر آنے والی نسلوں کی فلاح و بہبود کی بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔"

"ہونہہ...... بہو!...... پھر وہی بہو۔" معطر نے ان کی بات پر غور کیے بغیر طنز کیا۔ "بہو گھر کی بنیاد ہوتی ہے۔ اسی لیے تو اس گھر کی بیٹی کو پیر کی جوتی سمجھتی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" اماں بی چڑ سی گئیں۔ "تمہارے ہاں تو وہی مرغی کی ایک ٹانگ ہے۔ کتنا ہی پتھر سے سر پھوڑ لو، آخر میں وہی معاملہ ٹائیں ٹائیں فش۔ دراصل اپنی ذہنی رو میں تم خود ہی کچھ سمجھنا نہیں چاہتیں۔"

معطر نے بدتہذیبی سے ماں کی بات کاٹ دی اور اکڑ کر بولی۔

"آپ کا مطلب ہے کہ میری ذہنی رو بہک گئی ہے...... یعنی میں پاگل ہو گئی ہوں؟ یہی جتانا چاہتی ہیں نا آپ؟...... تو پھر اپنے گھر میں کاہے کو رکھا ہے۔ پاگل خانے میں بھجوا دیں مجھے تا کہ میرے بچے ہمیشہ کے لیے ماموں ممانی کے ٹکڑوں پر پڑے رہیں اور در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں۔"

اب اماں بی کو غصہ آ گیا۔ ڈانٹ کر بولیں۔

"خاموش احمق لڑکی! اکھو کھیت کی، ستو کھلیان کی۔ چھٹانک بھر کی زبان ہر لحظہ چلتی ہے۔ من بھر کا کھوپڑا استعمال نہیں کرتی۔ ایسی عقل سے پیدل پہلے تو کبھی نہ تھیں۔ اب تمہیں ہوا کیا ہے؟ بالکل ہی گھاس کھا گئی ہو کیا؟"

اس نے بے حد تنک کر جواب دیا۔

"ہمیں تو اس گھر میں گھاس کو بھی نصیب ہو جائے تو غنیمت ہے۔ ورنہ دنیا جہان کی نعمتوں پر یہاں نئے آنے والوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔"

"غضب خدا کا۔" اماں بی کی قوت برداشت جواب دینے لگی۔ وہ جتنی طرح دے رہی تھیں، معطر اتنی ہی بپھر رہی تھی۔ ان کا لہجہ آپ ہی آپ تلخ ہوتا گیا۔

"تم نے معطر! اس گھر کو اکھاڑا بنا ڈالا ہے۔ آخر تمہارے دل میں کیا بغض بھرا ہے بھاوج کے خلاف؟ کیوں ہر وقت اس کی طرف سے بھری رہتی ہو...... میں نے تو کبھی اسے تم سے عار رکھتے ہوئے پایا نہیں۔ سارا سارا دن تمہارے بچوں کے ... ہوئے کام ہنسی خوشی کرتی رہتی ہے۔ ان خدمت گزاریوں میں اسے کتنی ... پھر بھی تمہاری طرف سے برائی ہی ہے۔"

وہ آگ بگولا ہو کر بولی۔ "واہ اماں!...... ان بیگم صاحبہ کے آرام و آسائش اور کام چوری کی پردہ داری کے لیے تو آپ نے نوکراں رکھوا دیں ... خدمت گزاری کا الزام ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ بھلا میرے بچوں کے ... بازار سے کھانا منگواتی ہوں۔ اس سے بہتر تھا کہ میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتی۔ اگر جو کہیں بے چاری ... ہوں تو میرے بچوں بے چاروں کا کوئی سر دھلانے والا بھی نہ ہو۔ بس اب آپ ... مت کھلوائیں۔"

اماں بی اس کی دیدہ دلیری اور ... حیرت اور تاسف سے منہ کھولے اس کے جارحانہ تیور دیکھ رہی تھیں۔ یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ خود انھی کے پیٹ کی اولاد ہے۔ دل میں پکڑ دھکڑ سی ہونے لگی۔

اگر جو اس کے یہ خیالات خود فرحت سن لیتا تو اس کے دل پر کیا گزرتی! وہ ہی ... نکلتے۔ یا تو بیوی سے بدظن ہو جاتا یا پھر بہن کی طرف سے دل میں بال پڑ جاتا۔ ہر دو صورت میں تباہی اور خرابی تو گھر کے ماحول کی ہوتی!

ان کی خاموشی پر وہ فاتحانہ انداز میں ہنسی اور رازداری سے بولی۔ "ماں بیٹی میں ناچاقی اور اختلافات ڈلوا دیے۔ اس سے بڑھ کر کیا چار سو بیسی ہوگی؟ اسی کو کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ آخر پڑ گئی نا ہمارے درمیان نااتفاقی۔"

اماں بی نے اس نئے انکشاف پر آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا مگر وہ نہایت ڈھٹائی اور بے پروائی سے ہنس رہی تھی۔ اس نے ان کی کیفیت پر غور کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ ان کی مسلسل خاموشی کو نیک شگون سمجھتے ہوئے مزید اترا گئی۔ بہت جی جلانے والے انداز میں چبا چبا کر کہنے لگی۔

"معلوم نہیں کس نے آپ کو یہ رشتہ بتا دیا اور آپ جھٹ پٹ بیاہ رچانے بھی جا پہنچیں...... نہ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کچھ آگا دیکھا نہ پیچھا اور اپنے گئے گزرے لوگوں میں عزیز داری جوڑ لی۔ میرا تو خیال ہے فرحت کو اکیلا دیکھ کر دوستی کا ٹھان لی ہو گی ان لوگوں نے اور پھر اسی سرپھرے کو آپ کے پیچھے لگا دیا ہو گا رشتے کے لئے۔ تبھی تو سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ ایک آپ ہیں کہ بغیر سوچے سمجھے، بغیر دان جہیز کے لڑکی گلے لگالی۔"

اماں بی کا کلیجہ پھٹ کر رہ گیا۔ ان کی سماعت سے معطر کے الفاظ گرم گرم پگھلے ہوئے سیسے کی مانند ٹکرا رہے تھے۔ اذیت سے ان کا رواں رواں جل اٹھا۔ انتہائی غم و غصے سے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور پُرجلال آواز میں گویا ہوئیں۔

"اے معطر! بہت ہو چکی۔ بس اب خاموش ہو جاؤ۔ خبردار اگر جو تم نے آگے ایک حرف بھی زبان سے نکالا۔ میں دیکھ رہی ہوں تم نے نالائقی اور بدخلقی کی ہر حد عبور کر لی ہے۔ میں لحاظ اور مروت میں خاموش ہوں تو یہ مت سمجھ لینا کہ میری بھی تمہاری طرح عقل خبط ہو چکی ہے۔ مخالفت اور عداوت کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ معلوم نہیں وہاں ملتان میں تم کس ماحول میں رہ رہی تھیں اور کن لوگوں میں تمہارا میل جول تھا کہ اخلاقی طور سے تو قطعی تباہ ہو کر رہ گئی ہو۔ یہ سب تو مجھے نائمہ آپا (معطر کی ساس) سے پوچھنا چاہئے کہ ...... اور تم ...... مسلسل کیچڑ اچھال رہی ہو، معلوم ہے وہ ہے کون؟ آخر تمہاری جرأت کس طرح ہوئی اتنا بدزبان بننے کی؟ ...... کیا سوچ کر تم نے ہمارے گھر میں جادو سحر اور ٹونے ٹوٹکوں کا ذکر کیا؟ ...... کسی مرا ہوا سمجھ لیا ہے؟ ...... اور خبردار جو آئندہ بھی تم نے فرحت کی ذہنی ...... ایسی جہالت آمیز باتیں کرنا کہاں سے سیکھ آئی ہو؟ تمہیں پتا بھی نہیں معلوم ہے کہ ایک مشکل ...... قابل فخر بہو اور اس اعلیٰ و ارفع کردار کے حامل گھرانے کی بیٹی ...... ہے، میرے گھر اور بیٹے کے لئے کسی بیش بہا خزانے سے کم نہیں ہے۔ سعید احمد کی بیٹی فرحت کے نکاح میں آنا ہماری بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ اگر وہ بغیر جہیز کے ہوتی تب بھی ہم اپنی قسمت پر ناز کرتے جب کہ حقیقت ہے کہ اس کے مجبور باپ نے اپنی بچی کی خوشی اور ...... کی وجہ سے بظاہر بغیر جہیز کے رخصت ضرور کر دی مگر ایک جہیز کی سی نقدی سلامی داماد کو دے کر کسر پوری کر دی۔ جس میں ہم جیسی نادان اور ...... سوچ رکھنے والی وضع داری اور بے پناہ خودداری کے اس لطیف احساس کو چھونے سے بھی قاصر ہو گی۔ مگر خدا کا احسان اور شکر ہے کہ ہمارے دل سے ان کی قدر دانی اور عزت کوئی بدخو کم نہیں کر سکتا۔ اور تم خاطر جمع رکھو۔ ہم خوب سوچ سمجھ کر اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنی بہو بیاہ کر لائے ہیں بلکہ تمہاری آج کی باتوں نے تمہاری طرف سے کھٹک اور انجانا سا خوف بیدار کر دیا ہے۔ اب ہم تمہارا اعتبار نہیں کر سکتے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری تربیت تم نے کہاں جا گنوائی؟"

اتنی ساری باتیں کہہ دینے کے باوجود اماں بی کا جلال کم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت رنج، تاسف اور غصے کی انتہا سے ان کی عجیب حالت تھی۔ آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے مگر پھر وہ وہاں رکی نہیں بلکہ سیدھی اپنے کمرے میں آ گئیں اور چپ چاپ آ کر پلنگ پر لیٹ رہیں۔

معطر کی آج کی باتوں نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اکیلی لیٹی ہوئی بہت دیر تک تمام حالات کے تانے بانے پر غور کرتی رہیں۔ جس دن سے بہو بیاہ کر لائی تھیں، ایک ایک پل ان کی آنکھوں کے سامنے پردے پر چلنے والی فلم کی طرح چل رہا تھا۔ وہ حیران تھیں کہ نازیہ کو کس جگہ اور کس سین پر موردِ الزام ٹھہرائیں؟ اس کا اب تک کا تمام کردار شفاف آئینے کی مانند اُجلا اور بے داغ تھا۔

اپنی ہی بیٹی ہر بات میں اور ہر مقام پر قصوروار اور خطاکار دکھائی دے رہی تھی۔ اور آج تو اس نے بلاوجہ کی مخالفت اور دشمنی کی حد کر ڈالی تھی۔ معاً ان کے دل پر گھونسا سا لگا۔ انہیں اپنا آپ نہایت حقیر، چھوٹا اور غیر اہم محسوس ہونے لگا۔

'ہمارے ہونے نہ ہونے کا فائدہ کیا ہے آخر؟' انہوں نے انصاف کو مدِنظر رکھ کر سوچنا چاہا تو ایک بے پناہ کرب اور اذیت سے ان کا رواں رواں کانپ اٹھا۔

'ابھی ہم اپنی ہی بیٹی کی محبت اور مروت میں دوسرے کی بیٹی کے حقوق مسلسل تلف کر رہے ہیں۔ اس کی حق تلفی پر کیا خدا ہم سے جواب طلب نہ کرے گا؟...... کیا وہ کسی کے جگر کا ٹکڑا نہیں ہے؟...... اس کا قصور کیا ہے؟...... کیا اس کی بے زبانی کا صلہ یہی ہونا چاہئے کہ بغیر کسی جرم و خطا کے اس کے والدین تک پر کیچڑ اچھالی جائے؟...... کیا اس کی آنکھیں اور کان بند ہیں؟ وہ کچھ دیکھتی، سنتی اور سمجھتی نہیں۔ پھر فرحت ہر واردات اور گھر میں چلنے والے ہر جھگڑے سے بے خبر کیسے رہتا ہے؟...... یہ کیسی جادوگری ہے؟...... نہیں، نہیں...... یہ سب نازیہ کی اعلیٰ ظرفی ہے۔ کم ظرف اور بے انصاف ہم ہی ہیں۔'

وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ انہوں نے کاغذ قلم نکالا اور اسی وقت خط لکھنے بیٹھ گئیں۔ جو جی میں سمائی ...... وہ اس حد تک لکھنے کے لائق تھیں ہی!

وزیر بیگم نے شکرانے کے طور پر ...... ان کے چاروں بیٹوں میں یہی بیٹا بے اولاد تھا۔ سات برسوں میں اچانک ہی قدرت کے اشارے ...... سے خوشی کی نوید ملی تھی۔ خدا خدا کر کے یہ گھڑی آئی تھی ...... آنگن آنے جانے والوں سے پٹ گیا تھا۔ ...... وزیر بیگم کے بیٹے کے گھر میں ماشاءاللہ ...... پوتے پوتیوں کی کمی نہ تھی مگر جس کے اولاد نہیں تھی، اس کے لئے تو بحیثیت ماں کے وہ اندر ہی اندر گھلتی رہتی تھیں۔ پیر ولی فقیروں کے پاس بھی وہ گئی تھیں ...... اور اب اسی قدرت والے پر اور اس کے بے پناہ لطف و کرم پر وہ اس کا شکر ادا کرتے نہ تھک رہی تھیں۔ بے جا نام و نمود اور دکھاوا اور بناوٹ کے کاموں کو وہ ہمیشہ سے ناپسند کرتی تھیں۔ ہاں، مستحق کی دل کھول کر مدد کرتی تھیں۔

تانیا کے ہاں اولاد کی امید بندھتے ہی وہ بذات خود اس کے میکے میں یہ خوشخبری دے کر گئی تھیں۔ جواباً زمانی بیگم نے اپنی بہو شگفتہ کو تانیا کی سسرال بھیجا تھا جو اپنے ہاں کے رسم و رواج کے مطابق خوب لد پھند کر پہنچی تھیں۔ ان کے ہمراہ بھتیجی جان بھی آئی تھیں۔ شرمائی لجائی سی تانیا کا ایک نیا روپ سب کے سامنے تھا۔ مارے خوشی کے ان کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔

وہ دل ہی دل میں پھولن بوا کی ممنون احسان تھیں جن کے مشورے اور پھر محنت و مشقت نے یہ مبارک دن دکھائے تھے ورنہ شادی کے چھ سات برس کے بعد وہ تو تقریباً مایوس ہو بیٹھی تھی۔ سارا سارا دن دیور جیٹھوں کے بچوں سے جی بہلایا کرتی تھی۔

مدت سے سسرالی ماحول میں رہنے کے باوجود وہ اندر سے کہیں آج تک زمانی بیگم کے ہاں کی بچی تھی۔ آنکھ کھول کر جس ماحول کو دیکھا، اسی کے اثرات روح میں کچھ اس طرح پنجے گاڑ کر بیٹھ گئے تھے کہ باوجود کوشش کے بھی اپنے ارمانوں کے پھول کھلتے ہی سب سے پہلے اس کا دھیان اپنے میکے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کی پھولن بوا کی طرف گیا تھا جو اسی مقصد کے لئے مانی گئی منت کے لئے جانے کیسے کیسے جتن کر کر کے سات جمعرات مسلسل بستی مہرولی کے مزار پر جاتی رہی تھیں۔ ان کی طرف سے تانیا کے عقیدے میں مزید چار چاند لگ چکے تھے۔ دل سے ان کی معترف ہو گئی تھی اور انہیں کسی بڑے انعام کی حقدار تسلیم کر لیا تھا۔

آج کل جاڑے کا موسم رخصت ہو چکا تھا اور فضاؤں میں اک جانا پہچانا سا رنگ آ گیا تھا۔ ٹھٹھری ٹھٹھری رات سے چھٹکارا حاصل کر کے انسان تو انسان، چرند پرند اور نباتات تک سرشار ہو اٹھے تھے۔ بھاری بھاری لحافوں اور گرم گرم شالوں سے نجات پا کر اہل کائنات خوشی منا رہے تھے۔ پیڑ، پھول، پتے لہلہا اٹھے تھے۔ ٹنڈ منڈ درختوں نے انگڑائیاں لے لے کر پرانے لبادے اتار ڈالے تھے۔ جنگلوں، ویرانوں میں خزاں رسیدہ سوکھے پتوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ یہ ننھی ننھی ٹہنیاں نئی نئی ہری کونپلوں اور کلیوں سے سجنے لگی تھیں۔ شاخ شاخ کی اوٹ سے فاختائیں چہکنے لگی تھیں۔ فضاؤں نے اسی دھج سے موسم بہار کا خیر مقدم کیا تھا کہ باغوں میں مہکتی ادھ کھلی کلیوں کے انبار لگ گئے تھے۔

چچی جان اور شگفتہ آج ہی تانیا کی سسرال میں اتری تھیں۔ یہاں ان کا بھرپور استقبال ہوا تھا سب ہی اپنے اپنے مقام پر خوش اخلاق ملنسار تھے۔

شام کے وقت گھر کے لوگ چائے پر بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ تانیا کے شوہر طاہر بیگ آ گئے۔ چچی جان کے قریب جھک کر آداب کیا۔ شگفتہ پر نگاہ گئی تو اچھل پڑے، خوش ہو کر اپنی گونج دار آواز میں چہک کر بولے۔

"ارے...... اخاہ...... ہماری بھابی بھی تشریف فرما ہیں۔ زہے نصیب! زہے نصیب!"

پھر خود ہی جملے کا اضافہ کیا۔

"اور بھی آپ کیوں نہ گئیں دیور، دیورانی کے ساتھ یورپ کی سیر کے لئے؟"

سننے والوں نے با ہوش و حواس ان کا جملہ سنا اور سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ شگفتہ کے مسکراتے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہاں موجود افراد بیوقوفوں کی طرح ان کی صورت تکنے لگے۔ سب سے پہلے چچی جان نے سنبھالا لیا اور پاندان پرے کھسکا کر پوچھا۔

"ارے بھیا! یہ کیا کہا تم نے؟...... بھلا ان کے دیور دیورانی کون ہوئے؟ کچھ اتا پتہ بھی ہے یا یونہی روا روی میں کہہ گئے؟"

"لیجئے صاحب! آج نیا محاورہ سننے کو ملا۔ یعنی روا روی۔" وہ کلّے میں پان کی گلوری دبا کر ہنسے۔

"ہماری چچی اماں بھی لطیفے پر لطیفہ گھڑتی ہیں۔ اب ایک لطیفہ تو یہی ہو گیا کہ ہم شگفتہ بھابی کے دیور صاحب کو نہیں پہچانتے۔ چلئے ان کے دیور کو نہیں تو...... کم از کم اپنے سالے صاحب کی شناخت تو غلط نہیں ہو سکتی۔ ہم کوئی سٹھیائے ہوئے ہیں؟"

وزیر بیگم جو اتنی دیر سے خاموش بیٹھی ساری گفتگو سن رہی تھیں، اچانک انہوں نے بیٹے کو آڑے ہاتھوں لیا اور ڈپٹ کر گویا ہوئیں۔

"اور...... سٹھیائے ہوئے سے کسی طرح کم بھی نہیں لگتے آپ صاحبزادے!"

"ارے اماں! یہ آپ کیا غضب کر رہی ہیں؟" طاہر بیگ پان چبانا موقوف کر کے ان کی طرف گھوم پڑے۔ "ہم خلیل خان نہیں جو فاختہ اڑایا کرتے تھے بلکہ طاہر بیگ ہیں۔ اور آپ کے یہ طاہر بیگ بے پر کی اڑاتے ہیں نہ ہی بات کرتے ہیں، آپ کی دعا سے۔ اس لئے جو کچھ کہا وہ سو فیصد

درست کہا ہے۔ شبے کی گنجائش قطعی نہیں۔"

وزیر بیگم نے جرح کرنے کے انداز میں کہا۔ "دیور اور سالے کی پیچ بتا کر اگر سادہ الفاظ میں کہا جائے تو تم فاخر میاں کا تذکرہ کر رہے ہو۔ مگر صاحبزادے! تمہیں اتنی بھی خبر ہے کہ فاخر کی ابھی تک شادی ہوئی ہے نہ نکاح۔ پھر بیوی کہاں سے آ گئی؟"

طاہر بیگ نے سینہ ٹھوک کر بڑے وثوق سے جواب دیا۔

"بالکل آ گئی...... کہاں سے آ گئی؟ یہ ہمیں نہیں معلوم مگر ہم اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے بذات خود انہیں دیکھ کر آ رہے ہیں۔ سنی سنائی ہرگز نہیں کہہ رہے۔ بیوی تو بیوی، ہم ان کا پورا سسرالی گھرانا دیکھ کر آ رہے ہیں۔"

محفل بھر کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ چچی جان کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر داماد کے قریب آ بیٹھیں اور لجاجت سے پوچھا۔

"بھیا! پہیلیاں تو بجھواؤ مت۔ سچ سچ کہو کیا کہہ رہے ہو؟"

طاہر بیگ نے محبت سے ان کے شانے پر بازو پھیلا کر ادب سے سوال کیا۔

"چچی اماں! آپ نے کبھی ہمیں جھوٹ بولتے ہوئے پکڑا ہے؟ یہ تو ایک عبرت ناک بے انصافی ہے۔ کیونکہ آپ ہی سب بزرگ ہمیں سچ بولنے پر [illegible] کرتے رہتے ہیں۔"

چچی جان چپ ہو گئیں۔ وزیر بیگم دو ٹوک انداز میں ہو گئیں اور بیٹے کو سختی سے مخاطب کیا۔

"طاہر! بات کو مذاق کے پیرائے میں مت ٹالو۔ جو موضوع تم نے چھیڑا ہے، انتہائی سنجیدہ ہے۔ اسے معمولی مت سمجھو۔ جو کہہ رہے ہو سوچ سمجھ کر کہو۔ اگر محض مذاق ہے تو اسی لمحے تسلیم کر لو۔"

طاہر بیگ نے ہنس کر جواب دیا۔

"اماں جان! بات کی نزاکت سے ہم بھی واقف ہیں۔ بلکہ جس وقت ہم نے وہ منظر دیکھا، ہم بھی سناٹے میں رہ گئے تھے۔"

شگفتہ اس اچانک انکشاف پر پتھر کا بت بنی ایک ایک کی صورت تک رہی تھی مگر کسی کو اس کی کیفیت پر توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ اس وقت سب ہی ایک ایک کی طرف ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے۔ چچی جان نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔

"کیا منظر؟...... کون سا منظر؟...... بھیا! مکمل کر بتاؤ۔"

طاہر بیگ سنجیدہ ہو کر بولے۔ "معاف کیجئے گا چچی جان! ہم تو سب کی جرح اور سوالات سے گھبرا گئے۔ خواہ مخواہ سب کو پریشان کیا۔"

انہوں نے اٹھنے کے لئے پر تولے مگر چچی جان نے مضبوطی سے انہیں پکڑ لیا۔ "اب کہاں چل دیے بات ادھوری چھوڑ کر؟"

انہوں نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے متانت سے جواب دیا۔

"دل دکھانے کے لئے ہم آپ سب سے معافی کے خواستگار ہیں۔ معاف کر دیجئے۔"

وزیر بیگم نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "معافی تلافی کیا ہوتی ہے۔ اپنی بات مکمل کر کے جاؤ۔"

انہوں نے اسی لہجے میں دھیرے سے کہا۔ "جو کچھ ہم نے دیکھا ممکن ہے ہماری نظر کا دھوکا ہو اس لئے جانے دیجئے۔"

وزیر بیگم تیز لہجے میں بولیں۔ "اے بیٹا! باؤلے ہوئے ہو کیا؟ ادھوری بات تو پوری بات سے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ تم نے کتنے بھرم میں بیٹھ کر شوشہ چھوڑ دیا اور اب کی کمر اکڑ کر جانے پر تل گئے۔ ایسے میں تمہیں کون بچنے دے گا؟"

طاہر بیگ نے نیچی آواز میں طنزاً کہا۔ "کسی میں بچ نکلنے کی تاب بھی ہو!"

چچی جان نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔ "نہیں گے........ کہیں گے بیٹا! وہ تیر ہم ضرور کہیں گے جو مولا نے ہماری تقدیر میں رقم کر دیے۔ بھلا قسمت کے لکھے کو بھی کوئی مٹا پایا ہے؟"

طاہر بیگ نے انہیں بغور دیکھ کر کہا۔ "لیجیے، آپ تو ابھی سے غمگین ہو گئیں۔ اب ہم کس دل سے کہیں؟"

وزیر بیگم بھنک کر بولیں۔ "طاہر! زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔ لے کے سب کو ایک کشمکش میں ڈال دیا۔ فوراً اپنی بات کی وضاحت کرو۔ ہمیں معلوم ہے تم واقعی جھوٹ نہیں بولتے۔ مگر ایک دفعہ پھر تنبیہ کر رہے ہیں کہ جو کچھ بتاؤ اپنی پوری ذمہ داری سے بتانا۔"

طاہر پھر بدمان گئے۔ "اماں جان! آپ نے پھر ذمہ داری اور غیر ذمہ داری شروع کر دی۔"

انہوں نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں تو پھر اور کیا کہیں؟...... تم تو اب ماشاءاللہ جوان، سمجھدار، بیوی بچے والے ہو...... غیر ذمہ داری کا ثبوت دینا بھی مت۔"

تھوڑی دیر کے لیے گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ طاہر بیگ سر جھکا کر کچھ سوچنے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت اچانک ہی ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا تھا مگر اس کا شدید رد عمل دیکھ کر اندر ہی اندر ان کے ہوش اڑ گئے تھے۔ چونکہ واقعہ تازہ ترین تھا اور حیرت زدہ وہ خود بھی تھے اتفاق سے ہی گھر میں گھسنے کے ساتھ ہی فاخر کا ذکر کر دیا۔ پھر جو کچھ وقوع پذیر ہوا وہ سب بے ساختگی میں ہوا۔ اس لیے وہ خود کو [illegible] رہے تھے۔ مگر اب یہ مشکل ہو گئی تھی کہ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن" چچی جان نے انہیں ٹہوکا دے کر پوچھا۔

"ارے بھیا! سو گئے کیا؟"

"ایں......" طاہر بیگ نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تو خود کو بہت سی نگاہوں کے حصار میں پایا۔ جلدی سے وضاحت کی۔ "نہیں، نہیں...... جاگ رہے ہیں۔"

وزیر بیگم اکتا کر بولیں۔ "جاگ رہے ہو تو اب بول بھی پڑو۔"

طاہر بیگ خود بھی فیصلہ کن مرحلے سے نہ بچ سکے تھے۔ انہوں نے گہرا سانس لیا اور پوری سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ سب کو بتانے لگے۔

"واقعہ یہ ہے کہ ہم چند دوست اپنے ایک دوست کو رخصت کرنے گئے تھے کراچی ایئرپورٹ پر۔ وہیں تمام صورت حال خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کر کے آ رہے ہیں۔ کسی سے سنی سنائی نہیں کہہ رہے اور فاخر کو خود اس کی بیوی کے ساتھ بالکل ہوش و حواس کے ساتھ اس طرح روز روشن کی مانند دیکھا ہے جیسا کہ اس وقت آپ سب کو دیکھ رہے ہیں۔ کسی شبہے کی گنجائش ہے نہ شک۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ یہ کس طرح معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ جانے والی اس کی بیوی ہی تھی تو یہ بھی ہم نے ان لوگوں کے رخصت ہو جانے کے بعد تحقیق سے بھی معلوم کر لیا اور وہیں ایئرپورٹ پر ان لوگوں کی بات چیت سن کر بھی جان لیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور سسرالیوں کے ہجوم میں ایسا مگن اور مست تھا کہ اس نے ہمیں نظر بھر کر دیکھا نہ ہم اسے پکار کر چونکا سکے۔ لیکن تھا بہرکیف وہ فاخر ہی۔ ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ بتا رہے ہیں۔

بیوی اس کی ایسی حسین و جمیل اور دلکش کہ جیسے کوہ قاف کی پری۔ چچی اماں! اس کے چہرے پر ایسی تازگی اور معصومیت دکھائی دے رہی تھی کہ شاید جنت کی حور ایسی ہوتی ہو گی۔ نظر کھنچ کر اسی کی طرف اٹھ رہی تھی۔ صاف کسی اعلیٰ خاندان سے لگ رہی تھی۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ صاحب کو بھائی اور بیش قیمت ساڑھی باندھے محترمہ کو بھابی جان کہہ رہی تھی۔ ان کے ہمراہ دو بچے اور ایک خوبصورت سی دوسری لڑکی بھی تھی۔ رخصت ہوتے وقت دونوں رونے بھی لگی تھیں۔ شاید بہنیں تھیں دونوں۔"

تفصیل سے بتاتے بتاتے طاہر بیگ کی جھجک جاتی رہی تھی اور اب وہ نہایت روانی سے لگ لگ کر وضاحت سے بیان کر رہے تھے۔ چونکہ واقعہ تازہ ترین تھا، اس لیے ایئرپورٹ پر دیکھا ہوا ایک ایک سین ان کی نگاہوں کے سامنے پردہ فلم پر دیکھے ہوئے چلتے پھرتے خاکے کی طرح رواں دواں تھا۔

ادھر سننے والوں کا یہ حال تھا کہ حیرانی اور پریشانی آنکھوں سے ہویدا تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے جاتی رہی تھی۔ سماعت گویا داستان امیر حمزہ پر مرکوز تھی۔

ذرا سا تھم کر طاہر بیگ نے بت کی طرح ساکت و صامت افراد پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور اپنی دانست میں آخری دھماکا خیز اطلاع دیتے ہوئے بولے۔

"اگر اب کسی کو اس حقیقت پر بھی [illegible] کا گمان ہے تو سب کی تسلی کے لیے ہم فاخر کی بیوی کا نام تک بتائے دیتے ہیں۔ اگر بعد کو یہ [illegible] ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا، وہ ہماری۔ سنیے اس کو سب لوگ سعدیہ کہہ کر خطاب کر رہے تھے۔"

اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے سب [illegible] داد طلب نظروں سے دیکھا۔ مگر اب کوئی ان کی طرف متوجہ نہ تھا۔

چچی جان نے [illegible] اور وزیر بیگم [illegible] لیکن شگفتہ نے کسی کمزوری کا اظہار نہیں کیا تھا۔ دل و دماغ پر سے قیامت گزر گئی تھی اور ان کی آنکھوں کے سوتے خشک تھے۔ شدید توہین اور ہتک عزت کے احساس سے [illegible] تن بدن میں ایک الاؤ سا بھڑک اٹھا تھا جس کی تپش سے ان کا رواں رواں سلگنے لگا تھا۔

اچانک وہ اٹھیں اور غصے میں بھری ہوئی اندر کمرے میں چلی گئیں۔ وزیر بیگم نے تانیا کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ فاخر کے متعلق ایک بالکل نیا اور ہولناک انکشاف سن کر خود تانیا کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا یقین محال تھا۔ شگفتہ کی طرف سے دل ہول گیا تھا۔

وہ بمشکل تمام اپنے آپ کو سمیٹ کر اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بھاوج کے پیچھے اندر چلی گئی۔ دل بے طرح گھبرائے جا رہا تھا۔

وزیر بیگم کے گھر میں اچانک ہی اداسیوں نے دھاوا بول دیا تھا۔ تھوڑی دیر قبل جہاں باتوں کی چہکار اور ہنسی، دل لگی کی کھنک گونج رہی تھی اور خوشیوں اور مسرتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر بہہ رہا تھا، اب وہاں دکھوں اور پریشانیوں کی برسات پھوار کے مانند برس پڑی تھی جس کی یورش میں ہر کسی کا تن من بھیگ کر شرابور ہو گیا تھا۔ چونکہ طاہر بیگ نے یہ خبر ایک دم ہی سب کے بیچ کہہ دی تھی اس لیے کسی سے کچھ نہ رہ سکی تھی اور بھی اس انہونی سے آگاہ ہو گئے تھے۔

تانیا کی دیورانیاں، جیٹھانیاں سب اپنے کانوں سے یہ انکشاف سن چکی تھیں لیکن بات ایسی ہی گمبھیر تھی کہ کوئی کسی سے تسلی تشفی کے دو بول بھی کہنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ بھلا ہمدردی کا اظہار کیا

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بھی جاتا تو کیا کہہ کر کیا جاتا؟ وہ سب کی سب ایک ایک کر کے اٹھیں اور اپنی اپنی طرف چل گئیں۔
سب کا یہ کھلا کھلا رد عمل دیکھ کر طاہر بیگ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ پان چبانا بھول گئے تھے آج کی بے حیائی کر کے!

✱●✱

محلے میں کہیں محفل میلاد تھی جس میں صغریٰ دادی بھی مدعو تھیں۔ وہ نہایت اہتمام کے ساتھ صبح سے تیاری میں مصروف تھیں۔
جمعۃ المبارک ہونے کی وجہ سے ان کی بڑی پوتی باپ بھائیوں کے کپڑے استری کرنے بیٹھی۔
یہ اس کا ہر جمعہ کا دستور تھا۔
صبح ناشتے کے بعد وہ بھاری سی لوہے کی استری میں کوئلے دہکا کر بیٹھ جاتی اور چاروں پانچوں مردانہ سوٹ استری کر کے اوپر بند ڈال کر ٹانگ دیتی تھی۔ باقی گھر کے بچے اور عورتیں اس اہتمام سے آزاد تھے۔
میلاد شریف کے لیے دادی کا ذوق و شوق دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ”دادی! لاؤ تمہارا سوٹ استری کر دوں۔“
بکس کھول کر انہوں نے ریشمی چوڑی دار قمیض جوڑا اس کے حوالے کر دیا اور خود وہیں بیٹھ کر اپنے بالوں میں تیل ڈالنے لگیں۔ ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ فضا میں کپڑا جلنے کی بو پھیل گئی۔ دادی نے گھبرا کر سامنے نظریں دوڑائیں۔
پوتی کا رنگ فق تھا۔ وہ سرعت سے اٹھی استری کو تک رہی تھی جس کے تلے دادی کی قمیض چپکی ہوئی تھی۔
”ہائے تیرا ستیاناس جائے۔“ دادی وہیں بیٹھے بیٹھے حلق پھاڑ کر چیخیں۔ ”یہ کیا کر دیا تو نے پھوہڑ! خدا تجھے غارت کر دے۔ میرا اکلوتا ریشمی جوڑا جلا ڈالا۔ چلی تھیں استری کرنے.......
بوجہ۔“
ان کی چنگھاڑ سے پیچھے گھر بھر جاگ پڑا۔ ہر کوئی صورت حال کی تفتیش کرنے آ پہنچا۔ جب کہ موقع واردات پر دادی پوتی دونوں عجب حال میں تھیں۔ دادی اکڑی چلی جا رہی تھیں تو پوتی ہراساں سے ہراساں ہوتی جا رہی تھی۔ غضب پر غضب یہ ہوا کہ ان کی بہو دخل دے بیٹھی۔ ظاہر ہے کہ بیٹی کا خوفزدہ چہرہ دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکی اور جھٹ سے بول پڑی۔
”ارے جانے دو....... اماں بے چاری سے بھول چوک ہو گئی۔ تم دوسرا جوڑا پہن لو۔“
صغریٰ دادی بالکل ہی جھتے سے اکھڑ گئیں۔
”بیٹیا نے اپنے پھوہڑ پن سے جوڑا جلا ڈالا، اماں کلیجا جلانے آ گئیں۔ تم دوسرا جوڑا پہن لو....... چلی ہیں رائے مشورہ دینے۔ جیسے مجھ نصیب جلی کو جوڑوں پر جوڑے سلوا کر ہی تو ڈھیر کر دیے ہوں گے۔“
بہو کو بہت برا معلوم ہوا تاہم دبی زبان سے جواب دیا۔
”اس میں پھوہڑ کیا تو تھوڑا کیا۔ استری میں سلگتی آگ پر بھلا اختیار کیسا؟ جل گئی تو جل گئی قمیص۔ اب کیا کریں؟“
دادی بھڑک اٹھیں اور زیادہ چلا کر بولیں۔ ”اری منہ میں کیا بدبد کیے جا رہی ہے؟ بہادروں

کی طرح ذرا زور سے بول تو تیرا منہ توڑوں۔ ایک تو لے کے نقصان کر ڈالا اور اوپر سے زبان چلاتی ہے۔ اولاد کو گت کے کام نہ سکھائیں گی بلکہ شہ دے کر اور سر پر بٹھاتا ہے اس لیے تو بگھاتا برا لگتا ہے۔ جیسی خود پھوہڑ ویسی اولاد پھوہڑ۔“
پھر انہوں نے روئے سخن پوتی کی طرف پھیرا اور للکار کر گویا ہوئیں۔ ”لا ری ادھر میری قمیص۔ دیکھوں کیا کرتوت کیے ہیں۔“
پوتی نے بمشکل استری سے چپکی ہوئی قمیص اس کے چنگل سے چھڑائی اور ڈرتے ڈرتے لا کر ان کے حضور پیش کر دی۔
”ہائی! میری توبہ۔“ صغریٰ دادی اپنی جلی بھنی قمیص کا حشر دیکھ کر چیخ اٹھیں۔ ”اری پھٹکار تجھ پر پڑی!“ وہ غم و غصے سے بے قابو ہو کر دھاڑیں۔ ”کاہے کو مجھ بڑھیا کو فیشن کرانے چلی تھی؟...... کیا قصور میں نے کر دیا تھا جس کا بدلہ یوں مجھ سے میرا اکلوتا جوڑا جلا کر لیا ہے؟ ہے نا آخر دشمن ماں کی اولاد!“
نئے جوڑے کا ستیاناس دیکھ کر افسوس بہو کو بھی ہوا تھا اس لیے ساس سے دشمنی کا کھلم کھلا اعلان سن کر بھی اس نے حوصلے سے کام لیا اور چپ رہی۔ بے بجز تم ناک نگاہوں سے ریشمی قمیص پر پوری چھپی ہوئی استری کا نقشہ دیکھے گئی۔
دادی اپنا سر پیٹ کر بولیں۔ ”ہائے ہائے میری قمیص....... اری کلموہی! یہ کیا کر دیا؟...... اب کہاں لے گا ایسا انمول کپڑا!“
اچانک انہیں قمیص کا سارا تاریخی جغرافیہ یاد آ گیا۔ وہ پکار پکار کر دہائی دینے لگیں۔
”ہائے....... ہو تو ویسے ہی ہو دیسوں ہو سو جاری۔ اللہ اس پر تیری رحمت ہو۔ اس کی جان و مال کی حفاظت کرے....... اس کا ساتھ سلامت رکھے....... کتنا پیار کرتا ہے وہ توبہ....... اسی کی یادگار تھی یہ قمیص۔“
بہو نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر یہ کان تراش کلام سنا، مگر نہ مانا تو ناک پر انگلی رکھ کر براہ راست پوچھ بیٹھی۔
”ارے ہے اماں! یہ آپ کس پوتی کے گن گا رہی ہیں؟ کس کی یادگار تھی یہ قمیص جس کو اس قدر منہ بھر کر دعاؤں سے نواز رہی ہیں؟“
دادی صغریٰ کے تو پتنگے لگ گئے۔ ان کا رہا سہا صبر و قرار بھی لٹ گیا۔ مارے غصے کے جھلا کر جواب دیا۔
”کس کے لیے کہہ رہی ہوں، کیا تمہیں نہیں معلوم؟ ایسی ننھی تو نہیں ہو۔“
بہو نے فوراً شکست مان لی اور مصالحت سے بولی۔ ”قسم اللہ کی اماں! میری سمجھ میں جو ذرا بھی آیا ہو۔“
وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ ”اوئی پھٹکار تیری عقل پر۔ اتنی پاس کی بات بھی نہ سمجھو تو کس کام کی یہ عقلیں؟ کیا میری پوتی سعدیہ کو نہیں جانتی؟ سعید احمد کی بڑی والی کو؟“ کہتے کہتے انہوں نے کڑوی نظروں سے اسے گھورا۔ جھٹکا مار کر قمیص پوتی کے ہاتھوں سے جھپٹی اور ایک دلدوز آہ بھر کر اضافہ کیا۔ ”اسی نصیبوں والی کے ہاتھوں کی سلی ہوئی ہے یہ قمیص۔ دیکھا! کیسا بڑھیا کپڑا ہے اور سلائی کس قدر عمدہ ہے۔ ایسی ہنرمندی ہو گی کسی کے ہاتھوں میں؟“

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اب ان کا جوش و خروش دیکھنے کے لائق تھا۔ بہو سے بدقسمتی عروج پر جا پہنچی۔ بے چاری کو بری طرح لتاڑ ڈالا۔

"اور تم کیا جانو اپنے بڑوں کی قدر دانی اور ضرورت کا خیال۔ معلوم ہے اس پورے جوڑے کا کپڑا بھی سعید احمد کی بیوی نے دیا تھا۔ اللہ اسے نیکی دے، بچی چند دن رہنے کو میکے آئی تو سب سے پہلے اس سے میرا جوڑا سلوا کر دیا۔ یہ وہی یادگاری جوڑا ہے۔ پھر اس کے بعد ہی تو وہ سات سمندر پار گئی ہے۔"

"سات سمندر پار دادی؟" پوتی نے خود پر پڑنے والی پھٹکاریں فراموش کر کے دیدے پھاڑے۔

"ہاں تو اور کیا!" انہوں نے بڑے فخر سے جواب عنایت فرمایا۔ "سات سمندر پار گئی ہے اپنے میاں کے ساتھ۔ جاتی نہیں تھی، زبردستی کر کے لے گیا ہے گھمانے پھرانے۔ ان کے ہاں کا دستور ہے یہ نئے دولہا دلہن کو کہیں دور کے ملکوں کی سیر کرنے کے لئے جانا پڑتا ہے۔ پوری سسرال نے اللہ آمین کر کے رخصت کیا ہے۔ اللہ نے کیا جب وہاں سے سیر سپاٹا کر کے لوٹی تو سب میں پہلے اپنے میکے آئے گی۔ اس کے دولہا نے خود ہم سے اس روز وعدہ کیا ہے۔ سعید احمد اور اس کی بیوی تو مارے چلے جا رہے تھے۔ گھر میں نے ہی کہہ کہلوا کر اجازت دی جانے کی۔"

انہیں اپنا دکھڑا دوبارہ یاد آ گیا۔ ایک دھمو کا جڑا، جھنجلا کر بولیں۔

"لو بھلا، میں اب کیا بچی ہوں یا شرفاء میں؟......" تو تو اپنا کونک کر کے بیٹھ رہی۔

کاہے کو گئی تھی استری کرنے؟"

بہو نے ان کا غصہ ٹھنڈا کر کے بٹھایا۔ "لاؤ اماں! میں تمہارے بکس میں سے دوسرا جوڑا نکالے دیتی ہوں...."

اس نے بروقت دانش مندی کی اور جلدی جلدی دوسرا جوڑا نکال کر شلوار میں ازار بند ڈالا۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کے ان سے کپڑے بدلوائے، بال سلجھا کر ان کی چوٹی کی اور گھر سے روانہ کیا۔ تب سکون کی سانس لی۔

محفل میلاد کے دوران بھی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔ سلام پڑھنے کے بعد جب دعا بھی ہو چکی تو کسی نے پیار کر دریافت کیا۔

"صغریٰ خالہ! کیا ہو گیا؟...... آج بہت ڈھیلی ڈھالی بیٹھی ہو۔ طبیعت ٹھیک ہے؟"

وہ پھٹ پڑیں۔ "ہونا کیا ہے...... یہ آج کل نالائق پوتیوں سے بے زار ہوں۔ کمبخت ماری نے لے آج میری نئی قمیص استری سے جلا ڈالی۔"

اس انکشاف کے بعد انہوں نے نہایت سیاق و سباق کے ساتھ پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ آج کا واقعہ بیان کیا۔

بہت سی سننے والیاں کھسک کر ان کے ارد گرد جمع ہو گئی تھیں اور مسکرا مسکرا کر ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ جب انہوں نے سعدیہ کا تذکرہ کیا اور ساتھ ہی اس کے اپنے میاں کے ساتھ سات سمندر پار سیر کرنے کے لئے جانے کی تشریح کی تو ایک دم ہی محفل کی دلچسپی میں ڈھیروں اضافہ ہو گیا۔

اسی محفل میں سعید احمد کی بیوی بھی موجود تھیں مگر انہوں نے دخل نہیں دیا۔ چپ چاپ مسکراتی ہوئی سنتی رہیں۔ البتہ محفل برخاست ہونے کے بعد کسی طرح بہلا پھسلا کر انہیں اپنے گھر لے گئیں۔ اسی وقت حمید کو بھیج کر ان کی بہو سے جلی ہوئی قمیص منگوائی۔ دونوں ماں بیٹی دیر تک الٹ پلٹ کر اس کا

معائنہ کرتی رہیں۔ آپس میں مشاورت کے بعد حمیدہ نے اعلان کیا۔

"دادی! آپ کی قمیص اب بھی ٹھیک ہو سکتی ہے۔"

"ایں...... وہ بھلا کس طرح؟" انہوں نے ہڑبڑا کر دریافت کیا۔

"وہ یوں دادی!" وہ ان کے قریب قمیص لے کر بیٹھ گئی۔ "یہ دیکھئے...... حسن اتفاق سے آپ کی قمیص دامن کے کونے کی طرف سے جلی ہے اور قمیص کا کپڑا پھولدار بھی نہیں بلکہ پلین ہے۔ اس لئے اس پر نہایت آسانی سے کڑھائی ہو سکتی ہے۔ اس طرح جلے کا عیب چھپ جائے گا اور آپ اسے پہن سکتی ہیں۔"

مارے حیرت اور خوشی کے صغریٰ دادی کا منہ کھٹ سے بند ہوا اور کھل گیا۔

"یعنی...... تو کشیدہ کاری کرے گی؟"

"جی ہاں۔" حمیدہ نے گردن ہلا کر اعتراف کیا۔

"اللہ میں صدقے...... میں واری۔" انہوں نے خوش ہو کر اسے لپٹا لیا۔ "اللہ تیری ماں کی مامتا ٹھنڈی رکھے۔ کیا خوب بیٹیوں کی تربیت کی ہے۔ سونے میں تلنے کے قابل ہیں۔" وہ تمام دن کی کوفت بھول کر لمبی دعائیں دینے لگیں۔ پھر سلائی مشین کے ارد گرد بکھرے ہوئے کپڑے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کیا کیا سی رہی ہو آج کل؟...... بڑی مشین کی آواز آ رہی تھی۔"

سعید احمد کی بیوی نے ان کے قریب کھسک کر بتایا۔

"اماں! یہ ننھے منے کرتے، ٹوپی سلوا کر رکھ رہی ہوں میں۔ بہت سے ٹکڑے تو والے پڑے تھے گھر میں۔ آج کل دوپہریں بھی ذرا لمبی ہونے لگی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے ماشاءاللہ نازیہ کے ہاں سے اچھی خبر سننے کو مل چکی ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس کی طرف سے بھی کوئی خوشخبری مل سکتی ہے۔ اس لئے ابھی سے تھوڑا تھوڑا بہت شروع کر دیا ہے۔"

"شاباش، بہو! شاباش۔" دادی صغریٰ نے خوشی سے جھک کر ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ "ہاں ہو تو ایسی۔"

⁂•⁂

فاخر کی شادی کی خبر تھی...... یا قیامت خیز دھماکا!

شاید ایسی زبردست تباہی تو ہیروشیما پر ایٹم بم پھٹنے سے بھی نہ مچی ہو گی جیسی کہ فاخر کے ہاں دیکھنے سننے میں آئی۔

حویلی بھر میں اک کہرام مچ گیا۔

چچی جان اور شگفتہ کی واپسی کے ساتھ ہی کیا مالک اور کیا خادم سب کی زبان پر یہی ناقابل یقین قصہ تھا۔ غم و غصے، رنج و الم اور پریشانیوں کے شدید جھکڑ تھے۔ آہوں اور سسکیوں کی زرد آندھیاں تھیں جو ابا میاں کی حویلی کے افق پر نمودار ہوئی تھیں اور آن کی آن میں ہر کسی کو اپنی لپیٹ میں لے کر خوفزدہ اور حواس باختہ کر گئی تھیں۔

سوئے اتفاق زلزلے کے اس شدید ترین جھٹکے سے ابا میاں اگلی صبح ہی آگاہ ہو گئے تھے بلکہ خیریت یہ گزری کہ تین چار دن کی غیر حاضری کے بعد پچھلی شام کے سایوں میں حویلی کے اندرونی حصے میں گھسے تو سب سے پہلے یہی قصہ ان کی سماعت سے ٹکرایا۔ پل بھر میں پوری بات روز روشن کی طرح ان پر عیاں ہو گئی۔ کسی کی نگاہ میں آئے بغیر انہوں نے الٹے قدموں وہاں سے فرار ہونے میں عافیت جانی اور سیدھے بہاولپور کی راہ پکڑی۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اپنی زندگی میں پہلی بار وہ اس درجہ بدحواس ہوئے تھے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے بھائی صاحب کے سوا کسی سے مشورہ لے سکتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مضبوط اعصاب کے مالک ہونے کے باوجود وہ اندر سے اس انکشاف پر دہل کر رہ گئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔

دراصل دماغی طور پر ابھی وہ اس حقیقت کے انکشاف کے لیے تیاری نہیں تھے۔ باہر ان کا گن مین حشمت خان اب تک موجود تھا۔ وہ ملازم جیپ کی صفائی ستھرائی اور جھاڑ پونچھ میں لگے تھے۔ ابا میاں کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

انہوں نے توجہ دیے بغیر حشمت خان کو ضروری ہدایات دیں۔ انجن ابھی گرم ہی تھا۔ اس نے ریڈی ایٹر میں پانی ڈلوایا، ضروری تیاری کے بعد گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ابا میاں بہت تھکے ہوئے اور فکرمند تھے۔ پچھلی سیٹ پر چلے گئے۔ یوں نہایت رازداری کے ساتھ ان کی دوبارہ روانگی عمل میں آ گئی اور گھر والوں کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو سکی۔

وہ بیدار ہوئے تو رات ختم ہو چکی تھی۔ مغربی افق پر ہلکے ہلکے کافوری اُجالے اُبھر رہے تھے۔ صبح کی سنہری روشنیاں ہر طرف پھیل چکی تھیں۔

دلاور حسین کے شاندار مکان پر اُتر کر حشمت خان نے ضروری معلومات حاصل کیں اور واپس آ کر ایک دفعہ پھر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اس بار وہ تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا جس طرف جا رہا تھا وہاں ہر طرف ہرے بھرے کھیت اور درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ جن کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

یہاں ہر طرف ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ سورج اونچے اونچے کیکروں کے درخت کے عقب سے دھیرے دھیرے اونچا ہو رہا تھا۔ جو اور گیہوں کی قد آور بالیاں ہر طرف پھیلی سنہری دھوپ سے سنہری ہو رہی تھیں۔ ہر طرف ہریالی کا عالم تھا۔ ہریالی کا دور دورہ تھا۔

دور کہیں سے رہ رہ کر ڈھول بجنے کی آواز اُبھر اور ڈوب رہی تھی۔ سرسبز و شاداب کھیتوں میں ہوائیں چلتیں تو سرسراہٹیں اُبھرتیں، جلترنگ سے بجتے محسوس ہونے لگتے۔

حشمت خان گاڑی بھگاتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں پگڈنڈی کے ایک جانب دور تک لہراتے ہوئے کھیتوں میں جو اور گیہوں کی بالیاں ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ اور دوسری طرف کے کھیت ویران پڑے تھے۔ یہاں خوب چہل پہل اور رونق نظر آ رہی تھی۔ فصل تازہ تازہ کٹی تھی۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصل کے ڈھیر اُبھرے دکھائی دے رہے تھے۔ گیہوں کے خوشے بکھرے پڑے تھے اور بہت سی میلے کچیلے دوپٹوں والی عورتیں لڑکیاں خوشے چن رہی تھیں۔ دھوپ اب تیز ہو چکی تھی۔ جس کی تمازت سے مزدور عورتوں کے رخسار دہک رہے تھے۔ تیز دھوپ اور سخت محنت سے ان کی رنگت سنولا گئی تھی۔ گریبان پسینے سے تر اور تھے مگر ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔

آگے کے کھیتوں میں بھی کٹائی زوروں پر تھی۔ ڈھول بیٹھک پر پیٹے جا رہے تھے۔ ڈھولی ڈھول پر جس زور سے چوٹ لگاتے تھے، فصل کاٹنے والے اسی تیزی کے ساتھ فصل کاٹ رہے تھے۔ بعض اوقات ہاتھ لہرا لہرا کر "بلے بلے" بھی کہہ رہے تھے۔ اُن کا بے پناہ جوش و جذبہ اور محنت و مشقت کرنے کا حوصلہ مند انداز دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

یہیں پر دلاور حسین حقہ گڑگڑاتے ہوئے پائے گئے۔

اپنی اس دریافت کی کامیابی پر ابا میاں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"ہاں! تم یہاں کیسے؟" وہ اچانک بھائی کو روبرو دیکھ کر حیران رہ گئے اور ایک فلک شگاف قہقہے کے ساتھ انہیں گلے لگا لیا۔

یہاں زمینوں پر انہوں نے خاصا وسیع و عریض مکان بنوا رکھا تھا جو تھا تو کچی مٹی گارے سے بنا ہوا، چھتیں گھاس پھوس اور لکڑیوں کے شہتیر پر ڈالی گئی تھیں مگر بوقتِ ضرورت یہ مکان ان کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوا کرتا تھا۔ فصلوں کی کٹائی، بوائی اور چھلائی کے مواقع پر وہ دن رات یہیں بستر لگائے رہتے۔ اولادِ نرینہ کی محرومی نے ان کی ذمے داری بڑھا دی تھی۔

حشمت خان کو گاڑی سمیت ایک نوکر کے سپرد کر کے وہ بھائی کی طرف متوجہ ہوئے۔ دیگر ضروریات اور کھانا کھا لینے کے دوران تک انہوں نے ابا میاں کو ایک لفظ تک بول جانے کی مہلت دی نہ اجازت۔ دلشگاف الفاظ میں دمکتے رہے۔

ہر طرف سے فراغت کے بعد انہوں نے حقے کی نے ان کی جانب گھما کر دریافت کیا۔

"ہاں...... اب بتاؤ اتنے طویل سفر کا مقصد۔"

"کیا بتائیں؟" ابا میاں نے حقہ پیے بغیر روٹھے روٹھے انداز میں شکوہ کیا۔ "آپ وضع داری نبھاتے رہے اور وہاں سب کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔"

"کیوں...... کیا ہو گیا؟" اب انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہ پوچھیے کیا نہیں ہو گیا۔ خفیہ شادی کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے صاحبزادے کا۔"

"خیر...... الحمدللہ!" دلاور حسین کی زبان سے بے ساختہ نکلا جسے ابا میاں اپنی جھونک میں سن نہ سکے اور تفصیل کے ساتھ پورا واقعہ ان کے گوش گزار کرنے لگے۔ اس دوران حقے کی نے دونوں کے درمیان خاموش پڑی تھی اور وہ دونوں سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔ بات ختم ہو گئی تو دلاور صاحب نے پوچھا۔

"طاہر بیگ وہی ہے نا، جسے ہم اپنی "تو تو کاپی" کہا کرتے ہیں؟"

"جی ہاں۔" ابا میاں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اب...... داماد ہیں، ان کا کوئی شکوہ نہیں کیا جا سکتا۔" دلاور صاحب نے گونج دار قہقہہ لگا کر کہا۔ "قریب ہوتے تو ہم اپنی "تو تو کاپی" کو پھولوں کے ہار پہناتے۔ ہمیں زحمت دیے بغیر انہوں نے کہانی کا ڈراپ سین کر ڈالا۔ قابلِ فخر کارنامہ انجام دیا طاہر نے۔"

ابا میاں کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ بگڑ کر بولے۔

"آپ کو اٹھکیلیاں سوجھی ہیں اور ہماری بیزاری کا یہ عالم ہے کہ جی چاہ رہا ہے اپنا سر پھوڑ لیں۔ طاہر بیگ پر سخت طیش آ رہا ہے۔"

دلاور حسین نے جلدی جلدی حقے کے تین چار کش ایک ساتھ لگا کر نے ہٹا دی اور بے حد کیف اور سرشاری کے عالم میں گویا ہوئے۔

"سچ پوچھو تو ہمارے سر سے ایک بہت وزنی بوجھ اتر گیا۔ تمہارے ہاں سے آنے کے بعد سے اسی کشمکش میں گرفتار تھے کہ اس گھمبیر راز کو افشا کس طرح کریں۔"

ابا میاں تعجب سے آنکھیں پوری کھول کر بولے۔

"یہ...... آپ کیا فرما رہے ہیں؟...... ہماری سمجھ میں تو خاک نہ آیا۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"جناب کی عقل شریف ابھی "ان" کے خوف سے دنگ بلکہ گنگ رہتی ہے۔ کھوپڑی میں گوبر کہاں، بھوسہ بھر لیا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کیا لڑکا اب ساری زندگی گھر سے باہر کے ہی دھکے کھاتا پھرے گا؟...... اگر جو اس نے خاندان سے علیحدہ نکاح کر ہی لیا تو اسے ویسے نکالا کر دیا جائے؟...... میاں! شتر مرغ کی طرح ریت میں سر گھسا دینے سے آندھی چڑھنا رک نہیں سکتی۔"

ابا میاں نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا اور بڑی متانت سے دبنگ لہجے میں بولتے چلے گئے۔

"یہ مانا کہ لڑکی غیر خاندان سے ہے لیکن...... کیا غیر مسلم بھی ہے؟ ظاہر ہے یہ بات نہیں ہے۔ تو پھر کیا بات ہے کہ وہ ہمارے بیٹے کی منکوحہ ہونے کے بعد ہمارے گھر میں گھل مل نہ سکے؟ نہیں...... یہ بات بھی نہیں ہے۔ بات اصل میں یہ ہے دلاور حسین! اگر تم نے صرف اپنے صاحبزادے کی ضد دیکھی، اس کی دلی خواہش پوری کی، اس کی تمنا کو حسرت بننے سے بچایا۔ بس اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"بس بھیا بس۔" ابا میاں نے تڑپ کر ان کی بات کاٹ دی لیکن دلاور حسین بھی اپنے نام کے ایک ہی تھے۔ برابر کہتے گئے۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اسے حق و رسم و روایات کے مطابق اپنے گھر کی دہلیز پار کرا کے اندر لانے کی سبیل کیوں نہیں کرتے؟...... کیا وہ گھر کے بچے کا حق نہیں ہے؟...... اس بے قصور بچی کو اپنا جگر گوشہ کیوں نہیں بنا لیتے؟...... ہم تو اس دم بہت خوش ہوئے تھے کہ بیٹے نے یونیورسٹی میں کسی سے قول و قرار کیے تو محض دل لگی کی حد تک نہیں چھوڑ دیا بلکہ اپنی شرافت اور خاندانی وقار کو سربلند کر دیا۔ اور تم نے [illegible] ہمارے گھر میں یہ سب کہاں کافی۔ جاہل اور ناقابل بھروسہ ہے۔"

ابا میاں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"ہم کیا کریں؟ ...... گھر میں بھی خاندان کے لوگ کم نہیں ہیں، جہاں لوگوں کی باتوں سے سخت کوفت ہوتی ہے ایک سے ایک جہالت بھری باتیں ہیں وہاں کی۔"

دلاور حسین تحمل سے بولے۔ "ہیں تو تمہارے اہل و عیال ہی نا۔ شکایت کیسی؟ تم اس گھر کے سرپرست اعلیٰ ہو۔ حقیقتوں سے فرار مسائل کا حل نہیں ہوا کرتا۔" پھر شرارت آمیز تبسم سے ہنس کر اضافہ کیا۔ "اور...... ہم تو کہتے ہیں کہ جب اوکھلی میں سر دے دیا تو موسلوں سے کیا ڈر؟"

ابا میاں نے برجستہ جواب دیا۔ "ہماری چندیا پر ایک بال بھی نہ بچے گا۔"

دلاور حسین نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تمہاری بزدلی کوئی رنگ لا کر رہے گی۔ اب ہی کو کچھ کرنا پڑے گا۔" انہوں نے سکوت اختیار کیا، چند لمحے کسی نکتے پر غور کیا، پھر فیصلہ کن انداز میں بولے۔ "چونکہ طاہر بیگ نے معاملہ بھرے گھر کے سامنے بیان کر دیا ہے اس لیے تعجب نہیں کہ یہ خبر ہمارے گھر کے اندر تک بھی جا پہنچی ہو اور وہاں بھی عورتوں نے گریہ مچا رکھی ہو۔ اچھا کیا کہ تم اندر نہیں گئے۔ کسی سے ملے بغیر یہیں سے پلٹ جانا۔ تمہارے پیچھے ہی ہم آتے ہیں تمہاری بھاوج کو لے کر۔ سب کے درمیان بیٹھ کر خود ہی ٹھیکرے کی یہ مانگ توڑنے کا اعلان کر دیں گے۔"

ابا میاں کا سرخ و سپید چہرہ فق ہو گیا۔

دلاور حسین نے فوراً ان کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور ان کی طرف جھک کر رازداری سے

بولے۔ "تردد مت کرو...... ہم تمہاری بھتیجی شگوفہ کے لیے لڑکا پسند کر چکے ہیں۔"

⁂

سعدیہ اور فاخر کے چلے جانے کے بعد سے نازش کے دن اور رات بہت اکتا دینے والے اور زیادہ طویل طویل ہو کر گزر رہے تھے۔ اس کی ہر وقت کی اتری اتری سی صورت دیکھ کر بھابی بھی چھیڑنے سے گریز کرتی تھیں حتیٰ کہ بھائی نے بھی اس کی غیر معمولی سنجیدگی اور خاموشی کو نوٹ کیا۔ اس کے چہرے پر اکثر ایک جامد چپ سی چھائی رہتی۔

ایک شام ڈاکٹر منان جلدی گھر چلے آئے۔

برآمدے میں دونوں بھتیجے شور مچا رہے تھے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی ان میں شامل نہ ہو سکی۔ ابھی الجھنوں میں گرفتار بیٹھی رہی۔

یہ تو نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے شادی نہ کرنے کا تہیہ کر بیٹھی تھی مگر یہ ضرور تھا کہ وہ جب بھی زندگی کے اس اہم ترین پہلو کو زیر غور لانا چاہتی تو طبیعت پر ایک انجانا سا اضطراب، نامعلوم سا خوف طاری ہو جاتا تھا۔

سعدیہ کا خط پڑھ لینے کے بعد اس نے کئی بار اپنا محاسبہ کرنا چاہا مگر ناکام رہی تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

اس راستے پر اس کا خود کا تجربہ تو نہ ہونے کے برابر تھا لیکن جو کچھ رخشندہ کے توسط سے اس کے مشاہدے میں آ چکا تھا، اس کمزور دل لڑکی کو ذہنی الجھنوں میں گرفتار کر دینے کے لیے کافی تھا۔

وہ جب بھی اپنے مستقبل میں شریک ہونے والے کسی ان دیکھے شخص کا تصور کرتی تو اس کی نگاہوں کے آگے رخشندہ کو فریب دینے والے چہرے ابھرنے لگتے جن کی بدکرداریوں اور خباثتوں نے ہمیشہ کے لیے اس کا دامن داغدار کر ڈالا تھا۔ جن کے چہروں کی آوارہ چمک اسے دنیا کے ہر مرد کی آنکھوں میں چھپی محسوس ہوتی تھی۔ روح میں چھید کر دینے والے حساس لمحوں کا زہر اس کی نس نس میں اس طور بیٹھ چکا تھا کہ اسے ہر مرد اسی قبیل کا محسوس ہونے لگتا اور لاکھ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے باوجود وہ انجانی کراہت سے دامن نہ چھڑا پائی۔ بعض اوقات وہ بڑی سچائی سے اپنے رجحان کا تجزیہ کرتی تو سوچتی۔

"کاش! رخشندہ کے کیس کے فوراً بعد ہی ممی کا ایکسیڈنٹ نہ ہو جاتا تو تب...... میں یقیناً ان حالات سے دوچار نہ ہوتی!"

خیالات کی یلغار سے چونک کر اس نے دھیان دیا تو بھائی اس کے قریب کھڑے بہت غور سے اس کے چہرے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ وہ حیرت و پریشانی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اچانک وہ اس کے قریب بیٹھ گئے اور شفقت سے پوچھا۔

"ہماری ناز بیٹا ہم سے خفا ہے کیا؟"

نازش شرمندہ ہو گئی۔ کچھ بول نہ پائی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد وہ خود ہی رنجیدہ آواز میں بولے۔

"ناز! خدا گواہ ہے کہ ممی کی بے وقت جدائی کے بعد تم مجھے دونوں بچوں سے زیادہ عزیز ہو گئی ہو۔ تمہاری بھابی بھی بیٹی کی کمی محسوس نہیں کرتیں لیکن...... آج اتنے دنوں کے بعد بھی بسا اوقات تم اس قدر افسردہ اور خاموش لگتی ہو کہ...... مجھے لگتا ہے جیسے ہماری چاہتوں میں کمی رہ گئی ہے۔"

پھر ذرا تھم کر اضافہ کیا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"سعدیہ نے جانے سے پہلے مجھ سے کچھ باتیں کی تھیں۔ ان کی روشنی میں، میں نے بہتر سمجھا کہ تم سے خود مخاطب ہو کر کچھ کہوں۔ بیٹا! اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا کہ تم میرے لئے بوجھ قطعی نہیں ہو۔ تمہاری رضامندی کے بغیر میں بھی کوئی اقدام کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ تم اپنے بھائی کو کم فہم اور تاریک ذہن مت سمجھنا۔ ہاں، یہ جلد بازی ضرور سرزد ہوئی ہے کہ تمہارے بہتر مستقبل کے حوالے سے تمہاری بھابی کو تمہیں آمادہ کرنے کے لئے کئی دفعہ کہہ چکا ہوں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جب سے ممی اچانک بچھڑی ہیں، زندگی کی بے ثباتی نے بہت حساس بنا دیا ہے اور مجھے انسانی زندگی اور موت میں برائے نام فرق محسوس ہوتا ہے۔"

"بھائی جان......!" نازش بے تابی سے رونے لگی۔ "ممی کے بعد سے مجھے بھی یوں محسوس ہوا کرتا ہے جیسے میرا سارا اعتماد کہیں کھو گیا ہے ورنہ...... دوسرا کوئی سبب نہیں۔"

اس کے رونے کی آواز سن کر بھابی بھی آ گئی تھیں۔ پچکار کر بولیں۔

"تم بے فکر رہو نازش! سعدیہ بھی تمہارے بھائی جان کو سمجھا کر گئی ہے۔ جب تک تم ذہنی طور سے خود مطمئن نہ ہو، شادی کا مسئلہ کوئی نہیں اٹھائے گا۔"

آج دونوں بہن بھائی نے پہلی بار اس موضوع پر رو برو بات کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے توجہ اور غور سے اس کا موقف سنا تھا۔ انہیں اپنی بہن کی معصومیت اور سچائی پر مکمل بھروسہ تھا۔

انہوں نے بہت کچھ سوچ کر محبت سے اس کے بھیگے بھیگے رخسار تھپتھپائے پھر فیصلہ کن انداز میں کہنے لگے۔

"تمہاری بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر ایک بات ہے، تم سارا دن بور ہوتی ہو۔ تمہیں مصروفیت کے لئے اپنی پسند کا کوئی مشغلہ اختیار کرنا چاہئے۔"

Famous Urdu Novels

نازش ان کا مشورہ سن کر [illegible] پھر حیرت اور مسرت سے بھابی کی طرف دیکھنے لگی۔ جواباً بھابی نے بھی اسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ "کہو کیسی پٹی پڑھائی ہم نے؟"

Free pdf Library

ڈاکٹر حنان نے از خود اس کی رہنمائی کی اور سنجیدگی سے بولے۔

"میرا خیال ہے تم فرخ کا سینٹر باقاعدہ جوائن کر لو۔ وہ پہلے بھی تو تمہاری تصاویر چیک کر چکا ہے۔ تم مصوری میں دلچسپی بھی لیتی رہی ہو۔ اس نے اچھے پیمانے پر سینٹر کھول رکھا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہاں دو تین مشہور مصور باقاعدہ کلاسز لیتے ہیں بلکہ اس ادارے میں گڑیا سازی بھی سکھائی جاتی ہے۔"

وہ چند منٹ سر جھکائے سوچتی رہی، پھر سعادت مندی سے بولی۔ "ٹھیک ہے...... میں مصوری کی کلاسز اٹینڈ کروں گی۔ مجھے شوق بھی ہے۔"

"ویری گڈ!" انہوں نے خوش ہو کر اسے لپٹا لیا اور شفقت سے لبریز لہجے میں بولے۔ "مجھے تمہارا فیصلہ پسند آیا۔ اس طرح فارغ رہنے کا زیادہ موقع ملے گا نہ تم خود سے الجھو گی۔ مصروفیت کسی بھی انسان کے لئے بہت ضروری اور سودمند ہوتی ہے۔ اس سے وہ خوش رہتا بلکہ خوشیاں بانٹ سکتا ہے۔ غیر ضروری تفکرات سے دامن بچا رہتا ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ مشغلہ اس کا من پسند اور کارآمد ہو تاکہ صحیح معنوں میں طبیعت مائل رہے۔ اس سلسلے میں، میں فرخ کو بھی الرٹ کر دوں گا۔ وہ تم سے بہت تعاون کرے گا۔ ویسے بھی وہ بہت ہمدرد، مخلص اور مددگار قسم کا بندہ ہے۔ بلکہ اپنے تو فیملی ممبر کی طرح سے ہے۔ تم بھی اس سے واقف اور مانوس ہو۔ یہ امر میرے لئے باعث تقویت رہے

گی۔ اور ہاں! آئندہ میں تمہیں بور اور اداس صورت بنائے گھومتے نہ پاؤں۔"

✻●✻

کجھ اُنج وی راہواں اوکھیاں سن
کجھ گل وچ غم دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوک وی ظالم سن
کجھ مینوں مرن دا شوق وی سی

مرگھٹ پر ہو کا عالم طاری تھا۔

اندھیرا خوب گہرا ہو گیا تھا۔ ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ اونچے اونچے شیشم کے درختوں کی اوٹ میں کسی زمانے کے بنے ہوئے چند ایک کچے مکان اب نہایت خستہ اور اجاڑ حالت میں ویران پڑے تھے۔ ان کے تھوڑی دور سمادھی تھی جہاں گیدڑوں نے ہولناک بھٹ بنا رکھے تھے۔ در و دیوار پر مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تانے ہوئے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے صحن میں خودرو جھاڑ جھنکاڑ اگ آیا تھا۔

کوٹھڑیوں کے آگے ایک چھپر بھی تھا۔

پیپل کے ایک بلند و بالا گھنے پیڑ کے نیچے ایک بڑا کشادہ سا چبوترہ تھا جو پکا پختہ ہونے کی وجہ سے اب تک قدرے بہتر حالت میں تھا۔ بہت پہلے اس چبوترے پر مرنے والوں کی ارتھیاں لا کر رکھی جاتی تھیں مگر اب طویل عرصے سے یہ استعمال نہ ہونے کے سبب بالکل ویران اور سنسان ہو گیا تھا۔ عام گزرگاہ سے ہٹا ہوا ہونے کی وجہ سے کوئی ان اطراف آتا بھی نہ تھا۔

مرگھٹ تک آ جانے کے بعد وہ بے خوفی سے دندناتا اندر گھستا چلا گیا اور سیدھا سمادھی کے قریب سے گزرتا ہوا چبوترے تک [illegible] لوٹ آیا اور بے تابی سے باہر ٹہلنے لگا۔

Famous Urdu Novels

مرگھٹ اچھے خاصے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ دن میں بھی ہر سمت خاک دھول اڑا کرتی تھی۔ اس کے اندر گھسنے کا ایک ہی دروازہ تھا جہاں وہ کھڑا تھا۔ اس ویران جگہ اور ہیبت ناک ماحول بنانے میں معمولی اعصاب کے مالک شخص کا پتہ پانی ہو جاتا۔ مگر وہ ڈر و خوف کے احساس سے بے نیاز تھا۔ ان اطراف میں سب سے زیادہ خوف و ہراس وحشی گیدڑ پھیلاتے جو ہر شام ہی غول کے غول ادھر ادھر منڈلانے لگتے اور جب جی چاہتا اپنی تھوتھنیاں آسمان کی طرف اٹھا کر زور زور سے "ہو، ہو...... ہو" کا ہولناک رونا مچا دیتے۔

Free pdf Library

لمحہ بہ لمحہ رات کالی اور سنسان ہوتی جا رہی تھی۔ تیز ہوا رہ رہ کر پتوں میں سرسرا سرسرا کر چل رہی تھی جیسے سرگوشی میں کچھ کہہ رہی ہو۔

خاصی دیر انتظار کے بعد اس کا انتظار مایوسی میں بدل گیا۔ اب اسے انتظار کا جگنو تھامے دوسرے مقررہ مقام تک کا سفر کرنا تھا۔ آس اور امید کا لو دیتا چراغ روشن تھا اور وہ اس کی چمکیلی روشنی میں درختوں کے بیچ گھپ اندھیرے میں چلنے لگا۔ لگ بھگ پچاس ساٹھ گز کا راستہ ناپنے کے بعد وہ ٹھٹکا۔ شاید کوئی بے معلوم سی چاپ اس کے عقب میں کہیں چل رہی تھی۔ اس نے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ گھوم کر دیکھا۔

دور تک سناٹے کا راج تھا۔ جنگل کا رستہ ویران اور تنہا تھا۔ وہ مضبوط قدموں سے پھر آگے

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

بڑھنے لگا۔ سوکھے پتے پیروں کے نیچے چرمرا رہے تھے۔ ہوا کا جھونکا آتا، گہری خاموشی میں زرد پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی۔ مگر اب وہ ٹھہرا نہ ٹھٹکا بلکہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔

پہر رات بیت گئی تھی۔ اندھیرا اور ویرانی بڑھ گئی تھی۔

وہ بستی کے باہر باہر سے ہوتا ہوا ایک لمبا چکر کاٹ کر مہر ولی کے مزار کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اندر مزار کی اونچے اونچے میناروں والی مسجد میں ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔

وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر کا جائزہ لیتا ہوا ہرے بھرے لہراتے کھیتوں کی طرف بڑھا۔ آس پاس کوئی تھا نہیں۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ سے رستہ گزرتا تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدموں پہ پر چلنے لگا۔ اچانک اس کی سماعت سے کسی کے ہنسنے کی آواز ٹکرائی۔ ساتھ ہی چند ملی جلی مردانہ آوازوں میں باتیں بھی سنائی دیں۔

چند لمحوں کے لئے وہ سن سا کھڑا رہ گیا۔

دیکھ لئے جانے سے زیادہ پہچان لئے جانے کا خدشہ ہولناک ہوتا ہے۔ اب اسے اپنے آس پاس منڈلاتے والے خطرے کا احساس بڑی شدت سے ہوا۔ اس طرف سے آگے جانے کی گنجائش بالکل نہ تھی۔ وہ مزید وقت ضائع کئے بغیر تیزی سے واپس پلٹا اور جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے دبے دبے پاؤں چلتا ہوا کھیتوں سے نکل گیا۔

وہ چار راستے بدل بدل کر بالآخر وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ آنکھیں کسی اندرونی خوشی کی جوت سے جگمگانے لگیں۔

یہ جگہ ایک قدرتی چراگاہ تھی جو عرف عام میں جوہ کہلاتی ہے۔ جوہ میں جگہ جگہ قسم قسم کے درخت تھے۔ نیم، کیکر، پیپل اور بیری کے پیڑوں کی بہتات تھی۔ یہاں سب چارہ، گھاس پھوس، جھاڑ جھنکاڑ خوب ہونے کے سبب چرواہے اپنے ڈھوروں ڈنگروں کو چرانے لاتے اور اپنے مویشیوں کے ساتھ دن کا بیشتر حصہ گزارتے تھے۔ جوہ تمام دن انسانوں اور جانوروں کے دم سے آباد رہتا مگر رات کے اوقات میں ویران رہتا۔ جھینگروں کی آوازوں اور درختوں کی شاخوں سے الٹے لٹکے چمگادڑوں کے سوا غروب آفتاب کے بعد جوہ میں کچھ بھی باقی نہ رہتا تھا چنانچہ اس وقت بھی گہرے سناٹوں کا راج تھا۔

وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا جوہ میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہو کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ جس کی آس پر اتنا بڑا کام تھا، کوفت اٹھائی تھی وہ گوہر مقصود ناپید تھا۔ وہ دوڑ کر برگد کے نیچے گیا۔ بھاگ بھاگ کر جوہ کے ہر گوشے میں جھانک لیا مگر اس کی بے قراری اور بے تابی کا مثبت جواب کہیں سے بھی موصول نہ ہوا۔ مایوسی اور نامرادی نے اس کی رومانی اور دلی خوشی کے کلیجے میں اپنے نوکدار پنجے گاڑ ڈالے تھے۔

درد فرقت کا گاڑھا گاڑھا دھواں چاروں جانب پھیل گیا۔ روح کی گہرائیوں میں کچھ کھو دینے کا احساس جلتے انگاروں کی طرح دہک اٹھا۔ کالی رات مزید سیاہ ہو کر اس کے چاروں جانب پھیل گئی، بکھر گئی۔ جدائیوں کی پیاس ناقابل برداشت ہوتی چلی گئی اور وہ بے قرار ہو کر جوہ میں ادھر سے ادھر ٹہلتے ٹہلتے سرس اور فراش کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے ٹھہر گیا۔

درختوں کے اس جھنڈ سے ملے ہوئے شہتوت کے دو چھوٹے چھوٹے قد والے گھنیرے اور خوبصورت پیڑ ایک دوسرے سے گویا جڑے کھڑے تھے۔ ان کی گھنیری چھاؤں میں ایک اونچا سا چکنا پتھر پڑا تھا۔ وہ ایک آہ بھر کر وہیں بیٹھ گیا۔ روح سے دکھوں کا جوار بھاٹا سر پھری لہروں کی طرح اٹھا

اور اس کے دل و نگاہ کو جل تھل کر گیا۔

چاند کی آخری تاریخیں ہونے کی وجہ سے آسمان یہاں سے وہاں تک روپہلی نقرئی کرنوں سے محروم تھا۔ ہاں، رات کے آنگن میں ستاروں کے کنول ضرور جھلملا اٹھے تھے جن کی مدھم روشنیوں میں اردگرد کے مناظر دھندلے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان پر تاروں کی برات اتر آئی تھی مگر اس کا دل خالی تھا۔ رات کے اس سمے جب وہ حرماں نصیب آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو کی طرح شہتوتوں کی گھنیری چھاؤں تلے سر جھکائے بیٹھا تھا، اس کے جلتے ہوئے دل و دماغ رقص کرتے ہوئے لمحوں میں کہیں سے کہیں جا پہنچے اور وہ ہمہ تن گوش ہو کر بھولی بسری سی سرگوشی سننے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک پرشوخ سی آواز نے پل بھر میں اس کا احاطہ کر لیا۔

یہی جوہ تھا اور یہی فضا۔ یہی شہتوتوں کی دھوپ چھاؤں تھی اور وہ حسین سرگوشی۔ شوخی تھی، تجسس تھا اور شرارت۔

توتاں دی چھاں ہووے
اپنا گراں ہووے
وان دی منجی ہووے
سر تھلے بانہہ ہووے

اور وہ معلوم نہیں کتنے جتن سے اس خوبصورت پنجابی شاعری کا ترجمہ سمجھ سکا تھا۔ اس معصوم سی خواہش نے اس کا دل موہ لیا تھا۔

اے کاش! شہتوت کے درختوں کی چھاؤں ہو
اپنا گاؤں ہو
بان کی چارپائی ہو
اور سر کے نیچے بانہہ ہو

وہ اس ساحر لہجے سے کئی دن مسحور رہا تھا۔

یاد کرتے کرتے اس کے دل میں ہوک سی اٹھی اور وہ ایک مرتبہ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے چلتا ہوا جوہ سے نکل آیا۔ اب اس کا رخ دوبارہ بستی مہر ولی کی طرف تھا۔ دل میں کچھ اور ہی ٹھان چکا تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔

جس پر وہ چل رہا تھا وہ گلیارہ نیم پختہ سا تھا۔ زیادہ کشادہ نہ تھا۔ گلیارے کے دونوں جانب گھنے درخت تھے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا رہا۔

کافی دور تک آگے جانے کے بعد درختوں کی اوٹ سے ہلکی ہلکی روشنی کے آثار کہیں کہیں سے ٹمٹماتے دکھائی دینے لگے۔ وہ اسی طرف بڑھتا گیا۔ وہ ایک بار پھر بستی مہر ولی کے مزار کی پشت پر آ نکلا تھا مگر اس بار اس نے مزار سے دور جانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اس کی چوکنا نگاہوں کا ہدف مزار کے عقب میں بنا ہوا ایک چھوٹا سا کچا مکان تھا۔

مکان کی دیوار کے سائے میں وہ ٹھہر گیا اور تیز نظروں سے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک ہی درختوں کے سائے سے دو قد آور کتے تیزی سے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے نکلے اور زور زور سے بھونکتے ہوئے اسی پر جھپٹ پڑے۔ وہ بری طرح غرا رہے تھے۔ دانت نکال رہے تھے۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

وہ سراسیمہ ہو کر سرپٹ بھاگا۔

ان کے نرغے سے بچنے کے لیے قریب کچھ بھی نہیں تھا جس سے اپنا بچاؤ کر سکتا۔ بس پلک جھپکنے میں اسے مکان کی دیوار تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ اس نے پوری ہمت بروئے کار لا کر اپنا جسم اچھالا اور کچی دیوار پھاند کر اندر جانے میں کامیاب ہو گیا۔ کتے دیوار کے باہر مسلسل بھونک رہے تھے۔ غرا رہے تھے۔

جس منصوبے پر وہ اتنی دور سے چلتا غور کرتا چلا آ رہا تھا، کتوں نے ایک منٹ کے اندر اندر اسے ممکن بنا ڈالا تھا اور وہ بالآخر گھر کے اندر اسے پہنچا کر دوبارہ لڑنا جھگڑنا شروع ہو گئے تھے۔ انسان تو ان کی دسترس سے نکل بھاگا تھا مگر اب وہ آپس میں ایک دوسرے کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ انتہائی حساس موقع ہونے کے باوجود وہ دل میں کتوں کا شکر گزار تھا۔ گھر کی چار دیواری میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ سائے میں کھڑا کافی دیر تک سن گن لیتا رہا اور چوکنا ہو کر چاروں طرف دیکھتا رہا۔

اول تو کتے مسلسل بھونکے چلے جا رہے تھے اور دیوار کے عقب سے ٹلنے کا نام نہ لے رہے تھے جس سے کسی کے متوجہ ہو جانے کا خدشہ برابر سر کے اوپر منڈلا رہا تھا۔ تاہم وہ دیوار کے سائے میں اسی سے چپکا کھڑا رہا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ آج ہتھیلی پر سر رکھ لیا تھا۔

کافی دیر کے انتظار کے بعد کتے تھمے تو اس کی جان میں جان آئی۔ ورنہ کتوں نے شاید اس کے خلاف ایکا کر لیا تھا اور ایک کے بعد ایک سارے جمع ہو گئے تھے۔ لیکن لڑتے جھگڑتے کسی دوسری طرف نکل گئے۔

گھر میں صحن کے ایک طرف چھوٹا سا باورچی خانہ بنا ہوا تھا جہاں اس وقت چراغ جل رہا تھا اور جہاں سے روشنی نظر آ رہی تھی۔

وہ بلی کی طرح دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا اسی طرف چلا۔ جنگلوں ویرانوں میں تو وہ بے دھڑک، بے خوف و خطر گھوم رہا تھا مگر اب ایک انسانی گھر میں داخل ہونے کے بعد دل سینے میں معمول سے زیادہ دھڑک رہا تھا۔

وہ باورچی خانے کے قریب پہنچا۔ جھک کر اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دھیرے سے اندر داخل ہو گیا۔ چولہا سرخ سرخ انگاروں سے بھرا ہوا تھا۔ باورچی خانے کی فضا خوب گرم ہو رہی تھی۔ چولہے کے پیچھے اوپلے میں آگ کی تپش پہنچ رہی تھی جہاں بڑی سی کڑھی میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ تبھی آہٹ ہوئی۔ ڈھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ کوئی اسی طرف آ رہا تھا۔

وہ پلک جھپکنے میں دیوار سے چپک گیا۔

باورچی خانے کے اندر داخل ہونے والی ایک نوجوان، دلربا سی لڑکی تھی۔ ابھری ابھری سیاہ معصوم آنکھوں اور سبک نقش و نگار والی۔ اس کا کھلتا ہوا چمپئی رنگ چراغ کی روشنی میں جھلک رہا تھا۔ غیر متوقع طور پر اسے پا کر وہ کھل اٹھا۔ ساری کلفت بھاپ بن کر اڑ گئی۔

"رسیلی......"

اس نے والہانہ سرگوشی کی اور ایک سرکش لہر کی طرح اس کی طرف بڑھا۔ رسیلی نے بھی نظر بھر کر دیکھا۔

عین اسی وقت صحن میں آہٹ ابھری۔ باہر کا دروازہ چرچرایا۔ کوئی بھاری بھاری بوٹ پہنے اندر داخل ہوا۔ کواڑ بھیڑ کر وہ اپنے قدموں سے دھمک پیدا کرتا ہوا سیدھا باورچی خانے تک آیا مگر پھر

وہیں تھم گیا۔ اپنی رائفل کا بٹ اس نے ٹھک کر کے دیوار سے ٹکایا اور باورچی خانے میں منہ ڈال کر کھردرے لہجے میں ڈپٹ کر بولا۔

"روٹی ٹکر لا جھلی ناں۔ بڑے زور کی بھکھ ہے۔"

آنگن کی دھندلی روشنی میں وہ ایک قد آور شخصیت کا مالک نظر آ رہا تھا۔ لہجہ تند اور انداز تند ترین تھا۔ وہاں سے ہٹ کر زمین دھمکاتا اندر بڑھ گیا۔

باورچی خانے میں یہ دونوں دم سادھے کھڑے تھے۔

ایک ساکت تھا دوسری نڈھال...... قیامت ان سے بال برابر دور تھی۔

"رسیلی!" اس نے سرگوشی میں پکارا۔ آنکھوں میں چراغوں کی جھلملاہٹ تھی۔

"ششش......" رسیلی نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ آنکھوں میں خوف اور گھبراہٹ تھی۔ چراغ اور انگاروں کی روشنی میں دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"تو لائی نہیں روٹی شوٹی؟" اندر جانے والا زور سے دھاڑا۔

"لے آئی ویرا...... بس آئی۔"

رسیلی نے برق رفتاری سے کھانا نکالتے ہوئے جواب دیا مگر دیر ہو چکی تھی۔ وہ دھاڑتا ہوا سر پر پہنچ چکا تھا۔

"سو رہی پئی اے جھلی کر...... جیوں ویرا ہو گئی۔" وہ دانت پیستا ہوا دونوں کے درمیان حائل ہو چکا تھا۔

پھر سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔

دونوں نے ایک ساتھ ہی ایک دوسرے کا سایہ دیکھا۔ ایک ساتھ ہی ایک دوسرے پر جھپٹے۔ رسیلی اور روٹی شوٹی درمیان میں ہی رہ گئی۔

فرار ہونے والے کو دروازہ کھلا مل گیا تھا۔ مگر دوسرا بھی رائفل اٹھانا نہ بھولا تھا۔ کچھ دیر قبل جہاں کتے ایک دوسرے کو جھنجھوڑ رہے تھے وہاں دو انسان ایک دوسرے کے تعاقب میں بگٹٹ بھاگے جا رہے تھے۔ ان کے قدموں کی دھمک سے رات کا سناٹا مجروح ہو رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے پر بھاری تھے۔ برابر کی چوٹ تھی۔ سوکھے پتے پیروں کے نیچے آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آیا، سامنے سے کسی نے بندوق سے باڑھ مار دی۔

گولیاں چیختی چلاتی ہوئی چلیں......

وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ آناً فاناً کچھ ہو گیا تھا۔

❖❖○❖❖

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی۔

گولیاں ایک سنانے کی آواز سے عین اس کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ شاں...... شاں...... کے سوا دوسری کوئی آواز نہ تھی۔

وہ ساکت، سانس روکے زمین بوس رہا۔ اس لیے موت ہر طرف منڈلا رہی تھی۔ فرار کا کوئی راستہ نہ رہا تھا۔ سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ کوئی اس کے جسم کے کسی حصے کو چھید چکی ہے یا نہیں! بس گولیوں کی سنسناہٹ میں اتنا ہوش تھا کہ ابھی وہ زندہ ہے۔ آج وہ بری طرح گولیوں کے نرغے میں پھنس کر بے بس ہو چکا تھا۔

کئی لمحے اسی صورت گزر گئے۔

وہ دم سادھے پڑا رہا۔ اس وقت معمولی سی جنبش بھی خطرے سے خالی نہ تھی۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ فائرنگ نے اپنا رخ بدل لیا ہے۔ اس نے متجسس ہو کر لیٹے لیٹے ہی اپنے چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کے بالکل سامنے پانچ سات گز کے فاصلے پر ایک گھنی جھاڑی تھی۔ اس سے آگے برساتی نالہ تھا [illegible] اس کے دونوں کناروں پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ گھنی گھنی، اونچی اونچی۔ معاً اس کی چوکنا نظریں پہلی جھاڑی پر ٹھٹک کر تھم گئیں۔ اسے جھاڑی میں ایک موہوم سی سفید پرچھائیں سی ہلتی دکھائی دی۔ اسی وقت اسے اپنے بہت قریب بھاری بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔

کوئی زور سے بھاری بھرکم آواز میں چیخا۔

"دیکھو! بھاگنے کی کوشش نہ کرنا...... ٹھہر جا...... ورنہ گولی چلا دوں گا۔"

گولی کی سرسراہٹ سے اس کے کان جھنجھنا اٹھے۔

کوئی اس کے قریب سے دوڑتا ہوا نکل گیا اور شاید بھاگنے والے کی نظریں اپنے شکار سے ہٹنا نہیں چاہتی تھیں جبھی نیچے نظر ڈالنے کی غلطی نہیں کی۔

وہ بدحواس ہو کر مزید زمین سے چپک گیا۔ خطرہ بالکل سر پر تنا کھڑا تھا۔ دوڑنے کی آوازیں رفتہ رفتہ دور ہوتی گئیں۔ پھر ختم ہو گئیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد دوسری طرف سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ صورت حال کچھ کچھ اس پر واضح ہونے لگی۔

بات رفتہ رفتہ ٹھہرے ہوئے حواس میں آنے لگی۔ اس نے قدرے پرسکون ہو کر سوچنا چاہا۔

شاید...... یہ پولیس اور چوروں کا مقابلہ ہے۔ کوئی دوسری واردات لگ رہی ہے۔

مگر یہ اس کی سمجھ میں پھر بھی نہ آ سکا کہ وہ خود کیا کرے؟ کس طرف سے نکل بھاگنے کی کوشش کرے؟ حتیٰ کہ ہتھیلیوں کے بل اٹھ کر بھی اردگرد کا جائزہ نہ لے سکتا تھا۔ کوئی خود اس کا بھی تو پیچھا کر

رہا تھا جو معلوم نہیں کدھر رہ گیا تھا!

یہاں ٹھہرنا بھی خطرناک تھا۔ آوازیں دور و نزدیک ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ معلوم نہیں کس گولی کی نوک پر اس کا نام لکھا ہو!

آج تو بچ بچ اس کی ناک بندی ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے محسوس کیا کہ فائرنگ کا سلسلہ برساتی نالے کے آس پاس میں سمٹ گیا ہے۔

اس نے چوکنا نظروں سے ہر طرف دیکھا اور پھر کروٹیں بدل بدل کر اپنے بائیں طرف دکھائی دینے والے درختوں کے جھنڈ کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔ اپنے اس عمل کے ساتھ ساتھ اس کی متلاشی نگاہیں دور دور تک کا جائزہ بھی مسلسل لے رہی تھیں۔ ان لمحات میں اس کی پوری حیات بیدار تھیں۔ وہ فائرنگ کی زد سے خود کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کر لینا چاہ رہا تھا۔ درختوں تلے گھپ اندھیرا تھا۔ یہ روپوش ہونے کی بہترین پناہ گاہ تھی۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ تھم گیا اور اپنے پیچھے مڑ کر اپنے عقب میں گہری نظر سے بغور دیکھنے لگا۔ اسے سخت حیرت ہوئی۔ پیچھے دور تک راہیں سونی پڑی تھیں۔ اب آسمانوں سے کہرا گرنے لگا تھا۔ کہرا غبار سا چھانے لگا تھا ہر طرف۔ چمکتے ستاروں کی روشنی بہت دھیمی دھیمی اور دھندلی پڑ گئی تھی۔ ہوائیں اور فضائیں دونوں ہی [illegible] سی لگ رہی تھیں۔ برساتی نالے کی طرف سے گولیوں کی آوازیں اب رک رک کر آ رہی تھیں۔

اس نے عقب سے مطمئن ہو کر ایک دفعہ پھر سرکنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ رفتار پہلے سے زیادہ تیز تھی۔ بالآخر وہ درختوں کے گہرے اندھیرے میں چھپنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب وہ فائرنگ کی زد سے باہر تھا۔ بظاہر محفوظ تھا مگر دل پھر بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر وہ وہیں دبکا رہا۔ پھر کسی طرف کی آہٹ لیتا رہا۔ [illegible] مسلسل لوٹنے سے جگہ جگہ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ کہیں کہیں سے تو خون بھی رسنے لگا تھا۔ مگر اس وقت اس کا احساس کیا کرنا۔ وہ اس طرف سے قطعی بے پروا تھا۔ اس وقت تو اس کی سب سے بڑی ضرورت اور کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح جلد از جلد اس خطرناک مقام سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

بالآخر وہ درختوں اور جھاڑیوں میں چھپتا چھپاتا آگے بڑھتا۔ پولیس پارٹی کی چاپیں برابر اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ کبھی قریب آ جاتیں، کبھی دور چلی جاتیں۔ زوردار معرکہ سرگرم تھا۔ کئی منٹ تک وہ اسی صورت جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ وہ بار بار راستے تبدیل کر رہا تھا۔ کہیں رفتار سست کر دیتا تو کہیں تیز تر۔ کہیں کسی جھاڑی کی آڑ میں دبک جاتا۔ کبھی چوکنا ہو کر ہمہ تن گوش بن جاتا۔ ان اطراف میں خاردار جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ تاہم وہ اندھیرے میں مکمل مل گیا تھا اور دیکھ لیے جانے کا اندیشہ کم ہو گیا تھا۔ خاردار جھاڑیوں کے باعث چھوٹی موٹی خراشیں لگتی جا رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسے مقام تک پہنچ گیا جہاں سے اس بستی کے مضافات میں بہنے والی نہر، نیم دائرہ بناتی ہوئی مشرق کی طرف گھوم گئی تھی۔

موڑ پر دائیں جانب ایک کھالا تھا۔ یہ پانی کی ایک کم پاٹ والی نالی تھی جو کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرتی ہوئی ان کھیتوں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ اس کے کنارے جو اور گندم کے کھیت لہلہا رہے تھے۔

وہ کھیتوں کے درمیان درمیان سے گزر کر نہر کے پل پر نمودار ہوا۔ چند ہی قدم پر آم کا ایک پرانا

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

اور گھنا باغ تھا جو رات کے اس پہر اندھیارے کی چادر اوڑھے ہوئے بہت پراسرار اور پرہیبت سا لگ رہا تھا۔ کسی پیڑ پر کوئی پناہ گزین پرندہ اپنے گھونسلے میں پر پھڑپھڑاتا تو نہ معلوم خوف کی ٹھنڈی لہر رگ و پے میں سرایت کر جاتی۔ ویسے آم کا موسم نہ ہونے کی وجہ سے باغ اجاڑ اور ویران پڑا تھا۔ نہ رکھوالی کرنے والے تھے نہ آم توڑنے والے۔ گھنے گھنے پیڑوں پر بال بکھیرے چڑیلوں کا گمان ہو رہا تھا۔ نہر کے کناروں سے نیچے بہنے والے پانی کی دھیمی سی آواز سنسان رات کے سکوت کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھی ورنہ ہر آہٹ ناپید تھی۔

وہ حتی الامکان دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا باغ کے دائیں کنارے لگی ہوئی کانٹوں کی باڑ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اس باڑ میں کہیں کہیں چھوٹے قد والے بیروں کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جن کے سیکڑوں کانٹوں اور ہرے ہرے پتوں کی اوٹ سے بے شمار سرخ سرخ پکے پکے بیر جھانک رہے تھے مگر آدھی رات کے سناٹوں میں کسے سدھ بدھ تھی غور کرنے کی!

کانٹوں کی باڑ کے ساتھ ساتھ گھومتا ہوا جیسے ہی وہ باغ کے دوسرے رخ پر پہنچا اس کی آنکھیں طمانیت آمیز چمک سے جھلملا اٹھیں۔

گھنیرے درختوں کے سائے میں اس کی گاڑی محفوظ حالت میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ سکون کا گہرا سانس بھر کر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھالتا اس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

%●%

سارے بچوں کے جلوس میں شرافت علی ہنستے مسکراتے، لدے پھندے گھر میں گھسے تو ایک دم خوشگوار سا ہنگامہ جاگ پڑا۔ خوش خوش بچوں کی آوازوں سے در و دیوار گونجنے لگے۔ ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ سب اپنی اپنی چیزیں نانی اور اماں کو دکھانے لگے۔ وہ بھی مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھیں۔

شرافت … مٹھائی کا ڈبہ … کی طرف بڑھاتے ہوئے … کو کہا۔ "… کو بچے۔"

نازیہ نے ڈبہ لینے سے قبل اماں بی کی طرف دیکھا۔ وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"ارے بیٹے...... یہ کیوں لے آئے؟...... تمہاری بھی فضول خرچی کی عادت نہیں جاتی۔ بھلا اتنے بڑے ڈبے کی کیا ضرورت تھی؟ شرافت علی … ہیں کب عقل سیکھو گے؟ ابھی کل تو ملتان کا سوہن حلوہ کھلایا ہے سب کو تم نے۔"

"ارے کچھ نہیں ہے بجی بی!" انہوں نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ "جان ہے تو جہان ہے۔ وہ بے نیاز اوپر بیٹھا ہے، ان داتا دینے والا۔ بانٹنے والا۔ کھلانے والا...... ہم کیا اور ہماری ہستی کیا؟ وہی بخشے تو ہم کیوں نہ کھائیں۔"

معطر بھی سامنے بیٹھی ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ آج خلاف معمول ماتھے کے بل غائب تھے اور مسکرا بھی رہی تھی۔

شرافت علی، معطر کے میاں پرسوں رات کی گاڑی سے یہاں پہنچے تھے۔ گو کہ یہاں آ کر انہوں نے اماں بی کے خط کا تذکرہ نہیں کیا تھا تاہم وہ آئے تھے اسی کے خط کے جواب میں۔ اماں بی نے جو خط ان کی والدہ کے نام لکھا تھا اسے پڑھ کر والدہ نے انہیں فوراً معطر کی خیر صلاح کے لئے روانہ کر دیا تھا اور جلد ہی خود بھی آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اگلے چند روز میں ان کی آمد متوقع تھی۔

نئی بوا چائے کی ٹرے لے کر آ گئیں۔ نازیہ نے مٹھائی کا ڈبہ کھول کر طشتریوں میں مٹھائی نکالی۔ ساتھ میں خستہ نمک پارے بھی تھے۔ سب کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ نئی بوا کے ہاتھ اماں بی

نے کرائے داروں کے ہاں بھی مٹھائی بھجوائی۔

تھوڑی دیر میں اماں بی مغرب کی اذان سن کر نماز کے لئے اٹھ گئیں۔ نازیہ بھی وضو کر کے اندر چلی گئی۔ شرافت علی نے نیم دراز ہوتے ہوئے بیوی کو مخاطب کیا اور رسان سے بولے۔

"چلو جی۔ اب رخت سفر باندھ لو۔ بہت دن گزر گئے اپنا گھر بار اور شہر چھوڑے ہوئے۔ بہت دنوں آرام بھگت لیا تم نے۔"

معطر نے پان چباتے ہوئے تڑ سے جواب دیا۔ "تم کیوں جل گئے میرے آرام کرنے سے...... یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

شرافت نے مسکرا کر کہا۔ "نصیب کی بات ہے یا ڈھٹائی کی؟"

معطر نے فوراً تیوری چڑھائی اور جھٹ سوالیہ انداز اختیار کیا۔ "ڈھٹائی کیسی؟...... میں کیا تمہیں ڈھیٹ دکھائی دیتی ہوں؟...... کیوں بھلا؟"

شرافت نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "یہ...... ڈھٹائی نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلسل بس "میری چوکھٹ سے لگے بیٹھے ہیں" کی تصویر بنی بیٹھی ہو۔ کبھی سوچا کیا فرحت غریب کی شادی کو کتنے ماہ گزر گئے۔ اور سوال پر سوال اس طرح کر رہی ہو جیسے میں نے غلط بات کہہ دی۔"

وہ بگڑ کر بولی۔ "غلط...... سراسر غلط...... … ہے۔ اس لئے میری مرضی ہے کہ جب تک چاہوں، جتنا چاہوں رہوں۔ مجھے کون ہے روکنے ٹوکنے والا۔"

شرافت نے اس کا بگڑا لہجہ دیکھ کر … اختیار کی اور ملائمت سے کہا۔ "روک ٹوک کون کر رہا ہے؟...... اس میں بھی شک نہیں کہ … میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بس اپنے گھر بار کی بھی خبر لو۔ جب تمہیں ڈاکٹرنی نے … تصدیق کر دی تھی، تبھی مجھے خط لکھ دیا ہوتا۔"

وہ بھی چڑ گئی … جواب دیا۔

"کوئی نئی نرالی اطلاع تو نہیں تھی کہ تم کو خط لکھ کر بتاتی۔"

میاں نے ہمدردی جتائی۔ "اپنی حالت دیکھ رہی ہو۔ کیسی تباہ ہو رہی ہے میں تو تمہیں دیکھ کر ڈر ہی گیا تھا۔ اماں آ کر دیکھیں گی تو اور بھی زیادہ … ہوں گی۔ … کافی کمزور ہو رہی ہو۔ اس سے پہلے بھی ماشاء اللہ اتنے بچے ہوئے مگر یہ کیفیت نہیں ہوئی۔"

اس نے منہ پھیر کر خفگی سے جواب دیا۔ "مرد تو اپنی باگ جوت کر الگ ہو جاتا ہے۔ ساری اذیتوں سے تو عورت کو گزرنا پڑتا ہے۔ سو ہم بھی گزر ہی لیں گے۔ تمہیں کاہے کی پروا۔"

شرافت علی کو سخت غصہ آیا مگر صلح جو آدمی تھے۔ تحمل سے کہنے لگے۔ "تمہاری باتیں دنیا سے انوکھی ہیں۔ مرد کو اپنے بال بچوں کی پروا نہ ہوگی تو کیا پاس پڑوس کو ہوگی؟ وہ کماتا ہے تو اپنے اہل و عیال کے لئے۔ جس کا جو کام قدرت نے رکھ دیا ہے اسے وہی کرنا پڑتا ہے۔ قدرت کی مصلحتیں قدرت ہی جانے۔ بندہ کون ہے دخل دینے والا۔ میرا خیال ہے تم بہت کمزور ہو چکی ہو، اس لئے ہر بات کا تاریک پہلو زیادہ دیکھنے لگی ہو۔"

لیکن معطر نے میاں کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ کروٹ بدل کر خاموشی اختیار کر لی اور سوتی بن گئی۔

شرافت علی بھی اسی وقت طرح دے گئے۔

اماں بی نماز اور تسبیح سے فارغ ہو کر تخت پر پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ یہ بھی وہیں آ بیٹھے اور

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

فکرمندی سے کہنے لگے۔

"چچی بی! معطر تو بہت ہی کمزور ہو گئی ہے۔ کوئی خاص بات تو نہیں بتائی ڈاکٹرنی نے؟"

اماں بی نے ایک دبا ہوا سانس لے کر جواب دیا۔ "خون کی بہت کمی بتائی ہے۔ جو انجکشن اس نے بتائے وہ مسلسل لگ رہے ہیں۔ خاص طور سے تو کوئی بات یا مرض خدانخواستہ نہیں بتایا اس نے۔"

وہ کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے۔ اماں بی پان بنانے لگیں۔ پھر وہ جھجکتے ہوئے رک رک کر بولے۔ "اگر......... آپ کی اجازت ہو تو......... ملتان لے جاؤں سب کو؟......... اماں نے بھی یہی کہلا کر بھیجا ہے۔ شاید وہ خود بھی آجائیں آپ سے ملنے کے لئے۔"

اماں بی دل ہی دل میں مطمئن ہو کر بولیں۔ "بسر و چشم......... ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ آئیں ناصرہ آپا۔ ان کا اپنا گھر ہے۔ اور بھیا! جہاں تک تعلق ہے معطر کو لے جانے کا تو تمہیں کس نے روکا ہے؟ ماشاء اللہ تمہارا اپنا کنبہ ہے۔ جب جی چاہے لے جاؤ۔ بس ہنسی خوشی آؤ اور ہنسی خوشی جاؤ۔ بچیاں تو ہر کسی کی سسرال میں ہی رچتی بستی اچھی ہیں۔"

ان کے جواب سے شرافت علی کو بہت اطمینان حاصل ہوا اور مزید بولنے کی ہمت ہوئی۔ "معطر کی کمزوری اور سفر سے فکرمندی ہو رہی ہے۔ مگر اماں کے آجانے سے بہت تقویت مل جائے گی۔ معطر اور بچوں کے لئے سفر کے دوران سہولت رہے گی۔ ایک دوسرے کی مدد سے انشاء اللہ سفر با آسانی کٹ جائے گا۔"

اپنی بات پوری کر کے وہ [illegible] اماں کو بتا کر فرحت کے پاس اسٹور پر چلے گئے وقت گزاری کے لئے۔ وہ ایک چلتے پھرتے رہنے والے مستعد آدمی تھے۔ نکمے بے کام بیٹھے رہنا ان کی فطرت تھی نہ عادت۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے خوف کھاتے تھے اسی لئے سسرال میں آکر سستی کا شکار ہو جاتے تھے۔

رات میں وہ فرحت کے ساتھ ہی گھر میں گئے۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی کھانا کھایا۔ فرحت سارے دن کا تھکا ہوا تھا تاہم بہنوئی کے ادب اور خاطر میں بیٹھا باتیں کرتا رہا لیکن شرافت علی خود سمجھدار تھے۔ اس کی مروت اور آرام کی ضرورت سے واقف تھے خود ہی اٹھ کر معطر کی طرف آگئے۔

بچے سب سو چکے تھے۔ معطر لیٹی کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی مگر میاں کے آتے ہی ساکت ہو گئی۔ شرافت نے ایک دو بار پکار کر مطلب کا تذکرہ کرنا چاہا مگر اس نے مطلق ان کی حوصلہ افزائی نہ کی تو یہ بھی پڑ کر سو گئے۔

اگلے دو دن ایسی ہی کشمکش کی نذر ہو گئے۔

بالآخر جس روز اماں کے ملتان سے سوار ہو جانے کا ٹیلی گرام ملا اور رات کو انہیں لینے کے لئے اسٹیشن جانا تھا، شرافت علی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انہوں نے صبح کے ناشتے کے بعد ہی بیوی کو چھاپ لیا۔

معطر نے برآمدے میں پلنگ پر بیٹھے بیٹھے ناشتہ کیا تھا اور پان کی گلوری کلے میں داب کر دوبارہ لیٹنے کو تھی کہ شرافت علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اماں چار روز کے لئے آرہی ہیں۔ تم اپنی اور بچوں کی تیاری مکمل رکھو۔ آج سے پانچویں دن ہم سب ملتان روانہ ہو جائیں گے۔"

وہ پھٹ پڑی۔ "مجھے......... ملتان جانا ہے نہ ایران توران۔ مجھ پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔"

اس نے پہلا ہی جملہ ایسے توپ کے گولے کی طرح داغا تھا کہ سارے گھر نے بخوبی سنا۔ بے چارے شرافت اس کے کورے جواب پر ہکا بکا رہ گئے۔ چند لمحے تک ایک ہولناک سکوت طاری رہا پھر شرافت نے ہی سنبھالا لیا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے گویا ہوئے۔

"تم نے تو دھماکا کر ڈالا بھئی۔ ایسی بھی کیا زود رنجی؟"

"دھماکا......... زود رنجی........." وہ پان چبانا ترک کر کے انہیں گھورنے لگی، پھر بولی۔ "جو سچ تھا میں نے کہہ دیا۔ مانو نہ مانو، تمہاری مرضی۔"

شرافت ایک دفعہ پھر سناٹے میں رہ گئے۔ وہ ایسی ڈھٹائی اور بے ہودگی پر اتر آئے گی، انہیں گمان بھی نہ تھا۔ مگر اب مزید تحمل کی گنجائش نہ تھی۔ وہ بھی تیوری پر بل ڈال کر بولے۔

"بس بہت ہو چکی بیکار کی ضد۔ بحث سے کام مت لو تو زیادہ بہتر ہے۔"

معطر پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ نڈر لہجے میں بولی۔ "تم بھی دھمکی مت دو تو بہتر ہے۔ یہاں کوئی نہیں بیٹھا دب جانے والا۔"

انہوں نے زچ ہو کر پوچھا۔ "آخر کوئی سبب بھی ہو گا اس انکار کا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ برابر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ جواب نہ پا کر دوبارہ پوچھا۔

"وجہ بتاؤ ملتان نہ جانے کی۔ کیا ابھی مزید رہنا چاہ رہی ہو؟"

وہ بیزاری سے منہ بگاڑ کر بولی۔ "کہہ دیا نا، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

شرافت نے برجستہ کہا۔ "تم ٹھیک تھیں جب بھی انکاری تھیں۔"

وہ بدتمیزی کے ساتھ ایک انگلی اٹھا کر بولی۔ "مجھ سے بحث بازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بات تھی وہ میں نے بتا دی۔ اب یقین کرو نہ کرو سراسر تمہاری اپنی مرضی پر منحصر ہے۔"

وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ اماں بی دور تخت پر بیٹھی سب سن رہی تھیں مگر بظاہر پاندان میں الجھی ہوئی تھیں اور دل ہی دل میں ہول کھا رہی تھیں۔ بیٹی کی جہالت آمیز گفتگو اور وہ بھی اپنے شوہر سے، ان کی نظر میں ناقابل معافی تھی۔ وہ داماد کے حوصلے اور تحمل کو داد دے رہی تھیں۔ اس تمام کارروائی کا جواب نہایت منہ توڑ اور حوصلہ شکن بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ برابر مصالحانہ رویہ رکھے ہوئے تھے۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو قابل تعریف تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ کھنکار کر بولے۔

"بات کو طول دینے کا کچھ فائدہ نہیں۔ مختصر طور پر تم خود ہی بتا دو کہ کیوں جانا نہیں چاہ رہی ہو؟......... پچھلی دفعہ بھی تم نے یہی رٹ لگائی تھی، تاہم ضد پوری کر دی تھی مگر سوچو، اب تمہارا یہ مطالبہ کہاں تک درست ہے؟"

معطر نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "درست یا غلط تو میں جانتی نہیں لیکن تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی اس لئے بار بار یقین دلا رہی ہوں کہ میرا تمہارے ساتھ ملتان جانے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں ہے......... نہیں ہے۔"

مارے غصے اور کھسیاہٹ کے شرافت کا چہرہ تپ کر سیاہ پڑ گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ساس کی طرف چلے اور [illegible] بولے۔

"سن رہی ہیں چچی بی! آپ ان کی بے تکی راگنی؟"

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

انہوں نے بھی تپ کر جواب دیا۔ ”سن رہے ہیں۔ خوب سن رہے ہیں سب بے تکی باتیں۔“
شرافت نے دوبارہ فریادی لہجے میں کہا۔
”اگر ان کی حالت کے پیش نظر ہم نرمی اور مروت سے کام لے رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم کوئی گرے پڑے انسان ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی مسلسل ہتک اور توہین برداشت نہ کر سکیں۔ سمجھائیے ان کو۔“

حقیقت یہ ہے کہ خود اماں بی کو بھی اس پر تاؤ آ چکا تھا۔ وہ پائنچے سنبھالتی ہوئی تخت سے اٹھیں اور سیدھی بیٹی کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔

”اے معطر!“ انہوں نے بارعب انداز میں اسے نام لے کر پکارا۔ وہ جو نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ لیٹ چکی تھی، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور چندھی چندھی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ ان کے عقب میں شرافت کھڑے تھے۔

وہ جل بھن کر کباب ہو گئی۔ اماں بی دوسرے پلنگ پر بیٹھ کر ملامت سے بولیں۔
”تم نے یہ کیا شر پھیلا رکھا ہے؟...... بہت دیر سے تمہاری بکواس سن رہے ہیں۔ اپنا بدعامل کرتاؤ۔ لیکن آواز دھیمی رکھنا۔“

اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ فوراً پاؤں پلنگ سے نیچے اتار لیے اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے تنک کر بولی۔

”جب بولنے پر ہی پابندی لگا دی ہے تو اب کاہے کی گنجائش۔“

”اے خبردار!“ اماں بی خلاف عادت زور سے بولیں۔ ”اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرنا۔ آج ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرو...... اماں تم کیا چاہتی ہو...... گھر کو میدان جنگ بنانے کا ارادہ ترک کر دو۔“

وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ دھم سے بیٹھ گئی اور منہ لال کر کے شرافت سے بولی۔ ”اماں بی کو چاہے کتنا بھڑکا لو، جاؤں گی میں ہی نہیں تمہارے ساتھ۔“

اماں بی نے اس کے تخاطب پر گھوم کر دیکھا۔ شرافت خاموش کھڑے تھے۔ ان کی اتری صورت دیکھ کر وہ مزید تاؤ کھا گئیں۔ پوری قوت سے دھاڑیں۔

”چپ کم نصیب!...... زبان دراز لڑکی! آگے ایک حرف زبان سے مت نکالنا۔ تف تیری صورت پر اور خاندان پر۔ ہم پر، ہماری تہذیب پر بلکہ ہماری شرافت پر تھوک دیا تو نے...... کاش! ہماری کوکھ سے تو جنم ہی نہ لیتی!“

وہ خاموش ہوئیں تو پورے گھر پر سناٹا چھا گیا۔ ان کی ایسی زبردست پھٹکار سن کر شرافت علی تھرا کر رہ گئے تھے۔

معطر کی آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے شروع ہو گئے۔ کوئی جائے فرار نہ پا کر وہ زار و قطار رونے بیٹھ گئی مگر اماں بی بھی تن گئیں۔ متاثر ہوئے بغیر دوبارہ بولیں۔

”پہلے ہم نے تمہاری ساس سے کہہ سن کر مزید رہنے کی اجازت دلوا دی تھی۔ آج اللہ رکھے وہ پھر آنے کو ہیں مگر تمہاری سوئی اسی انکار پر اٹکی ہوئی ہے۔ اب ہم انہیں کیا جواب دیں گے؟ اگر تمہارا کوئی خاص مسئلہ ہے تو بتا کیوں نہیں دیتیں؟...... چلو فوراً بکو کیا چاہتی ہو؟“

مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ جواب دینے کی بجائے زور و شور سے روتی رہی۔ نفرت و کدورت،

غم و غصے کی آگ ان آنسوؤں سے سرد پڑنے کی بجائے مزید بھڑک رہی تھی۔ عداوت کے انگارے تن من جلا رہے تھے۔ حقیقت میں بھی اس کی طبیعت بہتر نہ تھی۔ فضول کی ضد اور جہالت نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ ہاتھ پیر سرد ہوتے ہوئے اکڑ گئے۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور اس پر غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

کرائے دار نیچ کے دروازے سے جھانک کر ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ حالانکہ وہ بھی معطر کی بد مزاجیوں کا ذائقہ چکھے ہوئے تھی مگر جی نہ مانا، لپک کر آ گئی۔ نازیہ سے، جس کا پریشانی اور ہول سے اپنا برا حال تھا، پانی منگوایا۔ معطر کے چہرے پر چھینٹے دیتے ہوئے اسے ہوشیار کرنے لگی اور اماں بی کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بس اب آپ چپ ہو جائیے۔ وقت اور حالات کو دیکھیے۔ یہ سب باتیں بعد کے لیے اٹھا رکھیے۔“

فرحت کا میڈیکل اسٹور قریب ہی واقع تھا۔ معطر کے کسی لڑکے نے ماں کی خرابی طبیعت کا وہاں جا کہا۔ وہ بے چارہ اسٹور لڑکے پر چھوڑ کر آندھی طوفان کی طرح بھاگا آیا۔ پریشانی سے برا حال تھا۔

بھائی کو روبرو پا کر وہ بالکل ہی ہاتھ سے جاتی رہی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر ایسی بلک بلک کر روئی کہ فرحت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گھر بھر میں سنسنی سی پھیل گئی۔ نئی بہو کام پر آ گئی تھیں اور باورچی خانے میں [illegible] چپکے چپکے سب کو دیکھ رہی تھیں۔

”آخر ہوا کیا؟...... مجھے بتائیے تو سہی!...... ڈاکٹر صاحب کو لاؤں؟“ وہ بوکھلا بوکھلا کر پوچھ رہا تھا مگر اس کے تسلی دلاسے اور استفسار سب بیکار جا رہے تھے۔ سب سراسیمہ کھڑے تھے اور خود معطر تھی کہ بے حساب روئے چلی جا رہی تھی۔

”اچھی بات ہے...... میں [illegible]“

وہ جانے کو مڑا۔ معطر نے اس کا دامن پکڑ لیا اور چلا کر بولی۔

”فرحت! میرے بھیا!...... مجھے بچا لو۔ یہ سب مجھے ملتان بھیجے دے رہے ہیں۔ مگر میں جانا نہیں چاہتی...... مجھے بچا لو......“

فرحت بھونچکا رہ گیا۔ وہ زار و قطار روئے چلی جا رہی تھی اور آنسوؤں کے ریلے میں دہائی دے رہی تھی۔

”میں یہاں سے نہیں جاؤں گی...... ہرگز نہیں جاؤں گی...... اس گھر میں میرے بیٹے کی روح آتی ہے...... وہ اسی گھر میں مرا تھا...... میرا بچہ...... میرا لعل...... میں اس کی قبر کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔ اگر تم نے مجھے نہ روکا تو گاڑی سے چھلانگ لگا کر مر جاؤں گی مگر ان ہواؤں، ان فضاؤں سے بھی جدا نہ ہوؤں گی جہاں میرے بچے کی خوشبو رچی بسی ہے......“

⁂

ہوا وہی جو دلاور حسین کہہ چکے تھے۔

فاخر کی شادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل چکی تھی۔

چھوٹا بڑا، کوئی فرد ایسا نہ باقی رہا تھا جو اس حقیقت سے آگاہ نہ ہو گیا ہو۔ اس دھماکا کی اطلاع نے ہر کسی کے ہوش و حواس خطا کر ڈالے تھے۔

لینے والوں نے ایکشن بھی بھرپور انداز میں لیا تھا۔

دلاور حسین فوراً ہی جلے پیر کی بلی کی طرح اپنی اہلیہ کے ساتھ آ دھمکے تھے اور حویلی میں وہ

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

دھما چوکڑی مچائی تھی۔ گھن گرج کے ساتھ اس اطلاع خاص پر تبصرے کیے گئے تھے کہ ان کے بے پناہ جوش و خروش اور غیض و غضب سے خود زمانی بیگم اور شگفتہ بھی دہل کر رہ گئیں اور فاخر کے خلاف اپنا غم و غصہ اور مخالفت کا شور و غل چھوڑ کر انہیں بہلانے بیٹھ گئی تھیں۔ لیکن وہ بھی اپنی ہٹ کے ایک ہی تھے۔ سب کے دلاسہ دلاتے دلاتے بھی سب کنبے کے بیچ بیٹھ کر فاخر اور شگوفہ کی نسبت ختم کر دینے کا اعلان نہایت دھڑلے سے کر گئے تھے۔

ابا میاں بے چاروں کو کچھ بولنے کا موقع ہی نہ مل پایا۔

بے حد شکست خوردگی سے سر جھکا کر رہ گئے تھے۔

کیا زمانی بیگم اور شگفتہ اور کیا بچی جان بھی دل تھام کر رہ گئے تھے۔ شاکر بھائی نے یہ خبر بلا تبصرہ سن لی تھی۔ باجی سرور کا ردعمل ناقابل شناخت رہا۔ ایک جمود سا طاری تھا ان کے حواس پر۔

دلاور صاحب جس برق رفتاری سے وارد ہوئے تھے اسی رفتار سے واپس لوٹ گئے تھے اور ایسا حویلی کی تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔ بقول شاعر

ذکر ہے جن حادثوں کے، سانس رکتی تھی بھی
وقت کی مجبوریوں میں سب گوارا ہو گئے

یہ سب کچھ اتنی غیر معمولی تیزی اور عجلت سے وقوع پذیر ہوا تھا کہ حویلی کے مکینوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ سما سکا سوائے اس کے کہ فاخر نے برا کیا۔

اور فاخر کی ذات پر اس روز [illegible] پوری طرح ثبت ہو کر رہ گئی جس روز دلاور صاحب نے بذات خود اطلاع دی کہ انہوں نے شگوفہ کی نسبت طے کر دی ہے اور رخصتی کے لیے ایک ماہ آگے کی تاریخ رکھ دی ہے۔

شگفتہ نے رو رو کر برا حال کر لیا۔

گھر کے دیگر افراد جس قدر اس کی تسلی کرنے کی کوشش کرتے، اس کے آنسو اتنی ہی روانی کے ساتھ بہتے۔ اندرونی ماحول میں گویا صف ماتم بچھی ہوئی تھی لیکن سب سے عجیب حال زمانی بیگم کا تھا۔

فاخر آج تو ان سے جدا نہ ہوا تھا۔ ابا میاں نے اسے اس کی تعلیمی ضروریات کے تحت بہت بچپن سے ان کی آغوش سے نکال کر شہر ہوسٹل کر ڈالا تھا۔ اس معاملے میں وہ ہمیشہ ان سے شاکی رہیں۔ پھر جوں جوں وقت آگے کی طرف بڑھتا گیا ابا میاں کے ساتھ ساتھ بیٹے سے بھی شاکی ہوتی چلی گئیں۔ حتیٰ کہ جب وہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا تو ان کی شکایت، بدظنی بالآخر بدگمانی، شدید ترین بدگمانی میں تبدیل ہو گئی تھی۔

فاخر کے خاموش اور الجھے الجھے رویے کو وہ شدید تنقید کی نظر سے دیکھنے کی عادی ہوتی گئیں۔ اس معاملے میں سرور باجی سے ان کی ایک سرد جنگ مستقل جاری و ساری رہتی۔ بسا اوقات طویل مباحثے میں تبدیل ہو جاتی۔ اور اب کوئی سال چھ ماہ سے زمانی بیگم اندر ہی اندر ایک عجیب سی کشمکش کا شکار رہنے لگی تھیں۔ ایک ایسی کشمکش اور الجھن، جس کو وہ لاکھ سمجھنے کے باوجود سمجھ لینے سے قاصر رہتی تھیں۔ کوئی گتھی تھی جسے وہ تنہائی میں بیٹھ کر گھنٹوں سلجھانے کی کوشش کرتیں مگر ناکام رہتیں۔ بعض اوقات جھنجلا اٹھتیں۔

فاخر جب یونیورسٹی سے آتا وہ پہلے سے زیادہ الجھا ہوا لگتا۔ ایسے میں اس کی ہمدرد اور غمگسار اس کی پھوپھی سرور جہاں ہوتیں۔ دونوں پھوپھی بھتیجا دن رات کے زیادہ اوقات میں ایک

ساتھ دکھائی دیتے اور جانے کون کون سے راز و نیاز میں مصروف رہتے۔

اس سلسلے میں کچھ کہہ دینا زمانی بیگم کے لیے قیامت ہو جاتا۔ سرور باجی ان کے لتے لے ڈالتیں۔ انہیں اپنی جان چھڑانا محال ہو جاتا۔

اسی زمانے میں فاخر شدید ملیریا کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ چنانچہ کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا والی بات ہو گئی۔ سرور باجی تو کیا، پورا گھر ہی اس کی ہمدردی اور شدید محبت میں گرفتار ہو گیا تھا تو بھلا زمانی بیگم تو ماں ہی تھیں۔ مگر ان کی چھٹی حس اس زمانے میں کچھ زیادہ ہی کرشمہ ساز ہو گئی تھی جس سے پریشان ہو کر انہوں نے بہت دفعہ چھپ چھپ کر پھوپھی بھتیجے کی گفتگو سننا چاہی تھی۔

اور تب مزید جھلاہٹ اور کوفت کا شکار ہو جاتیں۔

فاخر تنہائی میں نہایت دردناک آواز میں پھوپھی کو نت نئی شاعری سنا رہا ہوتا اور وہ شد و مد سے سر دھن رہی ہوتیں۔

بارہا کوششوں کے بعد بس اتنا ہی نتیجہ نکلتا۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ زمانی بیگم کے شکوک رفع تو ہو جاتے مگر وہ پوری طرح مطمئن نہ ہو پاتیں۔ اندر، کہیں دور...... بہت دور خطرے کا الارم بجتا رہتا اور مسلسل مضطرب رہتیں۔ لیکن پھر جیسے ہی یہ راز طشت از بام ہوا، سب سے پہلے زمانی بیگم ہی شانت ہو گئیں۔ یعنی اٹکی گنگا بہہ نکلی۔ یوں لگا [illegible] جیسے ہوا کا کانٹا نکل گیا ہو...... یا زخم کے اندر ہی اندر پکتا ہوا مواد جلد پھاڑ کر باہر آ گیا ہو...... انہیں محسوس ہوا جیسے وہ مدت سے اسی خبر کا انتظار کر رہی تھیں۔ جیسے اندر سے انہیں معلوم تھا کہ ایسا ہی ہونا ہے۔"

چنانچہ معاملہ سنگین ہونے کے باوجود ان کا ردعمل سب سے مختلف تھا۔ اس واقعے میں وہ فاخر سے زیادہ ابا میاں کو قصوروار سمجھ رہی تھیں اور دل ہی دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ کسی روز میاں سے روبرو بات ہو گی تو [illegible] کے پیش نظر انہوں نے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار ملتوی کر کے اپنے بیٹے کو اس بحران سے نکالنے کی ٹھانی تھی۔

دراصل دلاور [illegible] کر ڈالا تھا اور پھر نہلے پہ دہلا یہ کہ انہوں نے یہاں سے کسی کو جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا بلکہ بیٹی داماد کو بھی بڑی سفاکی کے ساتھ نظر انداز کر ڈالا تھا۔

شگفتہ کے دکھ روئے نہ کٹ رہے تھے۔

یکے بعد دیگرے رونما ہونے والے دونوں واقعات اس درجہ دل ہلا ڈالنے والے تھے کہ کافی دن تک ابا میاں نے بیرونی سرگرمیاں موقوف کیے رکھیں اور زیادہ تر گھر کے اندر دکھائی دیتے رہے۔ بچی جان اور سرور باجی کے پاس بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہتے۔

شاکر نے بھی خلاف معمول زمینداری کے جھمیلے نظر انداز کر کے بیوی کی غمگساری پر خصوصی توجہ دی۔ انہیں سمجھاتے بجھاتے اور تسلی دیتے رہے۔ انہوں نے بھی اس واقعے کو بہت سنجیدگی سے سنا اور فاخر کے اقدام کو غلط قرار دیا تھا۔ جس سے شگفتہ کی بہت تشفی ہوئی تھی۔

ایک دن شگفتہ نے نہایت دکھ اور تردد کے ساتھ ان سے گلہ کیا۔

"دیکھیے! ہماری زندگی بھر کی ایک ہی اکلوتی ماں جائی ہے۔ اب کیا ہم اس کی شادی بیاہ میں شریک نہ ہوں گے؟...... آپ خود سوچیے یہ محرومی ہمارے جگر میں ناسور کر دینے کے لیے کافی نہیں

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ہے؟ اس سے بڑا کوئی ستم ہو گا؟"

ان کے مسلسل سوالات سن کر انہوں نے پھر جواب دینے کی بجائے امی سے سوال کیا۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا کہ آپ ہمشیرہ کی شادی میں شامل نہ ہوں گی؟"

انہوں نے اسی انداز میں جواب دیا۔

"ظاہر ہے ابا جان یہاں سے شدید ملال کے عالم میں گئے تھے۔ انہوں نے اچانک ہی نسبت طے کر دی مگر ہمیں نہیں بلایا۔ انہی حالات میں شادی بھی ہو جائے گی۔ ہمیں وہ نہ بلائیں گے۔ اس نادان فاخر نے کیسے ہمارے حق میں کانٹے بوئے ہیں۔"

"خیر اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔" انہوں نے سر ہلا کر کہا۔ "فاخر نے چپ چپاتے بہت بڑا اقدام کیا ہے جس کا ملال بھی ہو گا۔ لیکن تمہارا یہ خیال کہ گلفام کی شادی میں شریک نہ ہو سکو گی، غلط ہے۔ بلکہ یہاں سے سب جائیں گے بہاولپور۔ خواہ بن بلائے ہی جانا پڑے۔"

شگفتہ نے بے یقینی سے انہیں بغور دیکھا تو بھائی وثوق اور متانت سے بولے۔

"کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے...... خود ابا میاں کا فیصلہ ہے یہ۔ جو کئی روز قبل کیا جا چکا ہے۔"

وہ خوشی سے اچھل پڑیں اور بولیں۔ "بے مثال فیصلہ ہے یہ تو۔ ابھی سنا کر آتی ہوں۔"

وہ کشور جہاں کو گود میں لے کر بڑے کمرے میں آ گئیں جو گھر کی خواتین کی خاص نشست بھی ہوتی تھی۔ پھولن بوا بیٹھی زمانی بیگم کے پیر دبا رہی تھیں۔

شگفتہ کو تیز تیز قدموں سے آتے دیکھ کر باتوں کا سلسلہ رک گیا۔ انہوں نے کسی طرف توجہ دیے بغیر جوش و خروش سے سب کو مطلع کیا اور میاں سے کی ہوئی باتیں دہرا دیں۔ چچی جان نے فوراً تصدیق کر دی۔

"ہاں...... یہ بات سو فیصد درست ہے۔ اور ایسا ہی ہو گا۔ تم بے فکر رہو۔ خدا لگتی تو یہ ہے کہ دلاور حسین اپنے تیکھے اظہار خیال اور سخت رویے میں حق بجانب ہیں۔ ان کی حق تلفی ہماری طرف سے ہوئی ہے۔ اب اس کا کچھ ازالہ بھی ہم ہی کو کرنا ہے۔ اس کی جو بھی صورت ہو۔ تم بہن کی شادی کی پوری تیاری رکھو۔ مولا بہتر کرے گا۔"

وہ چار اسی نوعیت کی باتیں ہوئیں اور شگفتہ مطمئن ہو کر اپنی طرف چلی آئیں۔ ان کے اطمینان سے زمانی بیگم کو سکون کا احساس ہوا۔

شگفتہ کے جانے کے بعد چچی جان نے پھولن بوا کو ٹہوکا دیا۔ "ہاں اب کہہ ڈالو کیا کہہ رہی تھی؟"

وہ زمانی بیگم کے سنجیدہ چہرے کی طرف دیکھ کر منمنائی۔

"بیگم صاحبہ! آپ خفا ہوں گی......"

زمانی بیگم کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ہم کیوں خفا ہوں گے؟...... ایسی کون سی بات ہے؟"

وہ بدستور چپ رہی۔ چچی جان نے حوصلہ افزائی کی۔ "اے اب کہہ چک پھولن! زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ چنانچہ پھولن بوا نے لاکھ اٹکتے، جھجکتے یہ انکشاف کر ڈالا۔

"بات یہ ہے بیگم صاحبہ! کہ یہ مصیبت، مجھ بدبخت کی لائی ہوئی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ ایک بار پھر

تھم گئیں اور سب کو ڈرے ڈرے انداز سے تکنے لگی۔ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔ چچی پھر سخت تیز نظروں سے زمانی بیگم کی طرف دیکھنے لگیں۔ سرور باجی بیزار ہو کر بڑبڑائیں۔

"ایک تو ہمیں اس پھولن کے چبا چبا کر بات کرنے سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ اب یہ نہیں کہ جو کہنا ہے کہہ کر پاپ کاٹے۔ نالائق کہیں کی۔"

پھولن اپنی جگہ سے کپکپاتی ہوئی اٹھی اور ان کے گھٹنے پکڑ کر ادب سے بولی۔

"مجھے معاف کر دیجیے بیگم صاحبہ!...... واقعی میری نالائقی نے سب کو یہ دن دکھائے۔ جس دن سے...... میرے منہ میں خاک فاخر میاں کے لیے وہ بدخبری سنی ہے، میرا کلیجہ مانو انگارے کی طرح پھنک رہا ہے۔ کسی پل چین نہیں ہے۔ سارا قصور مجھے اپنا ہی نظر آ رہا ہے۔ ضمیر پر بہت بوجھ ہے میرے۔ کئی دنوں سے دل کے اندر کھچڑی پک رہی تھی کہ کسی طرح اپنے مالکوں کے سامنے اقرار جرم کر لوں۔ آج بہت ہی کڑا کر کے آئی ہوں۔ اب آگے آپ لوگوں کی مرضی۔ معاف کر دیں یا جو جی میں آئے سزا دیں۔ بندی حاضر ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رک گئی۔ گھر کی ساری خواتین بھی انہیں سانس روکے یک ٹک دیکھ رہی تھیں۔ وہ چار گہرے سانس لے کر دوبارہ گویا ہوئی۔

"جن دنوں میں صاحبزادی نانی کے ساتھ [illegible] کے مزار پر منت کے لیے جایا کرتی تھی، یہ قصہ انہی دنوں کا ہے۔ بزرگوں نے [illegible] وہ مراد پوری کی، آپ سب کے سامنے ہے۔ ایک ایک روز [illegible] شکر گزار ہے ہم تمہارا [illegible] جمعراتوں میں سے ایک آخری جمعرات کی بات ہے۔ یہاں نشست گاہ میں فاخر میاں کے [illegible] شادی کا تذکرہ چھڑا ہوا تھا۔"

دفعتہً انہوں نے سرور باجی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "آپ بیگم صاحبہ اس روز بہت غصے میں تھیں اور معلوم نہیں کیا کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی عالم میں [illegible] مزار ولی پہنچی...... دل و دماغ میں سب انہی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ جانے کیا ہوا، کیا نہیں ہوا۔ بی بی کی منت کا چراغ جلا کر جیسے ہی مزار شریف کی طرف گھومی، بے اختیار روح کی گہرائیوں سے ایک ہی دعا نکلی۔ جانے تمام کریمی نے رو رو کر دعا مانگ لی۔

"اے صاحب مزار! میرے فاخر میاں کی شادی کرا دے...... تجھ کو واسطہ تیری بزرگی اور کرامات کا...... میری بیگم صاحبہ کا کلیجہ ٹھنڈا کر دے اور ان کو چاند سی بہو عطا فرما دے۔ اے صاحب کمال! تیری برکتوں اور فیض عالم کا چار کھونٹ شہرہ ہے۔ تو ہر کسی کو اس کی من کی مراد دیتا ہے۔ لوگوں کی منتیں پوری کرتا ہے۔ ہمارے صاحبزادے کے من کی مراد پوری کر دے اور ان کا گھر بسا دے۔ انہیں سکھی کر دے اور جتنی جلدی ہو سکے ان کے سہرے کے پھول کھلا ڈال۔"

حالت یہ تھی کہ پھولن کی بات ختم ہو چکی تھی مگر یہاں سب کے سب سکتے کے عالم میں بیٹھے تھے۔ سب سے زیادہ متاثر سرور باجی ہوئی تھیں۔ پھولن بوا کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھیں گویا اپنے لیے احکامات سننے کو تیار تھیں۔

اچانک زمانی بیگم اٹھیں اور تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کی خاموشی اور جلد چپ کو ان کی ناراضگی سمجھ کر بوا اور بھی شدت سے رونے لگیں۔

چچی جان کو بھی سخت غصہ آ رہا تھا۔ آگے بڑھیں اور ڈانٹ کر بولیں۔

"اب کاہے کو ٹسوے بہا رہی ہو؟...... جبھی تو بزرگ کہہ گئے ہیں کہ "پہلے تولو، پھر بولو" مگر تم

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ٹھہریں دس باڈلوں کی ایک باڈلی۔"

"سچ کہا آپ نے بیگم!" انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے بلبلا کر اعتراف کیا۔ "میری تو عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ یہ زبان بھی بدبخت چڑے کی بن گئی ہے۔ اس وقت ذرا بھی نہ جھجکی۔ ورنہ فاخر میاں کی شادی کے لئے منت مان رہی تھی تو شگفتہ بیگم کا نام تو لینا چاہئے تھا؟؟...... مگر میں تو سچ مچ سٹھیا گئی ہوں۔"

"ہاں...... اب خود ہی خود کو کوستی رہو بیٹھی۔" چچی جان نے جل کر جواب دیا۔ پھر وہ بھی رکیں نہیں۔ ہانپتی سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں اور مسلسل بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ ان کا رخ زمانی بیگم کے کمرے کی طرف تھا۔

سرور باجی اور پھولن بوا اکیلی رہ گئیں۔ باجی کسی گہری سوچ میں مستغرق تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پھولن بوا نے آنسو پونچھے اور اٹھنے کا قصد کیا۔

"اے پھولن!" سرور باجی نے اسے دھیرے سے پکارا۔ وہ ٹھٹک گئیں۔

"بات سنو!" انہوں نے ان کو قریب بلایا اور بہت رازداری سے دریافت کیا۔ "جو تو نے مہرولی کے بزرگ سے منت مانی تھی، وہ پوری بھی کی یا نہیں؟"

پھولن بوا گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"بول!...... کیا کہا تھا اس وقت؟" سرور بیگم نے اصرار کر کے دوبارہ پوچھا۔

"بیگم! میں نے منت مانی تھی، اگر فاخر میاں کی شادی وہ جلدی سے کرا دیں تو...... میں مزار شریف پر چادر چڑھاؤں گی۔" پھولن بوا نے ہکلا ہکلا کر وضاحت سے جواب دیا۔

باجی کے چہرے پر دبا دبا سا جوش ابھرنے لگا۔ "چل...... ادھر آ۔"

انہوں نے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور تیز تیز چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ اندر پہنچ کر ایک الماری کھولی، خفیہ خانے سے بہت سے پیسے نکالے اور حیران و پریشان کھڑی بوا کو دے کر پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولیں۔

"یہ تمام رقم اور آج کل کے اندر اندر بہت بڑھیا سی چادر لے کر مہرولی جا اور فوراً منت اتار۔ دیکھ! تاخیر سے کام مت لینا۔ میرا فاخر اور اس کی دلہن پردیس میں ہیں۔ مولا جان کی خیر اور سلامتی کے ساتھ دونوں کو واپس لائے۔ ہماری طرف سے بھی خیر و عافیت و تحفظ کی دعائیں کر کے آنا۔"

***

فرخ کا سینٹر جوائن کرنے کے ابتدائی دنوں میں نازش سخت الجھن کا شکار رہی لیکن ڈاکٹر منان کو بہت زیادہ اعتماد اور بھروسہ تھا اس پر۔ جس دن انہیں فرصت نہ ہوتی، فرخ کو ہدایت کر دیتے نازش کو لے جانے کی۔ وہ یوں بھی روزانہ انہی اطراف سے گزرتا تھا۔ بخوشی اسے لے جانے آ جاتا۔

شروع شروع میں جب بھی ایسا اتفاق ہوتا اور فرخ کی گاڑی کا ہارن بجتا، اسے یوں لگتا فرخ کے بجائے ملک الموت آ گیا ہو۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی گاڑی تک آتی جیسے پل صراط پر چل رہی ہو اور ذرا ادھر ادھر دیکھے گی تو جہنم میں جا گرے گی۔

اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا فرخ بھرپور نظروں سے اس کی بیوقوفانہ حرکات کا جائزہ لیتا رہتا لیکن ٹوکنے سے اجتناب برتتا مبادا کہ وہ بھڑک اٹھے۔ ویسے نازش کے محتاط محتاط رویے سے اسے حیرانی ہوتی، ہنسی بھی آتی مگر وہ بڑے تحمل سے ضبط کئے رہتا۔ یہ مولوی ٹائپ کی لڑکی اسے اور بھی زیادہ بھلی لگنے لگی

تھی۔ لیکن احتیاطاً راستے بھر انجان اور بیگانہ سا رہتا تھا۔

بالآخر وہی ہوا جو سب کا خیال تھا۔

آغاز میں نروس سی رہنے والی نازش کا اعتماد دھیرے دھیرے بحال ہونا شروع ہو گیا۔ یوں بھی اندر سے تو وہ ایک تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی تھی پھر بقول ڈاکٹر منان، فرخ گھر کے فرد کی طرح جانا پہچانا بندہ تھا۔ جلد ہی نازش کی شخصیت میں بندھی ہوئی گرہیں کھلنا شروع ہو گئیں۔ مصوری کا شوق خود اسے ذاتی طور سے بھی تھا بلکہ اب ہوا یہ کہ فرخ کی راہنمائی میں اس کی چھپی صلاحیتوں کو ہر روز ایک نئی جلا ملنے لگی۔ وہ خوف زدہ اور آشیانے سے بچھڑی ہوئی چڑیا کی طرح سہمی رہنے کی بجائے اپنے دلچسپ اور من پسند مشغلے میں کھوئی رہنے لگی۔

یوں تو سعدیہ کے گھر میں شامل ہو جانے کے بعد بھی وہ خاصی حد تک سنبھل گئی تھی اور اس کا وقت سہولت سے کٹنے لگا تھا مگر یہ موجودہ مصروفیت اس کے لئے بہت زیادہ سودمند ثابت ہونے لگی۔

کسی روز فرصت سے بیٹھی تو جی ہی جی میں سعدیہ کو دعائیں دینے لگی جس نے نہ صرف یہ کہ اسے جاتے جاتے خط لکھ کر جھنجھوڑ ڈالا اور ڈاکٹر صاحب سے نہ معلوم کس انداز سے بات کر لی کہ وہ بھی ان کے مسئلے کو نہ صرف یہ کہ سمجھ گئے بلکہ نہایت اچھے موڈ سے بذات خود اس کی رہبری بھی کی۔ کچھ بحیثیت ایک کلاس فیلو ہونے کے اور دوسرے ڈاکٹر صاحب کا ایک دیرینہ دوست ہونے کے ناتے گھر میں بے تکلفی سے آتے رہنے کی وجہ سے ان دونوں میں دوستی کا رشتہ استوار ہوتا چلا جا رہا تھا۔

فرخ مصوری کے اہم نکات سمجھاتے سمجھاتے باتوں باتوں میں اس کی صحیح صورت کو کاغذ پر اتار دیتا اور وہ حیرت سے پلکیں جھپکتی رہ جاتی۔

ٹھیک وہی لمحات تھے، جب اسے گہری آنکھوں اور شرارتی آنکھوں والا فرخ دنیاداری میں الجھے، مکر و فریب سے اٹے ہوئے مردوں سے بہت الگ لگا جن کی محبت سے دل و دماغ سے چپک کر رہ گئی تھی اور رشتہ کے ساتھ گزرنے والی واردات یاد کراتی رہتی تھی جس سے اس کی شخصیت الجھ کر رہ گئی تھی۔

رفتہ رفتہ کچھ وقت نہایت مسرت سے گزر گیا۔

اس عرصے میں فرخ کی محنت رائیگاں نہ گئی اور نازش اس سے ایسی مانوس ہو گئی کہ اس سے دنیا کے ہر موضوع پر بلا جھجک بحث کر لیتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مصوری میں اس نے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ اپنے سینیئرز کو پیچھے چھوڑ جاتی۔ ججوں کے اچھے نمبروں میں ٹاپ دیتی۔ فرضیکہ اس کی شخصیت میں بڑی صحت مند اور قابل تعریف تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ بھابی اس کا بغور مشاہدہ کرتی رہتیں۔ ان کا خیال تھا کہ اب وہ وقت کے ساتھ ساتھ ماضی کی بے پناہ کمی کو نارمل انداز سے لینے پر قادر ہوتی چلی جائے گی اور باہر کی دنیا کو قریب سے دیکھنے کے بعد اس کا اعتماد بحال ہو جائے گا تو پھر وہ زندگی کے دیگر مسائل کو بھی نارمل انداز سے لینا سیکھ لے گی۔

سعدیہ اور فاخر بذریعہ فون برابر سارے گھر سے رابطہ رکھے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے ایک ایک پل سے واقف تھے۔

ایک شام جب کہ فرخ شہر سے باہر گیا ہوا تھا، نازش نے بھی چھٹی کر لی۔ بہت دیر تک پھوپھی بچے مختلف کھیل کھیلتے اور غل مچاتے رہے۔ پھر بھابی نے اسے کچن میں پکار لیا۔

آج کل چاندنی بوا کی طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے ان کا زیادہ وقت کچن میں گزر رہا تھا۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

نازش جاتے ہی چہکی۔

"بھابی جان! آپ کے ہاتھ کا زردہ پلاؤ کھائے بہت دن ہو گئے۔"

انہوں نے اوون میں جھانکتے ہوئے فوراً ہاں کر دی۔ "کیوں نہیں بنو! جب کہو پکا لیں گے۔ بس تمہارے بھائی جان کو قہقہے بازی کا موقع مل جائے گا۔ چلو تمہاری خاطر یہ بھی سہہ لیں گے۔ لیکن اب ذرا تم بھی ہمارے سوال کو غور سے سنو اور سچ سچ جواب عنایت کر دو۔ ہمارا سوال ہے۔ تمہارے خیالات میں کچھ فرق آیا یا نہیں؟"

"کون سے خیالات؟" نازش نے چونک کر دریافت کیا۔

"بھئی وہی شادی وغیرہ۔"

"بھابی جان!" وہ احتجاجاً زور سے بولی۔ "دیکھئے! اب آپ خود ہی معاہدے کی خلاف ورزی کر رہی ہیں۔ یہ سراسر بے ایمانی ہے۔"

بھابی اس کی بوکھلاہٹ پر بے ساختہ ہنس پڑیں اور نرمی سے بولیں۔

"ارے...... تو میں کون سا تمہیں نکاح پڑھوائے دے رہی ہوں؟ صرف یہ دیکھنا چاہ رہی تھی کہ اب تمہاری سوچیں کس حد تک تبدیل ہوئی ہیں۔"

خلاف معمول آج نازش نے ان کے جملے کو توجہ سے سنا۔ چند منٹ سوچتی رہی، پھر ایک گہرا سانس کھینچ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں کوئی سچ مچ ہی شادی وادی کو ہوا نہیں سمجھ رہی جو آپ ہر وقت فکر میں مبتلا رہتی ہیں۔ بس تھوڑا سا یہ خیال ہے کہ معلوم نہیں وہ زندگی کیسی ہوتی ہے؟ ہو سکتا ہے شادی زندگی کے کسی خوبصورت اور خوش آئند موڑ کا ہی نام ہو...... بشرطیکہ...... اچھا کردار اور ہم خیال مل جائے۔"

بھابی کا منہ [illegible] کھلا رہ گیا۔ وہ پلک جھپکا [illegible] پھر خوشی سے [illegible] ہو کر بولیں۔

"اللہ...... نازش! یہ تم ہو؟...... یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔"

اس نے ہنس کر جواب دیا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی؟...... بھلا میں لڑکی نہیں ہوں؟ کیا فطرت بھی بدل سکتی ہے؟ ہر لڑکی کے دل میں ایک پرسکون اور اپنے مثالی گھر کی آرزو ضرور پروان چڑھتی رہتی ہے لہٰذا انسانی زندگی اور فطرت میں شادی کی اہمیت سے انکار کیسے ممکن ہے؟ میں بھی بہرحال اسی دنیا میں رہنے والے انسانوں میں سے ایک ہوں۔ لیکن...... میرے ان تمام تر اعترافات سے متاثر ہو کر کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے آپ میری بات کے اس رخ پر تو غور کیجئے کہ...... آج کل ہر کوئی تو باکردار اور قابل بھروسہ نہیں ہوتا۔ بلکہ میرے خیال میں ہم خیال اور بہترین رفاقت کا حق ادا کرنے والے چند ایک ہی ہوں گے۔"

بھابی نے برجستہ کہا۔ "مثال کے طور پر فرخ!"

"فر...... رخ......" نازش ہکلا کر رہ گئی اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

اب بھابی بھی کھل کر بولیں اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"ہاں بھئی۔ تمہیں حیرت کیوں ہوئی؟...... کیا تمہیں فرخ میں یہ تمام خوبیاں دکھائی نہیں دیتیں؟ کم عقل، بے وقوف لڑکی! ذرا اپنا انداز نظر بدل کر تو دیکھو! میں تو کہتی ہوں، دیکھا بھالا لڑکا ہے۔ کیا کمی ہے اس میں۔ اسٹیٹس، تعلیم، قابلیت، شکل صورت۔ اک ذرا اس کا خاندان، گھرانہ اور پس منظر

معلوم نہیں ہے تو بھی! تمہارے بھائی جان کس مرض کی دوا ہیں، خود ہی ساری معلومات کر لیں گے۔ بلکہ شاید جانتے بھی ہوں۔ آخر پرانی دوستی بتاتے رہتے ہیں۔"

بھابی کی ایک ایک بات نازش نے بغور سنی اور غور کرنے کے بعد اپنی کج فہمی اور لاعلمی پر متعجب رہ گئی۔ کس درجہ سادہ دل اور کم عقل تھی وہ بھی!

اب تک کی زندگی میں...... وہ پہلی رات تھی جب اس کے تصورات کی دنیا کسی کی باتوں، یادوں اور ملاقاتوں سے جگمگا رہی تھی۔ اس شب وہ فرخ کے متعلق یکسر مختلف انداز سے سوچ رہی تھی اور ہر لحظہ سوچنے کے، سمجھنے کے اور پرکھنے کے نئے نئے راستے نظر آ رہے تھے۔ فرخ کی بے شمار باتیں اور دلچسپ باتیں یکے بعد دیگرے ذہن کے افق پر طلوع ہو رہی تھیں۔ فرخ جس کی شخصیت کو اس نے کبھی اس طور سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی، اب دوسرے روپ میں دکھائی دے رہی تھی۔ اپنے خیالات کی تبدیلی پر حیرت ہو رہی تھی اسے۔

اللہ رے نسوانی حسن و جمال اور شرم و حیا کی پیکر عورت ذات کی فطری تبدیلیاں۔ اگلی شام سینٹر جانے کے لیے تیار ہونے لگی تو بے خیالی میں جانے کتنا اہتمام کر گئی کہ خود ہی حیرت زدہ ہو گئی۔

ڈارک بلیو ساڑھی، خوبصورت خم دار بالوں کے جوڑے اور ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ، آئینے کی چمک دار سطح پر اپنا عکس دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ کانوں میں سفید ٹاپس اور گلے میں ممی کی یادگار سچے موتیوں کی آب دار مالا اسے ماں کی یاد دلا رہی تھی۔ مگر اس شام وہ ہار دیکھ کر اداس ہو جانے کی بجائے اپنی ہی روشن روشن سی آنکھوں میں اک نئی جھلک دیکھ رہی تھی۔

اس روز اس کی گاڑی میں بیٹھ کر آتے اور جاتے ہوئے راستے میں اس نے ہر لمحہ اور ہر گھڑی فرخ کی حرکات و سکنات کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس مشاہدے میں نازش نے اس کی کئی چوریاں پکڑیں۔

یوں ان دونوں کے درمیان ایک [illegible] دوسرے کی دلی کیفیات سے بخوبی آگاہ بھی تھے۔

وہ سینٹر سے واپس آئی تو پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا صرف [illegible]۔ ڈائننگ ہال میں کرسی پر چوکڑی مارے [illegible] تھیں۔ بھابی کہیں گئی تھیں۔ نازش ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور صوفے پر لیٹ کر آج کے واقعات میں کھو گئی۔ آج اسے سعدیہ رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ کئی دفعہ اس کا رکھا ہوا پرچہ نکال کر پڑھ چکی تھی۔ عجیب بات ہے جس تحریر کو پہلی بار پڑھ کر اس پر بے شمار جھلاہٹ سوار ہو گئی تھی آج بار بار پڑھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اچانک اس کی ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ اس نے ڈاکٹر حنان کو صاف صاف کہتے سنا۔

"نہیں بھئی! ایسا غضب مت کرنا۔ سارا لطف کرکرا ہو جائے گا۔ تم کھانا تو ہضم کر سکتی ہو مگر اتنی سی بات ہضم نہیں کر سکتیں! کمال ہے بھئی...... مان گئے آپ کی ذات صفات کو...... سچ ہے صنف نازک کا نام و مقام آپ سے قائم ہے۔"

بھابی کی آواز ابھری۔ وہ چڑ کر بولی تھیں۔ "بات کا بتنگڑ بنانے میں بڑے ماہر ہیں آپ۔ میرے کہنے کا مقصد تو یہ تھا کہ نازش کا بھی تو جی چاہے گا کہ میں بھی ایئرپورٹ خود جاؤں ریسیو کرنے کے۔ فضول میں بے چاری کو لاعلم رکھ رہے ہیں اتنی اچھی خبر ہے۔"

نازش کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ اور بھی توجہ سے سننے لگی۔ اب بھائی کہہ رہے تھے۔

"جی نہیں...... آپ تو بالکل ہی حس مزاح سے محروم ہیں۔ ارے بھئی جب اچانک بجلی، بجلی

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کے سامنے آنے کی تصور کرو بھلا کیسا بھرپور منظر ہوگا؟"

"مرضی ہے آپ کی۔" بھابی نے تقریباً شکست تسلیم کر لی۔ "مگر یہ یاد رکھیے کہ ریحان اور سلطان کو بھی خبر نہ ہونے پائے کہ پرسوں سعدیہ اور فاخر پہنچ رہے ہیں۔ ورنہ میرا ذمہ نہیں ہے۔ دونوں ہی پیٹ کے ہلکے ہیں۔ مذاق ہی مذاق میں اپنی پھپھو کے سامنے بھانڈا پھوڑ دیں گے۔"

"آل رائٹ میڈم!" انہوں نے شوخی سے جواب دیا۔

اس سے زیادہ نازش نے سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ڈرائنگ روم کے پچھلے دروازے سے نکل کر گول زینے سے اوپر چلی گئی۔ اس وقت سعدیہ کے آنے کی اچانک اطلاع سے اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ بے اندازہ خوشی محسوس کر رہی تھی وہ۔ ساتھ ہی بھائی بھاوج کی چالاکی پر بڑے زوروں کی ہنسی بھی آ رہی تھی۔ اس نے جی ہی جی میں پکا عہد کر لیا تھا۔ شرارت کا جواب بھی شرارت ہی ہوگا اور جواب بھی ایسا کہ گویا نہلے پہ دہلا۔

دل کی چوکھٹ پہ جو اک دیپ جلا رکھا ہے
تیرے لوٹ آنے کا امکان سجا رکھا ہے
تم جسے [illegible] چھوڑ گئے تھے اک دن
ہم نے اس شام کو سینے سے لگا رکھا ہے
مجھ کو اس شام سے وہ [illegible] آنے لگا
دل نے [illegible] وہ اک قفل بھلا رکھا ہے

رات کس قدر گہری ہو چکی تھی [illegible] ہر طرف شب کا اندھیرا پھیلا تھا اور ہر طرف ہی خاموشی کی چادر تنی تھی۔ فرحت کے گھر پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور بہت سارے خزاں رسیدہ پتے کھڑکی میں لگی ہوئی بیل میں سے جھڑے اور دور تک بکھر گئے۔ لال لال کسوری اینٹوں سے جڑا ہوا صحن سنسان پڑا تھا۔ اچانک ہی نازیہ کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا مگر وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ ایک کیفیت ناگفتہ بہ اس کا حصار کیے ہوئے تھی۔ سارے دن کا تھکا ہارا فرحت گہری نیند سو رہا تھا۔ نازیہ نے آہستگی سے اٹھ کر جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگی۔ کئی منٹ گزر گئے مگر طبیعت سنبھلنے میں نہ آ رہی تھی۔ کمرے میں ہی ذرا دیر ٹہلنے کے بعد دروازہ کھول کر وہ باہر آ گئی۔

رات کے آنگن میں ستاروں کے حسین کنول جھلملا رہے تھے۔ ہوا کے سبک سبک جھونکوں سے بیل کے پتوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں سوکھے پتے اینٹوں پر بکھرے پڑے تھے۔

اچانک رات کے سناٹے میں ڈیوڑھی کی طرف سے کوئی آواز سن کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے چونک کر بغور دیکھا۔

ڈیوڑھی میں جلتے ہوئے بلب کی روشنی میں اسے معطر نظر آئی اس نے بھی نازیہ کو دیکھ لیا تھا مگر اس کے قریب سے حسب عادت تیوری چڑھائے گزرتی چلی گئی۔ معاً نازیہ کو کچھ خیال گزرا۔ اس نے اپنی کیفیت نظر انداز کر کے ہمدردی سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے آپا!...... طبیعت کیسی ہے؟"

"تم سے مطلب؟" اس نے ترشی سے جواب دیا۔

اس کی بے اعتنائی پر نازیہ کا دل دکھ کر رہ گیا۔ عین اسی لمحے اس کی کمر میں بے پناہ درد کا ایک تیز ترین کوندا لپکا اور وہ ایک دلدوز آہ کے ساتھ وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔

معطر نے جاتے جاتے گھوم کر اس کی طرف دیکھا مگر پلٹ کر نہ آئی بلکہ جھپاک سے اپنے کمرے میں گھس گئی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"ہونہہ...... اب دوڑ پڑے گا گھر بھر چہیتی بیگم کے نخرے اٹھانے کے لئے۔ بلوائی جائے گی پل بھر میں ڈاکٹروں کی پلٹن گھر کے اندر۔"

درد میں ذرا سی کمی آئی تو نازیہ بمشکل اٹھ کر کمرے میں آئی۔

رات کے پچھلے پہر کی گہری خاموشی میں اسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ اچانک اسے زور کی گھبراہٹ اور بے چینی محسوس ہوئی۔ پیٹ میں ایک شدید مروڑ سی اٹھی۔ جی متلایا کہ آنکھوں کے آگے تاریکیاں چھانے لگیں۔

اس نے سر جھٹک کر بار بار سنبھالا لینا چاہا مگر طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ ہمت کر کے وہ ڈگمگاتی ہوئی فرحت کی طرف چلی مگر چند قدم سے زیادہ نہ چل سکی۔ نڈھال ہو کر فرش پر گر گئی اور زور سے ابکائی آنے لگی۔

فرحت کی آنکھ کھلی تو وہ زمین پر نڈھال پڑی ہانپ رہی تھی۔ پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

فرحت اسے ایسی ابتر حالت میں دیکھ کر پریشان ہو اٹھا تیزی سے بھاگ کر اس کے قریب گیا اور اسے ہلا جلا کر بے تابی سے پوچھنے لگا۔

"نازیا...... نازیا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟...... آنکھیں کھولو نازیا!"

"آں...... ہاں......" فرحت کی آواز پہچان کر اس نے [illegible] سے کام لیا اور نقاہت بھری آواز میں بولی۔ "م...... میں...... میں ٹھیک ہوں...... وہ رات آلو گوبھی...... کھایا تھا......"

وہ رک رک کر گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ فرحت نے دیکھا۔ اماں بی گھبرائی اندر داخل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے زمین پر بیٹھ کر بے حد محبت اور ملائمت سے بہو کے بے ترتیب وجود کو سمیٹ کر اپنی پرشفقت آغوش میں سمیٹ لیا۔ نرمی سے اس کا پسینے سے تر چہرہ اپنے آنچل سے خشک کر کے پیشانی پر بوسہ دیا اور فرحت کو ہدایت کی۔

"بیٹا! جتنی تیزی سے جا سکتے ہو، دوڑ کر کرائے داری کو جگا لاؤ۔"

اور پھر سب کچھ جلدی جلدی وقوع پذیر ہوتا چلا گیا۔ کرائے داری نے آتے ہی بھاگ دوڑ مچا دی۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ فرحت کو لے کر باہر نکلی اور پڑوس کی ایک جہاندیدہ، باتدبیر خاتون کے ساتھ واپس آ پہنچی۔

اس موقع پر فرحت نے شرماتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر یا ہسپتال کی پیشکش کرنی چاہی جو نہایت عجلت میں مسترد کر دی گئی۔

تخلیق کا نازک لمحہ سر پر کھڑا تھا۔ تجربہ کار خواتین اس لمحے کی نزاکت اور اہمیت سے خوب آگاہ تھیں۔ اماں بی نے پوری طرح مستعد ہو کر نتیجہ اس لافانی و لازوال ہستی کے سپرد کر دیا جو کل کائنات

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کا تخلیق کار اور پالنہار ہے۔ جو بندے کو اتنی ہی تکلیف سے دوچار کرتا ہے جو اس کے ضبط و اختیار میں ہو۔ کون نہیں جانتا کہ وہ مالک کائنات اپنی ہر تخلیق سے ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرنے والی عظیم ہستی ہے اور رات کی اس حساس اور یادگار گھڑی میں نازیہ کو اٹھا کر کہیں لے جانا یا کسی کو گھر پہ لے آنا ممکن نہ رہا تھا۔

باورچی خانے سے ہلکی سی کھٹر پٹر سے بیگار کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ یوں بھی نازیہ کی حالت بیک نظر معظم نے تاڑ لی تھی مگر مجال ہے کہ معمولی سی خیر خیریت بھی دریافت کرنے اٹھی ہو۔ کمرے میں اس کے بچے اور میاں گہری نیند سو رہے تھے۔ صحن میں چلتے پھرتے قدموں کی آہٹیں اور چاپ سنائی دے رہی تھی مگر وہ اپنے پلنگ پر اطمینان سے لیٹی چھت کی کڑیاں گننے میں مصروف تھی اور دل ہی دل میں جلبلی جاری تھی۔

کیسے لاڈلی بہو کے آگے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑی بنی گھوم رہی ہیں اماں۔ وہ فرحت کا بچہ بھی بے دام غلام ہے۔ دیکھنا ابھی ڈنڈا ڈولی کر کے بڑے سے بڑے ہسپتال میں داخل کرانے لے جائے گا۔ اسے تو ایسی ہیرا موتی لعل جیسی بیوی مل گئی ہے کہ کسی کو گردانتا نہیں۔ بس کوئی اس کی خادمہ بنانے پہ تلا رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو بیٹا اور اماں کو پوتا جو ملنے والا ہے۔ اس بن جہیز کی بہو کی پوچھا کیوں نہیں کریں گی...... دنیا سے نرالی تکلیف سہہ رہی ہے نا۔

معظم ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی اور نفرت سے دل ہی دل میں بڑبڑاتی رہی۔

فرحت قریب ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پہ بیٹھا رہا تھا۔ آج اس کو ایک پل قرار نہ تھا۔ اس کا رواں رواں دعائیں کرنے میں مصروف تھا اپنی منکوحہ کی تکلیف پہ رو رو کر غصہ آ رہا تھا۔ معلوم نہیں نازیہ بے چاری کب سے ویسی تڑپ رہی تھی مگر سنگ دلی کی بنیاد پہ کسی نے اسے بے آرام کرنا منظور نہ کیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ ایسی صابرہ اور معصوم طبیعت بیوی کو کیا [illegible] کیسی وفا اس کے جی میں سمائی کہ اپنی آپا کو جگانے گھر جا کر پلٹ آیا۔ اگرچہ بہنوئی کا خیال نہ ہوتا تو وہ ایسا ہی کرتا مگر شرافت حسین کی موجودگی کی وجہ سے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا نہ سکا۔

اچانک فضا مؤذن کی خوش الحان آواز سے معمور ہو گئی۔ قریبی مسجد سے اذان فجر کی روح پرور پکار بلند ہونے لگی تھی۔ ہوائیں جیسے وجد میں آ گئیں۔ عین اسی وقت گھر کے در و دیوار سے دنیا کے رنگ و بو کی حسین ترین ایک ننھی سی چیخ ٹکرائی۔ فرحت اچھل پڑا۔

اس کے کمرے سے ایک بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگا۔ بے پناہ مسرت اور سرشاری کی ایک سرمئی لہر نے اس کا تن من بھگو ڈالا۔

وہ دم بخود ہو کر اپنے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے کرائے وارنی سیدھی اسی کی طرف بھاگی چلی آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر پھولی ہوئی سانس سے بولی۔

"مبارک ہو میاں! بچی کے باپ بن گئے۔ چلو اب جلدی سے دوڑ کر مسجد جاؤ اور نماز پڑھ کر اس کے اچھے نصیبوں کی دعا مانگ کر آؤ۔ بہت خوبصورت اور بڑی دھان پان سی گڑیا ہے۔ صورت دیکھو تو بنی بنائی اپنی دادی کے جیسی۔"

اپنی بات ختم کر کے وہ باورچی خانے کی جانب مارچ کرنے لگی۔ فرحت سے کچھ بولا نہ گیا۔ وہ بیوی کی طبیعت پوچھنا چاہ رہا تھا لہٰذا جب وہ گرم پانی کا برتن لئے دوبارہ کمرے کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی تب تیز قدموں سے بڑھ کر اس کے پاس پہنچا اور جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"اور وہ...... نازیہ تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں ہاں میاں اللہ کا بڑا کرم ہے۔" اس نے فی الفور جواب دیا اور کمرے کے اندر آ گئی۔

ضروری کارروائی سے نمٹتے اور سارے کام سمیٹتے دن نکل آیا تھا۔ مارے خوشی کے اماں بی سجدہ شکر بجا لائی تھیں۔ انہوں نے بہو کا صدقہ اتارا اور جی بھر کے پیار کیا تھا۔ آج ان کا بیٹا صاحب اولاد ہو گیا تھا۔

پڑوسن صفیہ بیگم نے بچی کو نہلایا، دھلایا اور چھوٹی سی رلائی میں لپیٹ کر اماں بی کی گود میں ڈال دیا اور مسکرا کر گویا ہوئیں۔

"لو بی بی! پوتی مبارک ہو۔ مولا نے کیسی چنگی گھڑی کے اندر گھر میں ہی ہاتھ پیر چھڑائے۔ ہر کام میں آسانی ہوئی۔ لاکھ لاکھ شکر ہے خدا کا۔"

کرائے وارنی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"سچ کہا تم نے صفیہ خالہ اور یہ تو اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی گھڑی ہوتی ہے۔ اسی کی بے نیاز ذات اس گھڑی کو باندھتی ہے اور وہی کھولتی ہے۔"

نازیہ مسکراتے ہوئے سب کی باتیں سن رہی تھی۔ نقاہت بھرے زرد چہرے پر ایک انوکھی سی پرکشش کیفیت سایہ فگن تھی۔

اس کی طرف سے مطمئن ہو کر اماں بی نے خوشی خوشی ننھی مہمان کو بانہوں میں بھر لیا اور بغور اس کی پیاری سی صورت دیکھتے ہوئے بولیں۔

"اے بی! فرحت میاں سے کہو مولوی صاحب کو بلا لائیں۔ سب سے پہلے تو ہماری "منگ خاتون" کے کان میں اذان دیں آ کر۔"

کرائے وارنی [illegible] "محنت جس نے کی، اس نے کی اور دادی صاحبہ نے لے کے جھٹ سے نام بھی رکھ دیا۔"

کمرے میں موجود خواتین ہنسنے لگیں۔

جب سب لوگ بہت دیر کے بعد ادھر ادھر ہو گئے تو فرحت کو آنے کا موقع ملا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک نئی خبر سے آگاہ کیا۔

"لو بھئی!...... آج کی دوسری خوشخبری سن لو۔ شام کی فلائٹ سے فاخر اور سعدیہ واپس وطن پہنچ رہے ہیں۔"

نازیہ کے چہرے پر خوشی کے ہزار رنگ پھیل گئے۔

✱●✱

پھولن بوا کے جانے کے بعد بہت دیر تک خالی الذہنی کے سے انداز میں سرور باجی الماری کے قریب ہی کھڑی رہ گئیں پھر کسی کھٹکے پہ چونکیں تو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اپنی مسہری تک آئیں اور چپ چاپ لیٹ رہیں۔

طبیعت تو ان کی فاخر کی شادی کا سنتے ہی سناٹے میں رہ گئی تھی مگر دوسروں کے احساسات کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنے تاثرات ظاہر نہیں ہونے دیے تھے بلکہ اندر ہی اندر ایک کشمکش کا شکار ہو کر رہ گئی تھیں۔

ان کے احساسات اور تاثرات اس لئے بھی پوشیدہ رہ گئے تھے کہ فاخر کے سلسلے میں کسی دوسرے

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

کی تو خیر بات کیا ہوتی، خود زمانی بیگم نے بھی ان سے کسی نوعیت کی بحث نہیں چھیڑی تھی۔ اس لئے سرور باجی کا مافی الضمیر کسی پر ظاہر نہ ہو سکا تھا اسی طرح سے اگر غور کیا جاتا تو وہ اندر سے ایک گھٹن محسوس کرنے میں حق بجانب تھیں۔ کچھ کہہ سن لیتیں تو غالباً جی کا غبار نکل جاتا اور ان کی دماغی صلاحیت اس درجہ بکھری نہ رہتی۔

لیکن آج جیسے ہی پھولن بوا نے اپنی منت کا ذکر کیا، سرور باجی کی ذہنی رو بھٹک گئی تھی۔ فاخر انہیں بے طرح یاد آنے لگا۔ اس سے وابستہ ایک ایک منظر، ایک ایک لمحہ اور اس کی ایک ایک ادا یاد آنے لگی۔

یادوں کی برات سجائے لیٹے لیٹے ان پر غنودگی طاری ہو گئی اور ان کے خوابیدہ حواس کو ہر طرف فاخر ہی فاخر دکھائی دینے لگا۔ یہاں فاخر، وہاں فاخر...... ہر جگہ فاخر ہی فاخر۔ کبھی وہ ننھا سا فاخر بن جاتا جسے وہ گود میں لئے لوریاں سنا رہی ہوتیں، کبھی روتے دھوتے فاخر کو کندھے سے لگائے بہلا رہی ہوتیں۔ اس ایک بچے کی خاطر بڑے چھوٹے ہر فرد کو ایک سانس میں دس صلواتیں سنا دیا کرتی تھیں۔

بچپن سے ہی فاخر کا بڑے سے بڑا قصور انہیں کبھی نظر نہ آیا تھا۔ ان کی اس شدت پسندی کو سب جان گئے۔ چنانچہ ہر کوئی درگزر سے کام لینے کا عادی ہو گیا تھا۔ زمانی بیگم کا تو کسی درست بات میں بھی بول جانا غضب تھا۔ بچے جھاڑ کے پیچھے پڑ جاتیں۔ گھر میں کئی کئی ملازمائیں ہونے کے باوجود اس کا چھوٹے سے چھوٹا کام وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ چھوٹا تھا تو اسے بذات خود نہلاتیں، کپڑے پہناتیں۔ ہنس ہنس کر اس کے ناز نخرے، لاڈ اٹھاتیں۔ ضدیں اور فرمائشیں پوری کرتیں۔ ایک طرح سے انہوں نے اپنی زندگی کا محور اس ایک بچے کو بنا لیا تھا۔ گھر میں فاخر کے لئے ان کے پیار کی شدت اور انتہا سے سب واقف تھے۔

غنودگی کی کیفیت میں وہ ہر روپ میں [illegible] ہوتی جا رہی تھیں۔ دراصل پھولن کی زبانی منت کا سن کر انہیں شدید شاک لگا تھا۔ اس کے معاملے میں تو وہ ہمیشہ وہمی ہی تھیں۔ اسی لئے انہیں منت اتار دینے کی بہت فکر لاحق ہو گئی تھی۔ حالانکہ پھولن کو ہوئے [illegible] کر اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا مگر کسی عجیب سے احساس کے زیر اثر ان کا بدن اندر سے برابر کپکپائے جا رہا تھا۔

اچانک ننھا سا فاخر بھرپور جوان کے روپ میں مجسم ہو کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لیکن اب وہ اکیلا نہ تھا بلکہ چشم تصور سے سرور باجی اس کے ہمراہ ایک نئی نویلی دلہن کو بھی بخوبی دیکھ رہی تھیں۔ نہایت خوش کن مسکراہٹوں سے اس کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔ اس کی پیشانی چوم رہی تھیں، اسے گلے لگا رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی مسہری پر بٹھا رہی تھیں۔

معاً انہیں محسوس ہوا کہ زمانی بیگم کسی طرف سے نکل کر آ گئی ہیں اور فاخر کی دلہن کو ان سے کہیں دور لئے جا رہی ہیں۔ دور...... بہت دور...... سرور باجی غضب ناک ہو کر ان کی طرف جھپٹی ہیں اور تیز آواز میں چیختی ہیں۔

"زمانی!...... زمانی!...... ہوش کے ناخن لو زمانی!"

"باجی! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" کسی نے دہشت زدہ آواز میں پکارا۔ ساتھ ہی انہیں پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ تھامنے والے کی گرفت سے پھسل کر بلکہ تقریباً اڑتی ہوئی کمرے کے دروازے تک پہنچ گئیں اور اس زور سے ٹکرائیں کہ ایک کواڑ کھلتا چلا گیا اور وہ دھڑام سے نیچے فرش پر گر گئیں۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا۔

کمرے میں داخل ہونے والی واقعی زمانی بیگم ہی تھیں اور ان کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ اس درجہ دہشت زدہ ہوئیں کہ بے تحاشا چیخنے لگیں۔ کھلی آنکھوں سے انہیں یوں لگا تھا کہ جیسے کسی نادیدہ قوت نے باجی کو اٹھا کر پٹخ دیا ہو۔ آن کی آن میں سب جمع ہو گئے۔ سمجھنے کی کوشش کون کرتا! باجی کو ایسی بے ترتیبی پڑی دیکھ کر ہر کسی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

شاکر کی موجودگی اس روز غنیمت تھی۔ اس نے کسی طرح ڈنڈا ڈولی کر کے پھوپھی کو مسہری تک پہنچایا۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانی ہو چکی تھیں۔

ذرا سی دیر میں ابا میاں کے پرانے معالج حکیم شمس الدین آ موجود ہوئے۔ پورے گھر میں رنج و ملال، خوف و دہشت اور فکر و پریشانی کی لہر دوڑ گئی۔ سرور باجی پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا جس سے ان کا دایاں حصہ بالکل مفلوج ہو گیا تھا اور...... زبان بھی بند تھی۔

بس وہ دن تھا اور پریشانیوں کا دور دورہ۔ ایک یونہی فاخر کی طرف سے بھرے بیٹھے تھے اور اس کے اچانک اقدام کی وجہ سے کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہ پہنچ پائے تھے کہ اچھی خاصی سرور باجی کے لینے کے دینے پڑ گئے۔ ابا میاں کو اس مرحلے میں سب سے زیادہ دقت اس بات سے پیش آ رہی تھی کہ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ باجی کا ڈاکٹری علاج کروانے سے قاصر تھے۔ جونہی وہ ڈاکٹر کا نام لیتے، ایک اودھم مچ جاتا۔ سب میں زیادہ مخالفت کرنے والی بچی جان تھیں۔

ان کا کہنا تھا کہ ایک وقت میں جب کہ سرور خود بول کر منع نہیں کر سکتیں، وہ ڈاکٹری علاج کی اجازت دے کر ان کا عہد تڑوانے کا عذاب مول نہیں لے سکتیں۔

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ سرور باجی نے ہمیشہ کے لئے عزیزوں کے درد جان کو لگا لئے تھے مگر کبھی ڈاکٹری ایک گولی کھا لینا قبول نہ کیا تھا۔ ان کے اپنے ہی اصول اور قواعد تھے جو سب کو عزیز تھے۔ ان کے گھر کی روایات دنیا سے نرالی تھیں۔

حکیم صاحب بہت جانفشانی اور تندہی سے علاج جاری رکھے ہوئے تھے مگر ساتھ ہی مایوس بھی تھے وہ۔ ان کی مریضہ ذرا بھی تعاون پر آمادہ نہیں تھی۔

حکیم شمس الدین اپنے والد کی تقلید میں ہندوستان میں بھی ابا میاں کے گھرانے کے معالج رہے تھے۔ بعد ازاں پاکستان آئے تو وہ بھی اطراف میں آباد ہو گئے تھے۔ اس گھر کی خواتین انہی کے زیر علاج رہنا پسند کرتی تھیں۔ لیکن سرور باجی کا کیس ہر روز ان کے لئے پیچیدہ تر ہوتا جا رہا تھا۔

ایک دن انہوں نے ابا میاں سے کہا۔

"یار صاحب! کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ کسی صورت فاخر کو جلد از جلد بلوا سکیں؟"

ابا میاں متحیر ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگے۔ حکیم صاحب ان کی حیرت رفع کرنے کو وضاحت سے بولے۔

"بات یہ ہے صاحب! کہ اگر مریضہ ذرا سا بھی بولنے کی کوشش کرتی ہیں تو وہ فاخر کا نام ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا تجربہ کہتا ہے مجھے یقین ہے کہ فاخر کی موجودگی یقیناً ان کے لئے باعث تقویت ہو گی۔ علاج کے معاملات میں مریض کا تعاون اشد ضروری ہوتا ہے۔ جب کہ مریضہ ضرور کسی اضطراب اور کشمکش میں مبتلا ہیں۔"

ابا میاں ایک گہرا سانس لے کر گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد حکیم صاحب ہچکچاتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئے۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"اور دوسری بات یہ کہ مریضہ بتلا کر اور عالم غشی میں بھی فاخر...... فاخرہ دلہن...... فاخر...... فاخرہ دلہن...... کہتی رہتی ہیں۔ اس مسئلے کو بھی مدِ نظر رکھیے۔"

ابا میاں سناٹے میں رہ گئے۔ حکیم صاحب تو چلے گئے مگر ان کے لیے سوچوں کے در وا کر گئے۔ وہ جتنا گہرائی میں جا کر غور کر رہے تھے، اتنی ہی ان کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں اور ایک خاص خیال دماغ میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

اس موقع پر انہیں دلاور حسین صاحب کی کہی ہوئی بہت ساری باتیں یاد آئیں جو انہوں نے بطور خاص انہیں سمجھا کر کی تھیں۔ حالانکہ آج کل وہ بے حد متفکر اور دلگیر رہتے تھے لیکن حکیم صاحب کا مطالبہ یا مشورہ جو بھی تھا، انہیں اندھیرے میں روشنی کی کرن کی طرح لگا تھا۔ یہ بات انہیں قدرت کی کرم نوازی دکھائی دے رہی تھی۔

تاہم ابا میاں نے گھر کی خواتین سے رابطہ کیا۔

چچی جان نے فوراً ہی حکیم صاحب کی تصدیق کر دی اور صاف لفظوں میں بتایا کہ انہوں نے بذاتِ خود سرور باجی کو یہی الفاظ بڑبڑاتے بارہا سنا ہے۔"

زبانی بیگم نے البتہ خاموشی اختیار کر لی تھی۔

ایک خوشگوار سی صبح ابا میاں نے اپنے کزن عین حشمت خان کے ساتھ کراچی کا رخ کیا۔ دماغ ہزاروں خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

شہر پہنچ کر انہوں نے فاخر کی رہائش گاہ کا رخ کرنے کی بجائے معراج الدین صاحب سے ملاقات کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔ شادی کے بعد وہ کبھی فاخر کے ہاں گئے بھی نہیں تھے۔

معراج الدین صاحب نے ایک شگفتہ قہقہے کے ساتھ انہیں گلے لگایا۔ استقبال کرنے کا ان کا یہ اپنا انداز تھا۔

اتفاق سے وہ تھوڑی دیر قبل اپنی بیگم کے ساتھ سعید احمد کے ہاں سے لوٹے تھے۔ اس وقت صحن میں بیٹھے ہوئے دونوں وہیں کی باتیں کر رہے تھے کہ ملازم نے ابا میاں کے آنے کی اطلاع دی۔ ملاقات کے کرتے ہی وہ دیر تک قہقہے گونجتے رہے، پھر وہ تھم کر گویا ہوئے۔

"معلوم ہوتا ہے صاحبزادے کو ریسیو کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں کراچی۔"

"ایں......؟" ابا میاں نے ہکا بکا ہو کر ان کی صورت تکی۔

معراج الدین شرارت سے مسکرا کر بولے۔ "کیوں...... کچھ غلط کہہ گئے ہم؟"

ابا میاں نے ان کا سوال نظر انداز کر کے اپنا سوال جڑ دیا۔ "کیا...... فاخر آ رہا ہے؟...... مجھے تو خبر نہیں ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" معراج الدین نے ماتھا پیٹ لیا۔ "میری بھی مت ماری گئی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم تو چلو میں بتائے دیتا ہوں۔ ابھی ابھی میں سعید احمد کے ہاں سے آ رہا ہوں، مبارکباد دے کر۔ اپنے فرحت میاں کے ہاں، میرا مطلب ہے تمہاری بہو کی چھوٹی بہن کو اللہ تعالیٰ نے بیٹی سے نوازا ہے۔ وہیں فاخر کی وطن واپسی کی خبر بھی سنی۔"

ابا میاں بیک وقت دو خوشخبریاں سن کر خوش ہوئے۔ "واللہ آج تو تم نے خوش کر دیا۔ اللہ مبارک کرے۔ کسی روز چلیں گے ان شاء اللہ لیاقت علی مرحوم کے ہاں مبارکباد دینے۔ بھائی صاحب کے نیاز دوبارہ حاصل نہیں ہوئے۔ اب یہ بتاؤ کہ...... فاخر کب آ رہا ہے؟"

معراج الدین قہقہہ لگا کر بولے۔ "کب کیا؟...... بس چلو ریسیو کرنے۔"

ابا میاں نے عجلت میں ان کو گھر کے تمام حالات سے آگاہ کیا اور سرور باجی کی مکمل کیفیت بھی بتائی۔ حکیم صاحب کا مشورہ سن کر معراج صاحب بھی سوچ میں پڑ گئے۔ مگر اب وقت تھا، نہ موقع۔ شام سر پر کھڑی تھی۔ یعنی ایک دفعہ پھر وہی کی وہی صورتِ حال سامنے آ گئی تھی۔ وقت کم، مقابلہ سخت! چنانچہ جلد ہی دونوں ایک فیصلے پر پہنچ کر پُرسکون ہو گئے۔ ابا میاں کی جیپ ایک مرتبہ پھر گھر کی طرف دوڑنے بلکہ اڑنے لگی تھی۔

❖❖○❖❖

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

اپنوں سے ملنے کی خوشی کا رنگ ہی کچھ دوسرا ہوتا ہے۔ فاخر اور سعدیہ کے دل بھی بے پناہ مسرتوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ آج کتنے دنوں، ہفتوں اور مہینوں کی جدائی کے بعد یہ گھڑی آئی تھی کہ وہ ایک بار پھر بخیریت اپنے وطن کی سرزمین میں آ اترے تھے۔ خوشی ان کی انگ انگ سے پھوٹی پڑتی تھی۔

حقیقت میں دونوں بہت خوش نصیب تھے۔ ایک دو نہیں...... بہت سارے احباب انہیں ریسیو کرنے کے لئے ایئرپورٹ پر آئے ہوئے تھے۔

تمام کارروائی سے نمٹ کر انہوں نے اپنوں کی تلاش میں نگاہیں گھمائیں شاید زمین اپنے مرکز سے پلٹ چکی تھی۔

فاخر کو گویا سکتہ ہو گیا۔

انہیں ریسیو کرنے والوں میں ڈاکٹر سبحان اور ان کی فیملی، فرحت، سعید احمد اور حمید، معراج الدین صاحب کے ساتھ ابا میاں بھی کھڑے تھے وہ لوگ سب انہی کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان کے برابر میں چچی جان سیاہ برقع اوڑھے کھڑی تھیں۔ لمحے بھر دیر کو گویا تھم گئے تھے۔

✱●✱

ملے ہی آنسوؤں کے [illegible] تو [illegible]

بڑی لو ہے، ذرا آنچل بھگو لوں
وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے
کہاں ممکن رہا، اس سے نہ بولوں
میں چڑیا کی طرح دن بھر تھکی ہوں
ہوئی ہے شام تو کچھ دیر سو لوں

ہونی کو کوئی روک نہیں سکتا۔

کس کی مجال کہ ربّ کائنات کے معاملات میں دخل اندازی کر سکے!

سو حویلی کے مکین بھی لاکھ نہ چاہتے ہوئے وہ سب کچھ بھی خوشی اپنے ہی ہاتھوں کر بیٹھے جس کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

کوئی ایک دوسرے کو مورد الزام نہ ٹھہرا سکا اور سعدیہ حویلی کے اندر آ پہنچی۔ کسی کو اعتراض کرنے کی مجال تھی نہ منہ بنانے کا حوصلہ۔ سب فاصلے قدم بہ قدم طے ہو گئے تھے۔ دلوں میں کچھ ہی سہی، پیشانیاں تیوریوں سے مبرا تھیں۔ وقت ایسا ہی نازک اور پر ہول تھا۔ سب کی نگاہیں بیمار اور نڈھال پڑی سرور باجی پر لگی رہتی تھیں۔

خوشی خوشی سرزمین پاک کی طرف لوٹنے سے فاخر بے چارے کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ واپسی میں اپنی جان سے پیاری پھوپھی کو اس درجہ لاچار و بے بس پائے گا کہ ان کی زندگی کے لالے پڑ جائیں گے۔ وہ سب کچھ حتیٰ کہ سعدیہ تک کو فراموش کر کے ان کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک ہی جھٹکے نے اس کی ساری شگفتگی اور زندہ دلی چھین لی تھی۔ چند دن کے اندر اندر وہ ست کر رہ گیا۔

سعدیہ کا حال سب سے مختلف تھا۔

اوّل تو اتنی وسیع و عریض حویلی دیکھ کر ہی وہ دنگ رہ گئی تھی اور اوپر سے حویلی کے مکین...... وہ اندر ہی اندر سے کپکپا کر رہ گئی تھی۔

کسی سے حال دل کہنے سننے کا مقام تھا نہ موقع۔ فاخر کی دلی کیفیت اس کی صورت سے ظاہر تھی۔ ابتدائی لمحات میں تو وہ حقیقتاً گھبرا کر بلکہ چکرا کر رہ گئی تھی کہ اب کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بالکل نیا ماحول...... نئے لوگ! لیکن پھر جلد ہی اس کی فطری حوصلہ مندی عود کر آئی اور وہ حالات کے سامنے نہایت صبر و تحمل کے ساتھ سینہ سپر ہو گئی۔

حالانکہ چچی جان بذات خود ایئرپورٹ سے اتروا کر اپنے ساتھ حویلی لے کر آئی تھیں مگر یہاں پہنچ کر بیگانی اور لاتعلق سی ہو گئی تھیں۔ سعدیہ اس غیریت اور اجنبیت کو کوئی عنوان نہیں دینا چاہتی تھی اس لئے سب کی سرد نگاہی کو نظر انداز کر کے وہ بڑی پھپھو ساس کی تیمارداری میں جت گئی۔

سرور باجی کی حالت واقعی بہت تشویش ناک حد تک گر چکی تھی۔ تمام دن ان پر غفلت طاری رہتی۔ اٹھ کر بیٹھنا تو در کنار، وہ از خود کروٹ بدلنے پر بھی قادر نہ رہی تھیں۔ نہ آنکھ کھول کر دیکھتی تھیں نہ کسی کو پہچانتی تھیں۔ جسم کا داہنا حصہ مفلوج ہو چکا تھا۔ حویلی کا ہر فرد ان کے اس درجہ صاحب فراش ہو جانے کے تحت ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ چچی جان اور زمانی بیگم نے جھاڑ پھونک سے لے کر منتیں مرادیں تک مان لی تھیں۔

چچی جان نے ابا میاں کی بھی ایک نہ چلنے دی تھی اور مجال ہے کہ ڈاکٹر کو آنے کی اجازت دی ہو۔ حکیم صاحب کا علاج جاری تھا۔

زمانی بیگم کی جان سخت مصیبت میں آئی ہوئی تھی۔ پے در پے مشکلات نے انہی کو تاک لیا تھا۔ ایک طرف فاخر کی شادی والی خبر نے جان جلائی تھی تو دوسری طرف سرور باجی کی ناگہانی بیماری نے ہوش اڑا ڈالے تھے۔ اور ابھی یہ آفات ایک ناقابل یقین اور خوفناک خواب کی مانند احساسات کو جکڑے ہوئے تھے کہ ابا میاں اور چچی جان کی باہمی سازش فاخر اور اس کی دلہن کو متعارف کرانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

ان کا جی چاہ رہا تھا کہ کلیجہ پھاڑ کر موجودہ حالات کا قلع قمع کر ڈالیں مگر تقاضائے وقت کچھ اور ہی تھا۔ خود بھی بھاری بھرکم شخصیت تھیں۔ وقت کی نزاکت کا عمل اور ادراک تھا ان کو۔ تاہم انہوں نے فاخر کی دلہن کو ایک نظر بھی بغور دیکھ لینے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

فاخر اور سعدیہ کے آنے سے قبل گھر کی خواتین کا زیادہ وقت سرور باجی کے کمرے میں گزرتا تھا مگر ان دونوں کے آتے ہی یہ بیٹھک درہم برہم ہو گئی۔ دن رات کے جن جن اوقات میں سعدیہ ان کے پاس موجود ہوتی، کوئی بھی وہاں جانا پسند نہ کرتا بلکہ خواتین کی یہ محفل حسب معمول بیرونی برآمدے والے کمرے میں آراستہ ہونے لگی تھی۔ یہ سعدیہ سے گریز اور لاتعلقی بہت واضح تھی۔ اس بیگانگی کو محسوس کر کے سعدیہ کا دل سہم سا گیا تھا۔ تاہم فاخر اس احساس سے عاری لگ رہا تھا۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ایک شام چچی جان پاندان صاف کرتے ہوئے بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

"اس گھر کا تو باوا آدم ہی نرالا ہو گیا ہے...... کوئی بن میں ہے تو کوئی من میں...... ویسے ہی سرور کے ناگہانی پڑ رہنے سے دل کو پنکھے لگے رہتے ہیں۔ طبیعتوں میں ایسی وحشت سمائی رہنے لگی ہے کہ تمام تمام دن جلے پیر کی بلی بن کر گھومتے رہتے ہیں ہم۔ کسی پل چین ہے نہ قرار۔ بلکہ یوں لگ رہا ہے کہ کسی کو کسی کی فکر رہی ہے نہ فاقہ۔ ہر کوئی اپنی اوجھڑ بن میں مبتلا رہنے لگا ہے۔ وہ تو شکر ہے ماماں قاعدے قرینے کی ہیں۔ سرور کی خدمتوں اور ریاضتوں کا نتیجہ ہے کہ آئے گئے اور عیادت کرنے والوں کو با آسانی اور ہنرمندی سے سنبھال لیتی ہیں۔ ورنہ تو کوئی بھی پرسان حال رہا نہیں ہے۔"

وہ اپنی رو میں بولے جا رہی تھیں کہ کب زمانی بیگم آ کر بیٹھیں انہیں معلوم بھی نہ ہو سکا۔ ان کے پان طلب کرنے پر چونکیں۔

"ارے تم کب آئیں زمانی؟" انہوں نے پان لگاتے ہوئے دریافت کیا۔

زمانی بیگم نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "آپ کی بڑبڑاہٹ سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

چچی جان نے انہیں گھوری دیتے ہوئے فوراً اقرار کیا۔ "ہاں بھئی...... جو تمہاری گھر گرہستی کا چلن ہو گیا ہے آج کل اسے دیکھ کر ہمارا تو جی جلتا ہے۔ اگر جو تربیت یافتہ کام کرنے والی نہ ہوتیں تو شاید باورچی خانہ الٹا پڑا ہوتا۔ کبھی ایسے اوسط سے دستور تھے یہاں کے؟"

زمانی بیگم نے خاموشی اختیار کر لی۔ ان کی بات کا جواب نہ دیا۔

چچی جان نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

"تم تو چپ کا گڑ کھا کر بیٹھ رہیں۔ [illegible] سے کھیلو اور جان شسق میں پڑ گئی ہماری۔ سرور نے پلنگ پکڑ لیا۔ تم نے چپ کی چادر اوڑھ لی۔ شگفتہ اپنے بچوں میں الجھی رہتی ہے۔ چلتے کو رہ گئے ہم اکیلے۔ خدا جانے کس کم نصیب کی نظر بد لگ گئی ہمارے آشیانے کو۔ کیسی بلبلیں چہکتی تھیں یہاں۔ اب سناٹے پڑ گئے۔"

چچی جان آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

زمانی بیگم نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گزریں۔ "وہ تو آ گئیں "آپ لوگوں" کی لائی ہوئی بلبل۔ اب خوب چہکار کریں گی اپنے خسر صاحب کے گلشن میں۔ تب سارے سناٹے دور ہو جائیں گے۔"

چچی جان ان کے غیر متوقع جواب سے سناٹے میں رہ گئیں۔ چند لمحے گم صم رہیں۔ جی نہ مانا تو آہستہ سے جواب دیا۔

"ان کا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے۔ تم نے کون سا ان کو "بہو" کا درجہ دیا؟"

زمانی بیگم کا لہجہ مزید طنزیہ ہو گیا۔ تپ کے بولیں۔

"ہم کس کھیت کی مولی ہیں اور ہمارا کیا حق ہے بھلا؟...... بہو بیگم کا درجہ دیں نہ دیں۔ آپ اور آپ کے وہ "بھتیجے صاحب" کو اختیار ہے۔ وہ جانیں اور آپ جانیں۔ ہمیں کس قطار شمار میں سمجھا گیا ہے۔ نہ ہمیں شوق ہے کسی کے بھی معاملات میں دخل اندازی کا۔"

چچی جان ان کی وجۂ ملال خوب سمجھ رہی تھیں۔ آج ان کے بول جانے کو غنیمت جان کر سمجھانے لگیں۔ "دیکھو زمانی! تم ہماری طرف سے اپنا دل قطعی صاف کر لو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم یاور میاں کے ساتھ سازش کر کے کراچی گئے تھے۔ اوپر والا گواہ ہے کہ جو کچھ ہوا، سرور کی خاطر ہوا اور وہ بھی حکیم صاحب کے مشورے کی وجہ سے۔ لہٰذا ہم بھی مجبور ہو گئے اور یاور بھی۔ ورنہ ایسی ہرگز کوئی

بات نہیں ہے کہ تمہاری بحث میں یہ سب کچھ ہوا ہے۔ نہ سرور، دشمنوں کے کان بہرے، ایسی جانکنی کے عالم میں مبتلا ہوتیں اور نہ یہ واقعہ رونما ہوتا۔ دیکھو اپنے دل و دماغ میں کسی بدگمانی کو جگہ ہرگز مت دو۔ اس طرح دلوں میں فاصلے پیدا ہو جائیں گے۔ ویسے ہی شگوفہ کا خیال آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے اور اپنے دلاور حسین سے شرمندگی دوچند ہو جاتی ہے۔"

زمانی بیگم نے ایک دلدوز آہ بھری۔ ان کے چہرے کے دلآویز نقوش پر تلخیوں کا غبار چھا گیا۔

شگفتہ بھی کسی طرف سے نکل کر قریب آ بیٹھیں اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں کہ موضوع گفتگو کیا تھا اور ان کی ساس کیوں اس قدر دلگیر اور سنجیدہ ہو رہی ہیں۔

چچی جان نے شگفتہ پر اک نظر ڈال کر کہا۔ "اب دیکھو...... یہ شاکر کی دلہن ہی جانے ہمیں کیا سمجھ رہی ہوں گی۔ حالانکہ ہمارا مولا گواہ ہے کہ ہم ہوائی اڈے سے ان دونوں کو لانے کے لئے فقط سرور کی محبت میں دوڑے چلے گئے تھے اور ہمیں لے کر جانے والے تھے یاور میاں۔"

زمانی بیگم پہلے ہی سلگ رہی تھیں۔ مزید بھڑک اٹھیں۔ جب بولیں تو ان کے انداز میں طنز کے علاوہ بے پناہ تلخی بھی عود کر آئی۔

"وہی تو "بس کی گانٹھ" ہیں جو سازش کر کے آپ کو ساتھ لے گئے۔ پھر آپ دونوں ہماری عزت کی دھجیاں کو ہمارے سینے پر مونگ دلنے کے لئے حویلی کے اندر لے آئے۔ انہوں نے کب ہمارے ساتھ دشمنی نہیں کی؟ یہ ہر بات کی گواہ ہیں۔ بچپن سے ہی فاخرہ کو ہم سے جدا رکھنے والے کون ہیں؟ ان کی [illegible] ہمیں بھی [illegible] کر دوا؟ دلوں میں بیج کدورت کا بونے والے ہی تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہے ہیں۔ چچی جان! ہمارا دل اندر سے گواہی دے رہا ہے کہ فاخرہ کی شادی کروانے میں سو فیصد انہی کا ہاتھ ہے۔ مگر صد افسوس کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔"

ماحول ایک دم ہی بہت حساس اور گرم ہو گیا تھا۔

زمانی بیگم کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت سخت طیش میں تھیں۔ چچی جان دم بخود تھیں اور انہیں چھیڑ کر پچھتا رہی تھیں۔

شگفتہ بھی بہت سارے دکھڑے بھری بیٹھی تھیں۔ ضبط نہ ہو سکا تو اپنی خالہ جان کے شانے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

انہی بولتے لمحات میں سعدیہ ان سب سے بہت ہی قریب کھڑی سب باتیں، سارے جملے سن رہی تھی۔ کھلی آنکھوں سے ایک ایک چہرے کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ قیامت خیز دھماکوں کی زد پر تھی اس کی ہستی۔ دل پہلو میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزے جا رہا تھا۔

کانپتے وجود کے ساتھ وہ اپنے کمرے میں تو بہت دیر تک مسہری کی پشت سے ٹیک لگائے حالات پر غور کرتی رہی۔ کہیں دور تک بھی اسے اپنا قصور یا خطا نظر نہیں آ رہی تھی۔ نہ سب کی برگشتگی کے اسباب۔

کبھی اسے اپنا وجود قطعی بے وقعت اور حقیر لگ رہا تھا اور کبھی غیر اہم اور فالتو ہونے کے باوجود وہ ایک سہما ہوا آنسو بن گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اندر کی ٹوٹ پھوٹ نے اسے حواس باختہ اور ہراساں کر ڈالا تھا۔

الجھی ہوئی سوچوں کی ڈور سلجھاتے سلجھاتے وہ بہت دور نکل گئی۔ گزرتے وقت کا احساس جاتا

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

رہا۔ اس کے بے چین و بے قرار وجود پر خود فراموشی سی چھاتی چلی گئی اور وہ یہ بات بھول ہی گئی کہ سرور باجی کے کمرے سے وہ کس کام کے لئے نکلی تھی اور فاخر ان کے پاس اکیلا ہوگا!

سورج مغرب کی پناہ گاہوں میں ڈوب جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا اور در و بام پر شام کے سائے اتر آئے تھے تب فاخر فکر مند ہو کر بچی کو سرور باجی کے پاس چھوڑ کر سعدیہ کی تلاش میں باہر آیا۔ تاہم سب سے پہلے اس نے اپنی خواب گاہ میں جھانکا اور حیران رہ گیا۔ سعدیہ نہایت بے ترتیبی کے ساتھ چت پڑی بے خبر سو رہی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر دھیرے سے اس کی پیشانی چھوئی۔ حرارت نارمل تھی۔ سعدیہ سبک سبک سے سانس لے رہی تھی۔

وہ قریب سے بغور اس کی من موہنی صورت تکنے لگا۔ یک بیک دل کے تہہ خانوں میں کسی نامعلوم سے ملال نے پنجے گاڑ لئے۔

شاید...... سعدیہ کسی ٹینشن میں ہے...... بے چاری وطن چھوڑ کر اپنوں سے مل لیتا تو دور کی بات کسی کو دیکھ بھی نہ پائی اور میں اسے قطعی مختلف ماحول میں کھینچ لایا...... آفرین ہے اس کی سعادت مندی پر کہ زبان سے اُف تک نہ کی؟

فاخر کی آنکھوں میں لازوال محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

حادثوں کی دھوپ میں جل کر
چہرۂ زندگی [illegible] ہے

معطر زور سے قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔

ونڈ پمپ کے قریب بیٹھی ہوئی نازیہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ برآمدے میں وہ اور کرائے داری آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔ معطر بچی کو گود میں لئے تھی اور محبت پاش نگاہوں سے اس کی ننھی سی صورت دیکھے جا رہی تھی۔ اماں بی اسی وقت اٹھ کر باورچی خانے میں گئی تھیں۔

نازیہ کے کانوں میں اس کے چہچہا کر بولنے کی آواز سنائی دی۔ ”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ لڑکی ہوگی۔ دیکھ لو وہی ہوا نا آخر۔“

اماں بی نے آ کر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”کیسے بھئی...... تمہیں کیسے پتہ چلا بھلا؟“

معطر اترا کر بولی۔ ”قیافہ بھی کوئی چیز ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں، نازیہ کی چال کس قدر بدل گئی تھی۔ اور سب سے بڑی بات کہ کتنی نیند آتی تھی اسے۔ جب دیکھو پڑی سو رہی ہے۔ جب دیکھو پڑی سو رہی ہے۔ میں نے تو جبھی کہہ دیا تھا لڑکی کا۔“

کرائے دارنی کا جی نہ مانا، بول پڑی۔ ”پہلے پہل کا معاملہ تھا۔ پہلوٹھی کے بچے میں تو کسی کو بھی اس طرح منہ بھر کر نہیں کہہ دینا چاہئے۔ ایک ہی تو دنیا میں تمہارے بھائی بھاوج ہیں۔“

مگر آج معطر کو کرائے دارنی کی دخل اندازی ذرا بھی بری نہ لگی۔ ہنس کر فخریہ انداز میں جواب دیا۔ ”اس سے کیا ہوتا ہے...... سچ تو سچ ہی رہتا ہے۔“

اب نازیہ بھی ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ اماں بی کو بیٹی کی جہالت آمیز باتوں سے سخت خفت ہو رہی تھی۔ بات رفع دفع کرنے کے لئے بے نیازی سے بولیں۔

”ہماری تو آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے بچی۔ بہت خوش ہیں ہم۔ اللہ کسی کو کسی طرح کی آزمائش میں نہ ڈالے۔“

”بالکل سچ کہا آپ نے۔“ کرائے دارنی نے اقرار کیا۔ ”آپ کے اور ہمارے گھر میں ویسے بھی خاموشی ہی خاموشی رہتی تھی۔ اس ننھی بٹیا کی قلقاریاں اب ہمارے سونے آنگن میں بھی گونجا کریں گی...... اولاد جنت کا میٹھا میوہ ہوتی ہے۔ خواہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ ہمیں دیکھو! آج شادی کے اٹھارہ بیس سال کے بعد بھی اس نعمت کے لئے ترس رہے ہیں۔“

اماں بی خاموشی سے بیٹھی ترکاری بناتی رہیں۔

معطر کھلکھلا کر بولی۔ ”اب تو کسی کو بھی گھر میں خاموشیوں کا شکوہ نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے بچوں نے ہمیشہ کے لئے اس شکایت کا خاتمہ کر ڈالا ہے۔“

اس دفعہ کرائے دارنی کی بجائے اماں بی نے جواب دینا ضروری سمجھا۔ ”اللہ رکھے تمہارے بچے تمہارے گھر کے ہیں......“

معطر نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی اور جم کر بولی۔ ”تمہارے گھر کے ہیں“ سے کیا مطلب ہے آپ کا اماں جی؟...... آپ بھی تو جانتی ہیں میرا۔ کتنی دفعہ میں کہوں کہ اب مجھے کہیں نہیں رہنا سوائے اس گھر کے۔“

اماں بی نے بنی ہوئی ترکاری کی ڈلیا نازیہ کو دے کر باورچی خانے میں بھیج دیا اور بیٹی کی طرف بغور دیکھتی ہوئی سنجیدگی سے بولیں۔

”یہ تو اب ہم خوب جان چکے کہ تم ہر گز اپنی سسرال میں جا کر نہ بسو گی۔ جتنی تم نے شرافت میاں کے ساتھ بدتمیزیاں کیں اور پھر نازیہ کے سامنے بھی جو حقارت سے کہہ دیا کہ ”ملتان نہ جاؤں گی“ یہ باتیں کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں رہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہاری ساس کی نیک فطرت اور صلح جو خاتون روئے زمین پر ہونا ممکن نہیں ہے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ شرافت کی شریف النفسی اور بے عمل امن پسندی کو دعائیں دو۔ ورنہ ایسی باتوں پر تو ماقبت نااندیش لڑکیاں مطلقہ کہلاتی ہیں۔ نامعلوم ہماری کون سی نیکی آڑے آ گئی ورنہ تم نے تو شیا ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ بے شک نازیہ نے کھلے دل سے شرافت میاں کو اجازت دے دی ہے کہ اپنے گھر کے سکون کی خاطر وہ یہیں سکونت اختیار کر کے اپنا کام دھام جما سکتے ہیں...... لیکن یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ تم مستقل رہائش کے لئے اسی گھر......“

معطر نے بے صبری سے ان کی بات کاٹ دی اور تیزی سے بولی۔

”اماں! آپ نے تو پوری داستان امیر حمزہ سنا ڈالی۔ اب جو باقی بچ گیا وہ کہہ ڈالئے۔ لیکن میرا فیصلہ ہر صورت میں یہی رہے گا کہ مجھے یہاں...... اسی گھر میں رہنا ہے۔ کہیں الگ نہیں جانا۔“

”اے واہ لڑکی!“ اماں بی کو اچانک طرارہ سا آ گیا مگر اس سے قبل کہ وہ سخت سی کوئی بات کہتیں، کرائے دارنی نے نامحسوس انداز میں ان کا گھٹنا دبا دیا۔

انہوں نے غیر ارادی طور پر سنبھالا لیا تاہم لہجے کی تلخی برقرار رہی۔

”دیکھو معطر! ہماری قوت برداشت کا امتحان مت لو۔ جو ہم نے کہہ دیا، سو کہہ دیا۔ بہن بیٹی اپنے گھر میں ہی رہتی ہوئی سجتی ہے۔ عقلمند لڑکیاں میکے جاتی ہیں مگر اعتدال کے ساتھ۔ اب تم اگر ملتان کو خیر باد کہنے کا ارادہ کر ہی بیٹھی ہو تو اپنی اس خوش نصیبی پر شکر کے سجدے کرو کہ تمہارے میاں بھی تمہاری

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

ایسی بھاری بھرکم فرمائش پوری کرنے پر آمادہ ہیں اور فرحت کے ساتھ مل کر اپنی روزی روزگار کے لیے جدوجہد میں مصروف ہو گئے ہیں۔ اب اس انتقام کے بعد اگلا مرحلہ ہوگا علیحدہ گھر لینے کا۔ خواہ وہ کرائے کا ہی کیوں نہ ہو!"

اماں بی کے خاموش ہوتے ہی معطر تھے سے اکھڑ گئی۔ اس کی تیوریوں پر دسیوں بل پڑ گئے۔ چیخ کر بدتمیزی سے بولی۔

"اماں! زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنے داماد کو منع کر ڈالئے کہ وہ ہماری یہ بھاری بھرکم فرمائش پوری نہ کریں تاکہ ہمیں خانماں برباد دیکھنے کی جو آرزو آپ کے اور آپ کی چہیتی بہو بیگم کے جی میں ہے وہ پوری ہو جائے۔"

بالکل دل ایک غلیظ تہمت لگانے کے بعد معطر نے بھی رونا شروع کر دیا۔

اماں بی کو سخت غصہ آ رہا تھا تاہم قدرے نرمی سے بولیں۔ "رو دھو کر اپنی طبیعت خراب کر و نہ دوسروں کو پریشان۔ خود ہی ٹھنڈے دل اور دماغ سے سوچو۔ جب بھی اختلاف کی کوئی بات نکلے تم فوراً ہر طرح کا الزام اطمینان سے فرحت کی دلہن کے سر تھوپ دیتی ہو۔ ذرا غور کرو، یہ بات غیر واجب ہے یا نہیں؟ وہ بھی تم سے لڑی جھگڑی؟"

معطر نے بگڑ کر جواب دیا۔

"بہتیرے لوگ لڑ جھگڑ کر اپنا نام بدنام نہیں کیا کرتے بلکہ اندر سے جڑیں کاٹ کر کھوکھلا کر دیا کرتے ہیں۔ آپ اس کے سکھانے پڑھانے میں آ کر عنقریب اپنی ہی بیٹی کی اولاد سے متنفر ہوتی رہیے۔ اس گھر کے قانون میں اب انصاف رہا ہی کہاں ہے جو اب ہمیں نصیب ہوگا۔"

اماں بی عاجز ہو کر بولیں۔ "تمہارے ساتھ ایک بات کے اندر دو جواب ہوتے ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ تم الگ گھر لے کر رہو گی۔"

"ہرگز نہیں۔" اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "مجھے کوئی اس گھر سے ہلا نہیں سکتا۔ فرحت نے سب کے سامنے اس بات کا اقرار کیا تھا۔ میں آج بھی آپ سب کے سامنے اعتراف کروا دوں گی۔"

"وہ ہے کون ان معاملات میں دخل انداز ہونے والا؟" اماں بی نے چیخ کر کہا۔ "ابھی ہم زندہ بیٹھے ہیں سب اچھے برے کے فیصلے کرنے والے۔ تم نے بہت دنوں سے بہت شر پھیلا رکھا ہے اس گھر کے ماحول میں مگر اب انتہا ہو چکی ہے۔ مجال نہیں ہے کسی کی کہ ہمارے آگے بول سکے۔"

"اماں جان!" وہ اچانک پنے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے ضد دلا کر بہت پچھتائیں گی آپ کی بہو بیگم۔ یاد رکھئے! مجھے نیچا دکھانے کا ان کا کوئی ہتھکنڈا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں بھی اپنے نام کی ایک ہوں۔"

پھر اماں بی کے بولنے سے پہلے ہی پیر پٹختی ہوئی باورچی خانے کی طرف گئی اور باہر کھڑے ہو کر زور سے بولی۔

"یہ جو تم آلو میتھی کی بھجیا پکا رہی ہو تو نہیں کھائیں گے وہ تمہارے نندوئی صاحب۔ کوئی ڈھنگ کا کھانا پکا لیا کرو ان کے لئے۔ ہماری بھی عزت کا سوال ہوتا ہے۔"

اندر نازیہ کا جو بھی حال ہوا ہو، اس کا آرڈر سن کر کرائے دارنی اور اماں بی ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگیں۔

لیکن معطر کسی پر توجہ دیے بغیر گردن اکڑائے قریب سے گزر گئی۔

"سنا تم نے؟" اماں بی نے ایک طویل سانس لے کر کرائے دارنی کو مخاطب کیا۔ "اب ہم ایسے گزرے ہو گئے کہ ایک داماد کی قدر و منزلت نہیں کر سکتے اور جیسے ابھی کی توجہ دلانے سے تو اس گھر کے کام سنورتے ہوں گے۔ اپنے مزاج کا باؤلا پن نظر نہیں آتا کہ بھاوج تو بھاوج، شوہر سے بھی بنا کر نہیں رکھ سکتیں۔"

ان کے چلے جانے کے انداز کو نظر انداز کر کے کرائے دارنی بیگ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لیکن اماں بی ان لمحات میں بہت تاؤ کھائی ہوئی تھیں، جلبل کر کہنے لگیں۔

"رنگ ڈھنگ دیکھے تم نے اس عقل سے پیدل لڑکی کے۔ کیسی مفت خدا میں پنجے جھاڑ کر نازیہ کے پیچھے لگی ہے۔ تم خود ایمان سے کہنا، بھی وہ منہ لگتی ہے ان کے۔ کیسے گھڑی گھڑی نادر شاہی انداز میں احکامات جاری کر کے چلتی بنتی ہیں جیسے وہ ان کی لونڈی غلام ہو۔ کسی کی شرافت کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اسے پیر کی جوتی سمجھ لیا جائے۔ اللہ کا کرم ہے وہ بھی کسی اشرافی گھرانے سے تو نہیں ہے۔ ماشاء اللہ بھرے پرے گھر سے آئی ہے۔ ابھی تم نے دیکھا بیگ کے سوا مہینے تک سعید احمد کے ہاں سے ایک نہ ایک مسلسل خیر گیری اور گھر کا کام نظام سنبھالنے کے لئے آتا جاتا رہا ہے۔ معطر کی زبان سے بھی برابر خدشے میں گھری رہتی کہ کہیں کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔ وہ تو شکر ہے خدا کا کہ وہ لوگ بھی بہت قاعدے قرینے کے ہیں۔"

وہ ذرا کی ذرا تھمیں تو کرائے دارنی نے دلاسہ دیا۔ "چھوڑیے آپ بھی۔ جی کو مت لگائیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کیا ٹھیک ہو جائے گا؟" وہ ہوئی کے عالم میں بڑبڑا کر بولیں۔ "ہم نہیں جانتے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ ہر طریقے سے اسے سمجھا کر تھک گئے مگر ان کی وجہ عداوت بھی معلوم نہیں ہوئی۔ پہلے تو ابھی شوہر والی ہو کر ان کی کمبخت عقل۔۔۔ معلوم نہیں کیا کیا فتور ہو گیا ہے۔ اور کچھ نہیں تو ایسی شبے میں مبتلا رہتی ہیں کہ نازیہ انہیں ستاتی رہتی ہے۔ حد ہوتی ہے بدگمانی کی۔ خود غور کرو اگر ایسی تمام باتیں نازیہ فرحت سے کہنا شروع کر دے تو کیا ہوگا؟ یہ اس کی انتہا سے زیادہ شرافت ہے نا کہ ان کے رہتے جاتے ہوئے تمام زیادتی خندہ پیشانی سے سہتی رہتی ہے۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت...... ہوگی کوئی بہو یا بھاوج ایسی فراخ دل اور گھر کو گھر سمجھنے والی؟"

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا کلیجہ معطر کی اوچھی بوگی کارگزاریوں نے پھونک ڈالا ہے۔ ابھی بیگ ہی کتنی سی ہے اور دلہن دن رات ہانڈی چولہے میں سر دیے بیٹھی رہتی ہے۔ غریب آرام بھی نہ کر پائی اور چولہے چکی میں پھنس گئی۔ ادھر ہم کسی کام کے ہیں نہ کاج کے۔ بہتیرا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں، کچھ بنائے نہیں بنتا۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ ہماری صاحبزادی کے مزاج تب بھی ٹھکانے نہیں آتے۔ اتنی گری ہوئی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہیں کہ سننے والے دانتوں میں انگلیاں داب لیں...... اسی لئے ہم تو اب یہ چاہتے ہیں کہ یہ نہیں ملتان جانا چاہتیں تو نہ جائیں۔ جب ان کی ساس ہی یہاں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے گئی ہیں تو ہم کون اعتراض کرنے والے۔ ہاں...... مگر یہ ضرور چاہتے ہیں کہ وہ اپنا گھر بار لے کر سکون اور آرام سے علیحدہ رہیں۔ اپنی ذمے داریاں خود نبھائیں۔ نہ دوسروں کو زیر بار اور پریشان کریں نہ خود پریشان ہوں۔"

معطر جو ایک ستون کی آڑ میں کھڑی کان لگائے سن رہی تھی، کلبلا کر آڑ سے باہر نکل آئی اور غصے سے منہ لال کر کے بولی۔

Famous Urdu Novels

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"پریشانی اور حیرانی دنیا میں کسی کو بھی لاحق نہیں ہے سوائے آپ کی بہو رانی کے۔ انہی نے آپ کو یہ پٹی پڑھائی ہے کہ معطر کو اس گھر سے بے دخل کر دو۔ ورنہ آپ کبھی بھی اس طرح منہ بھر کر یہ بات کہہ سکتی تھیں نہ سوچ سکتی تھیں۔ لیکن وہ شاید اس سچائی سے لاعلم ہیں کہ میں بھی بہت ضدی ہوں۔ جو سوچ لوں وہ بالآخر کر ضرور گزرتی ہوں۔ کسی کی طاقت نہیں کہ میرے راستے میں آئے اور اس گھر میں رہنے سے روک سکے۔ میں یہیں کھڑی ہوں اگر ہمت ہے تو سامنے آ کر بات کرے۔"

نازیہ جو بجیا کے علاوہ سفید قورمے کی دوسری ہنڈیا بھی تیار کر چکی تھی اور باورچی خانے سے باہر نکلنے کا قصد کر رہی تھی، ٹھٹک کر وہیں تھم گئی۔ اماں بی اور کرائے داری بھی دم بخود ہو کر معطر کی طرف دیکھنے لگیں۔ کولہوں پر ہاتھ رکھے تھانیداری کی طرح اکڑی کھڑی تھی اور باورچی خانے کی طرف ایسے کڑے تیوروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اپنی مخاطب کو کچا چبا جائے گی۔ نازیہ کو جھرجھری سی آ گئی۔ سینے میں دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

تھوڑی دیر تک ناگوار سا سکوت طاری رہا۔ پھر اماں بی نے سنبھالا لیا اور اسے ملامت آمیز نظر سے دیکھ کر بولیں۔

"شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں کے یہ چلن نہیں ہوا کرتے جو تم نے اختیار کیے ہیں۔ یہ ہمارا گھر ہے، پانی پت کرنال کا میدان یا کسی پہلوان کا اکھاڑا نہیں ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر بڑھکیں مارو نہ کسی کو للکارو۔ تمہاری اپنی عجیب و غریب حرکتوں کی وجہ سے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم خیر و عافیت اس زندگی سے فراغت پالو تو اپنے علیحدہ گھر کو بساؤ۔ خدا تمہیں اور تمہارے بچے کو رسائے بسائے۔"

کرائے داری نے زور سے پکارا۔ "آمین!"

معطر جل بھن کر کباب ہو گئی۔ تلخ سوچوں نے اسے اندر سے باہر تک کنجیوں کے ڈھیر میں چھپا ڈالا تھا۔ اماں بی کے جواب سے بے پناہ غم و غصے سے تاؤ آ گئی۔ چلا کر بولی۔

"علیحدہ گھر، علیحدہ گھر...... سن سن کر میرے کان پک گئے۔ نہیں جانا مجھے علیحدہ گھر میں...... بھاڑ میں گیا علیحدہ گھر اور بھاڑ میں گئی زندگی۔ آپ بھی سمجھی ہوں گی میں ان باتوں میں آ جاؤں گی؟ یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ ان مہارانی صاحبہ کے لیے یہ گھر آنگن چھوڑ کر میں کہیں بھی نہیں جانے کی۔ خوب اچھی طرح سن لیجئے۔"

اپنی بات ختم کر کے جوش غضب میں اس نے چاہا کہ پلٹ کر اپنے کمرے میں جا گھسے کہ پیر رپٹا اور وہ چاروں شانے چت ہو گئی۔

چشم زدن میں کچھ سے کچھ ہو گیا۔

ایک لمحہ پہلے وہ تکبر سے گردن اکڑائے بھنا رہی تھی، دوسرے لمحے زمین پر پڑی خاک چاٹ رہی تھی۔ رہے نام اللہ کا! تھوڑی دیر تک کسی کی عقل میں نہ سما سکی کہ یہ پل کی پل میں کیا ہو گیا؟ اور اب کیا ہوگا؟

نازیہ جو ابھی تک باورچی خانے میں پناہ گزین تھی، بالکل ہی بے خبر رہی، پھر سب سے پہلے لپک کر کرائے داری اٹھ کر بھاگی۔

اماں بی کی چیخ پر نازیہ گھبرا کر باہر نکلی۔ معطر ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہی تھی۔

⁂●⁂

شام کے ساڑھے پانچ بجے ہوں گے۔

سوتے سوتے اچانک ہی سعید احمد کی آنکھ کھل گئی۔

بھرا بھر گرمیوں کے دن تھے۔ اسکول سے واپس آ کر وہ سیدھے نماز ظہر پڑھنے پہلے مسجد چلے جاتے اور دوپہر کا کھانا کھاتے ہی نیند سوار ہو جاتی۔ بچے بھی اندر کمروں میں پڑ کر سو رہتے۔ سعید احمد نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ دوسری چارپائی پر بیوی بھی تکیے کا غلاف کاڑھتے کاڑھتے سو گئی تھی۔

گرمی کی دوپہر میں یہ لوگ باہر کے برآمدے میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔

اس وقت چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ صحن میں پیلی پیلی دھوپ بکھری تھی۔ شام دور تھی۔ دوپہر سنسنا رہی تھی۔

انہیں اپنے خلاف معمول جاگ جانے پر حیرت ہوئی۔ برقی پنکھا بھی چل رہا تھا اس لیے گرمی اور گھٹن بھی زیادہ نہ تھی۔ باہر سے کسی خوانچے والے کی پکار بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔

کافی دیر تک وہ دم سادھے خاموش لیٹے رہے، پھر دھیرے سے اٹھے اور ایک گوشے میں رکھی صراحی سے نقشین کٹورے میں پانی بھرنے لگے۔ ذرا سی آہٹ ہوئی تو بیوی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور آنکھیں مچ کر انہیں دیکھنے لگیں۔

وہ پانی پی کر دوبارہ آ لیٹے اور آہستہ سے بولے۔ "نیند ہی اچٹ گئی۔ جانے کیوں۔"

"ہو جاتا ہے کبھی یوں بھی۔ میں تو ابھی جاگ رہی تھی، کاڑھتے ہوئے اونگھ آ گئی۔" بیوی نے جمائی لے کر جواب دیا۔ اٹھ کر باہر گئیں۔ تھوڑی دیر میں واپس ہوئیں تو وہ بھی صراحی کے قریب جا بیٹھیں اور پانی پی کر کہنے لگیں۔ "اللہ میری توبہ...... کس قدر لو ہے باہر...... چرند پرند بھی ہانپ رہے ہوں گے۔"

سعید احمد نے پوچھا۔ "حمید مجید کہاں ہیں؟"

"اندر کمرے میں پڑے سو رہے ہیں۔" بیوی نے چھالیہ کترتے ہوئے جواب دیا۔ "دوپہریں اتنی گرم آ گئی ہیں کہ اب باہر نہیں نکلتے۔ کوئی پاگل ہی ہوگا جو اتنی گرم لو کے جھکڑوں میں گلی کوچوں میں گھومے گا۔"

تھوڑی دیر تک گہری خاموشی چھائی رہی۔ بس پنکھے کی گھوں گھوں اور سروتہ چلنے کی "کٹر کٹر" ابھرتی رہی۔

کروٹیں بدلتے بدلتے سعید احمد اکتا کر اٹھ بیٹھے اور سستی سے بولے۔

"بیٹیوں کے چلے جانے سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ ابھی ایک ہانک پر دس پیالی آ جاتی چائے کی۔ مگر اب مجبوری آن پڑی ہے۔"

بیوی حیرت سے انہیں تکنے لگیں پھر انہیں ہنسی آ گئی۔

"بہت چالاک ہیں آپ۔ گھما کر ہاتھ ناک پکڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ سیدھی طرح کہہ دیں کہ چائے چاہیے۔ ویسے اس قدر دوپہر میں؟"

وہ بھی ہنس پڑے۔ "گرمی، گرمی کا توڑ ہوتی ہے بیگم صاحبہ!"

وہ فریم رکھ کر مسکراتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

باورچی خانے کی طرف سے کوئلہ دہکنے کی مخصوص خوشبو کے ساتھ کھولتی ہوئی چائے کی مہک ایک

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

خوشگوار سندیسے کی طرح گھر کی فضا میں چکرائی اور ذرا سی دیر میں بیوی دو پیالی چائے لیے آموجود ہوئیں۔

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔" سعید احمد نے خوش ہو کر پیالی تھام لی اور مزے مزے سے چسکیاں لینے لگے۔ "ویسے...... ایک زبردست خوشخبری ہے ہمارے پاس آپ کے لیے۔"

"وہ کیا بھلا؟" بیوی نے پیالی رکھ کر اشتیاق سے پوچھا۔

وہ چائے پیتے ہوئے شوخ نظروں سے انہیں دیکھتے رہے اور ان کی بے چینی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

"اب کہہ بھی چکیں!" انہوں نے اکتا کر اصرار کیا۔

سعید احمد نے خالی پیالی ایک طرف رکھ دی اور ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"بات یہ ہے بیوی کہ...... ہمارے علاقے میں سوئی گیس آ پہنچی ہے۔ لکڑی کوئلے سے خواتین کو نجات ملنے والی ہے۔"

"ہائے اللہ، سچ!" بیوی اچھل پڑیں۔ "قسم کھائیے...... آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟"

"آپ کے سرِ عزیز کی قسم، سچ کہہ رہے ہیں۔"

"بھئی واہ...... آپ نے تو بہت اچھی خبر سنائی۔ آپ کے منہ میں گھی شکر۔"

"لیکن ایک بات ہے۔" وہ انہیں چھیڑنے پر آمادہ تھے۔ "زیادہ خوشی آپ کی بجائے ہماری بیٹیوں کو منانے کا حق ہے۔"

"کیوں؟...... بھئی کیوں؟" انہوں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہ یوں کہ بھئی باورچی خانے کے کام کا زیادہ تعلق تو ہماری بیٹیوں سے ہی ہے۔ آپ کو کہاں ہلنے دیتی ہیں وہ۔ وہ آجائیں تو بہت خوش ہوں گی سن کر۔"

"خیر...... اس میں بھی شک نہیں۔" بیوی نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"ابھی تو خدا خیر کرے انہیں نازیہ کے ہاں سے آنے میں کچھ دن لگ جائیں گے۔" سعید احمد سنجیدہ ہو گئے اور فکرمندی سے دریافت کیا۔ "کیسی ہیں اب فرحت کی ہمشیرہ؟...... پرسوں تم گئیں ان کے ہاں؟"

بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ "کچھ مت پوچھیے...... وہاں کے حالات تو واقعی بہت ابتر ہیں۔ نازیہ کی تو بے چاری کو دیکھ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ایک اچھے خاصے بھاگتے دوڑتے بیٹے کا زخم کھا کر بیٹھی تھیں۔ اور اب جو پیدا ہوا ہے، نہ ہونے کے برابر۔"

"کیا مطلب؟" سعید احمد نے چونک کر دریافت کیا۔ "ابھی کچھ عرصہ گزرا، تم خوش ہو ہو کر لڈو کھلا رہی تھیں ہمیں اور بتا رہی تھیں کہ فرحت کے ہاں سے آئے ہیں بھانجے کی خوشی میں۔"

"ہاں تو اس میں شک کیا ہے۔ بھانجا ہی پیدا ہوا ہے۔" انہوں نے پان منہ میں رکھ کر جواب دیا۔ "بس کوئی بہت بڑی خرابی ہے لڑکے میں۔ ایسی خرابی کہ شاید جسے ڈاکٹر بھی نہ سمجھ پا رہے ہیں۔ پڑا اتنے عرصے سے ہسپتال میں تھا بے چارہ ڈاکٹروں، نرسوں کی تحویل میں۔ معطر کی تو خیر چھٹی ہو گئی تھی مگر بڑے آپریشن کے بعد اس کی جان میں بھلا باقی کیا بچا ہے؟ ڈھانچا ہی ڈھانچا رہ گیا ہے۔"

سعید احمد نے ان کی بات کاٹ کر بے چینی سے پوچھا۔

"لیکن...... بچے میں کیا خرابی ہے آخر؟"

"کوئی ایک خرابی ہو تو بتاؤں۔" بیوی نے تاسف بھرے لہجے میں بتایا۔ "کمی یا محرومی کہیے جسمانی کمزوری تو ہے ہی، میرا تو خیال کہتا ہے کچھ دماغی مسئلہ بھی ہے۔ کیونکہ ہسپتال والوں نے تو ڈسچارج کر دیا ہے۔ اب فرحت نے دماغ کے کسی بڑے ڈاکٹر سے وقت لیا تھا۔ اسے دکھائیں گے۔ ایک آنکھ مسلسل بند ہے۔ معلوم نہیں اس میں بینائی بھی ہے یا نہیں۔ منہ سے ہر وقت رال بہتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے مجھے تو ہوشمند نظر نہیں آتا۔"

"اوہ......" سعید احمد کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ابنارمل بچہ۔"

بیوی خاموش ہو کر سوئی میں دھاگا پرونے لگیں۔ سعید احمد نے دوبارہ پوچھا۔

"سیدہ، سنجیدہ کب تک رہیں گی وہاں؟"

"اب میں کیا کروں؟" انہوں نے لاچاری سے جواب دیا۔ "وہاں تو پورا گھر الٹا پڑا ہے۔ نازیہ کی ساس بے چاری کے رونے دھونے نہیں کٹ رہے ہیں۔ کاٹے کو ایسے حالات ہوئے تھے ان کے گھر میں ایک دم ہی دو کمی جانوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ نازیہ اکیلی کیا کیا کرے۔ تمام دن دھندے سے لگی رہے تب بھی ذمے داریاں کم نہیں ہوتیں۔ بچی الگ ذرا سی ہے۔ جب سے معطر ہسپتال سے آئی ہے، اپنے پرائے، محلے پڑوس بھی جگہ ... آتا رہتا ہے۔ کسی وقت گھر خالی نہیں رہتا۔ معطر کے میاں اور بچوں کے ... کام ہیں۔ جبھی سب دیکھ کر نازیہ کی مدد کے لیے بھیج رکھا ہے سیدہ سنجیدہ کو۔ پرسوں کی تو ... لانے کے لیے گئی تھی مگر نازیہ نے پھر اصرار شروع کر دیا تھا۔ اس کی ساس بھی بہت ممنون ... رہی تھیں۔ بار بار شکریہ ادا کیے جا رہی تھیں۔"

"خیر...... شکریے کی تو کوئی بات نہیں ہے۔" سعید احمد نے متانت سے کہا۔ "اپنے ہی اپنوں کے کام آیا کرتے ہیں۔ خود ہی غور کرو، ان کی بچی غریب کی ایسی حالت ہو گئی کہ ہسپتال میں داخل کرانا پڑ گیا۔"

"ہاں تو اور کیا۔" بیوی نے سادگی سے اقرار کیا۔ "نازیہ اور اس کی ساس بتا رہی تھیں کہ معطر اچھی خاصی ہنسی باتیں کر رہی تھی۔ بس اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف گئی ہے کہ شلوار کے پائنچے میں پیر الجھ گیا۔ ایسی بری طرح گر پڑا کر گری ہے کہ آناً فاناً لینے کے دینے پڑ گئے۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اگر ہسپتال نہ پہنچایا گیا ہوتا تو خدانخواستہ جان کے لالے پڑ جاتے۔ فوراً بڑے آپریشن کے ذریعے بچے کی پیدائش عمل میں لائی گئی۔ معلوم نہیں کتنی بوتل خون لگ گیا بے چاری کو۔"

سعید احمد اظہار افسوس کرتے ہوئے نماز عصر کے لیے اٹھ گئے۔ جس وقت وہ مسجد جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے، دادی صغریٰ ہانپتی کانپتی آ ٹکرائیں۔

"اے بیٹا!" انہوں نے دیکھتے ہی سوال داغ دیا۔ "سنا ہے سوئی گیس آ رہی ہے محلے میں...... معلوم کیا سچ ہے کہ جھوٹ؟"

وہ مسکرانے لگے۔ "جھوٹ کیوں ہوتا؟ سچ ہے۔ آپ چلیے اندر میں ابھی لوٹ کر تفصیل بتاتا ہوں۔" وہ انہیں دلاسہ دے کر مسجد چلے گئے۔

جب ان کی واپسی ہوئی تو دونوں خواتین زور و شور سے باتیں کرنے میں الجھی ہوئی نظر آئیں۔ موضوع گفتگو تھی سعدیہ۔

دادی صغریٰ بہت افسردہ تھیں۔ رنجیدہ آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"تم تو ہو ہی واہیات ماں۔ نہ ہم سے مشورہ لیا نہ رائے اور لونڈیا کو چلتا کر دیا۔ مہینوں کے بعد

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

وہ پردیس سے واپس آئی تھی، تمہارا فرض تھا نا کہ کچھ ہفتے تک اس کی مہمانداری کرتیں۔ پیار سے اپنے قریب رکھتیں۔ اتنے دنوں کی جدائی کا حال احوال لیتیں۔ یہ کیا کہ......"

سعید احمد کی بیوی کو ان کے لیکچر پر ہنسی آ رہی تھی۔ "اماں!...... اماں! آپ تو اپنی کہے جاتی ہیں، میری بھی تو سنیے۔"

"کیا سنوں خاک؟" وہ جلے بھنے انداز میں گویا ہوئیں۔ "سارے رنگ ڈھنگ پھوہڑ ماؤں والے ہیں۔ تم جیسی مائیں یونہی ذمے داریوں سے بچ کر اپنا آپ سکھی رکھا کرتی ہیں اور الزام دیا کرتی ہیں قسمت کو، نصیب کو...... ہمارا تو کلیجہ پھونک ڈالا تم نے۔"

سعید احمد ان کے آخری جملے پر مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے ان کے قریب آ بیٹھے اور ان کے گھٹنے دباتے ہوئے بولے۔

"کس نے پھونک ڈالا ہماری اماں کا کلیجہ؟...... کیوں پھونک ڈالا؟ کہاں ہے وہ دشمن جاں؟"

بیوی نے آنکھوں آنکھوں میں انہیں گھورا اور منہ میں بڑبڑائیں۔

"لو...... یہ ایک اور آ گئے حمایتی۔"

اماں دگیر لہجے میں ان کو مخاطب کر کے بولیں۔

"اب تمہی کہو بھیا! ہم ان کی غلطی پر خاک ڈالیں تو کیسے نہ ڈالیں؟...... ہماری لونڈیا کو پردیس سے آئے دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ تمہاری بیوی نے اسے سسرال روانہ کر دیا۔ ارے ہم تو اس بچاری کو جی بھر کے دیکھ بھی نہ پائے۔ نہ پوری طرح خیر صلا بھی۔ اور اللہ کے سسرال میں تو ہماری زندگی ہی رہتا ہے۔ کہیں بھاگی جاتی تھی کیا سسرال؟ ہم خود پورے طور طریقے سے تاروں کی چھاؤں میں رخصت کرتے۔"

سعید احمد کی بیوی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ "ارے اماں! اب کہاں زمانہ رہ گیا تاروں کی چھاؤں والا؟"

"اری جا یہاں سے" دادی صغریٰ نے بگڑ کر ہاتھ چلایا اور بآسانی تو تکار پر اتر آئیں۔ "تو کیا جانے ماں کون؟ آج کل کی فیشن والی ڈیڈی ماں ہے نا۔"

سعید احمد کی بیوی نے ہمت نہ ہاری۔ کہہ گزریں۔ "اماں! بیٹے تو سہی۔ آپ نے دیکھا نہیں، سعدیہ کے دلہا کو کتنی جلدی لگی ہوئی تھی۔"

"تو کیا ہو گیا؟" انہوں نے سوالیہ انداز میں جرح کی۔ "جلدی لگی ہوئی تھی تو کیا ہو گیا؟ ساری دنیا کے دلہاؤں کو یہی مرض لگا ہوتا ہے تو کیا ہم انہی کی مرضیوں پر چلیں گے؟ تم نے اس کے دلہا کا ہم سے سامنا کرایا ہوتا۔ ہم ان کا وعدہ یاد دلاتے انہیں۔"

سعید احمد نے زیر لب مسکراتے ہوئے بیچ بچاؤ کرایا۔

"اماں! فرحت میاں کی ہمشیرہ کو دیکھنے میں گیا تھا ہسپتال۔ وہاں سعدیہ کے سسر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بتا رہے تھے کہ فاخر میاں کی پھوپھی بہت سخت بیمار ہیں اور ہر ہر لمحے بھتیجے کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی ہیں۔ اسی لئے ان دونوں کو ہوائی اڈے سے سیدھے انہی کے پاس جانا پڑا تھا۔ وہ تو کہو کہ کسی نہ کسی صورت میں وہ لوگ ایک آدھ دن کے لئے ہمیں ملنے کے لئے بس آ گئے تھے ورنہ ابھی ایسا موقع محل نہیں ہے۔ نازیہ کی بچی کا سن کر وہاں بھی گئے تھے مگر ایک گھنٹے میں اٹھ گئے تھے۔ بس مجبوری کا نام شکریہ ہوا کرتا ہے اماں!"

جلدی جلدی پوری تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد سعید احمد نے ان کی داخلی رد و بدل کے لئے موضوع گفتگو بھی بدل ڈالا اور کہنے لگے۔

"چلئے چھوڑیے ان باتوں کو۔ اب یہ خوشخبری سن لیجئے کہ انشاء اللہ بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے جب آپ کی بہوئیں لکڑی کوئلے کی فرمائش کرنا ترک کر دیں گی۔"

صغریٰ دادی کی ساری کلفت بھاپ بن کر اڑ گئی۔ خوش ہو کر پوچھا۔ "ارے ہاں...... میں تو بھول ہی گئی تھی۔"

"اجی ہم کہاں بھولنے دیں گے۔" سعید احمد نے ہنس کر ان کی بات کاٹ دی اور بولے۔ "آپ تو بس نوٹوں کا انتظام کیجئے۔ گیس والا چولہا منگوا لیجئے۔ بس سمجھئے کہ لکڑیوں سے ہمیشہ کے لئے نجات۔ نہ دھواں نہ گرمی۔"

"ایں؟" دادی کو زبردست جھٹکا لگا۔ "نوٹ؟...... وہ کہاں سے آئیں گے بھیا؟" ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

سعید احمد کی بیوی مسکراتی ہوئی ان کے قریب جا بیٹھیں اور سرگوشی میں بولیں۔

"فکر مند کیوں ہوتی ہیں اماں! ابھی سے کمیٹی شروع کر رہی ہوں...... بس پہلی آپ کی۔"

"ارے...... جیتی رہے میری بہو۔" صغریٰ دادی کی باچھیں کھل گئیں۔

آسمان رات سے ہی سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سویرے منہ اندھیرے ہلکا سا چھینٹا پڑ گیا۔ گویا برسات نے اک آگ سی لگا ڈالی فضاؤں اور ہواؤں کے تن من میں۔ ہلکی ہلکی خنکی بھیگتے موسم کی دلبرانہ ادا کی طرح خوشگوار اور دلنواز لگنے لگی۔

فرخ کے سینے کا چپہ چپہ مہک رہا تھا۔ ننھے ننھے سرسبز پتوں والے پودے سرخوشی کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ لہلہا رہے تھے۔ چاروں طرف سرسرانے والی ہوا بھی مہکی مہکی ہو رہی تھی۔

نازش اور فرخ لیموں کی ہلکی ہلکی ٹہنیوں والے ایک چھتنار پیڑ کے نیچے دبے کھڑے محو گفتگو تھے۔ کھلتے ہوئے دھانی رنگ کے کڑھے ہوئے کرتہ شلوار میں نازش مہکی ہوئی فضاؤں کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔ دھانی چنریا بار بار ہواؤں کے دوش پر اڑ رہی تھی۔

جانے کیوں فرخ ان لمحات میں حد درجہ مضطرب اور بے چین سا لگ رہا تھا۔ سفید شلوار سوٹ میں اس کی نکھری ہوئی وجیہ شخصیت کی ایک ایک ادا سے گہرا اضطراب جھلک رہا تھا۔

نازش نے سادگی سے دریافت کیا۔

"خیریت تو ہے؟...... آج آپ نے ایک بھی کلاس نہیں لی؟"

فرخ نے ایک گہرا سانس کھینچ کر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اور جو تم اس وقت کلاس سے باہر نظر آ رہی ہو۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ تیزی سے بولی۔ "واہ...... مجھے تو آپ نے ہی بلوایا ہے یہاں۔"

فرخ کو اپنی اضطرابی کیفیت اور اس بے خبر سی لڑکی پر بیک وقت رحم آنے لگا۔ چند لمحے وہ اسے گہری نگاہوں سے تکتا رہا۔ اچانک اس نے لیموں کی جھکی ہوئی ٹہنی پکڑ کر زور سے ہلا دی۔ پتوں پر اٹکی ہوئی بے شمار ننھی منی بوندیں پھوار کی طرح برس پڑیں۔ چشم زدن میں نازش بری طرح بھیگ گئی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"ارے..... ارے..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

بدحواسی میں اس کا دوپٹہ گھاس پر جا گرا اور وہ دونوں ہاتھوں سے بوندیں جھاڑنے لگی۔ شفاف پانی کے مہین مہین قطرے اس کی ریشمی سیاہ زلفوں میں سچے موتیوں کی طرح اٹک گئے تھے۔

انہی حساس گھڑیوں میں فرخ کو اپنی کمزوری کا بڑی شدت سے احساس ہوا اور اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ خود پر قابو نہ رکھ سکے گا۔ اسے اپنے احساسات اور دلی کیفیات پر کنٹرول کرنا دوبھر ہو گیا۔ پہلو میں دھڑدھڑانے والا دل سینہ چاک کر کے باہر نکلنے کو بے تاب ہو گیا۔ بالآخر کشمکش رنگ لائی۔ قوت برداشت پچھاڑ کھا گئی اور اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر نازش کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ گرفت اس قدر مضبوط اور سخت تھی کہ نازش اپنی جگہ ساکت رہ گئی اور دم بخود ہو کر اس کی صورت تکنے لگی۔

فرخ کا چہرہ فرط جذبات سے سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ ہاتھوں کا دباؤ اس کی بے پناہ چاہتوں اور جذبہ صادق کی شدتوں کا مظہر تھا۔ نازش بے خودی کے عالم میں سانس روکے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگی تھیں۔ فرخ کی زندگی سے بھرپور سانسیں، اس کے دہکتے ہوئے رخساروں پر پرواز کر رہی تھیں۔

تب نازش کی سماعت سے حیات آفریں سرگوشی ٹکرائی جس کی شگفتگی اور دلکشی کے سحر سے اس کی زندگی آج تک نا آشنا تھی۔ فرخ کا شدت جذبات سے بوجھل لہجہ، گرمی کی رُت میں اچانک چلنے والی چنچل اور خوابیدہ احساسات کو جھنجوڑ دینے والی ہوا کی طرح گنگنانے لگا۔

"نازا..... میری نازا..... میں تمہارا ہوں..... اور کسی کا نہیں۔"

وہ دم بخود تھی..... سراپا گوش تھی..... مگر اچانک ہی فرخ کی آواز ڈوب گئی۔ جیسے بہت کچھ کہتے کہتے وہ ہوش میں آ گیا ہو جیسے کوئی اعتراف گناہ [illegible] اچانک پڑ جانے والی گرہ سے گرفت ڈھیلی پڑتی چلی گئی۔ اس کا چہرہ محسوس ہو جانے کی حد تک پسینہ پڑ گیا تھا۔ وہ آہستگی سے علیحدہ ہوا اور دو سبزے کے درمیان گھری ہوئی بنچ پر جا بیٹھا۔

Famous Urdu Novels
Free pdf Library

لمحات..... صدیاں بن گئے۔

سامنے سرسبز مہندی کی باڑھ میں بے شمار رنگ برنگے پروں والی چڑیاں غل مچا رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے نازش کے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

بادل گھر گھر کر چلے آ رہے تھے۔ اس نے ایک طویل سانس کھینچ کر گھاس پر اڑتا ہوا اپنا دھانی آنچلوں والا دوپٹہ اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی فرخ کے قریب آ بیٹھی اور جھک کر اس کی اتری ہوئی صورت بغور دیکھ کر پوچھا۔

"آج آپ کو کیا ہوا ہے فرخ؟..... ابھی کیا کہہ رہے تھے؟"

وہ سیدھا ہو کر بیٹھتا ہوا الجھ کر بولا۔

"اس وقت..... بات مت کرو نازش! میری طبیعت شاید بہتر نہیں ہے۔"

"کیا؟" وہ حیران رہ گئی۔ اس کا عجیب و غریب رویہ سمجھ سے باہر تھا۔ تاہم حوصلے سے کام لیا۔ ملائم لہجے میں پوچھا۔ "بتاتے کیوں نہیں؟..... آخر میں نے کیا، کیا ہے؟"

"کیا بتاؤں تمہیں؟" وہ اچانک اس کی طرف پلٹ پڑا۔ پل بھر غور سے دیکھتا رہا۔ دفعتہً سرد لہجے میں بولا۔ "بہتر یہی ہے کہ تم اس وقت یہاں سے..... چلی جاؤ۔"

نازش کا چہرہ خجالت سے سرخ پڑ گیا۔

"یہی کہنے کے لئے بلایا تھا آپ نے؟"

لیکن جواب دینے کی بجائے فرخ نے ایک تیز سی نظر اس پر ڈالی۔ بے بسی، لاچاری، الجھن اور مجبوری..... جانے کیا تھا اس کے انداز میں!

اچانک وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اندرونی عمارت کی طرف چل دیا۔ عین اس وقت بادل زور سے گرجے اور دھواں دھار مینہ برسنے لگا۔

نازش بنچ پر تنہا بیٹھی رہ گئی۔ دم بخود اور حیران!

مصوری کی کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد اس نے گھر آنا چاہا تو چوکیدار نے بتایا کہ فرخ جانے کب کا گاڑی لے کر جا چکا تھا۔ ایسا آج پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ شام کو وہ ٹیکسی سے گھر آئی تو اس کی وحشتوں کی انتہا نہ تھی۔

اس کے لئے فرخ کا رویہ عجب معمہ بن چکا تھا۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ تمام رات اور اگلا سارا دن الجھن، شش و پنج اور کشمکش کی نذر ہو گیا۔

لیکن خلاف امید شام ڈھلے اس کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا تو نازش کو اپنی سماعت پر اعتبار کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

اس کے برابر فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے آنکھوں سے اسے دیکھا۔ موڈ تو بالکل نارمل لگ رہا تھا بلکہ ہمیشہ سے قدرے زیادہ ہی تروتازہ اور ہشاش بشاش دکھائی دیا۔

نازش کو یوں بار بار دیکھتے پا کر شوخی سے بولا۔

"محترمہ! آپ بھلا چوری چوری کیوں دیکھ رہی ہیں؟..... پریشان مت ہوئیے، ڈائریکٹ دیکھ لینے پر میں ٹیکس وغیرہ وصول نہیں کروں گا۔"

نازش پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ شرمندہ ہو کر سائیڈ کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر اب بھلا کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ یوں لگا وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ جلدی سے بولا۔

"قسم لے لو نازش! اگر میں رشوت کا ایک سینٹ بھی طلب کروں تو..... دیکھو ذرا میری طرف!"

لیکن جب نازش نے بالکل ہی توجہ نہ دی تو کہنے لگا۔

"اچھی بات ہے..... اب مجھ کو الزام مت دینا۔ ساری ذمہ داری تم پر ہو گی۔" یہ کہتے کہتے اس نے نہایت مہارت سے گاڑی کا رخ تبدیل کر دیا اور..... اور مخالف سمت میں پوری اسپیڈ کے ساتھ چھوڑ دی۔

نازش کی ساری ناراضگی ہوا ہو گئی۔ پریشان ہو کر پوچھا۔

"یہ..... آپ کدھر چل دیے؟"

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "میرے گھر۔"

وہ اچھل پڑی اور دہائی دینے کے انداز میں بولی۔ "خدا کے لئے رک جائیے فرخ!..... میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ اسے نہ مٹائیے۔"

وہ ایک بے ساختہ قسم کی مسکراہٹ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دبا کر، بظاہر تیوری چڑھا کر بولا۔

"دقیانوسی پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنی عزت بہت پیاری ہے۔"

اس کا مہمل سا جواب سن کر وہ چکرائی۔ کچھ سمجھ میں نہ آ سکا تو گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ

پر رکھ دیے۔ فرخ اگر بے حد مشاق قسم کا ڈرائیور نہ ہوتا تو حادثہ ہو جانا یقینی تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ سڑک سے اتر کر درختوں کے نیچے رک گئی۔ نازش کا سر پوری قوت سے فرخ کے شانے سے ٹکرایا اور وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئی۔

وہ کئی منٹ تک گہری پُرشوق نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر شرارت آمیز تبسم سے بولا۔

"بڑی احتیاط اور پیار سے رکھی ہے میں نے پچھلی سیٹ پر۔ اٹھا کر دیکھ لو۔"

نازش نے رول کیا ہوا بڑا سا کاغذ کھول کر دیکھا۔ حیرت، شوق اور خوشی سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ فرخ کی ساری شوخی اور شرارت کا سبب جان گئی۔ اس نے حیا بار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر سنجیدگی اور وقار سا چھا گیا تھا۔

سگریٹ باہر اچھال کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک اندرونی سڑک سے نکال کر سینٹر کی طرف جانے والی شاہراہ پر ڈال دی۔

نازش ابھی تک ناقابل یقین نظروں سے شفاف کاغذ کی سطح پر اپنے چہرے کے نقوش تک رہی تھی۔ اپنے اس روپ کے متعلق اس نے آج تک سوچا بھی نہ تھا۔ تصویر کیا تھی، روپہلے مستقبل کی اک جھلک تھی۔ سرخ آنچل میں جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ فرخ کے برش نے اسے روایتی دلہن بنا ڈالا تھا۔ صبیح پیشانی پر افشاں سے سجی ہوئی مانگ میں [illegible] سے الجھتا ہوا چمکدار ٹیکا اور ناک میں پہنی ننھی سی نتھ۔

نازش میں اتنی ہمت نہ تھی کہ نظر اٹھا کر اسے دیکھ سکتی۔ لرزتے ہاتھوں سے تصویر کا کاغذ دوبارہ رول کر دیا۔

فرخ نے ہاتھ پھیلا کر بے حد آہستگی اور ملائمت سے اسے قریب کر لیا۔

"نازو" وہ گنگنایا۔

نازش اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

وہ قریب تر ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں تم کل سے بہت پریشان ہو...... کل مجھے لگ رہا تھا میرے پاس میرے جذبوں کے اظہار کے لیے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے۔ میں اپنی ذات میں کتنا تنہا ہوں، بے بس اور اکیلا ہوں، تم نہ جان سکو گی۔ تمہیں معلوم ہے میں ساری رات جاگا ہوں، صرف تمہاری خاطر۔ تمام شب بیدار رہ کر تمہارے نقوش سنوارے ہیں۔ اس لیے کہ شاید میرا برش تم کو سمجھا سکے جو میں نہ کہہ سکا...... تم سمجھ رہی ہو نا نازو؟"

اس کے رنگین چہرے کو دیکھ کر وہ خود ہی پھر بولا۔

"لاکھوں باتیں ایسی ہوتی ہیں جو میں تم سے کہنا چاہتی ہوں مگر میری قوت گویائی دم توڑ جاتی ہے۔ جانِ فرخ! میرا دل بھی تمہارے احترام سے خالی نہیں۔ مجھے سدا بے غرض اور بے لوث پاؤ گی۔"

اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے شانوں سے ہٹا کر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ گاڑی سبک روی سے چلتی ہوئی سینٹر کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔

❋●❋

رات ڈھل رہی تھی۔

سناٹا گہرا ہوتا چلا گیا۔

ربیلی کا ویر رائفل سنبھالے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ایک لق و دق میدان کے نشیب میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اس کے دائیں جانب ایک اجاڑ اور خشک ٹیلوں کا سلسلہ تھا جو دیہاتیوں کی زبان میں "بڈے" کہلاتے تھے۔ "بڈوں" کا یہ سلسلہ جانے کس زمانے سے بنجر پڑا تھا۔ یہاں جگہ جگہ ریت کے تودوں کی بہتات تھی۔ زمین بے حد نرم اور ریتیلی تھی۔ ان تودوں کے ارد گرد کریل، جھڑبیریوں کے جھنڈ اور کہیں کہیں کیکروں کے پودے جھوم رہے تھے۔ ریتیلی زمین پر خشک پتوں کے علاوہ کیکر کے سوکھے "سکے" بکھرے پڑے تھے جنہیں بکریاں خاص طور پر شوق سے کھاتی ہیں۔ لیکن ان اطراف میں آبادی کا دور دور تک نام نہ تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔

رات ختم ہو رہی تھی۔ رفتہ رفتہ سویرا نمودار ہونے والا تھا۔ وہ چلتے چلتے تھک چکا تھا مگر اسے اپنی تھکاوٹ کی مطلق فکر نہ تھی۔ فکر تھی تو اس پیکر انسانی بلا کی جو آج خاص طور سے اس کے گھر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ خشک اور بنجر بڈہ ختم ہو گیا تو ایک اجڑی ہوئی ویران بستی کے کھنڈر نظر آنے لگے تھے۔ وہ نشیب چڑھتا ہوا اوپر آ گیا اور متجسس نگاہوں سے ہر طرف کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ کھنڈر ویران اور پُرہول دکھائی دے رہا تھا۔ دور دور تک کوئی ذی روح نہ تھا۔

ویران بستی کے کھنڈرات سے نکل کر وہ بنجر میدان میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ دو ڈھائی کوس طے کر لینے کے بعد کھیت نظر آنے لگے۔ [illegible] شیشم اور نیم کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ کھیتوں کی حدوں سے پار اس کی بستی سے ٹمٹماتے چراغوں کی مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔

وہ چنوں اور چری کے کھیتوں کے درمیان گزرنے والے گلیارے پر چلنے لگا۔ رائفل اب تک اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح چوکنا ہو کر ہر طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ رائفل پر گرفت بھی نہیں تھی۔ ساری رات کی محنت اکارت ہی گئی۔ جس کے تعاقب میں دوڑا تھا، وہ معلوم نہیں جنگل کے اندھیاروں میں کدھر روپوش ہو گیا تھا۔

چلتے چلتے اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ چاند ڈوب چکا تھا۔ اندھیروں میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا ابھر رہا تھا۔ ہر طرف دھواں دھواں سا دھند ابھرتی جا رہی تھی۔ گھروں سے گھٹی گھٹی انسانی آوازیں اور ڈھور ڈنگر کی اڑاٹ سنائی دینے لگی تھی۔

صبح دم چلنے والی نرم ہواؤں کے جھونکے گندم کی بالیوں اور خشک چنوں میں تیز سرسراہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ رات بھر کے جاگے ہوئے کو ان نرم اور خنک خنک جھونکوں سے فرحت محسوس ہونے لگی۔ اب چنوں اور گندم کے ساتھ سرسوں کے کھیت بھی نظر آنے لگے تھے۔ زور زور سے چلتی ہواؤں سے سرسوں کے پیلے پھول ہنکاتے ہوئے گلیاروں پر نکلنے لگے تھے۔ بیلوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیاں صدیوں پرانا الوہی راگ الاپنے لگی تھیں۔

وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا بستی میں ولی کے مزار کے گرد گھومتا ہوا سیدھا اپنے گھر کے سامنے آ نکلا اور آہستہ سے باہر کے کواڑ پر ہاتھ مارا۔ فوراً ہی دوسری طرف پیروں کی چاپ ابھری اور ربیلی نے زنجیر گرا دی۔

"آ گیا ویرا؟" اس نے بکھری ہوئی ہوا کے جھونکوں سے اڑ اڑ کر صندلیں چہرے پر بکھر جانے والے بال سمیٹ کر پیچھے کرتے ہوئے اپنی میٹھی آواز میں کہا۔ آنکھوں میں نیند کے خمار کے ساتھ انجانے سے خوف لہرا رہے تھے۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"چاء لے آ۔" اس نے بھاری آواز میں حکم دیا اور بھاری قدموں سے اندر بڑھتا چلا گیا۔

رسیلی آندھی طوفان کی طرح باورچی خانے میں گھسی۔ چولہا اور اوولے پر رکھی دودھ کی گڑوی دونوں ابھی تک نیم گرم تھے۔ اس نے ذرا سی دیر میں اپلے سلگا کر چائے کھولائی اور پیتل کے بڑے سے کول پیالے میں نکال کر بھائی کے پاس پہنچی۔ چائے پی کر اس نے اونچی سی ڈکار لی اور خالی پیالہ اسے لوٹا کر بولا۔

"دوڑ کے جا کنٹل میں گرم پانی لے آ۔"

خود وہ پچھلی کوٹھڑی میں روئی تلاش کرنے کے لئے گھس گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ گرم پانی کے ساتھ واپس آئی تو وہ اپنے سر پر بندھا ہوا پٹکا کھول رہا تھا۔ خوف اور گھبراہٹ سے رسیلی کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔

"ہائے ربا!...... میرا ویر......"

وہ تڑپ کر چیخی اور اس کے سینے پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ اس کے بھائی کی آنکھوں میں پہلی بار نرم سا جذبہ جاگا۔ زیر لب ہلکا سا مسکرایا اور شفقت بھری آواز میں اسے ڈانٹنے لگا۔

"چپ...... جھلی کڑی۔"

"ویرا!...... ویرا! یہ تمہیں کس نے مارا؟"

وہ رو رو کر پوچھ رہی تھی۔ دل میں غم اور اندیشوں کے ناگ سرسرانے لگے۔

"او مینوں کون مارے گا جھلیے!" وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔ "ہٹ جا۔ میرا وقت نہ خراب کر۔ بہت کم ہے میں نوں۔" اس نے آہستہ سے جھٹک کر رسیلی کو خود سے علیحدہ کیا اور سر کا زخم صاف کرنے لگا۔

چوٹ سر کے پچھلے حصے میں آئی تھی [illegible] زخم اچھا خاصا گہرا تھا جس سے ابتدا میں خون ندی نالے کی طرح بہا تھا مگر پھر کپڑے کی سوتی تہ اور سخت گرہ نے بالآخر اس بہاؤ کو ہلکے پھلکے رساؤ میں تبدیل کر ڈالا تھا۔ لیکن پوری رات گزر جانے کے بعد اب زخم کے منہ پر خون خاصی مقدار میں جم گیا تھا جسے صاف کرنا بہر حال ضروری تھا۔

تھوڑی دیر تک بمشکل سمجھانے بجھانے کے بعد آخر وہ اسے رام کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ہنس ہنس کر اس سے زخم صاف کروانے لگا۔

اس وقت رات والی خونخواری اور سرد مزاجی مفقود تھی اور وہ بہن کے ساتھ معصوم بچوں کی طرح لپک لپک کر باتیں کر رہا تھا۔

زخم کی مرہم پٹی کے بعد رسیلی پانی کا کنٹل اور گیلی روئی لے کر باہر آئی۔ دماغ ابھی تک سو طرح کی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ دل میں اندر ہی اندر پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔

"ہائے ربا...... ویرا! "اس نوں" قتل کر کے تو نہیں آ گیا؟"

اس کا رواں رواں کانپنے لگا۔ روح کے اندر کوئی ہول کھول کر بین کرنے لگا۔

وہ بہ مشکل اپنی امڈتی ہوئی سسکیاں روک کر آنگن میں جھومتے بلند و بالا شیشم کے درخت کی طرف بڑھ گئی جہاں چبوترے پر کھڑی بکریاں اسے دیکھ دیکھ کر ممیانے لگی تھیں اور اچھل کود مچا رہی تھیں۔

رسیلی ان کے آگے ہرا چارہ ڈالنے لگی۔

اس کا ویر المونیم کی بالٹی اٹھا کر گھر کے پچھواڑے چلا گیا تھا جہاں کنوئیں سے پانی نکال کر سر کی پٹی بچا بچا کر اس نے غسل کیا اور دھوتی باندھتا ہوا دوبارہ اندر آیا۔

رسیلی اس وقت تک اس کی شلوار میں ازار بند ڈال چکی تھی۔ کپڑے بدل کر اس نے سر کے لمبے بالوں میں تیل چپڑا۔ داڑھی اور مونچھوں کو بھی کنگھی سے سنوارا پھر اپنی بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

"رسیلی!...... اور آ۔"

"آئی ویرا!...... آئی۔"

باورچی خانے سے اس نے جواب دیا۔ جب وہ آئی تو ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی۔

"شاوا پتر! شاوا......" وہ خوش دلی سے ہنس پڑا اور لمبے لمبے ہاتھ مار کر گرما گرم پراٹھے کھانے لگا۔ چائے کے علاوہ سرسوں کا ساگ اور ایک کٹوری میں تازہ مکھن بھی تھا۔

ناشتے کے دوران اس نے پچھلی بار رات والا واقعہ دوہرایا اور بڑبڑا کر بولا۔

"تھا کون وہ کتے دا پتر؟...... میں نوں جھونے چڑھیا۔" لہجے میں شدید غراہٹ تھی۔

رسیلی تھرا کر رہ گئی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

اس کا لہجہ تیغ سے تیغ ہوتا گیا۔ رات والی خونخواری دوبارہ عود کر آئی۔ لقمہ چباتے چباتے بھیڑیے کی طرح غرایا۔

"تیرے دے پتر نے ساری رات خوار کروایا۔ رب جانے کدھر گیا؟...... مینوں شک ہے او ڈاکو سی۔ پولیسیے گولیاں تے گولیاں چلاتے رہے۔ پر او نکل گیا سور دا تخم۔ ورنہ کتھے نہ بچدا اوہ۔ ہے سی وڈا اگی وار۔ میرے ہتھ چڑھ جاندا تے پولیسیاں نوں......"

حقیقت بھی یہی تھی کہ اپنے باورچی خانے سے وہ جس ڈاکو کا پیچھا کرتا ہوا نا معلوم کہاں کہاں کے جنگلوں، بیابانوں کی خاک چھان [illegible] روپوش ہو کر دکھا دیا تھا۔ پھر یہ بھی اتفاق ہو گیا تھا کہ تعاقب کے آغاز میں ہی گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے اس نے خشک نالے میں چھلانگ لگا دی تھی اور انہی لمحات میں کسی نوک دار پتھر نے اس کے سر کا پچھلا حصہ اتنا شدید زخمی کر دیا تھا کہ وقتی طور پر اس کے حواس پر غفلت طاری ہوتی چلی گئی۔ معلوم نہیں رات کے کس حصے میں اسے ہوش آیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی تو وہیں خشک نالے کے جھاڑ جھنکاڑ میں چت پڑا تھا۔ انتہائی نڈر اور دلیر ہونے کے باوجود اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کے آس پاس گہری خاموشی تھی۔ اس خاموشی کو جھینگروں اور دیگر کیڑوں مکوڑوں کی آوازیں رہ رہ کر مجروح کر رہی تھیں۔ پولیس نے گولی چلانی بند کر دی تھی۔

سک نالے میں گھپ اندھیرا تھا۔

بمشکل تمام وہ جھاڑیوں سے الجھتا، پتھروں سے ٹھوکریں کھاتا گرتا پڑتا سک نالے کی گہرائی سے نکلنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ اس طرح وہ بوجھل اور تاریک رات اس نے بھٹک بھٹک کر اور ایک دیدہ دلیر دشمن کو ڈھونڈتے بتا دی تھی۔

ناشتہ ختم کر کے وہ اٹھ گیا۔ رائفل اٹھا کر کندھے سے لٹکائی۔ چادر دو تین دفعہ جھٹکی، پھر اس کے قریب رک کر بولا۔

"اوداں تاں کسی کھوتے دے پتر دی مجال نہیں کہ میرے گھر ول ویکھے...... پر ہشیاری ضروری ہے۔ اج توں اماں تیری رہے گی تیرے ساتھ۔ فکر دی کوئی گل نہیں۔"

اس نے قدم آگے بڑھائے تو رنگی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ "ویرا...... اپنا خیال کریں۔"

"او جھلی!" ویر نے ہنستے ہوئے اپنا بھاری سا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ "اتھرو اندر...... اتھرو اندر۔" اس کا سر تھپتھپا کر اس نے وارننگ دی۔ "تینوں پتہ اے ماں اور پیو دا مرن ہویا تے توں بہت چھوٹی سی۔ میں تینوں اولاد سمجھ کے پالا ہے۔ تیرا سوچ کے تاں میں ویاہ نہ کیا کہ پتہ نہیں بھرجائی تیری کیسی ہو؟ بس ایہہ اتھرو اندر۔ شاوا۔"

وہ اسے پچکارتا ہوا تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔

بھائی کے جانے کے بعد رنگی بہت دیر تک چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ دل میں ایک خیال آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ سورج چڑھ کے سامنے آ گیا تھا۔ پیلی پیلی زرد دھوپ سارے آنگن میں پھیل گئی تھی۔ گھر کے بہت سارے کام اس کے منتظر تھے۔ وہ اٹھنے کا قصد کر رہی تھی کہ ماں خیری لاٹھی ٹیکتی ہوئی آ گئی۔

ماں خیری کو دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عرصہ ہوا دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ انگل سے چلتی پھرتی تھی۔ اس وقت بھی کوئی بچہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہی بچہ ماں خیری کا بستر اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بھی پہنچا گیا۔ ان میں ایک عدد حقہ بھی تھا۔ رنگی نے حقہ تازہ کر کے چلم میں تمباکو بھرا اور آگ بھر کر ماں خیری کے سامنے لا رکھا۔

ماں خیری کے آنے کی اسے خوشی تھی۔ بس اپنے بھائی کے کہے کا خیر مقدم کیا تھا اس نے۔ دماغ ویسے ہی رات سے اڑا اڑا ہوا تھا۔ دن آدھا کام نمٹائے بغیر گزر گیا تھا۔ اس نے چھپاک چھپاک سارا دھندا نمٹایا۔ روٹی پکا کر بھاجی بھی دی، ساگ گرم کیا اور ماں خیری کے آگے رکھا۔

اس کے بار بار اصرار پر وہ بھی کھانے بیٹھ گئی اور بغیر بھوک کے بھی اچھا خاصا کھا گئی۔ پیٹ میں رزق گیا تو عقل ٹھکانے آئی۔

ماں خیری کا آ جانا اسے خود بخود غنیمت معلوم ہونے لگا۔ دوسراہٹ کا احساس واقعی اپنے اندر توانائی لئے ہوتا تھا۔ دل میں لاکھ شکوک و شبہات اور انجانے دکھ کا قہر ہراس کر رہا تھا مگر آج سکوت کا لبادہ اوڑھے رہنے والا گھر از خود بھرا بھرا سا لگنے لگا تھا۔ ورنہ وہ دونوں الگ تھلگ پڑے رہتے تھے۔ بھری پری دنیا میں اکیلی رہ جانے والی ماں خیری تھی بھی مشفق اور بھلی لوگ۔ ویر کے ایک بار کہنے پر اپنا چھپر چھوڑ کر اس کے گھر میں رہنے بخوشی آ گئی تھی اور آ کر بہت خوش اور مطمئن تھی۔ وہاں بستی بھر کا دیا کھاتی تھی، یہاں بھی اس کا اللہ بیلی تھا۔

بچا ہوا کھانا چنگیر میں کر کے رنگی نے چھینکے پر رکھا، باورچی خانے کا در بھیڑا اور شیشم کے گھنے سائے تلے کھری منجی پر جا لیٹی۔

لیٹی تو دل و دماغ بہت پرسکون اور خالی کر کے تھی غور و فکر کے لئے۔ لیکن ہوا یہ کہ لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی۔ ہلکے ہلکے جھونکوں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔

جانے کتنی دیر سوئی ہو گی۔ کسی آہٹ پر آنکھ کھلی تو ایک شرارتی بکری نے کھونٹا اکھاڑ لیا تھا اور اب سارے آنگن میں کھو کھو اچھلتی پھر رہی تھی۔ رنگی نے دو تین دوڑیں لگانے کے بعد اس کو جا پکڑا اور چار پانچ دھپ رسید کر کے دوبارہ کھونٹے سے باندھ دیا۔

دھوپ اتر کر دیواروں پر جا بیٹھی تھی۔ پورے آنگن میں شیشم کے سوکھے پتے چکراتے پھر رہے تھے۔ چھپر تلے ماں خیری گڑگڑاتی لیٹی تھی۔ حقہ ٹھنڈا پڑا تھا۔

رنگی نے جھاڑو سنبھال کر جلدی جلدی صفائی کی۔ ماں خیری کی فرمائش پر چائے کی بجائے قہوہ بنا کر دیا اور منہ ہاتھ دھو کر اس کے قریب بیٹھ کر گوار کی پھلیاں توڑنے لگی۔ آج یہی پکانے کا ارادہ تھا۔

کافی سو لینے کے بعد دل و دماغ تازہ دم سے ہو گئے تھے۔ رات سے چھا جانے والی دھند چھٹ گئی اور اس کے خوف میں کمی آ گئی تھی۔ دونوں باتیں بھی کرتی جا رہی تھیں۔ اچانک باہر دروازہ دھڑ سے کھلا۔

رنگی نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس کا بھائی اپنے پیروں سے زور زور سے زمین پر دھمک پیدا کرتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں ذبح کی ہوئی مرغابی لٹکی ہوئی تھی۔

"ہائے وے ویرا...... میں صدقے۔" وہ الہڑ پنے سے قلانچیں بھرتی ہوئی اٹھ کر بھاگی۔

ویر نے مونچھوں مونچھوں میں مسکراتے ہوئے مرغابی اس کے حوالے کی اور خود ماں خیری کے پاس جا بیٹھا۔

رنگی نے گوار کی پھلیاں اٹھا کر چھینکے پر رکھ دیں اور خوشی خوشی گوشت پکانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔ مرغابی کا گوشت اس کی بہت بڑی کمزوری تھا۔

✱✱✱

"وہی...... قطعی وہی...... سو فیصد وہی۔"

طاہر بیگ پان چبانا بھول گئے تھے۔ ان کی زبان سے ایک ہی لفظ کی تکرار نکل رہی تھی۔ وہ نہایت جوش و خروش میں دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے سے خوشی کے تاثرات چھلکے پڑ رہے تھے۔

سوئے اتفاق فاخرہ [illegible] پکارتا چلا گیا۔

"سعدیہ...... سعدیہ جلدی چلو...... پھوپھی جان دیر سے تمہیں بلائے جا رہی ہیں۔"

"وہ مارا......" طاہر بیگ فرط مسرت سے اچھل کر کھڑے ہو گئے اور چچی جان کو مخاطب کر کے بولے۔ "ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم نے ایئرپورٹ پر فاخرہ کی دلہن کو دیکھا ہے تو یاد ہے آپ نے کس قدر ہمیں بے بھاؤ کی سنائی تھیں۔ مگر اب تو یقین آ گیا نا کہ ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ دیکھئے! وہی چہرہ اور وہی نام۔ سعدیہ۔"

چچی جان ماتھے پر ہاتھ مار کر بولیں۔ "ارے بیٹے، طاہر! بھیا اب خاموش ہو جاؤ۔ یقین آ گیا ہمیں تمہارا۔"

اس وقت نشست گاہ میں زمانی بیگم بھی موجود تھیں۔ داماد کی باتیں سن سن کر ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے مگر بے حد مجبور تھیں۔ داماد کو کہتیں بھی کیا!

چچی جان کو بھی یہی دھڑکا لگا تھا کہ ان کے ٹوکنے کے باوجود طاہر بولے۔ "چچی بی! آج تو وہی بات ہوئی۔ سانچ کو آنچ نہیں۔"

چچی جان نے ہول کر زمانی بیگم کی طرف دیکھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاؤ تکیے کے سامنے سے اٹھیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔

تانیہ بھی قریب ہی بچی کو بیٹھی سلا رہی تھی۔ میاں کی باتوں پر کڑھ بھی رہی تھی۔ بچی کو تھپکتے ہوئے تنک کر بولی۔

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

"آپ بھی بولنے پر آئیں تو بلا سوچے سمجھے بولے چلے جاتے ہیں۔ آخر کو کر دیا نا اماں جان کو ناراض!"

"کس نے؟..... میں نے؟" طاہر بیگ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے پوچھا۔ "کیوں؟ میں نے ایسا کیا کر دیا؟"

"اوہ!..... یہ کہئے کیا نہیں کر دیا؟" تانیا نے اسی لہجے میں رنجیدہ ہو کر جواب دیا۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اماں جان فاخر کی طرف سے بہت کبیدہ خاطر ہیں آج کل۔ ان کے ملال اور دکھ کا احساس نہیں ہے آپ کو۔ ورنہ یہ گفتگو کرنے سے پہلے دس بار سوچتے آپ۔"

"واللہ..... ہمیں نہیں معلوم۔" طاہر بیگ فوراً دھیمے پڑ گئے۔ "ان کی دل آزاری ہمارا مقصد ہرگز نہ تھا۔ خدا گواہ ہے جو کچھ ہوا، انجانے میں ہوا۔ ہم ان سے معافی مانگ لیں گے۔" وہ اٹھ کر ان کے پیچھے چل دیے۔

"ارے..... خدا کے واسطے رک جائیے۔" تانیا دوڑ کر ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ "اب اور جلتی پر تیل مت چھڑکئے۔ بس بہت ہو گئی۔"

چچی جان نے بھی دہل دیا۔ "ارے..... اب اس قصے کو یہیں چھوڑ دو بھیا! جو ہونا تھا ہو چکا۔ ہمیں تو رات دن دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ کو بیادت کس کروٹ بیٹھے!"

سب کے کہنے سننے سے طاہر بیگ دوبارہ بیٹھ گئے اور شگفتہ کو مخاطب کر کے بولے۔

"اسی طرح اس دن آپ خفا ہو گئی تھیں۔ ہماری عقل میں یہ بات نہیں سماتی کہ آخر ہم ایسا کیا کہہ گزرتے ہیں کہ سب کی دل آزاری ہو جاتی ہے۔ اس دن بھی ہم نے سچی بات کہی تھی، آج بھی جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے۔"

چچی جان نے بات کا رخ بدل دیا اور شگفتہ سے دریافت کرنے لگیں۔ "دلہن! تم نے تیاری کر لی بہاولپور جانے کی؟"

"جی ہاں چچی جان!" شگفتہ نے کسی خیال سے چونک کر جواب دیا۔ "تیاری تو سب مکمل ہے۔ دیکھیں کس روز جانا ہوتا ہے۔"

چچی جان نے مطمئن ہو کر کہا۔ "ہاں بھئی! چھوٹی اور اکلوتی بہن کی شادی ہے۔ اہتمام سے ہی جانا چاہئے۔ ماؤں سے پہلے پہنچ جانا ضروری ہے..... اللہ خیریت سے دلاور حسین کو اس بڑے فرض سے سبکدوش کرائے۔ بس تمہارے پیچھے ہی ہم یاور حسین کے ہمراہ پہنچ جائیں گے۔ تم جاؤ شاکر کے ساتھ۔"

شگفتہ نے دھیرے سے جواب دیا۔ "جی ہاں..... ابھی کے فرصت پا جانے کا انتظار ہے۔"

موضوع سخن با آسانی تبدیل ہو گیا۔ سب لوگ شگوفہ کی شادی کی باتیں کرنے لگے لیکن اس کے باوجود شگفتہ کے چہرے پر کبیدگی اور ملال کے تاثرات صاف دکھائی دے رہے تھے جو وہ چھپانے میں ناکام رہی تھیں۔

طاہر بیگ اٹھ کر مردانے حصے کی طرف نکل گئے۔ تانیا اور اپنی بچی کے ساتھ وہ آج ہی اپنی سسرال میں آئے تھے۔

سرور باجی کی مسلسل علالت کی خبر ہر جگہ جا پہنچی تھی۔ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی عیادت کے لئے آتا رہتا تھا۔ بہاولپور سے دلاور حسین بھی آ کر دیکھ گئے تھے۔ فاخر اور سعدیہ آگے پیچھے سرور باجی کے

کمرے میں پہنچے تو وہ دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ گویا انہی کی منتظر تھیں۔ دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے۔ آنکھوں سے طمانیت جھلکنے لگی۔ دونوں کو خوب پہچاننے لگی تھیں۔ اشارے سے سعدیہ کو دیکھ کر پوچھا۔

"کہاں تھیں اب تک؟"

سعدیہ محبت سے ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی اور دلار سے بولی۔

"پھوپھی اماں! آپ نے تو مجھے اپنا اسیر بنا لیا۔ ایک لمحہ بھی آپ کے بغیر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ آپ ہی کے پاس چلی آ رہی تھی۔"

سرور باجی کی آنکھوں سے تشکر کے دو آنسو ڈھلک کر رخساروں پر بہہ نکلے۔ بے اختیار اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"فاخر!" سعدیہ نے بے پناہ سرشاری کے ساتوں آسمانوں کو چھوتے ہوئے اسے پکارا۔

فاخر بھی نیم مردہ پھوپھی کی جرأت کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

ان سارے دنوں کی جان توڑ محنت، دن رات کی بھاگ دوڑ، تیمارداری اور جانفشانی کے بعد یہ پہلا ردعمل تھا جس کا اظہار انہوں نے کیا تھا۔

"یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" وہ با آواز بلند گویا ہوا۔ اس کے جسم کا ہر رواں بارگاہ ایزدی میں سجدۂ شکر بجا لایا۔ اس نے دلی خوشیوں سے جھلک جھلک کرتی آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھا اور سرور باجی پر جھک کر خوشی سے لبریز، اطمینان بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"پھوپھی جان! اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟"

جواب میں وہ بول تو نہ سکیں، ہاں آنکھ کے اشارے سے اطمینان اور کسی حد تک سکون کا اظہار ضرور کر گئیں۔

فاخر اور سعدیہ نے بڑی توجہ، اپنائیت اور محبت کے ساتھ گرم پانی میں تولیا بھگو کر ان کا چہرہ، گردن اور ہاتھ صاف کئے اور اپنی گود میں ان کا سر رکھ کر کنگھی کرنے بیٹھ گئی۔

اس دوران برابر ان سے بچوں کی طرح باتیں بھی کرتی رہی۔ فاخر بھی ہر کام، ہر بات میں پیش پیش تھا۔ آج وہ بے اندازہ خوش تھا۔ یخنی پینے کے تھوڑی دیر بعد سرور باجی سو گئیں۔

ایک لمبی بیماری کے بعد اس دن وہ پریشان نیند کی بجائے ایک پرسکون نیند کے زیر اثر لگ رہی تھیں۔ چہرے کے نقوش میں مردنی کی بجائے صحت مندی کی اک ہلکی ترین ہی سہی لیکن معمولی رمق نظر ضرور آ رہی تھی۔ یہ ایک نہایت خوش آئند سندیسہ تھا۔

ورنہ فاخر تو دن رات پٹی سے لگے رہنے کے بعد ان کی زندگی سے بہت مایوس ہونے لگا تھا۔ اس کے دل و دماغ پر ناامیدیوں نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔

جوں جوں دن بیت رہے تھے، اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑتا چلا جا رہا تھا کہ اب مشکل ہے کہ وہ پھوپھی کو پائے۔ یہی سبب تھا کہ وہ سعدیہ سے بھی بے توجہی برت جاتا۔

اسی شام حکیم شمس الدین صاحب جب معمول کے معائنے پر آئے تو انہوں نے بھی اطمینان کا اظہار کیا اور اس پرامید تبدیلی کی اصل وجہ فاخر اور سعدیہ کی موجودگی کو قرار دیا تھا جو سو فیصد درست ثابت ہوا۔

اس دن کے بعد سے سرور باجی کی حالت بہتر سے بہتر کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ ہلکی پھلکی غذا

FAMOUS URDU NOVELS FREE PDF LIBRARY

نے کمزوری رفع کرنا شروع کر دی تھی۔ حویلی کے تمام افراد بخوبی فاخر اور سعدیہ کی محنت اور خدمت گزاری دیکھ اور محسوس کر رہے تھے مگر زبان سے اعتراف ابا میاں کے سوا کسی نے کرنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ لیکن ان دونوں سر پھروں کو اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ان کے جذبے سچے تھے۔

⌘●⌘

جب سے موسم گرما کا آغاز ہوا تھا، ڈاکٹر منان وقتاً فوقتاً کئی مرتبہ بیگم کو سنا چکے تھے۔

"کتنا عرصہ گزر گیا دہی پھلکیاں کھائے ہوئے۔ کتنا جی للچا رہا ہے۔ مگر کسی کاہل خاتون کو ہمارا احساس ہی نہیں ہے۔"

لہٰذا بھابی نے بڑے اہتمام سے بذات خود اپنے ہاتھ سے دہی پھلکی تیار کی۔ دونوں بچوں تک نے بصد شوق کھائی اور خوش ہوئے۔

تعریف تو ڈاکٹر صاحب نے بھی کی مگر آخر میں کہہ گزرے۔ "آہا! کیا لطف تھا سعدیہ کے ہاتھ میں اللہ اسے خوش رکھے۔ اب تو خیر سے اپنے سسرال والوں کو مزے کرا رہی ہو گی۔"

بھابی کو اچھو لگتے لگتے رہ گیا۔ گھور کر میاں کو دیکھا اور بدبدائیں۔ "اس کو کہتے ہیں جس تھالی میں کھاؤ، اسی میں چھید۔"

ڈاکٹر صاحب نے سن لیا۔ زور سے بولے۔ "لاحول ولا قوۃ...... سچ کہا ہے کسی تجزیہ نگار نے کہ خواتین ہر عمر میں "جیلس" جانے کا شدید جذبہ تازہ رکھتی ہیں اپنے اندر۔"

بیگم چیخ "جیلس" کر بولیں۔ "جی ہاں...... مجھے خوب معلوم ہے اس تجزیہ نگار کا نام۔" "ڈاکٹر عبدالمنان۔"

ڈاکٹر صاحب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ "واہ بیگم صاحبہ! چٹ پٹی سی پھلکیوں کے ساتھ چٹ پٹا جواب۔ واللہ ذائقہ دوآتشہ ہو گیا۔"

پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے قریب کھڑی چاندنی بوا کی منڈی ہلا کر پوچھا۔

"کیوں بوا! تمہیں بھی سعدیہ دلہن کے ہاتھوں کے ذائقے یاد ہیں یا بھول گئیں؟"

چاندنی بوا نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"میاں! ہم بھلا اس پھلکیوں والی کو بھول سکتے ہیں؟ دم کے ساتھ ہے ہمارے۔"

ڈاکٹر صاحب ان کے انداز سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ نازش بھی کھانے کے دوران بھابی بھاوج کی نوک جھوک سن کر مسکرائے جا رہی تھی۔ سعدیہ کے تذکرے پر اس کا دل بھی چوٹ کھا گیا تھا۔ سنجیدگی سے بولی۔

"بھابی جان! سعدیہ تو حقیقت میں ہم لوگوں سے ایسی چھن گئی کہ دل کو یقین نہیں آتا۔ اس کے وطن واپسی کا سن کر کتنی خوشی ہوئی۔ میں تو بہت کچھ سوچ کر بیٹھی تھی مگر افسوس کہ اس کے سسرال والوں نے ایک نہ سننے دی۔ محبت ٹوٹی تو ایک دم سے ایسی کہ بھی سے توڑ کر لے گئے ایئرپورٹ سے۔"

"نہ نہ...... بری بات۔" بھابی نے فوراً اسے سرزنش کر دی۔ "اس طرح منہ بھر کے نہیں کہتے۔ وہ دراصل انہی کی امانت تھی۔ دعا کرو وہاں اسے اس کا مقام با آسانی مل سکے۔ ہمارا اس کا ملاپ تو اتفاق سے ہو گیا تھا تاہم شکریہ ادا کرو فاخر کا جو دو مرتبہ اسے ملانے لے آیا تھا۔ تم نے دیکھا نہیں ان کی اپنی کوٹھی تو یوں ان کے بغیر کیسی سجائی رہ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ وطن واپسی کے بعد فاخر اور سعدیہ اپنی رہائش گاہ آباد کریں مگر وہی ہوا جو منظور خدا تھا۔ آج بھی

وہاں کا انتظام چوکیدار اور اس کی فیملی کے سپرد ہے۔"

نازش نے بجھے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ "خیر...... یہ تو سب درست ہے۔ مگر اس کا افسوس رہے گا کہ سعدیہ سے جی بھر کے ملاقات نہ ہو سکی۔ بھابی جان! آپ نے غور کیا وہ کتنی پیاری اور دلربا ہو گئی ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" بھابی اٹھتے ہوئے ہنسیں۔ "فاخر کم حسین ہو گیا ہے؟ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہے تھے دونوں۔ ایئرپورٹ پر ہر کوئی چونک کر دیکھ رہا تھا۔ واقعی ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں وہ۔"

اسی دن...... شام ڈھلے بھابی اپنی ریلنگ پر جھکی نیچے دیکھے جا رہی تھیں جہاں فرخ ہارن بجا بجا کر نازش کا انتظار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی کمرے سے ٹہلتے ہوئے قریب آ گئے اور بولے۔

"یہ آپ کس مراقبے میں کھڑی ہیں؟ خوشخبری سنی؟ فرخ کہہ رہا تھا نازش نے اس کی تمام توقعات پوری کی ہیں۔ اب عنقریب اس کی تصاویر کی نمائش بہت اعلیٰ پیمانے پر کرائے گا۔"

بھابی نے بدستور نیچے دیکھتے ہوئے بے توجہی سے جواب دیا۔ "معلوم ہے...... مجھے بھی نازش نے بتایا تھا کل۔"

ڈاکٹر صاحب غور سے ان کی صورت دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "آثار بتا رہے ہیں آپ کو اس خبر سے ذرا سی بھی خوشی نہیں ہوئی۔"

اب بھابی نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا پھر سامنے اشارہ کر کے بولیں۔ "میری نظر میں یہ خبر معمولی ہے۔ میں تو کسی بے حد اہم اور بڑی خوشخبری کی منتظر ہوں۔ ذرا دیکھئے! وہ دونوں ساتھ بیٹھے کس قدر جچ رہے ہیں۔ بھلا جوڑی سلامت رہے گی۔"

ڈاکٹر صاحب سامنے دیکھنے لگے جہاں فرخ گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا اور سیاہ چشمہ لگائے نازش اس کے برابر بیٹھی تھی۔

یک بیک ڈاکٹر منان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ تیز لہجہ میں دریافت کیا۔ "یہ کیسی احمقانہ بات کی آپ نے۔ نازش نے اس سلسلے میں کچھ کہا ہے کیا؟"

ان کا موڈ اچانک بدل جانے سے بھابی کا رنگ اڑ گیا۔ ہکلا کر جلدی سے بولیں۔

"نہیں، نہیں! آپ اس غریب کے متعلق تو سوچئے بھی نہیں...... اس نے کبھی بھی مجھ سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ یہ تو میں سراسر اپنی جانب سے کہہ رہی ہوں۔ آخر ہماری بھی تو کچھ ذمہ داری ہے نا!"

ان کی وضاحت سے وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔ تاہم رکھائی سے بولے۔

"براہ کرم آپ آئندہ ایسی بے تکی اور بے جوڑ باتیں کبھی مت سوچئے گا۔ نازش کو ایسے رشتوں کی کمی ہرگز نہیں ہے۔ وہ تو میں از خود اس کی طبیعت اور موڈ کا اندازہ کر کے چپ ہوں ورنہ شادی بیاہ کی عمر تو یہی ہوا کرتی ہے۔ بہرحال جلد ہی کوئی فیصلہ کر لیا جائے گا۔ آپ بھی دیکھ رہی ہیں، وہ پہلے کی نسبت بہت نارمل اور خوش و خرم نظر آنے لگی ہے۔"

بھابی کا خوف زائل ہونے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے الجھ کر پوچھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کو میری بات کیوں بری لگی؟...... فرخ میں برائی کیا ہے؟ میں نے تو یہ سوچ کر کہہ دیا کہ آپ کا دوست بھی ہے۔ بہت سی خوبیوں کا مالک ہے۔ میں تو بہت دنوں

Famous Urdu Novels

LS FREE PDF LIBRARY

سے ان دونوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"تو پھر......." ڈاکٹر صاحب شدید جھنجلاہٹ میں کچھ کہتے کہتے رک گئے اور ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئے۔ پلٹ کر ان کے قریب رکے اور تیکھے لہجے میں بولے۔

"شاید آپ نے مجھے افلاطونی بھائی سمجھ لیا جو بلا جانے بوجھے اور پرکھے فرخ کو نازش پر مسلط کر دیتا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اس کے سینٹر کو جوائن کرے اور آئے جائے بھی اس کے ہمراہ۔ جانِ من! میں فرخ کو قابل اعتماد اور ایسی ذمہ داری کا اہل کسی وجہ سے سمجھ رہا ہوں۔ آپ اس سے واقف نہیں ہیں اس لئے ایسی بے سروپا رشتے داری جوڑنے چلی تھیں۔ اسی لئے تو بار بار کہتا ہوں کہ آپ خواتین کی قوم سراسر عقل سے پیدل ہوتی ہے۔"

ان کے آخری جملے پر وہ بھڑک گئیں۔

"ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟....... یہی تو کہا کہ نازش اور فرخ ایک دوسرے کے لئے مناسب رہیں گے۔ میری تو دلی خواہش ہے کہ خدا کرے ایسا ہی ہو جائے۔"

ڈاکٹر صاحب چڑ کر طنزیہ بولے۔ "کم عقل خاتون! آپ کی یہ "دلی خواہش" پوری کرنے کے لئے فرخ کو اپنی بیوی کو طلاق دینی ہوگی....... جائیے....... کہتے جا رہی ہیں۔"

❖❖❖○❖❖❖

Famous Urdu Novels

Free pdf Library